

نیر و پوائنٹ 3

جاوید چودھری



WWW.PAKSOCIETY.COM



سیدنا الخیر الخیر

زیر پوائنٹ 3

زیر پوائنٹ 3

1) جاوید چودھری

علم و فن کی پیشکش

40- انڈیا مارکیٹ، آریو بازار، لاہور، فون: 7232336، 7352332
www.enorfanpublishers.com, E-mail: enorfanpublishers@hotmail.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

زیر پبلسٹ 3	نام کتاب
جاوید چودھری	مصنف
گلزار احمد	ناشر
علم و عرفان پبلشرز، لاہور	پروف ریڈنگ
محمد صابر نواز	مطبع
زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور	سن اشاعت
20- اکتوبر 2007ء	قیمت
350/- روپے	

مشاق بک کارنر

الکرم مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ فون: 7230350

سیونٹھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور
فون: 7223584۔ موبائل: 4125230-0300

علم و عرفان پبلشرز

40- الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 7232336، 7352332
www.ilmoranpublishers.com. E-mail: ilmoranpublishers@hotmail.com

W
W
W
.
P
O
K
S
O
C
I
E
T
Y
.
C
O
M

W
W
W
.
P
O
K
S
O
C
I
E
T
Y
.
C
O
M

روینہ
اپنی بیوی کے نام



کاشف آزاد

ترتیب

13	کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے	1
17	برکت	2
21	84 حکمرانوں کے اختیارات	3
25	تین ہزار ایک سو چوبیس	4
29	بڑی سرکار	5
33	مصلحت	6
37	خوشحالی کا دیوتا	7
41	بڑا انسان	8
45	ہماری کہانی	9
48	مہاتیر کے ساتھ ایک ملاقات	10
51	لوہار کا بیٹا	11
55	آمر ہمیشہ ہوشے کی موت مرتے ہیں	

Kashif Azad@OneUrdu.com

59	یونینفارم	12
63	ہمیشہ عاجز اور دستیاب رہو	13
68	گڈ بائی مائی فرینڈز	14
72	شہباز شریف کی کہانی	15
76	شہباز شریف سے دوسری ملاقات	16
80	ایک صد روہ بھی تھا	17
84	عبرت ناک انجام	18
88	انسان آخر انسان ہے	19
92	افسوس میں مر رہا ہوں	20
95	محبت تو جا اور وقت	21
99	”میرا کیا قصور تھا“	22
103	جو چلنا جانتے ہیں	23
107	امن و امان	24
111	عصر کی قسم	25
115	سات جمع سات جمع ایک	26
119	باب دولہر جیسا دل	27
123	ایک منٹ چودہ سیکنڈ	28
127	صرف ایک لمبے کارڈ	29
131	رائٹ اپروچ	30
135	صرف چند نوجوان چاہئیں	31
138	چنوں کا لٹافہ	32

Kashif Azad@OneUrdu.com

142	طاقت	33
146	ناں کہنے کا ہنر	34
149	غربت انعام ہے	35
152	دو گھنٹے اپنے لئے	36
156	ترقی کا سٹیڈیم	37
160	کرے گا کون	38
164	مرہم کون لگائے گا	39
168	ترقی کی شاہراہ پر	40
172	ہم بھکاری ہیں	41
176	کوڑے کے انڈوں سے ہنس نکلنے کا انتظار	42
179	دو نیشیں	43
182	لوگ بھی ضروری ہیں	44
185	بیڈ کوالٹی پر آس	45
189	ماہ نور بنام مملکت خدا داد	46
193	پروین بنام امیر الحق	47
198	رباب بنام پاکستان	48
204	رٹ آف دی گورنمنٹ	49
208	افسوس ہم نے ایک بار پھر ثابت کر دیا	50
212	انڈھی آنکھوں کے خواب	51
216	بنیادی اصول	52
220	قانون	53

Kashif Azad@OneUrdu.com

224	کاش ملک کی ساری عدالتیں ایسی ہو جائیں	54
228	نہ ا قانون	55
232	چیف جسٹس صاحب کے حضور	56
236	انصاف	57
240	358 برس بعد	58
244	بڑی عدالت	59
248	لیگل پرو فیشنلو	60
252	وہ کون ہے؟	61
256	ہم لوگوں نے تو	62
260	ججوں کی ذمہ داری باقی ہے	63
264	جس طرح	64
268	اکیسویں صدی کے شیخ چلی	65
271	ڈیڈ لائن	66
275	چند ماہ کی بات ہے	67
278	ٹائمن ایون	68
282	محبت اور امن	69
286	ملک بھی بھتو ہوتے ہیں	70
290	کاش اسرائیل اسلامی ملک ہوتا	71
294	بس اب رسوائی اور سزائے عظیم باقی ہے	72
297	پانسپ لائن کی بجائے	73
301	جو لوگ اپنا بیگ نہیں اٹھا سکتے	74

Kashif Azad@OneUrdu.com

305	صغیرہ اسلام کے خلاف غداری کا پرچہ درج کرائیں	75
309	صغیرہ اسلام جیسے رول ماڈل	76
313	ہم نے چین سے کیا پایا	77
317	دیوار چین	78
321	”کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں آتے“	79
325	ہم ایک زندہ دل قوم ہیں	80
328	ٹیری اگر یہاں ہوتی	81
331	گھانے کا سودا	82
335	بٹ آئی لائیک یوسوچ	83
339	معمول کی کارروائی	84
343	اپنے بچے	85
348	پہلا پڑاؤ	86
351	کانڈ کا گلاس	87
355	حرم کی مٹی	88
358	آدھا گلاس	89
362	خوشی	90
366	21 گرام	91
370	کنفن چور	92
374	دی آرسوری	93
379	سلی بریشن	94
383	ترتیب	95

Kashif Azad@OneUdu.com

زیر پبلیکیشن 3 0 12

387	جاب اور کام	96
391	ون مین شو	97
395	وفادار	98
398	بس ایک قدم	99
402	ایڈجسٹمنٹ	100
406	بڑے گھروں والے	101
409	جسے اللہ عزت دے	102
413	آج سے	103



کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے (میری داستان تھوڑی تھوڑی)

میری عمر اس وقت تین سال تھی میرے والدین گاؤں سے تازہ تازہ کھاریاں آئے تھے کھاریاں میں تھی نئی چھاؤنی نئی تھی شہر میں سوئی گیس نہیں تھی چنانچہ میرے والد نے کولے کا کام شروع کر دیا وہ صوبہ سرحد پنجاب اور بلوچستان سے کولنگنگوانے تھے اور یہ کولنگ چھاؤنی کو سپلائی کر دیتے تھے اس کا وہ پاسے انہوں نے لاکھوں روپے کمائے ہم لوگ کھاریاں میں گھمانے رو رہے تھے یہ دیکھ کر بچے کا ایک درمیانی دور بچے کا مکان تھا جس کا گھر بہت بڑا تھا اور مکان میں ایک چھوٹا سا کواں بھی تھا اس دور کی دو یادیں ابھی تک میرے ذہن سے چپکی ہوئی ہیں مجھے ان دونوں واقعات کی تمام جزئیات آج تک یاد ہیں یہ سردیوں کا زمانہ تھا ہم ایک صبح اٹھے تو ہمارے دروازے کے سامنے کوئی فقیر لیٹا تھا اس نے بدبو دار رضائی اوڑھ رکھی تھی میرے والد کو بڑا افسردہ آیا اور وہ اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگے لیکن وہ بس سے مس نہ ہوا میری والدہ نرم دل خاتون ہیں وہ نماز اور روزے کی انتہائی پابند ہیں انہوں نے فوری طور پر مداخلت کی اور فقیر کی "جان بخشی" کرادی وہ فقیر بعد ازاں مستقل طور پر ہمارے گھر کے سامنے اقامت پذیر ہو گیا ہمارے گھر کے آگے ایک بڑھی کی دکان تھی وہ بڑھی رات کو دکان بند کرتا تھا تو فقیر دکان کے تھڑے پر ڈیرہ ڈال لیتا تھا اور صبح کے وقت تھڑے سے اتر کر ذرا دور چٹائی بچھاتا تھا اور رضائی اوڑھ کر وہاں بیٹھ جاتا تھا فقیر کے کھانے پینے اور چائے کا بندوبست میری ماں نے اپنے ذمے لے لیا تھا اور انہوں نے مجھے فقیر کا "ویٹ" بنا دیا تھا میری ماں دن میں تین مرتبہ پڑے میں سامن زونیاں اور پانی کا پیالہ رکھتی اور میں بڑی مشکل سے یہ پڑے اٹھا کر فقیر کے پاس پہنچاتا فقیر مجھے جوں ہی گھر کی دلیز سے باہر نکلتے دیکھتا تو وہ ٹرے تمام لیتا اور مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیتا مجھے اس کی چٹائی اس کے کپڑوں اور اس کی رضائی سے شدید بدبو آتی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں میں اس کے باوجود اس کے پاس بیٹھ جاتا تھا میری ماں نے اس کا نام باباجی رکھ دیا تھا لہذا میں آنے والی سطروں میں اسے باباجی ہی لکھوں گا باباجی میرے ساتھ ہلکی ہلکی گفتگو بھی کرتے تھے وہ مجھے اکثر کہا کرتے تھے تم پڑھنا اچھے بچے بنا اور بڑے ہو کر کتابیں لکھتا اور میں تمہاری

کتابیں پڑھوں گا وغیرہ غیرہ میں برتن اٹھا کر وہاں جانے لگا تو وہ اپنے سر ہانے کے نیچے سے اخبار کا کوئی نہ کوئی مسئلہ نکلا مسخرہ لکھنے دوڑوں ہاتھوں سے اسے سیدھا کرتے اور کہتے تم مجھے اخبار پڑھ کر سناؤ میں اس وقت تک اخبار نہیں پڑھ سکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مجھے اخبار تمہارا دینے تھے اور میں اخبار کا یہ مسخرہ ساتھ لے آتا تھا اور سارا سا رولن اسے دیکھا کرتا تھا۔

ایک دن بارش کا موسم تھا شہر میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور بارش کے باعث بڑھی دکان کھولنے نہیں آتا تھا چنانچہ اس دن بابا جی کو گھر سے نہیں اترا تا پڑا تھا میری ماں نے مجھے بڑی مشکل سے اٹھایا اور میں شدید سردی اور دھند میں ناشتہ لے کر بابا جی کے پاس حاضر ہو گیا بابا جی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے اور سڑک پر بارش کے گرتے قطرے کود کچھ رہے تھے وہ اس سطر میں بری طرح محو تھے میں نے ان کے سامنے لڑے رکھا تو وہ چونک پڑے اور سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگے میں ڈر گیا بابا جی چند لمبے تک مجھے دیکھتے رہے اور اس کے بعد مسکرا کر بولے "چلو ادر بندہ جاؤ" میں ان کی چٹائی پر بیٹھ گیا باہر شدید سردی اور دھند تھی میں سردی سے کانپ رہا تھا بابا جی نے پوچھا "سردی لگ رہی ہے" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا بابا جی مسکرائے میرا ہاتھ پکڑا اور تھپی منہ میں کچھ پڑھنے لگے ذرا دیر بعد مجھے محسوس ہوا ان کے ہاتھ سے حدت نکل رہی ہے اور بڑی تیزی سے میرے جسم میں داخل ہو رہی ہے چھ لمبے بعد میرے ہاتھ پر پینے کے قطرے چھیننے لگے انہوں نے مسکرا کر پوچھا "اب بھی سردی لگ رہی ہے" میں نے انکار میں سر ہلا دیا وہ مسکرائے اور دوبارہ بولے "سردی اور گرمی انسان کے اندر ہوتی ہے اگر انسان اپنے باطنی رکھ لیز تک پہنچ جائے تو وہ بڑی آسانی سے اپنا درجہ حرارت کم اور زیادہ کر سکتا ہے" مجھے اس وقت ان کی بات سمجھ نہ آئی میرے لئے درجہ حرارت رکھ لیز اور باطنی جیسے الفاظ اجنبی تھے لیکن میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا انہوں نے اپنے سر ہانے کے نیچے سے چاق کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نکالا اور میرے سامنے فرش پر ایک دائرہ کھینچ دیا اور میری طرف دیکھ کر بولے "تم سڑک کے ایک سرے سے دوسرے تک دیکھو" میں نے باہر سڑک کی طرف دیکھا سڑک پر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی آسمان سے پانی برس رہا تھا پانی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل اختیار کرنا تیزی سے آگے بہتا چلا جاتا تھا میں نے جہاں تک نظر جاتی تھی سڑک دیکھ لی وہ بولے "اب تم آنکھیں بند کر دو اور جب تک میں نہ کہوں آنکھیں بند رکھنا" میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں بند کر لیں وہ نیچی آواز میں کسی اجنبی زبان کے الفاظ دہرانے لگے وہ پڑھتے پڑھتے خاموش ہوئے اور سخت آواز میں بولے "آنکھیں کھولو" میں نے ہٹ سے آنکھیں کھول دیں انہوں نے انگلی کے اشارے سے دائرے کی طرف دیکھنے کا حکم دیا میں نے دائرے کی طرف نظر گھمایا تو میں حیران رہ گیا دائرے میں ظہر چل رہی تھی یہ ایک بگی سڑک تھی جس پر تانے چل رہے تھے اور اس سڑک کے دونوں اطراف کچے مکان تھے مکانوں کے درمیان میں کھیت تھے اور کھیتوں میں لوگ بیلیوں سے چل چلا رہے تھے میں نے مکانوں کے درمیان میں تیلی کا ایک کولہ بھی دیکھا بوزھا تھا کھڑی

کے تحت پر بیٹھا تھا اس کے سامنے ایک کولو تھا اور ایک کمزور لاغر سائیل کولو کھینچ رہا تھا کولو کے پرنا لے سے سرسوں کے تیل کی باریک سی دھار نکل رہی تھی کچی سڑک کے ایک سرے پر ٹھیلے والے کھڑے تھے ٹھیلوں پر نکلنیاں برف کے گولے اور قاشے بک رہے تھے اور بچے جیب سے نکلے نکال نکال کر یہ چیزیں خرید رہے تھے میں نے گھبرا کر بابا جی کی طرف دیکھا بابا جی دائرے پر نظر میں جمائے بیٹھے تھے اور مسلسل کچھ بڑھ رہے تھے میں نے دوبارہ دائرے کی طرف دیکھا تو وہاں منظر بدل چکا تھا اب دائرے میں ایک کچی سڑک تھی سڑک پر سولہ گاڑیاں بسیں اور رکشے چل رہے تھے سڑک کے دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں اور خوبصورت دکاتیں تھیں اور ان دکانوں سے لوگ خریداری کر رہے تھے مجھے سڑک پر ایک سکول بھی دکھائی دیا سکول کے سامنے بچوں کا رش لگا تھا میں نے گھبرا کر منظر سے آنکھیں پھیریں اور بابا جی کی طرف دیکھنے لگا انہوں نے پڑھنا بند کیا اور سکرا کر میری طرف دیکھنے لگے دائرے سے تصویر میں عاصم ہو چکی تھیں وہ ہنسے اور بولے "یہ اسی سڑک کا ماضی اور مستقبل تھا جس پر تم اس وقت بیٹھے ہو پہلا منظر اس سڑک کا آس برس پرانا ماضی تھا اور دوسری مارتم نے آج سے تیس برس بعد کی سڑک دیکھی تم آج سے تیس برس بعد جب اس جگہ سے گزر دو گے تو یہ سڑک ایسی ہوگی " میں بابا جی کی بات من کر پریشان ہو گیا اس کے بعد وہ آگے بٹکے اور انہوں نے اپنی انگلی میرے سر اور گردن کے درمیان میں موجود جوڑ پر رکھ دی اور سکرا کر بولے "اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ایک کیمبرہ لگا رکھا ہے اگر کسی انسان کا یہ کیمبرہ چل پڑے تو وہ ماضی حال اور مستقبل کی ساری تصویریں دیکھ لیتا ہے" انہوں نے اپنی انگلی وہاں رکھی اور بولے "یہ وقت کی جگہ ہے تم سے پہلے کیا تھا اور تمہارے بعد کیا ہوگا یہ ساری باتیں یہ سارے منظر اس جگہ محفوظ ہیں انسان کی آنکھ اگر اس جگہ کے اندر چلی جائے تو وہ اپنا ماضی حال اور مستقبل دیکھ لیتا ہے اور اگر یہ آنکھ تیز ہو تو وہ دوسروں کا وقت بھی سن لیتا ہے" میں خاموش بیٹھا رہا وہ دوبارہ بولے "میں تم پر وقت کا دروازہ کھول رہا ہوں اگر تم اچھے بچے ثابت ہوئے تو تم اپنی اور دوسروں کی تصویریں دیکھ سکو گے اور اگر بڑے ہو کر بدعاش بن گئے تو تم دنیا میں بڑی خرابی پھیلاؤ گے" میری دعا ہے تم اچھے بچے بنو " اس کے بعد بابا جی نے میری گردن کے اس مقام پر اپنا انگوٹھا رکھا اور وہاں شروع کر دیا مجھے درد کا ہلکا ہلکا اثر محسوس ہونے لگا پھر اچانک میری رینجھکی ہڈی میں بجلی کا ایک گوند سا لہرایا اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا مجھے جب ہوش آیا تو میں گھر میں پڑا تھا میرے اوپر رضائی تھی اور سارے گھر والے میرے ارد گرد بیٹھے تھے میرا پورا جسم بخار سے جل رہا تھا جبکہ میری ماں ڈر رہے میرے من میں عرق گلاب بنکار رہی تھی میں نے سب سے پہلے دیکھنا شروع کیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ میرے کانوں میں آوازیں آئے لگیں ان تمام آوازوں پر میرے والد کی آواز عادی تھی وہ مجھے سے بابا جی کو گالیاں دے رہے تھے چند دن بعد میری ماں نے مجھے بتایا بابا جی نے اس دن دروازہ بجایا اور مجھے میری والدہ کو کچرا کر بولے تھے "بچے کا سر چکرا گیا ہے آپ اس پر کسل دو سدا میں" میری ماں نے مجھے بے ہوش دیکھ کر دروازہ شروع کر دیا تھا میرے والد نے انہیں روتا دیکھا پھر مجھے دیکھا تو وہ باہر کھڑے کی

طرف لپکے لیکن بابا جی تمزے سے عاقب تھے میرے والد مات تک تمزے کے چکر لگاتے رہے مگر بابا جی والہس نہ آئے میں دودن بخار میں جھلنے کے بعد باہر نکلا تو بابا جی ابھی تک عاقب تھے تمزے کے ایک کونے میں ان کی چٹائی ان کی بد بو دار رضائی اور لوٹا پڑا تھا یہ ساری چیزیں کئی ہفتوں تک وہاں پڑی رہیں لیکن بابا جی والہس نہ آئے یہاں تک کہ ایک دن بڑھی نے یہ ساری چیزیں اٹھا کر گندے سالے میں پھینک دیں میں نے زندگی میں دوبارہ بابا جی نہ دیکھے مگر ان کی پر اسرار باتیں آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہیں جیسے آج تک بابا جی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے اور میں چونک کر آگے پیچھے کیٹھنے لگتا ہوں لیکن وہ مجھے کبھی نظر نہیں آتے۔

میں عملی طور پر ایک پریکٹیکل اور سائنسی ذہن کا شخص ہوں میں نے کبھی زندگی کو دو جمع دوا اور نیوٹن کے تیسرے قانون سے باہر نکل کر نہیں دیکھا میں مادے پر بھی عمل یقین رکھتا ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے اس پریکٹیکل لائف کے علاوہ بھی کوئی زندگی ہے اور یہ زندگی ہر وقت ہمارے آگے پیچھے اور دائیں بائیں چلتی رہتی ہے مجھے بچپن سے ماضی حال اور مستقبل کے جھماکے ہوتے رہتے ہیں میں کبھی دیواروں پر تصویریں سی چلتی دیکھتا ہوں اور یہ تصویریں بعد ازاں بج ثابت ہو جاتی ہیں۔ مجھے لوگوں کی فطرت اور نفسیات جاننے میں بھی سیکنڈ گلتے ہیں اور میرے دوست مجھ سے اکثر کہا کرتے ہیں تم

میں سے بری بات نہ نکالو کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ تم سبھی اکثر بری باتیں اور بری سوچیں ہی ثابت ہو جاتی ہیں۔ میں نے کچھ حصر تحمل اپنے ایک درویش دوست سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا "ہم لوگ اس خوبی کو وجدان کہتے ہیں یہ بعض لوگوں میں پیدا آتی ہوتی ہے اور بعض کو ریاضت سے ملتی ہے تم میں یہ قدرتی ہے" میں نے ان سے بابا جی کے بارے میں پوچھا تو وہ مسکرا کر بولے "وہ کشتی درویش تھا قدرت جن لوگوں کو وجدان کی نعمت سے نوازتی ہے ان کے دماغ اور بڑھکی بڑی کے جڑ میں ایک پھوڑا سا ہوتا ہے اگر پانچ سال کی عمر سے پہلے یہ پھوڑا پھٹ جائے تو اس بچے کا دماغ ترقی کرنے لگتا ہے بصورت دیگر وہ بچہ مجذوب بن جاتا ہے۔ وہ کشتی درویش اس پھوڑے سے واقف تھا چنانچہ اس نے تمہاری گردن دبا کر وہ پھوڑا پھاڑ دیا اس کی بس اتنی سی ڈیوٹی تھی وہ آیا اس نے اپنی ڈیوٹی کی اور چلا گیا اگر وہ ایسا نہ کرتا تو تم آج دفائی امراض کے کسی ہسپتال میں ہوتے یا پھر مجذوب بن کر مرزکوں پر تنگ دھڑنگ بھر رہے ہوتے" میرے یہ دوست ٹھیک ٹھاک قسم کے متقی اور پرہیزگار شخص ہیں میں ان کی باتوں کو بڑی عجیبگی سے لیتا ہوں لیکن پتہ نہیں کہیں مجھے ان کی اس بات پر یقین نہیں آتا اور میں بچپن کے اس واقعے کو نظر کا دھوکا اور اپنے "مشفق" کو اور ان سمجھتا ہوں ہم اکیسویں صدی میں رہ رہے ہیں اور اس صدی کا سائنسی و ماخ لسی باتوں پر یقین نہیں کیا کرتا دوسرا واقعہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے (باقی آئندہ)

جاوید چودھری

ہاؤس نمبر 490 سٹریٹ نمبر 17

شہزادانہ ذمہ اسلام آباد

برکت

خان عبدالصمد خان صاحب سے میرا رابطہ اچانک شروع ہوا اور اچانک ختم ہو گیا۔ آج سے چار پانچ برس پہلے کسی صاحب نے مجھے فیصل آباد سے فون کیا، ان کا کہنا تھا "ہمارے بابا جی آپ کے بہت بڑے بھتیجے ہیں، ہم انہیں آپ کا کالم پڑھ کر سناتے ہیں تو وہ بڑی دیر تک سر ہلاتے رہتے ہیں" میں نے ان سے پوچھا "آپ کے بابا جی کون ہیں" انہوں نے بڑی عقیدت سے جواب دیا "فیصل آباد جھنگ روڈ پر صوفی برکت صاحب کا ڈیرہ ہے خان صاحب ان کے ڈیرے پر ہوتے ہیں، ان کی عمر نوے سال سے زائد ہے، وہ مشرقی پنجاب کے کسی زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، بچپن میں روحانیت کی طرف مائل ہو گئے اور گھریاں چھوڑ کر اللہ کی راہ پر نکل آئے" طبیعت میں مجذوبیت ہے لیکن جب مائل ہوتے ہیں تو بہت خوبصورت گفتگو کرتے ہیں" مجھے ان کی گفتگو میں ذرا سی دلچسپی محسوس ہوئی لیکن میں بابا جی سے زیادہ متاثر نہ ہوں گا، چند دنوں بعد ان کا دوبارہ فون آ گیا، اس بار انہوں نے فرمایا "ہم نے آپ کی کتاب خرید لی ہے جس دن آپ کا کالم نہیں آنا ہم اس دن آپ کی کتاب میں سے کوئی کالم نکال کر بابا جی کو سنا دیتے ہیں، وہ آپ کے لئے بہت دعا مانگتے ہیں" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بھول گیا، چند دن بعد ان کا ایک اور فون آیا اور انہوں نے مجھ سے ہی فرمایا "لہجے بابا جی سے بات کیجئے، بیوں میں نے پہلی بار خان عبدالصمد خان صاحب کی آواز سنی، خان صاحب کی آواز میں عاجزی اور نرمی تھی، وہ مجھے بیٹا کہہ کر

مخاطب ہوئے اور میری تحریر کی تعریف کرنے لگے، گفتگو کے دوران کہیں کہیں ان کا لہجہ تبدیل ہو جاتا اس میں جلال آجاتا اور بات بے ربط ہو جاتی، میں خاموشی اور ادب سے ان کی بات سن رہا ہوں پھر اچانک فون بند ہو گیا، سنتے بعد ان کا ایک اور فون آ گیا، اس فون میں وہ بار بار ایک فقرہ دہراتے رہے "مہلت کم ہے، مہلت کم ہے" اس دن ان کی گفتگو میں ربط تقریباً مفقود تھا، میں بڑے نور سے ان کی بات سن رہا لیکن سچی بات ہے ان کی کوئی بات میرے پلے نہ پڑی وہ میری گفتگو سے بھانپ گئے لہذا انہوں نے فون اپنے "قریبان" کو پکڑا دیا، وہ صاحب بڑی عاجزی سے بولے "بابا جی فرما رہے ہیں ان کے پاس مہلت کم ہے لہذا آپ انہیں آ کر مل جائیں" میں نے سوچتے کیلئے چند دن مانگے اور فون بند کر دیا، مجھے اس سلسلے کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی مجھے مجذوبیت اور پراسراریت دونوں ناپسند ہیں، میرا خیال ہے آج کے انسان کو لنگر چاہیے، اسے تعویذ اور پھوکس نہیں چاہئیں، چنانچہ جو شخص بول نہیں سکتا، جو گفتگو سے انسپز نہیں کرتا، اس کے قریب نہیں پہنکتا، یہی معاملہ پراسراریت کا ہے، جو شخص مجھے اپنا نام کام اور پتہ نہ بتائے، جو خط کے آخر میں آپ کا ایک قاری یا ممبر بنی فرما کر میرا نام خفیہ رکھا جائے، لکھ دے مجھے اس پر ٹیٹس آ جاتا ہے، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے میری بے عزتی یا توہین کر دی ہو، مجھے خان صاحب بھی ایک پراسرار اور مجذوب قسم کی شخصیت تھے لہذا میں نے معذرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان دنوں مرگودھا میں میرے عزیزوں کے ہاں کسی کی فونگئی ہوئی، مجھے وہاں جانا پڑ گیا، وہاں لوگوں کے ساتھ کپ شپ کے دوران ایک صاحب نے یہ صاحب فیصل آباد سے آئے تھے اور ان کا گاؤں صوفی برکت کے مزار کے قریب تھا، میں نے خان صاحب کا ذکر کیا تو وہ صاحب ان کے عقیدت مند نکلے، انہوں نے بتایا خان صاحب ایک محیر العقول شخص ہیں، وہ سارا سارا دن سورج کو ٹٹکی باندھ کر دیکھتے رہتے ہیں، ان کی آنکھ کی پتلی میں اللہ لکھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی سفارش رو نہیں کرتا وغیرہ، سچی بات ہے ان صاحب نے خان صاحب کا ایسا حشر کھینچا کہ میرے دل میں خان صاحب سے ملاقات کا شوق پیدا ہو گیا لہذا میں اگلے دن ان کے ساتھ فیصل آباد چلا گیا، وہ مجھے صوفی برکت کے مزار کے پیچھے لے گئے، مزار کے پیچھے کھیت تھی اور کھیتوں کے مین درمیان ایک کچا کوٹھا بنا تھا، ہم کوٹھے کی طرف چل پڑے، کوٹھے کے حتم میں کھجور کی صف پر ایک ضعیف بزرگ بیٹھے تھے اور ان کے گرد چند نوجوان ادب سے بیٹھے تھے، میں قریب پہنچا تو بزرگ نے نوجوانوں کو اشارہ کیا، نوجوانوں نے بابا جی کو سہارا دیا، وہ بڑی مشکل اور تکلیف سے سیدھے

کھڑے ہوئے میں آگے بڑھا انہوں نے دونوں بازو پھیلائے اور میرے ساتھ بغل گیر ہو گئے ان کے لمس میں ایک ٹھنڈ اور خوشبو تھی انہوں نے مجھے پکڑ کر ساتھ بٹھالیا اور میرے ساتھ گفتگو کرنے لگا ان کی باتوں میں ربط نہیں تھا اور انہیں سمجھنے کیلئے بڑی یکسوئی درکار تھی وہ بار بار کہہ رہے تھے "جنگ ہوگی سب منافق مر جائیں گے" سنے لوگ آئیں گے وہ کوٹ پتلون میں نماز پڑھائیں گے اور اللہ کے دین کو بچائیں گے" وہ کہہ رہے تھے "اللہ کافر کو برداشت کر لیتا ہے لیکن منافق کو نہیں" وہ کہہ رہے تھے "یہ لوگ قرآن کو آدھا کریں گے یہ اپنے مطلب کی آیتیں پڑھیں گے اور باقی کو چھپادیں گے یہ پتلون پہن کر حج کریں گے اور رمضان میں شراب پیئیں گے یہ نمازوں پر پابندی لگائیں گے اور داڑھیوں کا مذاق اڑائیں گے یہ عورتوں کو باہر نکالیں گے اور مردوں کو گھروں میں بٹھادیں گے یہ دشمنوں کو کھلا چھوڑ دیں گے اور دوستوں کو پکڑ لیں گے اور یہ عربی اور بے ایمانی کو قانون بنا دیں گے" اس کے بعد وہ عربی فارسی اور سنسکرت کے طے جملے شعر پڑھتے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے" وہ رومال سے آنکھیں پونچھتے اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے "تم مجھ سے کتنے ہونے والے منافق نہیں ہو" اس کے بعد وہ آسمان کی طرف سے دیکھنے اور لہک لہک کر بولنے "میرے مالک میں نہیں ہوں تو مجھی اس سے راضی ہو جائے"

میرے صاحب میں اسے اچھا سمجھتا ہوں تو اسے اچھا کر دے" میرے رسول کے اللہ اسے اچھا بنا دے" وہ بولتے جاتے جاتے اور رو رو کر ہنستے جاتے اور میں ہونٹوں کی طرح انہیں دیکھتا جاتا وہ میرا بازو چھوڑتے اور اس کے بعد دوبارہ بے ربط گفتگو شروع کر دیتے۔

میں خان صاحب کے ساتھ شام تک رہا اس دوران انہوں نے میرا سر پکڑ کر اپنے سر کے ساتھ ٹکرایا مجھے ان کے سر میں ہلکا سا کرنٹ محسوس ہوا اور میں چند لمحوں کیلئے مدہوش سا ہو گیا لیکن میں نے اسے ماحول کا اثر سمجھا اور فراموش کر دیا انہوں نے اپنی انگلی سے میرے ماتھے پر کلک لکھا اور ایک خربوزہ کاٹ کر میرے سامنے رکھ دیا مجھے جھوک گئی تھی میں سارا کھا گیا" میں رخصت ہونے لگا تو میں نے ان سے سوال کیا "یہ صوفیاء کرام کیا ہوتے ہیں" وہ مسکرائے "صوفیاء کرام اللہ تعالیٰ کے ہر کارے ہوتے ہیں یہ اس کے کلرک سپاہی اور چراسی ہوتے ہیں" میں نے پوچھا "یہ کرتے کیا ہیں؟" وہ مسکرائے "جو کام تمہاری دنیا کے چراسی سپاہی اور کلرک کرتے ہیں یہ پرست" من اور شوکار جاری کرتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے انعام ایوارڈ اور تحفے لوگوں تک پہنچاتے ہیں" میں نے پوچھا "آپ کون ہیں" وہ مسکرائے "میں اللہ کا چراسی ہوں" میں نے

پوچھا "آپ کی کیا ذیونئی ہے" مسکرا کر بولے "میں لوگوں میں برکت تقسیم کرتا ہوں" میں نے ان کا ہاتھ تھام کر پوچھا "آپ نے مجھے کیوں بلایا" انہوں نے قبضہ لگایا "تمہاری عرضی منظور ہوگئی تھی تم نے برکت مانگی تھی مجھے حکم ہوا اسے برکت دے دین میں نے دے دی" میں نے عرض کیا "یہ برکت کیا ہوتی ہے" وہ مسکرا کر بولے یہ جاگ ہوتی ہے یہ وہ ایک تولہ دہی ہوتی ہے جو درود کے پورے سٹکے کو دہی بنا دیتی ہے" میں نے پوچھا "مجھے کیسے پتہ چلے گا مجھے برکت مل چکی ہے" انہوں نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر میرے چہرے پر نظریں جما کر بولے "تم جہاں جاؤ گے وہاں رونق لگ جائے گی اور تم جہاں سے اٹھ کر آ جاؤ گے وہ جگہ اجازت ہو جائے گی لوگوں کے دل تمہاری طرف کھینچے چلے جائیں گے لوگوں کو تمہارے پاس بیٹھ کر خوشی اور سکون ملے گا تم سے دوستی کرنے والے لوگ قائدے میں رہیں گے اور نقصان پہنچانے والے خود نقصان اٹھائیں گے" میں نے پوچھا "یہ برکت کب تک میرے ساتھ رہے گی" انہوں نے مجھے سینے سے لگایا اور جھکی دے کر بولے "جب تک تمہاری سوچ مثبت رہے گی جب تک تو جھکا رہے گا اور جب تک تو کبیر سے بچا رہے گا"

Kashif Azad@OneUrdu.com

میں نے خان صاحب کو سلام کیا اور واپس آ گیا یہ میری خان عبدالصمد خان کے

ساتھ پہلی اور آخری ملاقات تھی وہ مجھے میرا حصہ دے کر اگلے ماہ رخصت ہو گئے۔



84 حکمرانوں کے اختیارات

میں نے ایک دن خواجہ صاحب سے پوچھا "عام آدمی اور صوفی میں کیا فرق ہوتا ہے" وہ نرم آواز میں بولے "صوفی پریشان ہوتا ہے اور وہی حیران" میں نے انہی سے پوچھا "آپ زندگی میں کبھی حیران اور پریشان ہوئے" وہ مسکرائے "میں اس فیلڈ میں آنے کے بعد صرف ایک بار پریشان ہوا تھا" میں انہیں استیقا سے دیکھنے لگا۔ وہ بولے "جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو پسند آجاتا ہے اور اسے صوفیاء کی صف میں شامل کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے تو اسے کوئی نشانی دی جاتی ہے، یہ نشانی صوفی کے حسب، اس کے درجے اور اس کے تمام کاتین کرتی ہے کسی کو آئینہ ملتا ہے، کسی کو خرقہ نصیب ہوتا ہے، کسی کو دستار مل جاتی ہے اور کسی کے سر پر تاج رکھ دیا جاتا ہے، یہ نشانیاں عام لوگوں کو نظر نہیں آتیں، انہیں صرف دوسرا صوفی دیکھ سکتا ہے، صوفی ہزاروں، لاکھوں لوگوں میں دوسرے صوفی کو انہی نشانیوں سے پہچانتے ہیں میں ایک بار لندن گیا میں سنٹرل لندن میں پھر رہا تھا اچانک ایک ڈسکو کلب کا دروازہ کھلا اور ایک شخص جھومتا اور جھومتا ہوا باہر نکلا اور لڑکھڑا کر فٹ پاتھ پر گر گیا میں نے اسے دیکھا، اس نے مجھے دیکھا اور ہم دونوں ہنس پڑے، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ ہم دونوں کلاس فیلو تھے وہ بھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا شاگرد تھا اور میں بھی، اسے شیخ نے اپنا رومال دے رکھا تھا، تم غور کرو وہ گورا تھا، لادین تھا، جواری اور شرابی تھا لیکن اس کے باوجود میرا بھائی اور کا اس فیلو تھا، ہم دونوں نے ایک دوسرے

کی طرف ہاتھ بلائے اور چپ چاپ اپنے اپنے راستے پر چل پڑے۔ تو میں عرض کر رہا تھا یہ وہ نشانیاں ہوتی ہیں جن سے ایک صوفی دوسرے صوفی کو پہچانتا ہے اور ہم لوگ ان نشانوں کی وجہ سے دوسروں کے کاموں اور ملاقاتوں میں مداخلت نہیں کرتے۔

وہ ر کے اور دو بارہ بولے "ہمیں جب منتخب کیا جاتا ہے تو ہمارے پاس کچھ امانتیں رکھ دی جاتی ہیں، یہ امانتیں ولایت کی نشانیاں ہوتی ہیں اور ہم اس وقت تک دنیا سے رخصت نہیں ہوتے جب تک ہم یہ امانتیں حق داروں کو سونپ نہ دیں، میرے پاس بزرگوں نے ایک خرقہ خلافت رکھوایا تھا، یہ وہی خرقہ تھا جو نور الدین زنگی کو عنایت ہوا تھا اور کبھی محمود غزنوی کو ہندوستان بھجوایا گیا تھا۔ یہ ولایت کی بڑی امانتوں میں سے ایک امانت تھی، میں اسے روزِ حسرت سے دیکھتا تھا اور سوچتا تھا وہ کون خوش نصیب ہو گا جسے یہ نشانی نصیب ہوگی اور میں ساتھ ہی یہ دعا کیا کرتا تھا کاش وہ خوش نصیب میں ہوں۔" خواجہ صاحب نے حسرت سے آدھ بھری اور دوبارہ گویا ہوئے "ایک دن مجھے تہجد کی نماز کے بعد انگلی اٹھی اور میں جائے نماز پر ہی لیٹ گیا، مجھے نیند میں اٹھا لیکس تیس برس کا

ایک نوجوان دکھایا گیا، اس کا کپڑا کھلایا گیا اور یہ خرقہ اسے پہنچانے کا حکم دیا گیا۔ وہ نوجوان وہاں کینٹ میں رہتا تھا، میں نے امانت کی پوچھی اٹھائی اور وہاں کی بس میں سوار ہو گیا، وہ پوش علاقے میں رہتا تھا، میں مختلف لوگوں سے ایڈرنس پوچھتا ہوا اس کے گھر پہنچ گیا، میرے سامنے ایک بہت بڑی کونجی تھی، میں نے گھنٹی کا جنر دیا، ایک بوڑھی خاتون گیٹ پر آئی، میں نے اس سے زاہد صاحب کا پوچھا تو اس نے شدید غصہ سے میری طرف دیکھا اور پھنکار کر بولی، اب تم آگے ہو، تم لوگ واپس چل کر رکھ کر بھی ایسے کام کرتے ہو، مجھے اس خاتون کا لہجہ اور ہاتھ عجیب لگیں، میں نے بڑی لیاقت سے درخواست کی میرے پاس زاہد صاحب کی ایک امانت ہے جس انہیں یہ سونپنے بغیر واپس نہیں جاسکتا۔ مہربانی فرما کر ان سے میری صرف ایک منٹ ملاقات کرواؤں بوڑھی خاتون کا بلڈ پریشر یک دم بڑھ گیا اور وہ اونچی آواز میں دہائی مینے لگی وہ بد بخت پوش میں ہو گا تو کسی سے ملے گا ناں اور اس کے بعد وہ بوڑھی خاتون آسمان کی طرف دیکھ کر زاہد صاحب کو بدبختی دینے لگی، وہ بار بار کہتی تھی اس او! وہ تو میں بانجھ ہی اچھی تھی وہ یہ بھی کہتی تھی یا اللہ تو است اٹھا لے یا پھر مجھے اٹھا لے اس زندگی سے تو روزِ ش میں مڑنا اچھا ہے مجھے اس ساری صورت حال کی آج بھی آرتھی تھی میں گیٹ کی ہینڈ پر کھڑا تھا اور بوڑھی خاتون میرا راستہ روک کر بددعا میں اسے دہن تھی مجھے محسوس ہوا میں خدا چتے پر آ گیا ہوں کیونکہ تصوف کے اصولوں کے مطابق وہی ایسا

شخص ولایت میں داخل نہیں ہو سکتا جو اپنے والدین کا گستاخ ہو اور زائد صاحب کی ماں، بیٹی پر کھڑی ہو کر انہیں بدو عا میں دے رہی تھی مہر حال قصہ مختصر یہ سلسلہ بڑی، دیر تک چلتا رہا جب بڑھیا کو یقین ہو گیا میں زائد صاحب سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا تو وہ مجھے پیچھے سروٹ کو اور میں ملے آئی۔

خوب صاحب دم لینے کیلئے رکے میں بے تابی سے ان کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا وہ گویا ہوئے "اگر کا منظر انتہائی پریشان کن تھا پورے کمرے میں شراب کی خالی بوتلیں بکھری تھیں اور ان بوتلوں کے درمیان ایک خست حال نوجوان آ زحار تہ چما چڑا تھا نوجوان نیم برہنہ تھا اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اس نے کئی دنوں سے غسل بھی نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے جسم سے شراب اور پسینے کی مٹی جلی ہو آ رہی تھی بوڑھی خاتون مجھے وہاں چھوڑ کر چلی گئی میں نے نوجوان کو ہلایا "تھیلیاں دیں اور اس کے پاؤں پر گدگدی کی تو اس نے نیم، آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور گھبرا کر بیٹھ گیا وہ وحشی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا میں نے اس کے پاؤں چھوئے اور پوچھی اس کی گود میں رکھ دی وہ بڑی دیر تک پوچھی کو دیکھتا رہا اس کی آنکھوں میں

سناٹا تھا جس پر بار بار ہاتھ مارا اس نے پوچھی کو دیکھا اور مجھے اشارے سے کہا "میں نے تمہیں انھیں

لیکن پھر دوبارہ بیٹھ گیا اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور یہی آواز میں بولا "میں معلوم کر کے کیا کرو گے" میں نے عرض کیا "حضور میں اپنے سوال کی سزا سے واقف ہوں لیکن اس کے باوجود میں اپنے آپ کو روک نہیں پا رہا" وہ انھیں اس نے کارنس سے ایک تصویر اٹھائی اور اس پر انگلی رکھ کر بولا "اس کی وجہ سے" میں تصویر پر جھک گیا تصویر میں ایک بزرگ دلیل پیٹیر پر بیٹھتے تھے اور ویل چیئر کے پیچھے دروازے پر ملنے والی بوڑھی خاتون اور زائد صاحب کھڑے تھے زائد صاحب نے بتایا یہ میرے والد ہیں، میں ان کی اگلی اواد ہوں، میرے والد بہت رئیس انسان تھے لیکن مجھے دولت نے بگاڑ دیا تھا، میں شراب کی لت میں پڑ گیا تھا، میری صحبت خراب تھی میں اور میرے دوست ساری ساری رات شراب پیتے تھے، میری خرابی کی وجہ سے والد کو آٹھ پانچ ماہیں فانی ہو اور وہ ویل چیئر تک محدود ہو گئے جس کے بعد میں براتواری صبح اپنے والد کو اپنے ہاتھوں سے نبا ہوا تھا۔ یہ میرا معمول بن گیا تھا، ایک دن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا چاہا، ہم لوگوں نے رات خوب شراب پی، نشے کے دوران مجھے اچانک یاد آیا تو اسے اور صبح میرے والد میرے انتظار کرتے رہیں گے، میں فوراً انھیں میں نے کازمی کھالی اور واپس کا اعلان کر دیا، میرے دوستوں نے مجھے بہت سمجھایا انہوں نے مجھے بتایا رات بہت اندھیری ہے اور تم نشے میں دھت ہو، تم ناراض نہ بنو، تم نے کھانا کھانے سے روکنا

مگر لیکن میں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا، میں سادہ ارادت اپنے سر پر برف رکھتا اور لیسوں چوستا رہا لیکن میں صبح واپس واپس پہنچ گیا۔ میرے والد ویل چیئر پر بیٹھ کر میرا انتظار کر رہے تھے، میں نے فوراً صبح میں نیم گرم پانی ڈالا، پانی میں نمک اور لیسوں ملایا اور انہیں پانی میں لٹا کر فوراً سے ان کا ساج کرنے لگا، میرے والد اس دوران مجھے خود سے دیکھتے رہے میری آنکھیں نیند نشے اور تھکاوٹ سے پوچھ لیں مجھے جھٹکے لگ رہے تھے لیکن میں اپنے والد کو غسل دیتا رہا، میں نے غسل کے بعد انہیں تولیے سے خشک کیا، ان کے جسم پر پاؤڈر چھڑکا، انہیں صاف ستھرے کپڑے پہنائے اور ان کی ویل چیئر کے ساتھ ٹیک لگا کر سو گیا، یہ میری زندگی کی سستی ترین نیند تھی اس نیند میں مجھے ایک بزرگ دکھائی دیئے انہوں نے اپنا فرق اتارا مجھے پہنایا اور آپ کی شکل دکھا کر رخصت ہو گئے۔

خوبصاحب ر کے اور ذرا دیر تک کر بولے، میں نے زاہد صاحب سے پوچھا آپ کے والد کہاں ہیں، زاہد صاحب نے جواب دیا وہ اپنے رب کے پاس لوٹ گئے ہیں، میں نے ان سے پوچھا اب آپ کیا کریں گے، انہوں نے پوچھی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے میں اس پوچھی کے بعد کیا کر سکتا ہوں، میرے ہاتھ راستے ملے سوچے ہیں مجھے شراہوں کو راہ راست پہلانے کی پوچھی سوچتی تھی ہے، میں اس ٹھہرے ٹھہروں کا اور شہر شہر گاؤں گاؤں اپنے جیسے لوگوں کی اصلاح کروں گا۔

خوبصاحب ر کے اور دوبارہ بولے، میں نے زاہد صاحب سے دعائی درخواست کی اور اٹھ کر واپس آ گیا، خوبصاحب خاموش ہو گئے، میں نے ان سے پوچھا، زاہد صاحب کے پاس کتنے اختیارات ہیں، خوبصاحب نے ذرا دیر سوچا اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے، اتنے جتنے 84 ملکوں کے حکمرانوں کے پاس ہیں۔ میں نے حیرت سے عرض کیا، صرف ایک غسل کے بدلے اتنے اختیارات، خوبصاحب نے تہہ لگایا، جب اللہ دیتا ہے تو وہ سارے خزانوں کے دروازے کھول دیتا ہے، میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور اٹھ کر واپس آ گیا۔

تین ہزار ایک سو چوبیس

وہ جسے کے دن غائب ہو جاتے تھے، صبح سویرے اٹھتے تھے، وہ گاڑی میں عجیب و غریب سی چیزیں رکھتے تھے اور گھر سے رکھتے ہو جاتے تھے اور جب شام کو واپس لوٹتے تھے تو ان کے ہاتھوں پر ہارکول، سینٹ اور گارے کے داغ ہوتے تھے لیکن ان کے چہرے پر گہرا اطمینان ہوتا تھا، میں ان سے ہر بار اس پر اسرار سرگرمی کے بارے میں پوچھتا تھا مگر وہ مسکرا کر تال دیتے تھے، ایک جمعرات وہ میرے پاس آئے اور مسکرا کر بولے، اگر تم کل فارغ ہو تو میرے ساتھ چلو میں تمہیں اپنی مصروفیت میں شامل کرنا چاہتا ہوں، میں فوراً تیار ہو گیا، اگلی صبح میری زندگی کا انتہائی دلچسپ اور پر اسرار دن تھا، گیلائی صاحب نے سٹور سے ایک ہتھوڑی، ایک کھرپہ، ایلو سوئیم کی ایک پرات، تینوں کا ایک ڈبہ، مین ہوٹل کے دو ڈھکن، چند چٹنیاں، چند کنڈیاں اور چند کیل نکالے، ڈنگی میں رکھے اور مجھے ساتھ بٹھالیا، ہم اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گئے، راستے میں گیلائی صاحب خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے رہے، ان کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی پر اسراریت تھی، گیلائی صاحب راولپنڈی میں میرے پہلے میزبان تھے، میں 1992ء میں اسلام آباد منتقل ہوا اور میرے پاس اسلام آباد میں رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، میں مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا گیلائی صاحب کے پاس پہنچ گیا، گیلائی صاحب واپڑا میں ملازم تھے اور سیلائٹ ٹاؤن راولپنڈی کے ایک چھوٹے سے مکان میں مجر زندگی گزار رہے تھے، میں دو ماہ تک ان کے پاس

مہمان رہا۔

میں اس دن کی طرف واپس آتا ہوں، گیلائی صاحبہ سے وہ من کوہ پہنچے، انہوں نے گاڑی سے ایک چٹخنی، چھ بیچ، ایک بیچ کس اور ہتھوڑی نکالی اور مجھے لے کر امن کوہ کے ریستوران میں داخل ہو گئے، وہ سیدھے ٹوائٹ میں پہنچے، میں بھی ان کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا، ٹوائٹ کے دروازے کی چٹخنی ٹوٹی ہوئی تھی، انہوں نے پرانی چٹخنی اتارنی اور اس کی جگہ نئی لگا دی، مسکرائے اور مجھے حکم دیا، چلو، میں چل پڑا، انہوں نے راستے میں ایک جگہ گاڑی روکی، ڈکی سے پرات نکالی، پرات میں کلو بھر سینٹ ڈاگ سینٹ میں پانی ملا یا، شین لیس سٹیل کے بڑے چھڑوں سے سینٹ کس کیا اور پہاڑ کی طرف چل پڑے، پہاڑ کی دیوار کا ایک پتھر کڑو تھا، انہوں نے پتھر نکالا، اس کے ساتھ سینٹ لگایا اور وہ پتھر دوبارہ اس جگہ جڑ دیا، انہوں نے فارغ ہونے کے بعد باقی سینٹ دوسرے پتھروں پر لگا دیا، انہوں نے ذرا سے فاصلے سے پہاڑ کو غور سے دیکھا اور اطمینان سے سر ہلا دیا، ہم آگے چل پڑے، وہ چیز یا گھر کے قریب رکے، انہوں نے ڈکی سے بیجوں کا

کھڑا اور پانی کا ٹین نکالا اور مارک کے کنارے بیٹھ گئے، یہاں پہاڑ اور پتھر کی دیوار کے

درمیان ایک قدرتی کیاری بنی تھی، انہوں نے کھر پہلے سے کیاری کی مٹی نرم کی، وہاں بیج چھڑ کے اور ان پر پانی کی پھوار ڈال کر واپس آ گئے، ہم آگے چل پڑے، وہ جی تھری کی ایک جمبونی سی گلی میں داخل ہوئے، یہ مکانوں کی پچھلی گلی تھی اور اس میں کینوں نے جگہ جگہ کھرے کی نوکریاں لٹی ہوئی تھیں، پوری گلی میں سماز جھنکار اور کائی جی تھی، گیلائی صاحبہ کے ہاتھ میں مین بول کا ایک ڈھکن تھا، وہ گلی کے درمیان پہنچے، وہاں ایک مین بول کا ڈھکن غائب تھا، گیلائی صاحبہ نے مین بول پر ڈھکن لگا دیا، وہ کورڈ مارکیٹ کے قریب رکے، انہوں نے گاڑی سے بجلی کا ایک سوئچ نکالا اور بلال مسجد کے استیخانوں میں داخل ہو گئے، استیخانانے کا ایک سوئچ ٹوٹا ہوا تھا، گیلائی صاحبہ نے وہ سوئچ تبدیل کر دیا، وہ بازار روڈ کے سکول میں داخل ہوئے، ان کے ہاتھ میں ٹوٹے کا ایک دست تھا، سکول کے برآمدے میں کھٹی لکٹی تھی، کھٹی کے ساتھ دست پڑا تھا، انہوں نے پرانا دست اٹھایا اور اس کی جگہ نیا رکھ دیا، ہم دونوں آگے چل پڑے، راستے میں انہوں نے درخت کی ایک برنی سی شاخ توڑی اور ایک گلی میں داخل ہو گئے، گلی کے تین درمیان میں ایک بڑا سا گڑھ تھا جس کی وہی سے گاڑیوں، خاصیت زحمت اٹھانے پر برنی تھی، گیلائی صاحبہ نے یہ شاخ کڑھ سے میں رکھ دی، ہم آگے بڑھتے گئے، وہ شام تک مختلف جگہوں پر اس قسم کی کارروائیاں کرتے رہے، میں خاموشی سے

ان کے ساتھ ساتھ چندار ہا مغرب کی اذان کے وقت انہوں نے گھر پر ہاتھ رکھا آسمان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر واپسی کا اعلان کر دیا۔

میں گاڑی میں بیٹھ کر بار بار پیلو بدل رہا تھا، گیلانی صاحب میری بے چینی سے کالطف لے رہے تھے، ہم چاندنی چوک سے سیٹلائٹ ٹاؤن کی طرف مڑنے لگے تو وہ بولے "میں حضرت یہ فرماتے کا بیروکار ہوں اور یہ سب میری ذیوبی 'میری عبادت کا حصہ ہے" میں حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا، وہ بولے اس فرماتے کے بانی حضرت حضرت ہیں، ہم لوگ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کے قائل ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں نیکی کی طرح ہوتی ہے آپ آدھے تو لے کا کاج بوتے ہیں اسے پانی دیتے ہیں اس کج میں سے ایک کو نیل نکلتی ہے اور یہ کو نیل آگے چل کر سینکڑوں من کے روخت میں تبدیل ہو جاتی ہے دنیا کا کوئی انسان زمین میں کچھ نہیں کھسکتا، روخت نہیں لگا سکتا لیکن دنیا کا ہر انسان با آسانی سینکڑوں ہزاروں روختوں کے کج ہو سکتا ہے اور ہم لوگ نیکیوں کے کج بوتے ہیں،

ہم لوگ خاموش رہتے ہیں، ہم اپنے فرماتے کا اعلان نہیں کرتے، ہم اس کی نشر و اشاعت نہیں کرتے، ہم اپنی دلچسپی چاہتے کج بولنے، کج ہیں اور اپنے اپنے حصے کا کام ختم کرنے کے روخت

ہو جاتے ہیں، ہم لوگ ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر قوم میں موجود ہیں، ہم لوگ یہودیوں میں بھی ہیں، عیسائیوں میں بھی، مسلمانوں میں بھی، بودھوں میں بھی اور شاید ہندوؤں میں بھی ہیں، ہم روس میں بھی ہیں، امریکہ میں بھی، یورپ میں بھی اور پاکستان میں بھی، ہمارا ایک پورا ایک ہے، ہم پوری زندگی خود کو کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتے، ہم لوگ مجرور زندگی گزارتے ہیں اور زندگی میں چھوٹی چھوٹی نیکیوں کے تین ہزار ایک سو پانچ میں کج بول کر روخت ہو جاتے ہیں۔ "وہ رے اور دوبارہ

بولے "تم مجھ سے آج کے دن کی کارگزاری پوچھنا چاہتے ہو، میں تمہیں بتاتا ہوں، وہ امن کوہ کے اس نوائلٹ کی چٹخنی تھی، دنوں سے شراب تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو پریشانی ہوتی تھی، میں نے یہ

چٹخنی لگا کر سینکڑوں لوگوں کی پریشانی دور کر دی۔ یہاں کا وہ پتھر گر جاتا تو آگلی بارشوں میں وہاں لینڈ سلائڈ ٹھٹھ ہو جاتی، میں نے لینڈ سلائڈ ٹھٹھ کا راستہ روک دیا، میں نے سڑک کے اس موڑ پر

پھولوں کے کج لگا دیئے ہیں، وہاں بعد جو شخص اس تہہ سے گزرے گا وہ پھول دیکھ کر خوش ہوگا، اس گلی کے میں بول کا ہاتھن غائب تھا، وہاں سے بچا چلنے والے بچے گزرتے تھے اور ان کی جان کو

خطرہ رہتا تھا، پانچ مسجد کے نوٹے ہوئے سوچے سے نمازیوں کو آگت لگاتا تھا اور ان کے گزرنے میں شام رستے سے ڈرائیروں کو خطرات کی نشاندہی ہو جاتی تھی، میں نے اسے یہاں سے

ٹھکتا ہوں، وہ ر کے اور سکرا کر بولے "اب تم پوچھو گے میں نے یہ ساری باتیں تمہیں کیوں بتائیں" میں نے اثبات میں سر بلا دیا، وہ سکرائے "ہم میں سے ہر شخص رخصت ہونے سے پہلے یہ راز اپنے کسی قریبی شخص کو بتاتا ہے، یہ پانچ ہزار سال سے ہماری روایت ہے، میں رخصت ہو رہا ہوں لہذا اپنی امانت تمہیں سونپ رہا ہوں" ہمارا گھر آ گیا، گیلانی صاحب اترے، انہوں نے تالہ کھولا اور گھر میں داخل ہو گئے، میں پیسے میں شراہور تھا، انہوں نے لائٹ جلائی اور بولے "لیکن تم یہ نہ سمجھنا، ہم تمہیں اپنے فریضے میں داخل کر رہے ہیں، ہم لوگ دنیا دار لوگوں کو اپنی جماعت میں شامل نہیں کرتے۔ میں بس تمہیں راز دار بنا رہا ہوں، تم کل اپنا پورا پائسز اٹھانا اور یہ گھر چھوڑ دینا، ہمارا ساتھ بس بسیں تک تھا" وہ تویہ لے کر غسل خانے میں چلے گئے، میں نے دوسرے دن گیلانی صاحب کا گھر چھوڑ دیا اس کے بعد وہ مجھے کبھی نہیں ملے لیکن میں جب بھی کوئی من ہوں دیکھتا ہوں، کوئی ٹوٹی ہوئی چٹنی دیکھتا ہوں یا مجھے کسی سڑک کے گڑھے میں درخت کی کوئی شاخ نظر آتی ہے تو مجھے بے اختیار گیلانی صاحب یاد آ جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کیا یہ لوگ واقعی ہمارے

لوگوں میں سے ہیں، کیا حضرت خضر کی جماعت حقیقتاً ہمارے ارد گرد چھوٹی چھوٹی جگہوں کے چکر پر
 رہی ہے یہاں پہنچ کر میں ہمیشہ کو کوئی صورت حال کا شکار ہو جاتا ہوں۔



بڑی سرکار

”درمیان میں پانچ دن آگے سے پانچ دن کہاں سے آئے تھے اور ان کے آنے کی وجہ کیا تھی مجھے آخر تک سمجھ نہیں آئی۔ وہ ایک لمحے کے لئے رکنے اور سٹپا کر دوبارہ گویا ہوئے۔“ میں ملک سے باہر تھا، میری خواہش تھی میں رٹائرمنٹ کے بعد باقی زندگی فرانس کے کسی گاؤں میں گزار دوں، میں نے سوکس فرانس سرحد پر چھوٹا سا مکان بھی خرید لیا تھا لیکن پھر وزیر اعظم صاحب فرانس آگئے وہ میرے گھر تشریف لائے اور مجھے پاکستان آنے کی ترغیب دینے لگے، میں نے عرض کیا میں ملک کے حالات سے دلبرداشتہ ہو چکا ہوں لہذا میں نے اپنی خواہش سے اپنے لئے یہ گوشہ منتخب کیا ہے، میں اس خرابے میں واپس جانے کیلئے تیار نہیں ہوں، وزیر اعظم صاحب میرے پرانے دوست تھے انہوں نے اصرار شروع کر دیا، میں ان کے اصرار کے سامنے بے بس ہو گیا، وزیر اعظم صاحب میرے گھر سے اٹھنے لگے تو میں نے ان سے اپنی مرضی کا ٹکڑا مانگ لیا، میرا کہنا تھا میں اس جگہ میں زیادہ بہتر طریقے سے کام کر سکتا ہوں، وزیر اعظم نے فوراً ہاں کر دی، ہم نے تاریخ طے کی اور وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

میں نے چند ماہ میں اپنی نوکری سے استعفیٰ دیا، سامان پیک کیا اور پاکستان آ گیا، میں نے وزیر اعظم صاحب سے ملاقات کی، وزیر اعظم نے میری پوسٹنگ کا حکم دے دیا، دو دن بعد مجھے تقرر نامہ مل گیا، میں نے تقرر نامہ کھولا تو میں حیران رہ گیا، میری تقرری ایک غیر متعلقہ جگہ کے

دورہ از سنیشن پر کر دی گئی تھی مجھے ایک ایسے ٹکٹے کا ڈائریکٹر جنرل لگا دیا گیا تھا جس کی میں الف سے تک سے واقف نہیں تھا میں نے فوراً نیشنل سیکرٹری سے رابطہ کیا وہ پریشان ہو گئے انہوں نے تحقیق کی تو پتہ چلا اس دن وزیراعظم نے دو افسروں کے تقرر کا حکم دیا تھا اور غلطی سے دوسرے افسر کا خط میرے نام سے جاری ہو گیا خط جاری کرنے والا جوائنٹ سیکرٹری انتہائی پریشان تھا اس نے مجھ سے درخواست کی آپ مہربانی فرما کر وزیراعظم صاحب کو اس غلطی کی اطلاع نہ دیں ہم سب کی نوکری اور کیریئر برباد ہو جائے گا میں نے اس کا تل پوچھا اس نے ایک عجیب حل تجویز کیا اس نے کہا "سر آپ اس ٹکٹے کو جوائن کر لیں ہم پانچ دن میں آپ کو دوسرے ٹکٹے میں ٹرانسفر کر دیں گے" میں نے احتجاج کیا لیکن وہ گریہ زاری اور منٹوں پر اتر آیا چنانچہ میں اسے پریشان دیکھ کر نرم ہو گیا میں نے سوچا صرف پانچ دن کی تو بات ہے میں یہ پانچ دن جیسے تیسے گزار لوں میں نے ہاں کر دی دوسرے دن میں نے جوائننگ دے دی "دور کے سانس لیا اور مسکرا کر بولے" میں نے پانچ دن پورے کئے چھٹے اور ساتویں دن جیسی تھی آٹھویں دن مجھے نیا تقرر نامہ مل گیا میں نے پانچ دن واسٹے ٹکٹے کو ختم کر لیا اور نئے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا میں اسلام آباد پہنچ گیا یہ 12 اکتوبر کا دن تھا میں ہونٹوں میں ٹھہرا ہوا تھا کہ شام کو اطلاع آئی فوج نے ایک ہار پھراقتدار سنبھال لیا ہے میں حیران رہ گیا دوسرا اور تیسرا دن اسی حیرانی میں گزر گیا چوتھے دن میں اپنے نئے دفتر گیا تو پتہ چلا وزیراعظم کے تمام پرانے احکامات منسوخ ہو چکے ہیں لہذا میں اب ٹکٹے کا چارج نہیں لے سکتا میرے مقدر کا فیصلہ اب نئی انتظامیہ کرے گی میں نے کندھے اچکائے کراچی واپس آیا اپنا سامان بک کرایا اور فرانس آ گیا میرا دینے کا اینڈ پنچر ختم ہو گیا وہ خاموش ہو گئے۔

میں ان کی انتہائی بور اور غیر ضروری حد تک طویل داستان سن کر تھک چکا تھا میرے چہرے پر بیزاری کے آثار نمایاں تھے اور سوچ رہا تھا اس کہانی میں مقدر کا عنصر کہاں پوشیدہ ہے، ایسی ہزاروں کہانیاں ہمارے دائیں بائیں بکھری پڑی ہیں وہ میری کیفیت بھانپ گئے انہوں نے کافی کے گک پر ہاتھ پھیرا اور ذرا سی شوخ آواز میں بولے "اب سوال پیدا ہوتا ہے قدرت نے مجھے پاکستان کیوں بھجوا یا تھا" میں نے آہستہ سے سر ہلا دیا وہ ہنسے "قدرت نے مجھے صرف ایک ڈرائیور کے لئے پاکستان بھجوا یا تھا" میں نے چونک کر سر اٹھایا وہ شوخ آواز میں بولے "میں نے جب اس غیر متعلقہ اور ناپسندیدہ ٹکٹے کا چارج لیا تھا تو اس سے پہرے ٹکٹے کا ایک بوزھا اور بنار ڈرائیور میرے پاس آیا اس نے مجھ سے پوچھا صاحب آپ دوسرے ملک سے آئے ہیں میں

نے اسے گھور کر جواب دیا "ہاں فرانس سے ڈرائیور نے کانپتے ہوئے عرض کیا "جناب آپ کو یہاں صرف میرے لئے بھجوایا گیا ہے" میں نے اس سے وجہ پوچھی وہ بولا "جناب پانچ دن بعد میری بیٹی کی شادی ہے اور میرے گھر میں پانی کے ایک گھڑے کے سوا کچھ نہیں" میں نے پچھلے صاحب کو امداد کی درخواست دی تھی لیکن اس نے انکار کر دیا تھا میں نے بڑی سرکار سے اس کی شکایت کر دی لہذا وہ یہاں سے ٹرانسفر ہو گیا جس کے بعد میں نے بڑی سرکار سے درخواست کی "آپ کسی باہر کے بندے کو میری مدد کے لئے بھجوائیں اس ملک کے افراد کے دل بہت تنگ ہیں بڑی سرکار نے مجھ سے وعدہ کیا وہ سیکنڈ کی بارات سے پہلے کسی نرم دل افسر کو یہاں بھجوادیں گے" میں نے اس سے پوچھا "تمہاری بڑی سرکار کون ہے" اس نے انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کیا اور گھوگھیر آواز میں بولا "وہ ہم سب کی بڑی سرکار ہیں" وہ مجھے ایک دلچسپ کردار لگا لہذا میں نے اس سے کہا "تم ثابت کرو مجھے یہاں صرف تمہارے لیے بھجوایا گیا ہے" وہ مسکرایا اور عازرانہ آواز میں بولا "آپ مجھے صرف ایک سوال کا جواب دے دیں میں ثابت کر دوں گا" میں نے کہا "پوچھو وہ بولا" کیا تم یہاں اپنی مرضی سے آئے ہیں" میں نے انکار میں سر ہلا دیا وہ بولا

Kashif Azaad@One Urdu.com

"جناب آپ کا انکار میرے دعوے کا ثبوت ہے" میں نے خموزی دیر سوچا تو وہ ڈرائیور مجھے ڈرا ڈرا سا ٹھیک لگایا، میں نے اپنے پی اے کو بلایا اور اسی وقت اس ڈرائیور کو مجھے کے فنڈ سے تین لاکھ روپے دینے کا حکم دے دیا، میں نے بینک فون کر کے خیبر سے فوری ادائیگی کی درخواست بھی کی، اس کے بعد میں نے شاف کو حکم دیا بارات کے استقبال کیلئے لان میں خوبصورت شامیانہ لگا یا جائے اور بارات کو کھانا منگنے کی طرف سے دیا جائے، میں نے انہیں حکم دیا ہم سب بارات کا استقبال کریں گے اور پورا محکمہ مل کر ڈرائیور کی بیٹی کو رخصت کرے گا۔ میرے احکامات پر عملدرآمد شروع ہو گیا، ڈرائیور کو جہیز کے لیے رقم مل گئی، ہم لوگوں نے دفتر کے لان میں شامیانہ لگوائے، لان میں چراغ لگایا۔ بارات کیلئے کھانا پکوا دیا، سب نے مل کر بارات کا استقبال کیا، پورے منگنے نے وہ لہے لہن کو سلامیاں دیں اور دعاؤں اور پیار کے ساتھ بیٹی کو رخصت کر دیا۔ اگلی صبح وہاں میرا آخری دن تھا، میں دفتر آیا تو پتہ چلا فجر کی نماز کے دوران ڈرائیور کو ہارٹ ایک ہوا اور وہ جہدے کے عالم میں فوت ہو گیا۔ میں نے اس کا جنازہ پڑھا اور کراچی واپس آ گیا۔ کراچی سے میں اسلام آباد گیا اور اسلام آباد سے پانچ دن بعد میری واپسی کا عمل شروع ہو گیا یوں میری ڈیوٹی ختم ہو گئی، وہ خاموش ہو گئے۔

میں انہیں حیرت سے دیکھنے لگا، دو بولے "مجھے صرف اس ڈرائیور کے لیے پاکستان بھجوا دیا گیا تھا، میری جاب صرف پانچ دن تک محدود تھی لہذا جوں ہی میرا کام ختم ہوا، میں واپس فرانس آ گیا" وہ رے کے اور دو بارہ بولے "ہم سب بڑی سرکار کے ممبرے ہیں، ہمیں بڑی سرکار کبھی کسی ڈرائیور، کبھی کسی مالی، کبھی کسی چوکیدار، کبھی کسی چیز اسی اور کبھی کسی خانساے کیلئے دائیں بائیں اور آگے پیچھے کرتی رہتی ہے اور ہم نا جانتے ہوئے نا چاہتے ہوئے اپنے حصے کی خدمت سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ جب ہمارا کام ختم ہو جاتا ہے تو ہمیں بڑی سرکار رینا کر دیتی ہے اور ہم واپس اپنے گھر لوٹ جاتے ہیں" وہ خاموش ہو گئے، میں نے ان سے آہستہ سے پوچھا "وہ ڈرائیور کہاں کا رہنے والا تھا" وہ مسکرائے اور میری طرف دیکھ کر بولے "وہ سکھر کا رہنے والا تھا" میں نے ان سے عرض کیا "وہ ایک صاحب دسترس شخص تھا، ہمیں اس کی قبر پر حاضری دینی چاہیے" وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے، میں نے عرض کیا "جس شخص کو بڑی سرکار عرضی ڈالنے کی اجازت دے دے، جس کی مدد کے لیے اللہ آپ جیسے لوگوں کو فرانس سے بھجوادے وہ شخص کوئی عام انسان نہیں ہو سکتا، وہ ناقیناً بڑی سرکار کے نظام کا کوئی بڑا جزوہ تھا" انہوں نے ذرا دوپوچھا اور ہاں میں سر ہلا دیا، وہ گزشتہ روز دو بارہ میرے پاس آئے تو میں نے ان سے ڈرائیور کی قبر کے بارے میں پوچھا، وہ بڑی دیر تک افسردہ انداز سے میری طرف دیکھتے رہے اور آہستہ آہستہ آواز میں بولے "وہ قبر قبروں کے جہوم میں گم ہو چکی ہے، میں قبرستان میں مسلسل دو دن قبر تلاش کرتا رہا لیکن وہ مجھے نہیں ملی" میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور پورے یقین سے عرض کیا "وقت نے ثابت کر دیا وہ واقعی کوئی بڑا شخص تھا"۔



مصلحت

ان کی آنکھوں میں پانی آ گیا، انہوں نے آنسو روکنے کیلئے تیز تیز چپکلیں ملائیں اور
 آرام سے لے لی تھی، وہ بہاروں انکھوں لوگوں کی طرت پنہنوں میں فوت ہو چائیں، اللہ تعالیٰ کو
 انہیں یوں چار برس تک ہسپتالوں میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت تھی، مجھے ان کی تکلیف نہیں
 بھولتی، میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو میرے دماغ میں ان کی جھپٹیں گونجنے لگتی ہیں، میں تڑپ کر اٹھ
 جاتا ہوں اور اس کے بعد مجھے ساری رات فینڈ نہیں آتی، انہوں نے رومال سے آنکھیں صاف
 کیں، ٹھنڈا سانس بھر اور خاموش ہو گئے۔

وہ پاکستان کے سب سے بڑے صنعت کار ہیں، ان کی فیکٹریوں میں کتنے لوگ کام
 کرتے ہیں، ان کے ستنے بینک اکاؤنٹس ہیں اور ان اکاؤنٹس میں روزانہ اتنی رقم جمع ہوتی ہے، وہ
 نہیں جانتے، وہ پچھلے 20 برس سے پاکستان کی 20 امیر ترین شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ ان
 کے پاس حقیقتاً دنیا کی ہر نعمت ہے، انہوں نے زندگی میں خوشی، کامیابی اور آسائش کو بڑے قریب
 سے دیکھا۔ وہ ایک ایسے شخص ہیں جن پر لوگ رشک کرتے ہیں، لوگ ان جیسا کامیاب شخص بننا
 چاہتے ہیں لیکن پھر ان کی زندگی میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، ان کی بیٹی کو کینسر ہو گیا، ان کے پاس
 بے تحاشا دولت تھی لہذا ان کا خیال تھا ان کی دولت کے سامنے یہ مرض بہت چھوٹا ہے، وہ دنیا کے

بہترین ہسپتالوں اور ماہر ترین ڈاکٹروں سے ٹیم کا علاج کرائیں گے اور ٹیم صحت مند ہو کر گھر آ جائیں گی۔ انہوں نے دنیا کے ایک سر سے سے مان شروع کیا اور دوسرے کو نے تک ملے تھے وہ ٹیم کو لے کر دنیا کے تمام بڑے ڈاکٹروں کے پاس گئے، انہوں نے ٹیم کے سر ہائے قیمتی ترین ادویات کا ڈھیر لگا دیا، انہوں نے کوئی جہ نسیہ، کوئی حکیم، کوئی بابا نہ چھوڑا لیکن ٹیم کی تکلیف میں اضافہ ہوتا چلا گیا، دو چار سال تک ہسپتالوں میں، عکے کھاتے رہے مگر ٹیم کے درہ میں ہی نہ آئی۔ یہاں تک کہ ٹیم صلابہ کو مارفین کے نیچے گئے شروع ہو گئے۔ پچھلے سال ٹیم صلابہ کا انتقال ہو گیا، میں تعزیت کیلئے ان کے پاس حاضر ہوا، وہ بڑی دیر تک ٹیم صلابہ کا ذکر کرتے رہے، وہ کہتے تھے ”مجھے ان کے انتقال کا دکھ نہیں، دنیا کے ہر شخص نے فوت ہو جاتا ہے، مجھے صرف ان کی تکلیف کا دکھ ہے، ان کا آخری وقت بہت کرب، بہت تکلیف میں گزارا تھا، میں جب بھی ان ہلوں کو یاد کرتا ہوں تو میں اندر سے زخمی ہو جاتا ہوں، میں اپنے وہ سنتوں سے ذکر کرتا ہوں تو سب اسے اللہ کی رضا، اسے قدرت کی مصلحت کہتے ہیں لیکن میرا دل نہیں مانتا، میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں ایک شخص کو چار سال تک مسلسل تکلیف دینے میں اللہ کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے، میں اللہ کی اس عظیم مصلحت ہے، میں اپنی ٹیم کو جانتا ہوں، وہ بے انتہا پرہیزگار، مہتمم، شخص اور عی خاتون تھیں، وہ ہر سال کروڑوں روپے ضرورت مندوں میں تقسیم کرتی تھیں، انہوں نے سینکڑوں غریب بچوں کو تعلیم دلائی اور ہزاروں بچیوں کی شادیاں کرائیں اور وہ چیرٹی ہسپتال چلاتی تھیں، ایسی خاتون کو اتنی اوفیت دینا یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔“

میں ان کا سوال سمجھ گیا، میں نے ان سے عرض کیا ”سر شاید آپ کو معلوم نہیں دنیا کے تمام طاقتور صاحب اقتدار صنعت کار اور سرمایہ کار لوگ اور ان کے اہل خانہ کسی نئی چیز ان کن اور شدید بیماری کا شکار ہوتے ہیں، یہ لوگ عموماً کسی ایسے مرض کے ہاتھوں فوت ہوتے ہیں جو میڈیکل سائنس کے لئے نیا ہوتا ہے یا پھر اس مرض کی یہ نوعیت انوکھی ہوتی ہے، آپ کیونکہ پاکستان کے امراء میں شمار ہوتے ہیں لہذا آپ کی ٹیم صلابہ بھی قدرت کے اس قانون کا شکار ہو گئیں، مجھے ان کے چہرے پر حیرت کے آثار دکھائی دیئے، مجھے محسوس ہوا وہ میری بات پر یقین کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، میں نے عرض کیا ”سر آپ دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی تاریخ نکال کر دیکھ لیں، آپ کو وہ لوگ اپنی محبوب بستریوں کو ہسپتالوں میں اٹھانے اٹھانے پھرتے نظر آئیں گے، انہوں نے پہلو بدلا اور ٹھنڈے لہجے میں بولے، ”لیکن کیوں، میں قدرت کی یہ مصلحت جانتا چاہتا

ہوں! میں نے مسکرا کر عرض کیا "میرا اس میں قدرت کی تین تہیں ہوتی ہیں اول بڑے لوگوں کی تکلیف بنیادی طور پر صدقہ جاریہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ جب کسی حیران کن بیماری کا شکار ہوتے ہیں تو دنیا بھر کے سائنس دان، ڈاکٹر اس بیماری پر ریسرچ شروع کر دیتے ہیں۔ ماہرین اس بیماری کا علاج تلاش کرتے ہیں اس کی دوا بناتے ہیں اور یہ دوا یہ علاج اور یہ تحقیق آگے چل کر عام انسان کو فائدہ پہنچاتی ہے، آپ ڈپرین سے انسولین تک دنیا کی تمام ادویات کی بسٹری وکھیں ان تمام ادویات کا محرک آپ جیسے بڑے لوگ تھے یہ ادویات بنیادی طور پر امراء کے لئے ایجاد ہوئی تھیں لیکن پھر ان کا فیض عام انسان کو پہنچا، دوم بڑے لوگوں کی تکلیفوں سے دنیا میں بے شمار نئے ہسپتال بنے تھے۔ آپ دنیا کے تمام بڑے ہسپتالوں کی تاریخ نکال کر دیکھ لیں یہ تمام ہسپتال آپ جیسے لوگوں نے اپنے اپنے پیاروں کی یاد میں بنوائے تھے۔ اگر آپ جیسے لوگوں کے پیارے کسی مہلک بیماری کا شکار ہوتے، آپ لوگ انہیں انھا کر طبیبیوں اور ہسپتالوں میں نہ پھرتے تو یہ ہسپتال یہ لیبارٹریاں اور یہ کینسر سٹرنڈ بننے اور آج ان اداروں سے عام لوگ فائدہ نہ اٹھارے

ہوتے، مزہ خانہ قیام سے مہر کی بات سنتے ہوئے میں نے عرض کیا "شاید اگر آپ عمران خان کو لکھتے

اگر عمران خان کی والدہ کو کینسر نہ ہوتا تو شاید عمران خان کو اس مرض کا یہ نہ چلنا، انہیں یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ پاکستان میں کوئی کینسر ہسپتال نہیں یہ عمران خان کی والدہ کی بیماری کا صدقہ جاریہ ہے کہ آج پاکستان میں نہ صرف شوکت خانم میموریل ہسپتال ہے بلکہ اس میں ہر مہینے سینکڑوں ہزاروں خریوں کا علاج ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ دنیا کے دوسرے بڑے لوگوں کو دیکھئے، انٹل تیبلی کا مالک اینڈریو گروڈ "پرمٹریٹ کینسر" کا مریض ہے اس نے اس مرض کے علاج کے لئے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ وقف کر رکھا ہے اس وقت دنیا کی 16 بڑی لیبارٹریاں اینڈرو گروڈ کیلئے علاج دریافت کر رہی ہیں ڈراما سوچئے جب یہ علاج دریافت ہو گا تو کتنے عام لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے اسی طرح دنیا کا امیر ترین شخص بل ٹینس بھی ایک عجیب و غریب مرض کا شکار ہے وہ دودھ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، بل ٹینس ہر وقت دودھ پیتا رہتا ہے اس کی میز اس کی گازی اس کے بریف کیس حتی کہ اس کی جیب تک میں دودھ کا پیکٹ ہوتا ہے۔ سائنس دان اس عجیب و غریب بیماری کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں اس تحقیق کے تمام تر اخراجات بل ٹینس برداشت کر رہا ہے اسی طرح بل ٹینس کا ایک قریبی دوست ایڈز کا شکار ہو گیا، بل ٹینس نے اس کا علاج کرایا لیکن وہ فوت ہو گیا اس وقت بل ٹینس کو اس مرض کی شدت کا اندازہ ہوا ابتدا دنیا میں اس وقت ایڈز

کے بارے میں یقینی ریسرچ ہو رہی ہے اس کے تمام اخراجات بل نہیں ادا کر رہا ہے، دنیا کا پانچواں امیر ترین شخص شیخ ادہ ولید بن طلال ثانی کے مرض کا شکار ہے اس کی آنکھوں کی پتلیاں حرکت نہیں کرتیں، وہ صرف سیدھا کچھ سکتا ہے اس وقت اس مرض پر تحقیق ہو رہی ہے اور اس تحقیق کے اخراجات بھی شیخ ادہ طلال برداشت کر رہے ہیں آپ ذرا سوچئے جب اس مرض کا علاج دریافت ہو گا تو اس سے کتنے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ کتنے لوگوں کی زندگیاں تبدیل ہو جائیں گی۔"

وہ خاموشی سے میری بات سنتے رہے، میں نے عرض کیا "سر بیگم صاحبہ کی اس بیماری میں اللہ کی ایک تیسری مصلحت بھی پوشیدہ تھی آپ نے اس مصلحت پر غور نہیں کیا ہو گا، آپ ذرا یاد کیجئے جب آپ بیگم صاحبہ کو لے کر کسی ڈاکٹر کسی ہسپتال میں جاتے تھے تو وہاں آپ اور بیگم صاحبہ کو کتنے ضرورت مند لوگ ملتے تھے یہ وہ لوگ تھے جن کے پیارے ہسپتالوں میں داخل تھے لیکن ان کے پاس وہ اڈن اور خون کے لئے پیسے نہیں تھے ان دنوں آپ کا دل نرم تھا پتہ نچھے یقین ہے آپ نے بے شمار ضرورت مندوں کی مدد کی ہوگی" میں خاموش ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں

نے غصہ مایاں میں سر ہلا دیا، میں نے عرض کیا "سر بیگم صاحبہ اپنے بندہ کو ہمیں فوت ہو جائیں تو آپ ان ہسپتالوں کا پھر نہ لگائے آپ ان ضرورت مندوں سے نہ ملے، آپ ان کی دعاؤں کرتے اور یوں ان لوگوں کے عزیزوں کو صحت نہ ملتی لہذا ضرورت بیگم صاحبہ کی تکلیف کے ذریعے آپ کو ان لوگوں تک پہنچانا چاہتی تھی آپ ان لوگوں تک پہنچنے آپ نے چند کروڑ روپے خرچ کئے اور آپ کے یہ چند کروڑ روپے بے شمار لوگوں کو زندگی دے گئے اور یوں بیگم صاحبہ کی تکلیف سے بے شمار لوگوں کو شفا ملی آپ ان لوگوں کو یاد کیجئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے" میں خاموش ہو گیا۔

انہوں نے سر اٹھایا اور مسکرا کر بولے "واقعی میں نے ان پہلوؤں پر بھی غور نہیں کیا تھا" جب آپ گفتگو کر رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا مجھے دو کام کرنے چاہئیں مجھے بیگم صاحبہ کے نام سے کینسر کا ایک ایسا ہسپتال بنانا چاہیے جس میں غریبوں کا مفت علاج ہو اور مجھے ایک ایسا میڈیکل کالج بھی بنانا چاہیے جس میں ڈاکٹروں کو کینسر کی سوشلائزیشن کرائی جائے یہ سوشلائزیشن بھی فری ہو، بس ڈاکٹروں سے یہ وعدہ لیا جائے وہ زندگی بھر غریبوں کا مفت علاج کریں گے ان کے الفاظ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی، میں نے ان سے عرض کیا "سر یہ تھی اللہ تعالیٰ کی وہ مصلحت جس تک لے جانے کیلئے قدرت کو آپ پر چار سال محنت کرنا پڑی۔"

خوشحالی کا دیوتا

72 سالہ رضیہ تین راتوں سے دروازے پر بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں بوتلی اور گلاس کے بار تھے وہ دروازے سے چہرہ لڑکے کا منظر دیکھتی لیکن سمجھتی نہیں اور کی بات سے اسے ہنسنے لگتا ہے

دیر ہو جاتی تھی اور وہ لوگوں سے لپٹنے اور ہاتھ ملاتے ہوئے رخصت ہو جاتے تھے رضیہ دوبارہ بیٹھ جاتی تھی تیسرے دن چونکہ دروازہ کھلا گیا اور اس نے رضیہ کو دیکھ کر کہا 'رضیہ دروازے کے فریم کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی' اندر حرکت ہوئی 'دروازہ کھلا اور وہ مسکراتا ہوا چہرہ باہر آ گیا 'رضیہ آگے بڑھی وہ رضیہ کے سامنے جھکا اور رضیہ نے اس کے گلے میں بوتلی کے سر جھمائے ہوئے ہار ڈال دیئے 'ٹھیک اس لمحے رضیہ کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے آنسو اس کی جھریوں سے اچھٹے 'نکراتے ہوئے ٹھوڑی پر پہنچے اور ٹھٹک کر روک گئے 'آنسوؤں میں صبح کا سورج لرز رہا تھا 'جب ٹھوڑی ہلٹی تھی تو آنسوؤں کے سورج بھی آہستہ آہستہ ڈولتے تھے اس نے بوڑھی ٹھوڑی پر نظریں جمادیں آنسو نونے کیلئے نیچے جھکے 'لکیر بنے اور انہوں نے ٹھوڑی کا ساتھ چھوڑ دیا 'غریبوں کے دیوتانے فوراً اپنی اتیلی آگے کر دی 'پانی کے دو شفاف آہرے سین اس جگہ آ کر سے جہاں سے اس کے مقدر کی لکیر شروع ہوتی تھی اس نے ہتھیلی تہ کی 'منھی بنائی 'مسکرایا اور وہ پلیٹر سے نیچے اتر گیا 'اسے 30 سال کی منت کا معاوضہ مل گیا۔

ڈاکٹر پولیس 1974 تک چنا گنگ کے ایک ٹڈل گلاس سوتا رکھتا تھا اور اس کی دوا

بیچان اس کی بی بی ایچ ڈی کی ڈگری تھی وہ امریکہ میں پڑھتا تھا اسے وہاں اطلاع ملی اس کا ملک مشرقی پاکستان سے بلکہ دیش بن گیا ہے وہ فوراً چنانکا ٹک واپس آیا اور اس نے یونیورسٹی میں نوکری کرنی وہ غالب علموں کو اکنامکس پڑھتا تھا چنانکا یونیورسٹی کے اردگرد دیہات تھے ان دیہات میں ان دنوں صرف تین چیزیں تھیں قحط، غربت اور قرض وہ روز شام کی سیر پر نکلتا تھا دیہات میں جاتا تھا اور معیشت کو اصل حالت میں دیکھتا تھا اس کو محسوس ہوتا تھا کتابوں میں لکھی غربت اور غمیوں میں تحریر منطقی میں زمین آسمان کا فرق ہے ایک دن اس نے پردیس سے کارکن بننے کا فیصلہ کیا وہ یونیورسٹی سے نکلا اور "جو برا" گاؤں چلا گیا گاؤں میں ایک 42 سالہ بیوہ تھی وہ کھندی پر رومال بناتی تھی شام کو شہر سے ایک بیوہ پاری آتا تھا یہ رومال لیتا تھا اور اس کی جمبولی میں دو منھی چاول ڈال دیتا تھا رفیقہ کا خاندان ان چاولوں پر چومیس کھنے گزار دیتا تھا ڈاکٹر یونس اس کے پاس بیٹھ گیا پتہ چلا گاؤں کے تمام لوگ سارا دن سوڑھے جاتے رومال کا تے اور کپڑے سے سیتے ہیں اور شام کو بیوہ پاری ان کی جمبولی میں دو دو منھی چاول ڈال کر سارا سامان شہر لے جاتے ہیں اس کی بی بی 42 گھرتے دو درماتے دو روٹے لے گیا اس نے سب کی کہانیاں سنیں اور اسے معلوم ہوا اگر کوئی شخص ان لوگوں کو صرف 27 ڈالر دے دے تو نہ صرف یہ 42 گھرانے قرض سے آزاد ہو سکتے ہیں بلکہ یہ لوگ اپنے پاؤں پر بھی کھڑے ہو سکتے ہیں ڈاکٹر نے اپنے ۶۱ ٹے کا اندازہ لگایا اس کے پاس 30 ڈالر تھے اس نے تین ڈالر اپنے پاس رکھے اور باقی 27 ڈالر ان لوگوں میں تقسیم کر دیئے یہ 27 ڈالر آگے چل کر گرامین بینک بن گئے ڈاکٹر یونس نے اپنے طالب علموں کو ساتھ ملا یا اور ان لوگوں نے معیشت کے ایک نئے فارمولے کی بنیاد رکھ دی اس فارمولے کی بنیاد اعتماد تھا ڈاکٹر یونس کا خیال تھا عورت خاندان میں سب سے زیادہ ذمہ دار فرد ہوتی ہے ایک گھریلو عورت دنیا کے ہزار معیشت دانوں سے زیادہ سمجھدار ذمہ دار اور ایماندار ہوتی ہے لیکن بد قسمتی سے آج تک دنیا کے کسی فنانشل انسٹی ٹیوٹ نے عورت کے اس ٹیلنٹ کو نہیں آزمایا ڈاکٹر یونس کا کہنا تھا قرض کے معاملے میں مرد غیر ذمہ دار ہوتے ہیں اس لئے وہاں میں 98 فیصد مرد و بیفات کرتے ہیں جبکہ عورتوں کی شرح محض دو فیصد ہے ڈاکٹر یونس کا خیال تھا اگر ہم عورتوں پر اعتماد کریں تو وہ بلکہ دیش کا مقدر بدل سکتی ہیں ڈاکٹر یونس کا ایک دوست بلکہ دیش کے فنانشل بینک میں ملازم تھا ڈاکٹر نے اس کے ساتھ ملاقات کی اور اپنی ذاتی ضمانت پر جو برا گاؤں کی تمام عورتوں کو قرض لے دیا قرض کی کل رقم تین سو ڈالر تھی ان تین سو ڈالروں سے پورے گاؤں کی حالت بدل دی لوگوں

نے بینک کو تمام قسطیں بھی وقت پر ادا کر دیں۔ ڈاکٹر یونس کا وہ سراجہ یہ بھی کامیاب ہو گیا۔ اس دورے سے تجربے نے آئے والے دنوں میں دنیا کے وہ کروڑ لاکھ تہنی غریبوں کی حالت بدل دی۔

گرامین بینک کا ماڈل بہت دلچسپ تھا۔ یہ بینک غریب گھرانوں کو ضمانت کے بغیر چھوٹے قرضے دیتا تھا۔ یہ قرضے بلا سود ہوتے تھے اور قرض دار انہیں چھوٹی چھوٹی قسطوں میں

واپس کرتے تھے۔ گرامین 1976ء دسمبر میں شروع ہوا اور اس نے 1979ء میں حکومت کی توجہ حاصل کر لی۔ حکومت نے ڈاکٹر یونس اور گرامین بینک کی سپورٹ شروع کر دی۔ حکومت نے

1983ء میں اسے باقاعدہ بینک کی شکل دے دی۔ ڈاکٹر یونس نے اسے دیہات میں پھیلاتا شروع کر دیا۔ اکتوبر 2006ء تک اس کی دو ہزار دو سو 26 شاخیں کھل چکی تھیں۔ گرامین نے 30

سال میں 71 ہزار 371 دیہات کو غربت کے چنگل سے آزاد کرایا۔ عالمی بینک کے مطابق اس بینک سے اب تک 65 لاکھ بینکالی قرض لے چکے ہیں۔ بینک کے اثاثے 7 ارب ڈالر ہیں جبکہ

بنگلو دیش کے علاوہ دنیا کے 45 ممالک میں گرامین طرز پر بینک شروع ہو چکے ہیں۔ بینک کی برکات بنگلو دیش کے دو کروڑ بائیس لاکھ لوگوں تک پہنچ چکی ہیں جبکہ پوری دنیا کے 10 کروڑ لوگ

اس ماڈل سے فائدہ اٹھا چکے ہیں اس بینک کے قرض خواہوں میں 96 فیصد عورتیں ہیں جبکہ اس کی ریکوری 98 فیصد ہے۔ گرامین صرف بینک نہیں بلکہ ایک سماجی ادارہ بھی ہے اس سے قرض لینے

والے تمام خاندانوں کے بچے سکول جاتے ہیں گھر کے تمام افراد تین وقت کھانا کھاتے ہیں تمام گھروں میں ٹوائٹ ہیں تمام گھروں کی چھتیں کچی ہیں تمام لوگ صاف پانی پیتے ہیں بینک سے

قرض لینے والوں کیلئے انکیشن میں ووٹ دینا اور خاندانی منصوبہ بندی لازم ہے اور ان سب کو ہیلتھ انشورنس کی سہولت بھی حاصل ہے جبکہ ان تمام سہولتوں کے ساتھ یہ لوگ ہر ہفتے 8 ڈالر کی قسط بھی

ادا کرتے ہیں۔ گرامین بینک اب تک بنگلو دیش کے 45 ہزار بھکاریوں کو بھی مفید شہری بنا چکا ہے بینک بھکاریوں کو سونگے (ڈیرہ ڈالر) قرض دیتا ہے بھکاری اس رقم سے کاروبار کرتے ہیں اور

بینک کو ہر ہفتے دو سونگے واپس کرتے ہیں گرامین بینک نے گرامین فون اور گرامین ٹیلی کام کے نام سے موبائل اور وائرلیس فون کی کمپنیاں بھی بنائیں ان کمپنیوں نے ایک لاکھ 39 ہزار خواتین کو

دیہات میں بی بی اوز لگا کر دیئے اور اس کے نتیجے میں بنگلو دیش کے 85 ہزار دیہات عالمی رابطوں کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ گرامین بینک اب بینکالی محنت کشوں کو پھلنے کے 11 ارب بنا کر دے رہا ہے۔ یہ 11 ارب آئے والے دنوں میں بنگلو دیش کو پھلنے کا سب سے بڑا کیسپورنر بنا دیں گے۔

ڈاکٹر یونس کو 13 اکتوبر 2006 کو نوٹس پر انزوا دیا گیا 'ڈاکٹر یونس' خلیق اس اعزاز کا مستحق تھا۔ ڈاکٹر یونس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا اگر کیا شخص نھان لے تو وہ صرف 27 مارچ سے غربت کو جڑوں سے ہلا سکتا ہے اور وہ 46 ملکوں کے دس کروڑ لوگوں کا مقدر بدل سکتا ہے۔ آج بنگلہ دیش کے 165 لاکھ گھرانوں اور 2 کروڑ 22 لاکھ لوگوں کی آنکھوں میں تشکر کے وہ آنسو ہیں جو کبھی ڈاکٹر یونس کی آرزو تھے۔ آج انکھوں بنگالی عورتوں کی آنکھوں سے تشکر کے کروڑوں آنسو نکل رہے ہیں۔ یہ آنسو چہروں کی جھریوں سے اٹھ اٹھ کر ٹھوڑیوں تک پہنچ رہے ہیں اور ان ٹھوڑیوں پر آنے والے دلوں کے سنگڑوں ہزاروں سورج چمک رہے ہیں 'یہ سورج آج اعلان کر رہے ہیں اگر خلیق بنگال میں 1971ء طلوع نہ ہوتا تو آج بنگلہ دیش ہوتا 'ڈاکٹر یونس ہوتا' گرامین بینک ہوتا اور تہی بنگلہ دیش کے دو کروڑ 22 لاکھ لوگ خوشحالی کے دروازے تک پہنچ پاتے 'آج ڈاکٹر یونس کا نوٹس پر انزوا خلیق خلیق کر رہا ہے جب تک ڈاکٹر یونس پاکستان کا شہری تھا اس وقت تک وہ محض ایک لیچرار تھا لیکن جب وہ بنگلہ دیش کا شہری بنا تو اس نے اپنی قوم کے قدموں میں نوٹس پر انزوا دیا وہ دنیا کا سب سے بڑا کامیاب انسان بن گیا تو سب نے آج کے دن ہم کو یاد دلائی 'اس کریم جو ہمارے ڈاکٹر یونسوں کو لیچرار سے اپرٹینس اٹھنے دیتی 'جس نے ہمارے ہاتھ ہمارے پاؤں باندھ رکھے ہیں 'جو ہمیں پاکستان میں گرامین جیسے ادارے نہیں بنانے دے رہی اور جو پاکستان میں خوشحالی کا کوئی دیوتا پیدا نہیں ہونے دے رہی 'جو ہمیں آگے نہیں بڑھنے دے رہی اس بد قسمتی کا نام کیا ہے؟ میں اس سوال کا جواب اب آپ پر چھوڑتا ہوں۔



بڑا انسان

استاد نے اسے گھور کر دیکھا اور شہدید غصے میں بولا "بل تم میری بات کان کنول کریں تو تم ذہن کی تہاں نویداد سے زیادہ حرکت نہ دیکھو۔ بن سکتے ہو" پوری کلاس نے توجہ سے سنا۔ کان کنول کا قدموں سے باہر نکل گیا یہ ہارورڈ یونیورسٹی میں اس کا آخری دن تھا وہ اس یونیورسٹی میں ریاضی کا طالب علم تھا اسے کلاس روم کا ماحول اس کا سنبھالنا مشکل تھا اساتذہ کا پڑھانے کا طریقہ اور یونیورسٹی کی نئی پرانی روایات بورنگ تھیں وہ کئی کئی دن کیسپس سے غائب رہتا تھا ۲۱ کا زیادہ تر وقت سیٹل جمیل کے کنارے پال ایلن کے ساتھ گزرتا تھا پال بھی اس کی طرح لمبی منصوبہ بندی کا ماہر تھا وہ دونوں گھنٹوں کسی ایسی دنیا کے بارے میں سوچتے رہتے تھے جو ابھی تخلیق کے مراحل میں داخل نہیں ہوئی تھی وہ دونوں دن میں خواب دیکھتے تھے ان خوابوں کے دوران ایک دن ہارورڈ یونیورسٹی نے اس کا نام خارج کر دیا تھا وہ یہ خط لے کر ایلن کے پاس گیا اور اسے خط دکھا کر بولا "آؤ پال ہم اس دنیا کی بنیاد رکھیں جو آج تک صرف ہمارے ذہن میں تھی" پال ایلن نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

28 اکتوبر 1955ء کو دانشمندانہ ریاست کے شہر سیٹل میں پیدا ہوا اس کے والد وکیل تھے سارا گھرانہ پڑھا لکھا اور معزز تھا لیکن بل پڑھائی میں ذرا پیچھے تھا اس میں یکسوئی نہیں تھی اس کی سوچیں منتشر ہو جاتی تھیں اور اس کے والدین اس کی بیج سے پریشان رہتے تھے اس

کے والد کی خواہش تھی وہ بارورڈ یونیورسٹی سے اعزاز کے ساتھ ڈگری لے لیکن یونیورسٹی نے اس کا نام خارج کر دیا اس کے والد کو شدید صدمہ پہنچا لیکن بل مٹھن تھا اس کا خیال تھا بارورڈ یونیورسٹی کسی نہ کسی دن اپنے اس نانا کو طالب علم پر فخر کرتی گی۔ آنے والے دنوں میں اس کی یہ بات سچ ثابت ہوئی اور بارورڈ یونیورسٹی کے کیت پر اس کے نام کی ترقی لگ گئی لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے ہم ابھی 1975ء میں ہیں 1975ء میں اس نے اپنے دوست پال اٹین کے ساتھ مل کر دنیا کی پہلی سافٹ ویئر کمپنی بنائی اس کمپنی کا نام "مائیکروسافٹ" رکھا گیا لوگ اس کے آئیڈیاز اور کمپنی کے نام دونوں پر ہنستے تھے لیکن اس نے بہت نہ ہاری وہ کام کرتا چلا گیا یہاں تک کہ 1979ء تک کمپنی نے پرنس نکال لئے اور وہ ٹھیک ٹھاک امیر ہو گیا لیکن ابھی وہ اس کامیابی سے دور تھا جو بچپن سے اس کے ذہن پر دستک دیتی آ رہی تھی 1980ء میں سٹیو بائرن نے کمپنی جو ان کی اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے مائیکروسافٹ واٹشمن ریاست کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی اس کے پاس روزانہ ات چیک آتے تھے کہ بینک نے اس کے دفتر میں اپنی شاخ کھول لی آنے والے دنوں میں دنیا کے 51 بڑے بینکوں نے مائیکروسافٹ میں اپنی شاخیں کھولیں اور بینک اکاؤنٹس کے حصول کیلئے مائیکروسافٹ کو ہاتھ دھو کر لیا اس کے بعد مائیکروسافٹ دنیا کی سب سے مشہور کمپنی تھی اور وہ دنیا کا نامور ترین شخص تھا وہ اس قدر مشہور ہوا کہ بل کلنٹن نے 1998ء میں اعلان کیا "وی آر ڈی ٹیمس آف بل ٹیمس" یہ بارورڈ یونیورسٹی کے اس نانا کو طالب علم کا پہلا اعزاز تھا۔

جی ہاں اس شخص کا نام بل ٹیمس ہے اور یہ پچھلے بارہ سال سے دنیا کا امیر ترین شخص ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا واحد شخص ہے جو 38 برس کی عمر میں دنیا کا امیر ترین شخص بنا اور اس نے مسلسل 12 سال تک یہ اعزاز برقرار رکھا مائیکروسافٹ میں اس وقت 63 ہزار 5 سو 64 لوگ ملازم ہیں اس کا کاروبار 102 ممالک تک پھیلا ہے جبکہ یہ کمپنی اب تک دنیا کے ایک اٹھ 28 ہزار لوگوں کو راب پتی بنا چکی ہے مائیکروسافٹ کے ملازمین اوسطاً 89 ہزار 6 سو 6 ہزار سالانہ تنخواہ لیتے ہیں مائیکروسافٹ کے پانچ ڈائریکٹر ہیں اور بل ٹیمس کے پاس سب سے زیادہ شیئرز ہیں وہ 97 کروڑ 174 لاکھ 99 ہزار 3 سو 36 شیئرز کا مالک ہے امریکی سٹاک ایکسچینج میں مائیکروسافٹ کے شیئرز کی قیمت اس وقت 23 ڈالر ہے پچھلے 15 برسوں میں میڈیا نے بل ٹیمس کو پوری دنیا میں سب سے زیادہ گورنر وی وہ دنیا کی بااثر ترین شخصیات میں شمار ہوتا ہے لوگ اس کے ساتھ ہاتھ

ملانا اور اس کے ساتھ تصویر کھنچوانا اعزاز سمجھتے ہیں جبکہ اسے دنیا کے 35 ممالک میں سربراہ مہفلیت کا پرہونو کول حاصل ہے۔

بل ٹیس 15 جون 2006ء تک محض دنیا کا امیر ترین شخص تھا لیکن اس کے ایک اعلان نے اسے دنیا کا سب سے بڑا انسان بنا دیا۔ بل ٹیس نے 15 جون کو اعلان کیا وہ جولائی 2008ء کو انگریز و مسافت چھوڑ دے گا اور وہ اپنی باقی زندگی فلان عامہ کے کاموں کے لئے وقف کر دے گا۔ اس کا کہنا تھا وہ یکم جولائی 2008ء سے اپنا سارا وقت فاؤنڈیشن کو دے گا اس اعلان کے بعد وہ پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد شخص بن گیا اس سے پہلے دنیا میں عورتوں کیلئے تخت اور تاج چھوڑنے والے بے شمار لوگ تھے دنیا میں مہاتما بده جیسے لوگ بھی تھے جنہوں نے سکون کیلئے اقدار تیاگ دیا تھا لیکن یہ پہلا شخص ہے جس نے عام لوگوں کیلئے دنیا کی سب سے بڑی کہنی چھوڑنے کا اعلان کیا جس نے لوگوں کے دکھ درد کیلئے بادشاہت چھوڑ دی بل ٹیس نے اپنی بیوی میلیڈا کے ساتھ مل کر جنوری 2000ء میں فلاح عامہ کی ایک فاؤنڈیشن بنائی تھی اس کا نام "بل

ایڈ میلیڈا ٹیس فاؤنڈیشن" رکھا گیا اس وقت یہ دنیا کا ویلفیئر کا سب سے بڑا ادارہ ہے اور

فاؤنڈیشن کے اکاؤنٹس میں 29 بلین ڈالر ہیں یہ کئی بڑی رقم ہے اس کا اندازہ آپ پاکستان کے بجٹ سے لگا لیجئے پاکستان کا ٹوٹل بجٹ 12 بلین ڈالر ہوتا ہے بل ٹیس کی یہ فاؤنڈیشن پوری دنیا میں صحت، تعلیم، لائبریریوں اور کمپیوٹر کی تربیت کے لئے کام کرتی ہے یہ فاؤنڈیشن ہر سال غریب ممالک کے ذہین طالب علموں کو ایک ارب ڈالر کے وظائف دیتی ہے یہ غیر سرکاری لائبریریوں کو ایک بلین ڈالر کا ایوارڈ دیتی ہے فاؤنڈیشن ہر سال تیسری دنیا کے سو ذہین طالب علموں کو اپنے خرچ پر کمپیوٹر میں تعلیم دلاتی ہے فاؤنڈیشن ڈیوک یونیورسٹی کی برکلاس کے دس ذہین طالب علموں کو وظیفہ دیتی ہے بل ٹیس نے چندرہ بلین ڈالر سے کمپیوٹر سٹری میجیم بتایا اس نے چاول کی نئی قسم دریافت کرائی وہ ہر سال دنیا کے کروڑوں بچوں کو پولیو کیسین پاتا ہے اور اس کی فاؤنڈیشن ایڈز کا علاج دریافت کر رہی ہے اور بل ٹیس کی یہ فاؤنڈیشن پانچ سال سے پوری دنیا میں کام کر رہی ہے بل ٹیس نے اعلان کیا وہ جولائی 2008ء کو انگریز و مسافت سے فاؤنڈیشن کے دفتر شفٹ ہو جائے گا اور اپنی باقی زندگی لوگوں کی صحت اور تعلیم کے لئے وقف کر دے گا اس کا کہنا ہے وہ اپنے بچوں کو صرف ایک ایک بلین ڈالر دے گا اور اپنی باقی ساری دولت دنیا کے ضرورت مندوں کے حوالے کر دے گا اس کا کہنا ہے یہ دولت ضرورت مندوں کی امانت

ہے اور وہ یہ امانت ان لوگوں کو لوٹنا کروا نہیں جائے گا۔

میں نے جب اس کا یہ بیان پڑھا تو مجھے محسوس ہوا بل ٹینس کل تک دنیا کا سب سے امیر شخص تھا لیکن آج سے وہ دنیا کا سب سے بڑا انسان ہے، وہ مائیکروسافٹ کی وجہ سے 12 سال تک دنیا کا امیر ترین شخص رہا لیکن اب شاید وہ "بل اینڈ میلینڈ انٹینس فاؤنڈیشن" کی وجہ سے قیامت تک دنیا کا سب سے بڑا انسان رہے گا اور میں نے سوچا دنیا کے دس دولت مند ترین لوگوں میں تین مسلمان بھی شامل ہیں لیکن لوگوں کی خدمت کرنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے بل ٹینس کو عطا فرمائی، میں نے سوچا دنیا کا پانچواں امیر ترین شخص ایک عرب مسلمان شہزادہ ولید بن طلال ہے اس کی دولت جو خانوں میں خرچ ہو رہی ہے جبکہ بل ٹینس اپنی دولت ایڈز کے علاج پر خرچ کر رہا ہے وہ مسلمان بچوں کو تعلیم دے رہا ہے اور وہ دنیا میں کہیں عام کر رہا ہے، میں نے سوچا بل ٹینس جیسے لوگ ہیں جنہیں حقیقتاً رول ماڈل کہا جا سکتا ہے، میں نے سوچا پوری اسلامی دنیا ٹینس لوگوں سے بھری پڑی ہے، اسلامی دنیا میں ایسے ایسے لوگ ہیں جو بیروں کی کئی کئی کانوں کے مالک ہیں جن کی زمینوں سے سونا نکھٹا ہے اور جو تیل کے کارڈوں کو مالک کے مالک ہیں لیکن ان کی ضرورت مند کو دس روپے دینے کی توفیق نہیں ہوتی جبکہ بل ٹینس اپنی ساری دولت لوگوں کیلئے چھوڑ جائے گا، میں نے سوچا 162 اسلامی ممالک کی اس دنیا میں ایک ارب 45 کروڑ مسلمان ہیں لیکن ان ڈیڑھ ارب لوگوں میں ایک بھی بل ٹینس نہیں، ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جو پچاس سال کی عمر میں اپنی کنبھی کا دروازہ کھولے اور اپنا سارا مال اپنی ساری زندگی اللہ کے بندوں کے لئے وقف کر دے جو لوگوں میں وہ اور کتاب ہائے جو لوگوں کے زخم ہموئے جو لوگوں کو کھانا کھلائے اور جو لوگوں کے آنسو پونچھے، میں ہمیشہ اپنے آپ سے پوچھتا تھا عالم اسلام پر یورپ اور امریکہ کیوں غالب ہیں؟ مجھے محسوس ہوتا تھا (نعوذ باللہ) یہ اللہ تعالیٰ کی نا انصافی ہے لیکن مجھے آج معلوم ہوا امریکہ اور یورپ بل ٹینس جیسے لوگوں کی وجہ سے ہم پر غالب ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے پاس بڑے انسان ہیں جبکہ ہم لوگ تاجروں، بیوپاریوں اور صنعت کاروں کی غلامی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا ان کے پاس انسان ہیں جبکہ ہم لوگ آدمیوں کی چاکری میں سانس لے رہے ہیں۔



ہماری کہانی

میدان میں بہت گرمی تھی بچے فٹ بال کھونکر مارتے پھیٹ پر ہاتھ رکھتے اور آسمان کی طرف دیکھتے وہ باہار ملتا ہے بس نہ کچھ ہنستے تھے وہ میدان کے ایک سرے پر کھڑا ہو کر سب بچوں کو دیکھ رہا تھا اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اسے کھانے اور میدان سے باہر آ گیا باہر اس کے دادا کی بکان تھی اس نے 25 سینٹ دادا کے سامنے رکھے کوکا کولا کی چھ بوتلیں خریدیں بھانستے ہو میدان میں آیا اور یہ چھ بوتلیں بچوں میں فروخت کر دیں اسے اس سود سے میں پانچ سینٹ بیچ گئے اس نے پانچ سینٹ کا سکہ ہوا میں اچھا کچھ کیا اور "تات بیڈ" کا ٹھونڈ لگایا یہ اس کا پہلا کاروبار تھا اور اس کی عمر اس وقت محض چھ سال تھی۔

لوگ اسے "پیدائشی سرمایہ کار" کہتے ہیں اسے اللہ تعالیٰ نے ایک ڈالر کو بلین میں بدلنے کا ہنر دے رکھا ہے وہ ہوا کو سونگہ کر سرمائے اور منافع کا رخ پہچان جاتا ہے وہ سناک اچھینچ کا شہنشاہ کہلاتا ہے وہ دنیا کا واحد شخص ہے جس نے بغیر ہاتھ بلائے اربوں کمائے جس نے دنیا میں سب سے زیادہ ارب پتی پیسے اکٹھے کیوں یہ ہماری کہانی نہیں ہماری کہانی دوسری ہے وہ 30 اگست 1930 کو ریاست اوہائیو میں پیدا ہوا اس کا والد سناک اچھینچ کا بروکر تھا وہ درمیان کا بچہ تھا اس کی ایک بہن بڑی اور ایک چھوٹی تھی اس کے والدین اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے لیکن اس کا رجحان کاروباری طرف تھا اس نے گیارہ سال کی عمر میں "سنی سر ہوز" کے تین شیئرز

خریدنے اس وقت ایک شیئر کی قیمت 38 ڈالر تھی اس کی بہن ذوری اس کا روہار میں اس کی پارنر تھی بد قسمتی سے شیئر کی قیمت کم ہو کر 27 ڈالر ہو گئی وہ گھبرا گیا چند دن بعد شیئر کی قیمت بڑھ کر 40 ڈالر ہوئی تو اس نے فوراً شیئر بیچ دینے سے چھ ڈالر منافع ہوا لیکن چند روز بعد ان شیئر کی قیمت بڑھتے بڑھتے 200 ڈالر ہو گئی اس وقت اس نے سرمایہ کاری کا سب سے بڑا اصول سیکھا اس نے سیکھا جس شخص میں صبر نہیں ہوتا وہ بھی سرمایہ کار نہیں بن سکتا اس کے بعد باقی زندگی اس نے صبر کو اپنا سب سے بڑا ہتھیار بنالیا اس کا دوسرا اصول ہماؤ اور خریداری تھا اس کا کہنا تھا آپ کے منافع کا فیصلہ آپ کی خریداری کرتی ہے اگر آپ نے چیز سستی خریدی ہے تو آپ زیادہ منافع حاصل کریں گے وہ کہتا تھا کاندار چیز کو بیچنے میں جتنی محنت کرتے ہیں اگر وہ اس سے آجھی محنت خریداری کے دوران کر لیں تو وہ کئی گنا منافع کمائیں اور اس کا تیسرا اصول ساکھ تھا اس کا کہنا تھا جب تک لوگ آپ پر بائبل جتنا اعتبار نہیں کرتے آپ سرمایہ کار نہیں بن سکتے شاید یہی وجہ ہے لوگ بینک آف امریکہ پر اتنا اعتماد نہیں کرتے جتنا اعتبار وہ اس پر کرتے ہیں لیکن یہ ہماری کہانی نہیں ہماری کہانی دوسری ہے۔

اس نے چند سالوں کی عمر میں اخبار کی باکری شروع کی وہ لوگوں کے گھروں میں اخبار پھینکا کرتا تھا اس سے اسے 175 ڈالر ماہانہ ملتے تھے اس نے باکری کے ذریعے 1200 ڈالر جمع

کئے اور 140 ہیکڑ کے ایک فارم پر لگا دینے دو سال بعد وہ اس فارم کا مالک تھا 17 سال کی عمر میں اس نے "پین ہال" مشین لگائی اس مشین سے اس نے پانچ ہزار ڈالر کمائے 22 سال کی عمر میں اس نے اپنی پہلی انویسٹمنٹ کمپنی بنائی اس نے اپنے خاندان اور دوستوں کو سرمایہ کاری کی دعوت دی سب نے مل کر ایک لاکھ پانچ ہزار ڈالر جمع کئے اس نے یہ رقم سٹاک مارکیٹ میں لگا دی دو سال بعد یہ رقم کروڑوں ڈالر تک پہنچ گئی اس کے بعد اس کی ترقی کو پر لگ گئے آج 2006ء میں وہ دنیا کا سب سے بڑا سرمایہ کار ہے آج اس کے پاس امریکہ کی سب سے بڑی ٹیکنیکل کمپنی فیکس کرٹک برک سٹارز ہتھوے والٹ ڈزنی اور امریکن ایکسپریس کے شیئر ہیں آج جب بھی امریکہ کی کوئی بڑی کمپنی ڈیفلٹ کرنے لگتی ہے تو کمپنی کے مالکان اس کے پاؤں پکڑ لیتے ہیں وہ کمپنی کے چند شیئر خرید لیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کمپنی اپنے قدموں پر کھڑی ہو جاتی ہے لوگ اپنی تمام بینچوں کو اس کے قدموں پر نچا کر دیتے ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں وہ جس ڈالر کو چھو دیتا ہے وہ بلین ڈالر بن جاتا ہے لیکن یہ ہماری کہانی نہیں ہماری کہانی دوسری ہے۔

وہ دنیا کا دوسرا سب سے بڑا سرمایہ کار ہے اور اس کا نام وارن بٹل ہے وہ 44 بلین ڈالر کا

مالک ہے لیکن وہ عام زندگی میں بہت سادہ اور درونش صفت انسان ہے وہ آج بھی اس مکان میں رہتا ہے جو اس نے 30 برس پہلے 31 ہزار 5 سو 400 روپے میں خریدی تھا وہ آج بھی پرانی کار چلاتا ہے جو اس نے 25 برس پہلے خریدی تھی اور وہ آج بھی اپنے دن کا آغاز نوک کانوا کے کارن اٹھا کر کرتا ہے لیکن یہ بھی ہماری کہانی نہیں ہماری کہانی دوسری ہے اس وارن ہفت نے 26 جون 2006ء کو اپنی دولت کا 87 فیصد حصہ مل ٹینس کی فلاح و بہبود کی فاؤنڈیشن کو دینے کا اعلان کر دیا اس کے اعلان کے مطابق اس کی کمپنی ہر سال مل اینڈ میلینڈ آئینس فاؤنڈیشن کو ڈیڑھ بلین ڈالر دیا کرتی ہے مل ٹینس یہ رقم پوری دنیا میں صحت اور تعلیم پر خرچ کرے گا وارن ہفت کا یہ عطیہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک یہ 37 بلین ڈالر کی حد تک نہیں پہنچ جاتا وارن ہفت نے یہ اعلان کرتے ہوئے کہا "میں نے مل ٹینس کی فاؤنڈیشن کو اس لئے منتخب کیا کہ یہ امریکہ کا واحد ادارہ ہے جو اپنے فنڈز کا 70 فیصد حصہ امریکہ سے باہر دوسرے ممالک میں خرچ کرتا ہے" اس کا کہنا تھا "اگلے ماہ سے مل ٹینس کو میری طرف سے امداد کا پہلا چیک مل جائے گا اور میری کوشش ہوگی میں مرنے سے پہلے اپنا حصہ مل ٹینس کے حوالے کر جاؤں" اس کا کہنا تھا "میں چھ برس کی عمر سے مل ٹینس کی کارپوریشن سے ملنے والے فنڈز اور دولت سے عطیہ کرتے آئے ہیں۔" اس کا کہنا تھا "79 بلین ڈالر ہونگے جن میں نے آج سے 30 برس پہلے جس شخص سے سو ڈالر لئے تھے وہ شخص آج سو بلین ڈالر کا مالک بن چکا ہے لوگ مجھے جاوے کر سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے میں کاتھ کے کتھوں کو سونے میں ڈھال دیتا ہوں میں جس کمپنی کی ڈیویڈنڈ پر قدم رکھ دیتا ہوں وہ کمپنی ڈیفالٹ سے نکل کر عروج کو چھوئے لگتی ہے میں جس کارپوریشن کا ایک شیئر خرید لیتا ہوں لوگ اس کے کروڑوں شیئر خرید لیتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں وارن ہفت جینک آف امریکہ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور زیادہ ہوا ہوا ہے لیکن میں آج یہ اعلان کرتا ہوں میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی سرمایہ کاری کا آغاز 26 جون 2006ء سے کر رہا ہوں میں آج اپنی زندگی کا سب سے بڑا کاروبار شروع کر رہا ہوں لیکن یہ بھی ہماری کہانی نہیں ہماری کہانی دوسری ہے۔

ہماری کہانی اسلامی دنیا سے شروع ہوتی ہے اور اسلامی دنیا پر ہی آخر ختم ہو جاتی ہے پوری اسلامی دنیا تا جبروں سرمایہ کاروں اور دولت مندوں سے بھری پڑی ہے لیکن دنیا کی خدمت کا اعزاز پہلے مل ٹینس نے حاصل کیا اور اس کے صرف دو ہفتے بعد وارن ہفت اس اعزاز میں شریک ہو گیا جبکہ بیرون کی تک ہمارے امراء اپنی حرم سراؤں میں اپنی چالیس چالیس لونڈیوں کے ساتھ آرام فرما رہے ہیں وہ اونٹوں پر اڈنگا رہے ہیں اور وہ شراہیں پی رہے ہیں یہ ہے ہماری کہانی۔

مہاتیر کے ساتھ ایک ملاقات

کھانے کی اس میز پر ہم آٹھ لوگ بیٹھے تھے، ہمارے بائیں سامنے مہاتیر تھے، مہاتیر نے ہاتھ دھوئے اور اللہ کا نام پڑھا اور پھر ہم سے تھے، قلم لکھنے والے اور اس کی اسٹیٹس پر غور کرنے والے اور اللہ پر کاہل ستایا انہوں نے بتایا وہ پچھلے دنوں ملائیشیا کے دورے پر تھیں، وہاں انہوں نے ایک ہندو ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا، تم انڈین ہو، اس نے ہنستے سے ان کی طرف دیکھا اور کہا، کر بولے، "تو آئی ایم ملائشین" مہاتیر محمد مسکرائے اور جیسی آواز میں بولے، "یہ طرز فکر ہماری ترقی اور استحکام کا نتیجہ ہے، جب کوئی ملک ترقی کرتا ہے، جب کوئی ملک دنیا میں عزت اور آبرو پاتا ہے، تو اس کے باشندے اپنے ملک پر فخر کرتے ہیں، اس کے برعکس جب کوئی ملک غریب ہوتا ہے، اس کی معیشت احمقار یا بھیک پر چلتی ہے، تو اس کے باشندے اپنے ملک کا تعارف کراتے ہوئے شرمندہ ہوتے ہیں، آپ زائر یا رہانہ انڈیا کے کسی باشندے سے پوچھیں، وہ کبھی روا انڈین یا زائر انڈین ہونے پر فخر نہیں کرے گا، وہ آئی ایم افریقین کہہ کر اپنا تعارف کرائے گا۔ ہم نے دنیا میں ملائیشیا کی عزت اور آبرو میں اضافہ کیا، لہذا آج ملائیشیا کے بڑے خود کو آئی ایم فرام جیت نہیں کہتے، انڈین انڈین اور سنگاپورین سنگاپورین نہیں کہتے، حتیٰ کہ ملائیشیا میں آباؤ پاکستانی تک خود کو پاکستانی ملائشین کہتے ہیں۔"

ہم میں سے ایک صاحب نے پوچھا، "آپ نے یہ قومی تقاضے کیسے حاصل کیا؟" مہاتیر محمد اپنے مخصوص انداز سے مسکرائے، "ہماری ترقی کے بے شمار اصول ہیں، لیکن ان میں تین کو بنیادی

حیثیت حاصل ہے ہم نے تاریخ کے مطالعے سے اندازہ لگایا دنیا میں تعلیم کے بغیر ترقی ممکن نہیں لہذا ہم نے اپنے کل بجٹ کا 25 فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کرنا شروع کر دیا وہ ذرا سے رکے اور مسکرا کر بولے "ہم لوگ دفاع پر اپنے بجٹ کا صرف چھ سے آٹھ فیصد خرچ کرتے ہیں دوسرا ہم نے قومی ترقی کیلئے مذہب کا سہارا لیا ہم نے تحقیق کی مسلمانوں کی وہ کون سی عادتیں ہیں جو ان کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہیں ہمیں محسوس ہوا فرقہ پرستی اور نسلی اختلافات عالم اسلام کو اٹھنے نہیں دے رہے ہم نے ملائیشیا میں فرقہ بازی اور نسلی اختلافات پر پابندی لگا دی آج ملائیشیا میں کوئی مسلمان کسی بودھ سے یہ نہیں کہتا اسلام بودھ سے بہتر مذہب ہے یا میں ملائی ہوں اور تم ایک کٹر ہندو ہو یا میں شیعہ ہوں اور تم سنی وہاں اس قسم کے فقرے یا دارے قانوناً جرم ہے ہم لوگوں نے مسجد کو شہت رخصانات کی ترویج کیلئے استعمال کیا ہماری مساجد میں ملائے کرام معاشرتی بہبود اور اجتماعی کوشش کی تلقین کرتے ہیں وہاں کسی ممبر کسی سپیکر سے اختلافی بات نشر نہیں ہوتی اور دوسری بات ہم نے دیکھا کسی ملک کے شہریوں کے دل میں اپنے ملک کی محبت اپنے ملک پر فخر وہاں کا حکمران ملکہ پیدا کرتا ہے اگر پھر سے بیچے لہذا ہمیں تعلیم حاصل کرین گے تو ملائیشیا کے لوگ ملائیشیا کے تعلیمی اداروں پر اعتماد نہیں کریں گے اگر میں اپنا سرمایہ برطانیہ کی کمپنیوں میں لگاؤں گا یا میں اپنی رقم سوئس بینکوں میں جمع کرواؤں گا تو ہمارے سرمایہ کار ہمارے عام لوگ ملائیشیا کے بینکوں ملائیشیا کی کمپنیوں پر اعتماد نہیں کریں گے لہذا ہماری پوری حکومت پوری بیوروکریسی کے بیچے ملائیشیا کے سکولوں میں پڑھتے ہیں اور ہم میں سے کسی نے فارن اکاؤنٹ نہیں کھلویا میں اس ضمن میں ایک مثال پیش کرنا ہوں 1989ء میں مجھے دل کا دورہ پڑا میرے سٹاف نے مجھے امریکہ سے آپریشن کرانے کا مشورہ دیا لیکن میں نے انکار کر دیا اور اپنی وزارت صحت کو تحریری حکم دیا میرا آپریشن ملائیشیا کے ہسپتال میں ہوگا اور ملائیشیا کے لوکل ڈاکٹر کریں گے اس حکم کا یہ نتیجہ نکلا 1989ء سے پہلے ہر سال ایک سے دو ملین ملائیشین علاج کیلئے ملک سے باہر جاتے تھے لیکن اس کے بعد ہر سال چھ ملین لوگ علاج کیلئے ملائیشیا آنے لگے"

ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا "جب کوئی لیڈر اپنے ملک کو ترقی دیتا ہے تو لوگ اسے ناگزیر کہنا شروع کر دیتے ہیں وہ یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں سر اگر آپ نہ رہے تو یہ سارا سٹم ختم ہو جائے گا" کیا آپ کو لوگوں نے یہ نہیں کہا تھا اگر کہا تھا تو آپ نے اقتدار کیوں چھوڑ دیا" مہاتر نے قبضہ لگایا اور نرم آواز میں بولے "مجھے بھی لوگوں نے کہا تھا لیکن میں تاریخ کا

طالب علم ہوں میں نے تاریخ میں پڑھا وہ تمام حکمران جو خود کو کسی ملک کیلئے ناگزیر سمجھتے تھے وہ رخصت ہوئے تو ان کے بعد بھی وہ ملک قائم رہے دنیا ان کے بغیر بھی چلتی رہی وقت ان کے بغیر بھی آگے بڑھتا رہا دوسرا میں نے محسوس کیا دنیا کے تمام لیڈر ایک وقت میں بہت پاپولر ہوتے ہیں لوگ ان کی پرستش کرتے ہیں لیکن جب وہ لمبے عرصے تک اقتدار میں رہتے ہیں تو لوگ ان سے اکتا جاتے ہیں عوام کو ان کی ذات میں کیزے نظر آنے لگتے ہیں میں نے دیکھا دنیا کے تمام پاپولر لیڈر جب اقتدار سے رخصت ہوئے تو وہ ان پاپولر ہو چکے تھے تیسرا میں نے محسوس کیا اگر میں آج فوت ہو جاؤں تو کوئی نہ کوئی شخص میری جگہ لے گا لہذا پھر کیوں ناں میں زندگی ہی میں اپنی جگہ کسی دوسرے کو پیش کر دوں اور ساتھی بن کر اس کی مدد کروں "ہم میں سے ایک صاحب نے پوچھا "آپ کی زندگی کا کوئی ون لائن فلسفہ" مہاتیر نے ہنس کر جواب دیا "وہ جمہوریت جو تعلیم کے بغیر ہو وہ ملک کو نقصان پہنچاتی ہے" ہم نے عرض کیا "ہم سمجھ نہیں سکے" مہاتیر نے اٹھتے اٹھتے جواب دیا "صرف تعلیم یافتہ لوگ ہی اچھے لیڈر منتخب کر سکتے ہیں" میں نے ان سے عرض کیا "آپ پاکستان اور ملائیشیا میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں" انہوں نے تھوڑی دیر ہو جا اور فریڈم تھا سبھی میں بولے "ہم اپنے جی ڈی پی کا 25 فیصد تعلیم پر خرچ کرتے ہیں اور چھ فیصد دفاع پر جبکہ آپ لوگ تعلیم پر دو فیصد خرچ کر رہے ہیں اور دفاع پر 48 فیصد" میں نے مزید عرض کرنے کیلئے ت کھولا لیکن وہ ہنس کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

(نوٹ: مہاتیر محمد کے ساتھ اس نشست کا اہتمام انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد نے کیا تھا۔)



لوہار کا بیٹا

اس کا والد ایک لوہار تھا، گارسر میں اس کی چھوٹی سی بھئی تھی جس میں وہ کسانوں کے چھوٹے چھوٹے آلات بناتا تھا، محمود اس کا چھوٹا بیٹا تھا، 1957ء میں کسی لڑکے سے بتایا، تہران میں لوہاروں کی بہت مانگ ہے، لوہار نے بھئی بچھائی اپنے چار بچوں اور اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور تہران آ گیا، تہران شہر میں اللہ نے اسے مزید تین بچے عنایت کئے، یہ ہجرت اس کیلئے سود مند رہی، اس نے تہران کی ایک کچی بستی میں لوہا کوٹنے کا کام شروع کیا، یہ کام چل نکلا، اور وہ لوہار سے تاجر بن گیا۔

محمود احمدی اس کے چوتھے بیٹے میں تین خوبیاں تھیں، وہ پڑھائی میں دلچسپی لیتا تھا، وہ ایک فعال اور عملی بچہ تھا، وہ دوسروں کو کام کا حکم دینے کی بجائے خود کام شروع کر دیتا تھا اور تیسرا وہ برائی کو ہاتھ سے روکنے کا قائل تھا، وہ چھوٹی عمر میں کہا کرتا تھا، "جس بڑائی کو آپ توبت سے نہیں روک سکتے، وہ برائی آپ کے احتجاج سے نہیں رکے گی" محمود کے والد نے اسے سکول میں داخل کر دیا، محمود ایک اچھا طالب علم ثابت ہوا، وہ پڑھتا چلا گیا، اس نے سکول سے تعلیم حاصل کی، وہ کالج میں گیا اور وہاں سے بیوروٹنی اس نے سول انجینئرنگ میں داخلہ لیا، اس نے ایم ایس سی کی اور اس کے بعد ٹریٹنگ اینڈ ٹرانسپورٹ پلاننگ میں پی ایچ ڈی کرنی، یہ مضمون بھی اس کی ذات کی طرح اٹو کھا تھا، اس کے ممتحن نے اس سے وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا تھا، "ٹرانسپورٹ

اور نریٹک ایک سو پندرہ صدی کا سب سے بڑا مسئلہ ہو گا۔ اپنی ایچ ڈی کے بعد اس نے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا وہ ڈاکٹر محمود احمدی نژاد ہو گیا ڈاکٹر محمود احمدی کے والد اسے سرکاری افسر بنانا چاہتے تھے لیکن اس کے رجحانات میں توازن نہیں تھا وہ ایک طرف تعلیم و تدریس کے جنون میں مبتلا تھا اور دوسری طرف عملی جہاد کا شیدا کی تھا 1980ء میں جب ایران عراق جنگ شروع ہوئی تو وہ سپاہ پاسداران انقلاب میں شامل ہو گیا وہ ایران کی مغربی سرحد پر لڑنے لگا اس دور میں اس نے ریکارڈ کا میا بیاں حاصل کیں اس جنگ کے بعد اس نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر کرڈینر عبدالرحمن کو بیانا میں گولی مار دی اس قتل کی ساری منصوبہ بندی محمود احمدی نے کی تھی اس نے شام رسول سلیمان رشدی کے قتل کا منصوبہ بھی بنایا تھا لیکن وہ بچ گیا۔

محمود احمدی نژاد ان تمام کامیابیوں کے باوجود 2003ء تک گوشہ گمنامی میں رہا تو می سٹیج پر لوگ اس کے نام سے واقف نہیں تھے لیکن پھر 2003ء کا سٹی آ گیا اور وہ اچانک تہران شہر کا ستر بن گیا۔ ہم نے اس کے بعد اس نے اخبار کی نمائندگی کو جو اس پر یو ڈاؤ اس کے وقت اس کے لئے لکھنے کا آئینہ دار تھا اس نے کہا "میں لوہار کا بیٹا ہوں میرے پاس لوگوں کو دینے کیلئے خدمت کے سوا کچھ نہیں میرا کل اثاثہ خدمت ہے اور تہران کے لوگ مجھے بھی یہ خزانہ لاتے ہوئے بخیل نہیں پائیں گے" وہ لوہار کا پہلا بیٹا تھا جسے کسی دارالحکومت کی نظامت ملی تھی اس دور میں تہران میں امریکی فاسٹ فوڈ کے نئے نئے ریستوران کھلے تھے یہ ریستوران ایران کی نئی حکومت کی روشن خیالی اور امتداد پسندی کے مظہر تھے محمود احمدی نژاد نے ان ریستورانوں پر پابندی لگا دی اس کا کہنا تھا "مگر مغرب کے دل میں ہماری تہذیب کیلئے جگہ نہیں تو ہم بھی ان کے ٹیچر سے انکار کرتے ہیں" اس نے تہران کے تمام ثقافتی مراکز کو اسلامی قوانین کا پابند بنا دیا اس نے میوٹیل کارپوریشن کی آڈیو لٹس خواتین کیلئے مختص کر دیں اس نے کارپوریشن کے تمام ملازمین کو ڈرامی رکھے اور سکھائی آئین کی تمیز پہننے کا پابند بنا دیا اس نے وقت کی پابندی کو شعاع بنایا اور سارے عملے کو حکم دیا وہ اس وقت تک گھر نہیں جائیں گے جب تک وہ اس دن کا کام ختم نہ کر لیں اس کا کہنا تھا "جو شکایت آج درج ہوئی ہے اس کی تلافی بھی آج ہی ہونی چاہیے" اس نے تہران کی ساری ٹریفک کو نظم و ضبط کا پابند بنا دیا ایک سال میں تہران دنیا کا واحد شہر بن گیا جس میں پارکنگ اور ٹریفک کے قوانین پر سرفیہد عملدرآمد ہوتا تھا اس نے تہران کی ساری عکس سڑکیں دوبارہ

بنوانے کا اعلان کیا شاہراہ سازی کے اس عمل میں بھی اس نے ایک اٹوٹھا اصول وضع کیا اس نے اعلان کیا ہم غریب بستیوں سے سڑکیں بنانا شروع کریں گے اور آہستہ آہستہ بڑی شاہراہوں کی طرف آئیں گے محمود احمدی نژاد تہران کا پہلا میسٹر تھا جس نے تہران کے مضافات کی ساری سڑکیں وسیع اور پختہ کر دیں جس نے تمام سڑگوں پر لائٹس لگا دیں اس نے نو بیابتا جوڑوں کیلئے قرضوں کا پروگرام شروع کیا وہ کہتا تھا "جو شخص شادی کرنے وہ دوسرے دن کارپوریشن سے قرض لے اور نئی اور آواز زندگی شروع کرنے اس کی ذاتی زندگی کو فروغ دیکر سے پاک تھی اس نے میسٹر کی سرکاری رہائش گاہ استعمال کرنے سے انکار کر دیا اس نے سرکاری گاڑی اور پٹرول بھی مسترد کر دیا وہ تہران سے 20 میل باہر ایک پسماندہ بستی کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا وہ گھر سے ٹھن لے کر دفتر آتا تھا یہ اس کا لچ ہوتا تھا وہ تہران کے میسٹر کی حیثیت سے کاہنہ کے اجلاس میں شرکت کرتا تھا "کاہنہ میں اس کے خیالات "باہریان" ہوتے تھے وہ کہتا تھا "ہمارے وزراء لوگوں کے اصل مسائل سے واقف نہیں ہیں ہمیں بیرونی دنیا کے بجائے اندرونی دنیا پر توجہ دینی چاہیے" اس کے خیالات کے باعث کاہنہ کے اجلاس میں اس کی شرکت پر پابندی لگا دی گئی

2005ء میں دنیا کے 65 میسٹر نے تہران کی قبرستان میں محمود احمدی نژاد کا نام اس قبرستان میں

شامل تھا یہ قبرستان دنیا کے 550 میسٹروں کی پر فارمنس دیکھ کر بنائی گئی تھی اور اس میں ایشیا کے صرف 9 میسٹر شامل تھے محمود احمد نژاد ایران کا پہلا میسٹر تھا جس نے یہ اعزاز حاصل کیا۔

محمود احمدی نژاد 2005ء کے الیکشن میں صدارتی امیدوار بن گیا اس نے الیکشن مہم کے بغیر الیکشن لڑنے کا اعلان کیا اس کے مقابلے میں علی اکبر ہاشمی رفسنجانی نے الیکشن مہم پر 5 بلین ڈالر خرچ کئے محمود احمدی نژاد اپنی الیکشن مہم کے دوران صرف ایک نعرہ لگا تا رہا "میں لوہار کا بیٹا تھا میں میسٹر شپ کے دوران بھی لوہار کا بیٹا رہا اور میں صدارت میں بھی لوہار ہی کا بیٹا رہوں گا" وہ کہتا تھا "میں تمہیں امریکہ کی غلامی سے نجات دلاؤں گا" مغربی میڈیا کا کہنا تھا "نژاد گیارہ ستمبر کے بعد دنیا کا واحد صدارتی امیدوار تھا جو اپنی تقریروں میں امریکی تعلقات کو لگا رہا تھا" لوہار کا یہ بیٹا 25 جون 2005ء کو ایران کا صدر منتخب ہو گیا اس نے ایران کی تاریخ میں سب سے زیادہ ووٹ لئے اس کی کامیابی پر امریکہ کے ایک نیٹو ایجنٹ نے تبصرہ کیا "یہ 1979ء کے بعد ایران میں امریکہ کی دوسری شکست ہے" جب نتائج کا اعلان ہوا تو میرے ایک دوست نے تبصرہ کیا "نژاد نے امریکی نفرت کو کیش کر لیا" میں نے اسے نوک دیا "یہ امریکی شجاعت کی شکست نہیں یہ نژاد کی

خدمت سادگی اور اخلاص کی فتح ہے" اس نے میری طرف دیکھا میں نے عرض کیا "نژاد کی یہ فتح ثابت کرتی ہے عوام ہمیشہ ایسے لوگوں کو اپنا حکران دیکھنا چاہتے ہیں جو ان کے مسائل سمجھتے ہوں جو طے سے ان جیسے ہوں اور جو ان کے درمیان رہتے ہوں" میرے دوست نے پوچھا "لیکن ہمارے ملک میں ایسا کیوں نہیں ہوتا" میں نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "اس لئے کہ پاکستان میں اقتدار سونے کی کان ہے اور اس کان کے منہ پر لوہار کی بجائے سونا کے بیٹے بیٹھے ہیں"



Kashif Azad@OneUrdu.com

آمر ہمیشہ پنوشے کی موت مرتے ہیں

والدہ نے اس کا نام آگستور رکھا تھا لیکن دنیا میں وہ جنرل پنوشے کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ جنوبی امریکہ کے ملک چلی کا رہنے والا تھا۔ چلی دنیا کا سب سے چلا اور لسا ملک ہے امریکی اسے "گمراہ" کہتے ہیں اس کے والد منٹم اسپنر تھے مگر میں غربت تھی لیکن والدہ اپنے سلیقے سے مگر چلا یعنی تھی وہ انجینئر بننا چاہتا تھا لیکن والدہ کی خواہش تھی وہ فوج میں افسر بنے اس نے والدہ کی خواہش مان لی پنوشے نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور وہ آگے بڑھتا چلا گیا 1970ء کے ایشین ہوئے اور ان ایکشنوں میں عوام نے سوشلسٹ پارٹی کے مشہور لیڈر سلواڈور آلندے کو صدر منتخب کر لیا آلندے ایک کمیونسٹ شاعر تھا اس نے ملک کی تمام صنعتیں کانٹیں بینک اور مواصلاتی کمپنیاں سرکاری حویل میں لے لیں یہ اقدامات امریکہ کے لئے تشویشناک تھے امریکہ کو خدشہ تھا کہیں چلی بھی کیوبا کی طرح کمیونسٹ ملک نہ بن جائے چنانچہ امریکہ نے صدر آلندے اور کمیونسٹوں کو ہٹانے کا فیصلہ کیا امریکہ نے حزب اختلاف اخبارات سیاستدانوں تاجروں اور ٹریڈ یونین رہنماؤں پر کروڑوں ڈالر کی "سرمایہ کاری" کی جس کے آخر میں امریکہ کو فوج میں ایسے افسر کی ضرورت پڑی جو چلی کی حکومت پر قبضہ کر لے اور پھر برسوں امریکی مفادات کی کاشت کاری کرے جنرل پنوشے میں یہ ساری خوبیاں موجود تھیں جنرل پنوشے صدر آلندے کے دور میں کور کمانڈر تھا صدر آلندے کو ایک ایسا جرنیل درکار تھا جس کا خاندانی پس منظر زیادہ

مضبوط نہ ہو اور جس میں وفاداری اور خلوص موجود ہو وہ جنرل پنشنے کی شکل اور مجرد اٹکسار سے دھوکہ کھا گیا چنانچہ اس نے اسے مسلح افواج کا کمانڈر انچیف بنا دیا، امر کی حکومت جنرل پنشنے کی تازہ میں تھی امریکہ نے جنرل پر سرمایہ کاری کی اور جنرل پنشنے نے 11 ستمبر 1973ء کو صدر آئندے کا تختہ الٹ دیا جس کے بعد صدر آئندے نے صدارتی محل میں خودکشی کر لی، یوں اس شام جنرل آگسٹو پنشنے یوگارے چلی کا بااثر کت غیر سے مالک و مختار بن گیا۔

جنرل پنشنے میں چار خصوصیات تھیں، وہ طاقت استعمال کرنا جانتا تھا، وہ سمارٹ اور چالاک تھا، وہ شطرنج کی طرح لوگوں کے ساتھ کھیلتا تھا اور وہ سازش کرنے میں ماہر تھا، اس نے اقتدار میں آتے ہی تمام کیونسنوں کو گرفتار کر لیا، اس نے 28 ہزار لوگوں کو مارا چر کیا جن میں سے تین ہزار سیاستدان قتل ہو گئے، وہ مخالفین کو گرفتار کرتا اور اگلے دن ان کی نعشیں دریا میں تیرتی ہوئی ملتیں یا جنگل میں کسی درخت سے لٹک رہی ہوتیں، وہ سو سو نعشوں کو ایک گڑھے میں دفن کر دیتا تھا، وہ ایک تابوت میں تین تین مردے بھی ڈال دیتا تھا، اس نے تین برسوں میں چلی سے کیونٹ

ختم کر دیئے، وہ آئین اور قانون توڑنے اور تباہ کرنے پر یقین رکھتا تھا، اس کا کہنا تھا، وہودی اس کی اصل کت ہے اور جب تک وہ مسلح افواج کا کمانڈر رہتا ہے اسے ایسی طاقت کا کوئی خوف نہیں

وہ کہتا تھا "چلی میں صرف وہی ہتائل سکتا ہے جسے میں بلنے کی اجازت دوں گا" اس نے 1974ء میں ریفرنڈم کر لیا اور 75 فیصد عوام نے اس کے حق میں "ووٹ" دے دیا، اس نے مارچ 1981ء میں اپنی مرضی کا آئین بنایا اور خود کو آٹھ برس کیلئے پاروڈی صدر منتخب کر لیا، وہ یونیفارم کے بغیر کسی سیاستدان سے ملاقات نہیں کرتا تھا، اس نے 1982ء میں جمہوریت نافذ کرنے کا اعلان کیا لیکن وہ 1982ء آتے ہی اپنے وعدے سے مکر گیا، وہ خود کو عوام میں انتہائی پاپولر تصور کرتا تھا، 1988ء میں اس نے عوام کو تھوڑی سی آزادی دی اور اس کے بدلے میں ریفرنڈم کرادیا، اس کا خیال تھا عوام اسے مزید دس برسوں کیلئے صدر منتخب کر لیں گے لیکن وہ پار گیا، ملک میں صدارتی الیکشن ہوا اور عوام نے اپوزیشن لیڈر اور کرچن ڈیموکریٹک پارٹی کے پیٹریشیو ایلیون ایزو کار کو صدر منتخب کر لیا، جس کے بعد اسے صدارتی عہدہ چھوڑنا پڑا لیکن اس نے یونیفارم اتارنے سے انکار کر دیا، اس نے خود کو دس سال کے لئے بطور کمانڈر انچیف توسیع دے دی، اس نے خود کو تاحیات سینیٹر بھی بنالیا۔

جنرل پنشنے چلی کو روٹن خیال اور احتدال پسند بنانا چاہتا تھا، "سب سے پہلے چلی"

اس کا فلسفہ حیات تھا لہذا وہ امریکہ کا ہر جائزہ ناجائز حکم نورمان لینا تھا اس نے امریکی شہریوں کو چلی میں خصوصی حقوق دے رکھے تھے امریکہ نے چلی میں ایف بی آئی اور سی آئی اے کے باقاعدہ دفتر بنا رکھے تھے اور یہ لوگ ان دفاتروں کے ذریعے پورے جنوبی امریکہ کو مانٹر کرتے تھے اس نے کیوسٹوں کے ساتھ ساتھ تمام مذہب پسند عناصر بھی چلی سے قاصر کر دیئے کسی نے ایک بار اس سے پوچھا تھا "تم ایک تابوت میں دو دو تین تین مردوں کو کیوں دفن کرتے ہو" اس نے ہنس کر جواب دیا "میں قبرستانوں کی جگہ بچاتا ہوں" اس نے عدالتوں پر بھی قبضہ کر رکھا تھا وہ نافرمان بچوں کو عہدے سے ہٹا دیتا تھا یا پھر انہیں "روڈ ایکٹیوٹ" میں مروا دیتا تھا اسے سیاستدان ایچھے نہیں لگتے تھے وہ انہیں ملکی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا تھا چنانچہ اس کے دور میں زیادہ تر سیاستدانوں نے جلا وطنی اختیار کی یا پھر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی اسے کرنسی نوٹ بدلنے کا بھی شوق تھا اس نے اپنے دور میں چلی کے تمام نوٹ تبدیل کر دیئے اسے شراب پینے اور پلانے کا بھی شوق تھا لہذا اس نے اپنے دور میں چلی میں بے تحاشا شراب خانے اور ڈسکو کلب بنائے وہ خوش لباس تھا اس کے سوٹ اٹلی سے مل کر آتے تھے اور نئے یارک میں ڈرائی کلین ہوتے تھے اسے رقص دیکھنے کا بھی شوق تھا چنانچہ اس کے دور میں دنیا بھر کی اداکارائیں سان تیاگو آتی تھیں اور اس سے خوب داد پاتی تھیں وہ سکیورٹی کے بخار میں بھی مبتلا تھا لہذا وہ جب صدارتی محل سے نکلتا تھا تو سان تیاگو کی ساری سڑکیں ویران ہو جاتی تھیں اور اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں بیسیوں بلسٹ پروف گاڑیاں چلتی تھیں اس کے بندروم کے باہر تو ہیں اور میزائل نصب ہوتے تھے لیکن پھر اس کی زندگی میں ایک دن طلوع ہوا اور وہ سان تیاگو کی گلیوں میں رسوا ہو کر رہ گیا اس کی اپنی بٹائی ہوئی عدالتوں نے اس کے خلاف انکوائریاں شروع کرا دیں اس کا اپنا بتایا ہوا قانون اس کے پاؤں کی بیڑیاں بن گیا وہ دن دس مارچ 1998ء تھا اس دن جنرل ہوشے نے یونیفارم ۳۱ روری ریٹائرمنٹ لی اور زندگی آرام اور سکون کے ساتھ گزارنے کا اعلان کر دیا لیکن اگلے ہی دن اس کا احتساب شروع ہو گیا وہ علاج کیلئے لندن گیا اور برطانوی حکومت نے اسے گرفتار کر لیا برطانوی حکومت نے 2000ء میں اسے سان تیاگو بھیجا تو عدالت نے اسے طلب کر لیا اس پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی تین ہزار لوگوں کے قتل اور وسیع کرپشن کا الزام تھا 2004ء میں اس کا دورہ 70 اکھ ڈالروں کا ایک اکاؤنٹ بھی چکڑا گیا وہ شدید ڈپریشن اور پریشانی کا شکار ہو گیا اسے سمجھ نہیں آتی تھی لوگ اس سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں اس نے

ایک دن اپنے خادم خاص سے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا "سر آپ خود کہا کرتے تھے یونین فارم آپ کی اصل طاقت ہے آج آپ اس طاقت سے محروم ہو چکے ہیں" اس نے سر جھکا لیا۔ جنرل پنوشے کو تین دسمبر 2006ء کو ہارٹ اٹیک ہوا، اس کی اسٹیجی پلاسٹی ہوئی لیکن وہ دس دسمبر کو دم توڑ گیا، دس دسمبر انسانی حقوق کا عالمی دن تھا اس دن پنوشے کی موت قدرت کا اس سے انتقام تھا، اس نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی "میری نیش کو جلا دیا جائے، مجھے خطرہ ہے لوگ میری قبر کی بے حرمتی کریں گے" اس کا خدشہ درست تھا پنوشے کی موت پر ہزاروں لوگ گھروں سے نکلے اور انہوں نے سان تیا گو میں قفس شروع کر دیا تھا۔ وہ آتش بازی بھی کر رہے تھے پولیس کو ان لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے لانچی چارج اور آنسو گیس استعمال کرنا پڑی۔

جنرل پنوشے کی موت ایک اور آمر کا انجام تھی، اس موت نے ثابت کر دیا۔ زمین کا ہر آمر دنیا سے رسوا ہو کر رخصت ہوتا ہے، وہ اپنی آنکھوں سے اقتدار اور طاقت کو اپنے ہاتھوں سے نکلنے دیکھتا ہے اور پھر بائے بائے اور اوئے اوئے کے نعروں کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتا ہے اور دنیا میں شاید ہی کوئی آمر گنہگار ہو جسے قبر اور مٹی نصیب ہوئی ہوں اور جسے مرنے کے بعد بھی لوگوں نے یاد رکھا ہو۔ پنوشے کی موت نے ثابت کر دیا لیڈر اور آمر میں صرف انجام کا فرق ہوتا ہے، لیڈر دنیا سے ہمیشہ عزت کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد لوگ ان کی قبر پر دیا جلاتے ہیں جبکہ آمر ہمیشہ پنوشے کی موت مرتے ہیں اور لوگ ان کی قبر کی طرف پشت کر کے کھڑے ہوتے ہیں لوگ مرنے کے بعد بھی ان سے نفرت کرتے ہیں لہذا میں صدر جنرل پرویز مشرف سے درخواست کرتا ہوں وہ اپنی میز پر جنرل پنوشے کی تصویر لگالیں اور اٹھتے بیٹھتے اس پر ایک نظر ضرور ڈال لیا کریں اور اللہ سے دعا کیا کریں اللہ تعالیٰ انہیں صدر پنوشے کے انجام سے بچائے۔



یونینفارم

وہ دنیا کا ایسا حکمران بننا چاہتا تھا جو مرنے کے بعد بھی یونینفارم میں رہے اسے ریٹائر کے لفظ سے نفرت تھی جب اس کا اقتدار سوانہیز سے ہو گیا تو اس نے وہ کام کئے اس نے خود کو فیلڈ مارشل ڈیکلئیر کر دیا اور دوسرا اس نے وصیت کی جب اس کا انتقال ہوا تو اسے یونینفارم میں پورے فوجی اعزازات کے ساتھ دفن کیا جائے اور اس کے بعد اسے فیلڈ مارشل صدام حسین کے نام سے لکھا اور پکارا جائے۔

وہ 16 جولائی 1979ء کو عراق کا صدر بنا اس وقت وہ عراقی فوج میں میجر جنرل تھا وہ 24 برس تک مسلسل عراق کا حکمران رہا اس کی ذات ایک ایسا گھنڈا گھر تھی جس کے گرد اقتدار و اقتدار طواف کرتے تھے وہ کہتا تھا میرا جوتا میرا آئین اور میرا قانون ہے عراق میں چھ بڑے عہدے تھے صدر، وزیر اعظم، افواج کا سپریم کمانڈر، وزیر دفاع، چیئر مین انقلابی کمانڈ کونسل (آر ڈی سی) اور بعث پارٹی کا سیکرٹری جنرل یہ سارے عہدے صدام حسین کے پاس تھے وہ عراق کا مضبوط ترین شخص تھا لیکن وہ وردی کو اپنی اصل طاقت کہتا تھا اس کا کہنا تھا اگر انتظامی اور سیاسی طاقت کو وردی کی قوت مل جائے تو وہ ناقابل تہخیر اقتدار میں جاتی ہے وہ یونینفارم اتارنے کیلئے تیار نہیں تھا اس کا کہنا تھا جس جرنیل کو یونینفارم کے ساتھ اقتدار ملے اسے زندگی میں اقتدار اور یونینفارم میں سے کوئی چیز ترک نہیں کرنی چاہیے اس کا کہنا تھا یونینفارم اس کو ارض پر اللہ تعالیٰ کی

سب سے بڑی نعمت ہے اور جو لوگ اس نعمت کا کفران کرتے ہیں وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں اس کی بات درست تھی یونینفارم نے اسے وہ طاقت بخشی تھی جو اس سے پہلے عراق کے کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی تھی اس نے یونینفارم کی طاقت سے پورا آئین بدل دیا تھا۔ اس نے عراق کا سارا قانون تبدیل کر دیا تھا اس یونینفارم کی مہربانی سے اس کا ہر حکم قانون اور ہر خواہش آئین کا درجہ رکھتی تھی وہ اگر کہہ دیتا تھا کہ عراق کے تمام شہریوں کی صبح نو بجے سے شروع ہوگی تو اگلے دن یہ حکم قانون کا درجہ اختیار کر جاتا تھا پورا ملک صبح نو بجے آنکھ کھولتا تھا وہ وہ جسم کی فوجوں کا سربراہ تھا ایک ملک کی فوج جس کی تعداد پانچ لاکھ تھی جس کے پاس ہتھیار تھے تو ہیں اور میزائل تھے اور دوسری اس کی ذاتی فوج یہ فوج صدام حسین اور اس کے نظام کی ذاتی محافظ تھی اس فوج کے پاس بیک وقت فوج پولیس اور عدلیہ کے اختیارات تھے یہ کسی بھی وقت کسی بھی شخص کو گرفتار کر سکتی تھی اسے سزا سناسکتی تھی اور کسی سے اجازت لئے بغیر اس سزا پر عملدرآمد کر سکتی تھی پورے عراق میں صدام کے ہزاروں لاکھوں مجسمے تھے اور ہر مجسمے میں اس نے لینڈ مارشل کی وردی پہن رکھی تھی عراق میں کہا جاتا تھا آپ اپنے گھر کی کھڑکی کھولیں آپ اپنے گھر کے دروازے سے اپنے گھر کے باہر نکلتے ہوئے دارتین بائیں اور دلوں پر نیچے دیکھیں آپ کی نظر سب سے پہلے صدام حسین کی تصویر یا مجسمے پر پڑے گی۔ کہا جاتا تھا آپ بغداد میں رہ کر صدام حسین کی نظروں سے اجمل نہیں رہ سکتے کہا جاتا تھا بغداد کا ہر بچہ آنکھ کھولنے کے بعد سب سے پہلے صدام حسین کا شاندار اور بارعب چہرہ دیکھتا تھا اور یہ چہرہ دیکھتے دیکھتے جوان ہوتا تھا صدام حسین اور اس کی یونینفارم عراق کی فضاؤں عراق کی ہواؤں میں رچی بسی تھی وہ روز روزی پہن کر دفتر جاتا تھا وہ اپنی پر وہ سوٹ پہنتا تھا لیکن اس کی یونینفارم اس کی میزائل پر وہ گاڑی میں اس کے ساتھ سفر کرتی تھی وہ اس یونینفارم کو اپنے آپ سے جدا نہیں ہونے دیتا تھا صدام حسین کے ماتحت اس کی اس انفریاتی کمزوری سے واقف تھے چنانچہ اس کے دھوبلی یونینفارم دھونے سے پہلے یونینفارم کو سیلوٹ کرتے تھے اور اس یونینفارم کو آگے پیچھے لے جانے والے اسے اٹھانے سے پہلے سیلوٹ کرتے تھے اس کا حکم تھا کرنل سے کم رینک کا کوئی افسر اس کی یونینفارم کو ہاتھ نہ لگائے اس نے یونینفارم کا تقدس برقرار رکھنے کیلئے اپنے دھوبلیوں استری کرنے والے ملازموں اور یونینفارم کی "یک کیٹ" کرنے والے خادموں کو امرامی کرش کا ہندوہ۔ رکھتا تھا۔

KashafAzad.com Urdu.com

صدام حسین اور اس کی یونیفارم کامیابی سے چل رہی تھی لیکن پھر 2003ء آ گیا امریکہ نے اتحادیوں کی فوجیں جمع کیں اور عراق پر حملہ کر دیا صدام حسین اور اس کی یونیفارم نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جلد ہی دونوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا صدام حسین روپوش ہو گیا اور بغداد فتح ہو گیا سقوط بغداد کے بعد امریکی فوج کی تھرڈ انٹرنی ڈیویژن کا ایک سپاہی ایئر پورٹ کی تلاشی لے رہا تھا تو اسے وہاں ایک شاپنگ بیگ ملا اس بیگ میں ایک یونیفارم بھی اس نے یونیفارم سیدھی کی تو وہ حیران رہ گیا یہ صدام حسین کی دردی تھی یونیفارم کے سینے پر صدام حسین کے تمام فوجی اعزازات اور تمغے سجے تھے سپاہی نے یہ یونیفارم چھپائی 2003ء کے آخر میں یہ سپاہی واپس امریکہ آیا تو اس نے یہ یونیفارم امریکہ کے مشہور نیلام گھر "مانین انٹرنیشنل آکشن ہاؤس" کے حوالے کر دی مانین کا شمار امریکہ کے چند بڑے نیلام گھروں میں ہوتا ہے یہ نیلام گھر پچھلے 30 برس سے کام کر رہا ہے اور اسے فوجی اعزازات اور عسکری باقیات فروخت کرنے کا خصوصی تجربہ ہے اس نیلام گھر نے نومبر 2005ء کو یہ یونیفارم آکشن پر رکھ دی نیلام گھر نے اس یونیفارم کی ابتدائی قیمت 5 ہزار ڈالر طے کی تھی کپنی نے اس ضمن میں ایک "سب سائٹ" بنائی اور اس ویب سائٹ کے ذریعے دنیا بھر میں موجود شائقین کو بولی کی دعوت دی کپنی کا خیال تھا عراق کے سب سے طویل حکمران اور سب سے بڑے عہدیدار کی یونیفارم کی لاکھ ڈالروں میں فروخت ہوگی کپنی کا کہنا تھا وہ یونیفارم کی آکشن سے حاصل ہونے والی رقم کا ایک حصہ کسی خیراتی ادارے کو دے گی لیکن کپنی کو اس وقت حیرت کا شدید جھکا لگا جب گا کہوں نے صدام حسین کی یونیفارم خریدنے میں کوئی سرگرمی نہ دکھائی یہ کپنی اس سے قبل بٹلری کی یونیفارم بھی بیچ چکی تھی اور اسے اس سودے میں کروڑوں ڈالر ملے تھے لیکن اس مرتبہ انہیں کاروبار میں گھانا پڑنا دکھائی دیا صدام حسین کی یونیفارم کی بولی نومبر 2005ء میں پانچ ہزار چالیس ڈالر سے شروع ہوئی اور فروری 2006ء میں سولہ ہزار ڈالر پر آ کر رک گئی آکشن ہاؤس نے بولی آگے لے جانے کی کوشش کی لیکن چھ ارب لوگوں کی اس دنیا میں انہیں سوا سولہ ہزار ڈالر دینے والا کوئی شخص نہیں ملا بقا کپنی کو مجبوراً یہ یونیفارم 16 ہزار ڈالر میں بیچنا پڑی۔

اگر ہم اس یونیفارم کی مالیت کا اندازہ لگائیں تو میرا خیال ہے صدام حسین کے فوجی اعزازات پر سولہ ہزار ڈالر سے زیادہ کی پالش لگی ہوگی سولہ ہزار ڈالر تو اس یونیفارم کا دھوبی لے لیا کرتا تھا میں نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے یونیفارم کی اس ناقدری پر دلی دکھ ہوا آپ مکافات عمل

دیکھئے جس صدام حسین کو پوری دنیا جانتی ہے اس صدام حسین کی یونیفارم کے بارے میں کوئی نہیں جانتا وہ اس وقت کس کے پاس ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے؟ میں نے سوچا ایک طرف یہ یونیفارم ہے اور دوسری طرف اس یونیفارم کا مالک ہے جو کپڑوں کے دوسرے جوڑے کو ترستا ترستا مریا جسے سلیپروں کے نئے جوڑے کیلئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے۔ میں مائین انٹرنیشنل کی ویب سائٹ دنیا کے تمام ہاروری حکمرانوں کی ٹیمبل پر لگوادوں اور اس کے بعد ان سے عرض کروں "سراخلاق اور اخلاص دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے اور جو حکمران اس طاقت سے مالا مال ہوتا ہے اس کا نام ہزاروں ورریوں سے زیادہ دیر پا اور مضبوط ہوتا ہے" میں ان سے عرض کروں "سر یونیفارم چھ میٹر کپڑے، سو فٹ دھاگے اور آدھا میٹر بکرم کا نام نہیں یہ اخلاق، سچائی اور ایمان کا نام ہوتا ہے اور جس شخص کے پاس یہ تینوں چیزیں ہوتی ہیں سر ان کے رد مال بھی یونیفارم سے نکلے ہوتے ہیں سر ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون اور ان کی سوچ کا ہر دوجہ آئین ہوتا ہے اور سر ہمارا کام ہمارا اخلاص اور ہماری کوششیں ہمیں بڑھاتی ہیں ہمارے کپڑے ہمارے جوئے اور ہماری بات چول گادیاں ہیں سر حضرت عمرؓ کے کراؤزے تنگ تک کسی کے تن پر یونیفارم نہیں تھی لیکن آج وقت ان کی چوکھٹ کو سیلوٹ کر رہا ہے کیوں؟ کیونکہ سر یہ لوگ اپنے ایمان کو اپنی طاقت سمجھتے تھے یہ لوگ یونیفارم کی بجائے عوام کو اپنی قوت سمجھتے تھے اور سر یہ حقیقت ہے عوام وہ طاقت ہوتے ہیں جو لیڈروں کو اپنے دل اپنے دماغ میں زندہ رکھتے ہیں جو انہیں صدیوں تک پھیلی محبت اور عقیدت دیتے ہیں"



”ہمیشہ عاجز اور دستیاب رہو“

مرنے سے چند لمحے پہلے اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اس نے جیول کی طرف
 ہاتھ بڑھا دیا۔ جیول نے ہاتھ تھام لیا۔ ساتھ اس کی ہونٹوں کی تھمی اس نے پیار سے اس کی طرف
 دیکھا، بیٹوں اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا، بک والد کی آنکھوں میں مسنونیت کا احساس ابھرا، اس نے
 آنکھیں بند کیں، ایک لمبا اور مطمئن سانس لیا اور اپنی روح خالق کائنات کے حوالے کر دی، اس
 کے ہاتھ آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہونے لگے، جیول اور جیول کی بیوی نے اس کے ہاتھ سیدھے کئے
 اور اس پر گردن تک چادر دے دی، جس کے بعد ایک عہد ختم ہو گیا، ساتھ برس تک کروڑوں دلوں
 پر حکمرانی کرنے والا آرٹ بک والد فوت ہو گیا۔

آرٹ بک والد دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم نگار تھا، اس کا کالم بیک
 وقت 600 اخبارات میں شائع ہوتا تھا، آرٹ بک والد کی کہانی انتہائی دلچسپ تھی، وہ 1925ء
 میں نیویارک میں پیدا ہوا، دوسرے بانی سکول میں داخلہ لیا، لیکن پڑھ نہ سکا، نیوی میں بھرتی ہوا، تین
 سال نوکری کی، سارجنٹ بنا اور استعفیٰ دے کر واپس آ گیا، یونیورسٹی آف ساؤتھ کیلیفورنیا میں
 داخلہ لیا، تین سال یونیورسٹی میں پڑھا، لیکن ناکام ہو گیا، 1948ء میں 250 ڈالر کا بندوبست کیا
 اور پیرس آ گیا، پیرس میں ”ورائٹی سیکرین“ سے وابستہ ہو گیا، پیرس کی شانہ زندگی پر لگا چھلکا کالم
 لکھا، لوگوں نے پسند کیا اور آرٹ بک والد کالم نگار بن گیا، 1952ء میں نیویارک ہیرلڈ ٹریبون

نے 'کالم کو سینڈ کیٹ' کر دیا۔ آرٹ بک والد کا کالم امریکہ کے 130 اخبارات میں شائع ہونے لگا۔ 1962ء میں وہ واپس امریکہ آ گیا۔ 1970ء میں اس کا کالم انٹرنیشنل سطح پر سینڈ کیٹ ہوا اور دنیا کے چھ سو اخبارات میں شائع ہونے لگا۔ وہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم نگار تھا۔ اس نے 36 ماہرین کی ٹیم بنا رکھی تھی یہ سب لوگ مل کر اس کا کالم پلان کرتے تھے۔ زبان کے ماہرین زبان کی باتکیاں ٹھیک کرتے تھے۔ قانونی ماہرین کالم کی قانونی چھیدیں کا جائزہ لیتے تھے اور انسانی نفسیات کے ماہر کالم کی نفسیاتی جہتوں کا تجربہ کرتے تھے۔ آرٹ بک والد کا کالم ایک مختصر مزاحیہ تحریر ہوتی تھی لیکن اس کے اثرات کئی مہینوں تک جاری رہتے تھے۔ اس کے فخرے اور خیالات عام لکھاریوں سے مختلف تھے مثلاً اس نے ایک کالم لکھا تھا "ہم مجیب لوگ ہیں ہمیں محسوس ہوتا ہے ہمارا گزارا ہوا کل ہمارے آج سے بہتر تھا۔ میں ان تمام لوگوں سے مختلف ہوں۔ میں آج کی خوبیاں جاننے کیلئے دس سال انتظار نہیں کر سکتا لہذا میں اپنے آج کو گزارا ہوا کل سمجھتا ہوں اور ہمیشہ آج سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میری آپ سے بھی یہی درخواست ہے۔"

آج 2004ء اور 1994ء کے درمیان اس نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس نے کئی ڈراموں کا ڈراما لکھا۔ اس نے لکھا "میری بیوی ایک بار ٹھوکر لگنے کے باعث کرنی اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ڈاکٹر نے کہا یہ نوے کے زاویے پر مری اگر یہ 45 کے زاویے پر مری تو اس کی کلائی بچ سکتی تھی اس دن سے میں نے گرنے کا یہ نسخہ پلے باندھ لیا ہے لہذا میں اپنے دوستوں کو ہمیشہ یہ مشورہ دیتا ہوں اگر تم گرنے کا منصوبہ بناؤ تو تم مہربانی فرما کر 45 کے زاویے پر مری تاکہ تمہاری کلائی بچ جائے۔"

میں آرٹ بک والد سے بہت متاثر تھا۔ میں 2001ء میں امریکہ گیا تو میں نے اسے فون کیا اس کی سیکرٹری سے بات ہوئی اس نے مجھے شام پانچ بجے کا وقت دے دیا۔ آرٹ بک والد ایک خوبصورت گھر میں شاہانہ زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی سیکرٹری مجھے اس کی سنڈی میں لے گئی۔ بک والد کتابوں کے ریکس کے درمیان بیٹھا تھا اس کے پیچھے شیشے کی دیوار تھی اور دیوار کی دوسری طرف نصف درجن لوگ کمپیوٹر پر کام کر رہے تھے۔ میں نے شیشے سے جھانکا تو بک والد نے قہقہہ لگا کر کہا "مائی شاف" میں شرمندہ ہو گیا اس نے ہاتھ رگڑے اور شرارتی لہجے میں بولا "سو مسٹر شوہری تم زیر پوائنٹ کے ٹائٹل سے کالم لکھتے ہو تمہارے ہنٹے میں تین کالم آتے ہیں تمہارے کالموں کا سائل ڈرامائی ہے اور لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں" میں نے حیران ہو کر اس

کی طرف دیکھا اس نے میز پر بڑی فائل کھولی اس میں سے میرے چند کالم نکالے اور میرے سامنے رکھ دیئے ایک کاغذ خود اٹھایا اور میرا پر د فائل پڑھنا شروع کر دیا وہ پڑھتا پڑھتا ہا پڑھتا ہا جب کاغذ ختم ہوا تو مزاحیہ انداز میں بولا "میں نے یہ ساری معلومات انٹرنیٹ سے نکالی ہیں مجھے جب پتہ چلا میرا ایک پاکستانی دوست آ رہا ہے تو میں نے فوراً یہ معلومات جمع کر لیں تاکہ جب تم آؤ تو میں پاکستان اور تمہارے بارے میں سوال پوچھ کر تمہارا وقت ضائع نہ کروں ہم اس ملاقات میں زیادہ بہتر گفتگو کر سکیں لہذا انیل سی سم تھنک ایبائٹ شرف" مجھے اس کا سائل بڑا اچھا لگا وہ حقیقتاً ایک دلچسپ انسان تھا اس نے مجھے بتایا وہ روزانہ پانچ گھنٹے مطالعہ کرتا ہے کالم لکھتا ہے، شام کو نینس کھیلتا ہے اسے شطرنج جمع کرنے اور کھیلنے کا شوق ہے اس کے پاس سینکڑوں قسم کی شطرنجیں تھیں وہ ریس ٹریکس پر جا ٹنگ کر تا تھا اور مزاحیہ فلمیں دیکھتا تھا اس نے مجھے بتایا اسے صدر ریش اور اسامہ بن لادن اچھے لگتے ہیں وہ یہ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہے ان دونوں نے کس طرح چوری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے ہم ایک گھنٹہ گفتگو کرتے رہے پھر بجے میرا وقت ختم ہو گیا اس کی سیکرٹری اندر آئی میں نے جاننے کیلئے اجازت چاہی وہ اٹھا لیکن کچھ سوچ کر بولا "میرے پاس جلدی نہیں تو تم حریص ادا کا گھنٹہ میرے پاس بیٹھ سکتے ہو" میں بیٹھ گیا اس نے سیکرٹری کو اشارہ کیا وہ باہر گئی اور چند منٹ بعد ایک فائل لے کر اندر آ گئی "مسٹر بک والڈیہ ویٹام کا ایک طالب علم ہے اس نے یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور اب یہ جینز ٹیکنالوجی میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہے اسے سکا لرشپ چاہئے" بک والڈ نے اثبات میں سر ہلادیا سیکرٹری نے دوسرا بیچ پڑھنا شروع کر دیا "یہ ساؤتھ افریقہ کی بچی ہے کینسر کی مریض ہے، پچیس ہزار ڈالر میں اس کا علاج ہو سکتا ہے" اس نے اس پر بھی اثبات میں گردن ہلادی سیکرٹری نے دونوں کاغذ اٹھائے اور باہر چلی گئی "بک والڈ نے قبضہ لگایا اور ہاتھ رگڑ کر بولا "یہ میری عبادت تھی" میں نے اس عجیب و غریب عبادت کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنس کر بولا "انسان تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے جسم ذہن اور روح ہم جسم کو تندرست رکھنے کیلئے ورزش کرتے ہیں اور ذہن کو چست و چالاک رکھنے کیلئے مطالعہ لیکن ہم اپنی روح کو ہمیشہ بھلا دیتے ہیں ہم اسے زندہ اور چست و چالاک رکھنے کیلئے کچھ نہیں کرتے جبکہ ہمارے جسم اور ہمارے ذہن کی تمام جڑیں ہماری روح میں پیوست ہوتی ہیں ہمیں ایک غیر مذہبی انسان ہوں لیکن میں ورزش کو جسمانی عبادت، مطالعے کو ذہنی عبادت اور فلاح عامہ کو روحانی عبادت سمجھتا ہوں میں ساڑھے چار سو اخبارات سے حاصل ہونے والی

آمدنی ذاتی زندگی پر خرچ کرتا ہوں جبکہ ڈیزے سو اخبارات سے آنے والے چیک اپنے چیرٹی اکاؤنٹ میں ڈال دیتا ہوں۔ میں روز شام چوبیس بجے سے ساڑھے چوبیس بجے تک چیرٹی کا کام کرتا ہوں۔ میں طالب علموں کو دیکھنے دیتا ہوں۔ مریضوں کے علاج کا بندوبست کرتا ہوں۔ ہوم لیس لوگوں کی مدد کرتا ہوں اور میں سیلاب اور زلزلوں کے شکار لوگوں کی خدمت کرتا ہوں۔ میں اسے اپنی عبادت سمجھتا ہوں۔ میری یہ پریز میرے دماغ میرے جسم کو بھی صحت مند رکھتی ہے اور میری روح کو بھی "میں نے اسے سلوٹ کیا اور واپس آ گیا۔"

آرٹ بک والڈ کی موت اس کی زندگی سے زیادہ دلچسپ تھی۔ فروری 2006ء میں اس کے دونوں گردے ٹل ہو گئے اور وہ بیٹھے بیٹھے میں تین دن ڈیالیسس کرانے لگا۔ وہ ڈیالیسس سے بور ہو گیا۔ لہذا اس نے مرنے کا فیصلہ کیا۔ امریکہ میں دو قسم کے طبی مراکز ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے مرکز کو ہسپتال کہتے ہیں جبکہ دوسری قسم ہوٹس کہلاتی ہے۔ ہوٹس میں علاج سے مایوس مریض داخل ہوتے ہیں۔ ہوٹس میں داخل مریضوں کا علاج نہیں کیا جاتا۔ ڈاکٹر مریض کو ایک شاندار کمرے میں لٹاتے ہیں اور اس پر خواہشوں کے دروازے کھول دیتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں کھاتا ہے۔ جس سے چاہتا ہے ملتا ہے۔ کوئی شخص اسے منع نہیں کرتا۔ چوں مریض ساری خواہشیں پوری کر کے فوت ہو جاتا ہے۔ آرٹ بک والڈ نے فروری 2006ء میں ڈیالیسس بند کر لیا اور ہوٹس چلا گیا۔ اس کے اس اقدام نے اس کی شہرت میں اضافہ کر دیا۔ امریکہ کے تقریباً تمام اخبارات رسائل اور ٹیلی ویژن چینلز نے اسے خصوصی جگہ دی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا وہ دو تین ہفتوں میں انتقال کر جائے گا۔ لیکن قدرت کا کمال دیکھئے وہ نہ صرف زندہ رہا بلکہ اس کے گردوں نے بھی اچانک کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ تین ماہ بعد ہوٹس سے نکلا اور معمول کے مطابق کالم لکھنے لگا۔ امریکہ کے ڈاکٹر اس معجزے پر حیران تھے۔ لیکن میرا خیال تھا آرٹ بک والڈ کو اس کی "عبادت" نے زندہ رکھا تھا۔ وہ ان غریبوں ناداروں اور مریضوں کی وجہ سے زندہ رہا۔ جن کی خدمت کو وہ عبادت سمجھتا تھا۔ یہ آرٹ بک والڈ 18 جنوری 2007ء کو فوت ہو گیا۔ اس کے انتقال کے وقت اس کا بیٹا جیول اور اس کی بہو اس کے پاس تھے۔ جیول بک والڈ نے میڈیا کو بتایا میرے والد نے مرنے سے پہلے اپنے چاہنے والوں کو پیغام دیا "ہمیشہ عاجز اور دستیار رہو" میں نے آرٹ بک والڈ کا یہ پیغام پڑھا تو میں بے اختیار ہنس پڑا۔ یہ فقرہ میرے باپ نے آرٹ بک والڈ کو دیا تھا۔ میں نے 2001ء میں آرٹ بک والڈ کو بتایا تھا ہمارے ایک پسر جیول سکاٹر ہیں۔ باپ جی آپ اور بابا جی کے خیالات

زیر پوائنٹ 3.....0.....67

بہت ملتے ہیں، وہ کہا کرتے ہیں "اللہ کی عبادت انسانوں کی خدمت سے شروع ہوتی ہے" آرت جب والد نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ رگڑ کر بولا "باباجی اور کیا کہتے ہیں" میں نے مسکرا کر جواب دیا "وہ کہتے ہیں صوفی کی دونشانیاں ہوتی ہیں، وہ زمین کی طرح عاجز اور ہوا کی طرح دستیاب ہوتا ہے" آرت جب والد یہ سن کر خاموش ہوا اور تھوڑی دیر سوچ کر بولا "ہاں انسان کو ہمیشہ عاجز اور دستیاب ہونا چاہیے"



کاشف آزاد
Kashif Azad@OneUrdu.com

گڈ بائی مائی فرینڈز

آرٹ بک والدہ نے 2006ء کے وسط میں آخری کالم تحریر کیا تھا، اس کالم کا عنوان "گڈ بائی مائی فرینڈز" تھا۔ اس نے وصیت کی تھی یہ کالم اس کے انتقال کے بعد شائع کیا جائے۔ وہ اس کالم کے بعد بھی کالم تحریر کرتا رہا اور یہ کالم معمول کے مطابق اخبارات میں شائع ہوتے رہے لیکن اس کا آخری کالم اس کے جانے کا انتظار کرتا رہا یہ کالم اس کے انتقال کے بعد 19 جنوری 2007ء کو دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوا۔ آرٹ بک والدہ کے کالموں میں ہمیشہ طنز کی کاٹ اور مزاح کے رنگ رہے ہیں، اس نے اپنی 82 سالہ زندگی اور 60 سالہ صحافت میں کبھی سنجیدہ کالم نہیں لکھا، اس نے اپنی یہ روایت آخری کالم میں بھی سمجھائی۔ آرٹ بک والدہ کے آخری کالم کے تجزیے سے پہلے میری خواہش ہے آپ ایک نظر اس کالم پر ضرور ڈال لیں، میں اس کے بعد آرٹ بک والدہ کے فن پر گفتگو کروں گا، آرٹ بک والدہ لکھتا ہے۔ "میرے دوستوں نے مجھے یہ آخری کالم لکھنے کا حکم دیا، ان کا کہنا تھا مجھے اس کالم کے بغیر دنیا سے رخصت نہیں ہونا چاہئے لہذا میں آج ان کا یہ حکم بجالاتا ہوں، دوستو انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ اپنی زندگی کا حساب کرتا ہے، جب وہ زندگی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا تجزیہ کرتا ہے، میں بھی جب اس لئے اپنی زندگی کا حساب کر رہا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے، شمس میری زندگی کا اہم پہلو تھا، مجھے اس وقت اپنی زندگی کے تمام ہیچ اور وہ تمام کھلاڑی یاد آ رہے ہیں جنہیں میں نے اپنی خاص "لاب"

کے ذریعے شکست دی تھی، مجھے اپنی "لاب" پر یقین تھا لہذا میں سمجھتا تھا میں نہ صرف دنیا کے تمام کھلاڑیوں سے اچھی نہیں کھیل سکتا ہوں بلکہ میں ٹینس کا ایک عظیم کھلاڑی بھی ہوں، میرا دوست کے۔ گراہم میرے اس خیال سے متفق نہیں تھا، وہ ہمیشہ میرے ساتھ کھیلا، میں نے اسے ہمیشہ شکست دی لیکن اس نے کبھی مجھے عظیم کھلاڑی تسلیم نہیں کیا۔ میں آج یہ سمجھتا ہوں گراہم ٹھیک تھا اور میں غلط، میں گراہم سے معافی مانگ چکا ہوں اور وہ مجھے معاف بھی کر چکا ہے۔

میں اس کا لمبے میں وہ تمام باتیں لکھنا چاہتا ہوں جو میں زندگی بھر نہیں لکھ سکا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے میں اب بھی ایسا نہیں کر پاؤں گا، تاہم میرے لئے آپ تمام لوگوں کا ساتھ دنیا کی عظیم ترین مسرت تھا، میرے لئے یہ کافی تھا میں آپ کو جانتا ہوں اور آپ نے مجھے عمر بھر اپنی زندگی کا حصہ بنائے رکھا، میں آج اعتراف کرتا ہوں آپ میں سے ہر شخص نے میری زندگی پر اثر چھوڑا میرے ہر قاری نے میری زندگی میں ایک خاص کردار ادا کیا۔ میں اب اپنے آپ کو سمیٹ رہا ہوں، میں رخصتی کیلئے سامان باندھ رہا ہوں، مجھے اطمینان ہے میں نے جس طرح اپنی شرائط پر زندگی بسر کی تھی میں اسی طرح موت بھی اپنی مرضی کی منتجب کر رہا ہوں، پچھلے سال جب میرے دونوں کمرے غلے ہوئے تھے تو میرے تمام دوستوں اور عزیزوں کا خیال تھا مجھے اس بیماری کا بہادری سے مقابلہ کرنا چاہئے مجھے بار بار ڈایا لیسس کی اذیت سے گزرنا چاہئے لیکن میں نے ہسپتال کی بجائے ہوٹس کا انتخاب کیا، میں نے اپنے لیے بیمار زندگی کی بجائے صحت مند موت پسند کی، میرے تمام دوستوں کو میرے اس فیصلے سے اختلاف تھا لیکن میں سمجھتا ہوں انسان کو دنیا سے رخصتی کی آزادی ہونی چاہئے، انسان کو اپنے لئے بہتر موت کے انتخاب کی اجازت ہونی چاہئے، میں نے اپنے لئے آرام دہ موت کا انتخاب کیا، میں نے آخری دن ہوٹس میں گزارنے کا اعلان کیا، میرے خاندان اور میرے ڈاکٹر دوست مائیک نیومین نے میری حمایت کی، مجھے معلوم ہے ڈاکٹر مائیک نیومین اور میرے خاندان کیلئے میرے اس فیصلے کی حمایت کتنی مشکل تھی لیکن یہ لوگ مجھ سے پیار کرتے تھے لہذا انہوں نے میری آخری خواہش کا احترام کیا، میں آج ہوٹس میں بیٹھ کر یہ سطر لکھ رہا ہوں، میں اعتراف کرتا ہوں ہوٹس میں آنا میرا ذاتی فیصلہ تھا کیونکہ مجھے ہوٹس کی موت سب سے بے ضرر اور آرام دہ محسوس ہوتی ہے لہذا میں ہوٹس میں رہ کر زندگی سے رخصت ہونا چاہتا ہوں، چھ ماہ محسوس کروں گا۔

زندگی کی ان آخری ساعتوں میں میرا دماغ نہ جانے کیوں کھانے پینے کی چیزوں کی

طرف مائل ہے۔ مجھے رو رہ کر چاکلیٹ کی دو ساری ٹافیاں یاد آ رہی ہیں جو میں زندگی میں نہیں کھا سکا، میں پچھلے چند ماہ سے جب بھی "چیزیک فیکٹری" کے پاس سے گزرتا ہوں تو میں بے اختیار پرائف رول اور بنا سائپٹ خرید لیتا ہوں، میرے لئے اب ان نعمتوں سے محروم رہنا ممکن نہیں، میں جانتا ہوں زندگی کی آخری ساعتوں میں کھانے پینے کے بارے میں سوچنا اور بنانا سائپٹ، پرائف رول اور چاکلیٹ ٹافیاں کھانا نہایت احمقانہ فعل ہے، یہ چیزیں طبعی نکتہ نظر سے درست نہیں ہیں لیکن میں آخری وقت خود کو سزا دینا چاہتا ہوں، میں اپنے جسم کو بتانا چاہتا ہوں میں نے زندگی کے اچھے لمحوں میں خود کو ایسی شاندار اور مزیدار چیزوں سے محروم کر کے اپنے ساتھ زیادتی کی تھی۔ میں اپنے آپ کو بتانا چاہتا ہوں زندگی کے سفر میں مزیدار چیزوں سے محروم رہنا اپنے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔

دوستو! زندگی کی ان آخری ساعتوں میں مجھے ایک گیت کا مصرعہ بار بار یاد آ رہا ہے "What's it all About, alfie" "ہٹلی" یہ سب کیا ہے "میں نہیں جانتا میں نے زندگی میں جو کچھ کیا اس کی کیا اہمیت ہے، دنیا کے تخلیقی مواد میں میرے کالموں کی کیا حیثیت ہوگی لیکن اس کے باوجود مجھے کبھی کبھی گمان ہوتا ہے میں نے زندگی میں جو تخلیق کیا وہ کم از کم تین سال تک ضرور محفوظ رہے گا، کوئی مجھے کم از کم تین سال ضرور یاد رکھے گا، آپ نے زندگی میں یہ نغزہ بار بار سنا ہوگا "اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی بڑے مقصد کیلئے زمین پر بھیجا تھا" میں یہ سمجھتا ہوں ہمارا یہ خیال ہماری انا کی تسکین کا بہانہ ہے۔ ہم اور ہمارا کام سب کچھ فضول ہے لیکن اس کے باوجود مجھے نہ جانے کیوں یہ محسوس ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی خاص کام کیلئے دنیا میں بھیجا تھا، مجھے معلوم ہے میرا یہ آخری کالم بھی خوراک کے کسی ڈبے پر پیٹ دیا جائے گا یا لوگ اسے "THANKS GIVING DAY" کے موقع پر ایک دوسرے کو سنائیں گے اور اس کے بعد مجھے اور میرے کالم دونوں کو فراموش کر دیں گے لیکن اس کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں میں کسی خاص کام کیلئے دنیا میں آیا تھا۔

میں آج جب آپ سے رخصت ہو رہا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے میں آپ سے "What's it all about alfie" کہوں اور آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رخصت ہو جاؤں۔"

یہ بظاہر ایک سٹی اور عامیانه سا کالم لگتا ہے، آپ کو اس میں سوائے آرٹ بک والڈ کے آخری کالم کے کوئی خوبی نظر نہیں آئے گی لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ کالموں کی تاریخ کی انتہائی

شاعر اور نا قابل فراموش تحریر ہے۔ یہ بیاز کے تھلکے کی طرح تہہ در تہہ کھلنے والا کالم ہے آپ اس کالم کا پس منظر ملاحظہ کیجئے یہ کالم ایک ایسے کالم نگار نے تحریر کیا ہے جو نہ صرف موت کے دروازے پر بیٹھا تھا بلکہ وہ کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں سے موت کی چاب سن رہا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اس کالم میں اپنی روایت اور اپنے آرٹ کو مجروح نہیں ہونے دیا آرٹ بک والڈ نے پوری زندگی طنز یہ کالم لکھا تھا اس کالم میں بھی طنز کے تمام رنگ موجود ہیں آرٹ بک والڈ نے ہمیشہ مختصر کالم لکھا تھا یہ کالم بھی اس کے دیگر کالموں کی طرح مختصر ہے وہ زندگی بھر ماہوی سے دو رہا اس کا یہ کالم بھی ماہوی سے پاک ہے اور اس کے تمام کالم اچانک ختم ہو جاتے تھے اس کا یہ کالم بھی کسی منطقی نتیجے پر پہنچے بغیر اچانک ختم ہو گیا لہذا آرٹ بک والڈ کی یہ آخری تحریر دنیا کے دوسرے لکھاریوں کی آخری تحریروں سے یکسر مختلف ہے دنیا کے تمام مزاح نگار آخری تحریروں میں سنجیدہ ہو گئے تھے اور دنیا کے تمام مختصر نویس آخری وقت میں طوالت کا شکار ہو گئے تھے لیکن آرٹ بک والڈ شاید دنیا کا واحد لکھاری تھا جس کی پہلی اور آخری تحریر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جس کے قلم نے آخری وقت تک طوالت اور سنجیدگی کو قرب نہیں چھیننے دیا اور جس نے اپنے آخری کالم کو دمیت نہیں بننے دیا۔

Kashif Azad@Onaltrou.com



شہباز شریف کی کہانی

میں دو مارچ 2007ء کو لندن پہنچا تھا اور تین مارچ کو میری میاں شہباز شریف سے

پہلی ملاقات ہوئی تھی، میں 1999ء تک نواز شریف خاندان کا مخالف رہا تھا، امن مخالفت کی

وجوہات میں بعض صحافیوں سے لے کر لاہور کے وہ بٹ اور خواجے بھی شامل تھے جنہوں نے نواز

شریف کو گھیر رکھا تھا اور جن کے بارے میں میرا خیال تھا یہ انسانی شکل میں فصلی بیڑے ہیں، جس

دن فصل کٹے گی یہ اسی دن دوسرے کھیت میں جا بیٹھیں گے، 12 اکتوبر کے بعد یہی ہوا، نواز

شریف کے سارے بیڑے اڑ گئے اور انہوں نے دوسرے کھیت اجازت شروع کر دیئے، نواز

شریف کے پروردہ صحافی ان کے خلاف لکھنے لگے، نواز شریف کے قریبی ساتھی ان کی پارٹی کو نگل

گئے اور نواز شریف کے ذاتی دوست اسٹیبلشمنٹ کے بھڑ بن گئے اور ان کے پاس صرف چودھری

نثار، مسدرفیق، جاوید ہاشمی، تمیز، دولتانہ اور احسن اقبال رہ گئے جبکہ صحافیوں میں صرف عطاء الحق

قاسمی نے کیریکٹر کا مظاہرہ کیا، وہ آج تک نواز شریف کے لئے اکیلے لڑ رہے ہیں۔ 2000ء کے

بعد میں نے نواز شریف خاندان کا مطالعہ شروع کیا تو 2006ء تک میرے دل میں ان کے لئے

نرم گوشہ پیدا ہو گیا، اس کی دو بڑی وجوہات تھیں ایک یہ نواز شریف تھے، مجھے اس عرصے میں نواز

شریف بے گناہ دکھائی دینے لگے تھے، مجھے محسوس ہوا نواز شریف سے صرف ایک نطفی ہوئی تھی،

انہیں جلا وطنی قبول نہیں کرنی چاہیے تھی، انہیں وقار کے ساتھ جیل کا نانا چاہیے تھی، دوسری وجہ میاں

شہباز شریف تھے '1999ء کے بعد میں پنجاب کے جس بیورو کریٹ سے ملا 'میری جس سیاستدان بزنس مین اور دانشور سے ملاقات ہوئی اس نے میاں شہباز شریف کے اخلاص انتظامی صلاحیتوں اور ایمانداری کی تعریف کی 'میاں شہباز شریف نے اذحائی برسوں میں پنجاب میں حکمرانی کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا تھا جس نے آنے والے دنوں میں تاریخی حیثیت اختیار کر لی ' آج یہ عالم ہے جنرل خالد مقبول ہوں یا چودھری پرویز الہی پنجاب کے تمام حکمران نفسیاتی طور پر میاں شہباز شریف کا مقابلہ کرتے دکھائی دیتے ہیں 'یہاں مجھے جنرل رینارڈ محمد صفدر حسین کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے 'جنرل محمد صفدر 1999ء کے بعد پنجاب کے گورنر بنے تھے 'انہوں نے ایک بار مشہور بیورو کریٹ ناصر کھوسر سے کہا تھا "میں پنجاب کے جس اچھے منصوبے کو ہاتھ لگاتا ہوں معلوم ہوتا ہے وہ شہباز شریف نے شروع کیا تھا 'یہ شہباز شریف انسان تھا یا جن 'میں پچھلے سات برس سے شہباز شریف کے ساتھ کام کرنے والے بیورو کریٹس سے ملتا آ رہا ہوں 'ان میں ڈاکٹر توقیر شاہ 'ڈاکٹر امجد ثاقب اور شہباز شریف کے سیکرٹری جاوید محمود بھی شامل ہیں 'میں اس دوران میاں صاحب کے ساتھ تھوڑے عرصے کیلئے کام کرنے والے افراد سے بھی ملا اور ان سے شہباز شریف کے بارے میں پوچھا 'ان برسوں میں ایک شخص کے سوا کسی نے شہباز شریف کے خلاف بات نہیں کی 'شہباز شریف کے بڑے سے بڑے مخالف نے بھی ان کی انتظامی صلاحیتوں کی تعریف کی 'یہاں تک کہ فوجی اسٹیبلشمنٹ میں بھی شہباز شریف کے لئے نرم گوشہ موجود ہے۔ یہ وہ ساری باتیں اور پس منظر تھا جس کی وجہ سے میں نے لندن پہنچتے ہی میاں شہباز شریف کو فون کیا اور دوسرے دن ہماری ملاقات طے ہو گئی۔

ہم پارک لین کے ایک ریسٹوران میں بیٹھ گئے 'میاں شہباز شریف صحت مند اور فریش لگ رہے تھے 'شہباز شریف نے اپنے خاندانی پس منظر سے بات شروع کی 'ان کا کہنا تھا "ہمارے دادا صرف پانچ انچز مین کے مالک تھے 'میرے والد نے 1930ء میں اپنے خاندان کی عمان سنبھالی تھی 'ہم نے پوری دنیا میں کسی شخص کو اپنے والد سے زیادہ محنتی مخلص اچھا یا نیشنل اور سادہ نہیں دیکھا 'انہوں نے 1930ء میں لوہا پھلانے کی پہلی بمبئی لگا لی اور اس کے بعد وہ زندگی بھر کام کرتے رہے 'ہم نے انہیں کبھی آرام کرتے ہوئے یا فارغ بیٹھے نہیں دیکھا 'جدہ کی سٹیل مل ان کا آخری پراجیکٹ تھا 'وہ اس وقت شدید عملی تھے لیکن وہ اس کے باوجود مل چیئر پرسن سٹیٹ پر جاتے تھے اور اپنی عمرانی میں سٹیل مل کا کام کر داتے تھے 'وہ ذاتی زندگی میں انتہائی سادہ تھے 'ان

کے پاس صرف دو سو تھے لیکن وہ انہیں ہمیشہ صاف ستھرا رکھتے تھے انہوں نے پوری زندگی جھوٹی گاڑی استعمال کی اور وہ وقت کے انتہائی پابند تھے ہم تین بھائیوں نے اپنے بزرگوں کے برعکس خوشحالی میں آنکھ کھولی تھی ہم لوگ تانگے پر سکول جاتے تھے ہم پورے سکول میں واحد بچے تھے جن کے پاس ذاتی تانگہ ہوتا تھا۔ میں جوانی میں شہزادوں کی طرح زندگی گزارتا تھا۔ میں نے باہر سے انتہائی مہنگی اور خوبصورت گاڑی منگوائی تھی پورے ملک میں اس جیسی دوسری گاڑی نہیں تھی میں ٹیکسری جاتا تھا اور ٹیکسری میں اس طرح کام کرتا تھا جس طرح بزنس مین اور مل اوٹریا کرتے ہیں لیکن پھر ایک واقعہ پیش آیا اور میری زندگی کا رخ بدل گیا۔ وہ رے کے اور انہوں نے قبوے کی پیالی منہ سے لگائی وہ ڈراویر بعد بولے "میں نے 1985ء میں نواز شریف کی الیکشن مہم شروع کی" میں لاہور کی تنگ و تاریک گلیوں میں جاتا تھا اور لوگوں کو نواز شریف کی تصویر دکھا کر ووٹ مانتا تھا نواز شریف یہ الیکشن جیت گئے اور اس کے بعد وزارت میں مصروف ہو گئے اس دوران حلقے کے لوگوں نے میرے پاس آنا شروع کر دیا حلقے کے لوگوں کا کہنا تھا ہم نے آپ کے کہنے پر نواز شریف کو ووٹ دینے سے روک دیا تھا۔ پھر دو دن میں دو دو گھنٹے اور پھر دو دن میں دو دو گھنٹے اور اس کے بعد سارا دن اور پھر میں نے اپنے دو دن حلقے کے لوگوں کیلئے وقف کر دیے ہم بچھلی تین نسلوں سے رمضان میں ضرورت مندوں میں آنا بھی اور دالیں تقسیم کرتے آ رہے ہیں اس سال میں نے حلقے کے لوگوں کو نارگت کیا اور میں اور خواجہ ریاض حق داروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ایک شام ہم نسبت روڈ کی ایک گلی میں داخل ہوئے اور ایک گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے یہ ایک کمرے کا انتہائی خستہ حال مکان تھا، اندر ایک بوڑھی مائی دال صاف کر رہی تھی، چار پائی پر ایک نوجوان لڑکی لیٹی تھی، لڑکی کوئی بی تھی اور فرش پر اس لڑکی کا تھوکا ہوا خون پڑا تھا دوسری بچی اس کمرے کے ایک کونے میں اپنے ہی بول و براز میں لتھڑی پڑی تھی، کمرے کے اندر اندر حیر اور بو تھی، مجھے مائی نے بتایا وہ لوگ اس کمرے میں رہتے ہیں، کھانا بھی اسی میں پکاتے ہیں، نہاتے بھی اسی میں ہیں اور اسی کمرے کے ایک کونے کو دالیں روم کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں، ان لوگوں کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں باہر آیا اور مجھے اپنے کپڑوں، اپنے جوتوں اور اپنے آنف سائل سے نفرت ہونے لگی، میں اپنے آپ کو ان لوگوں کا مجرم سمجھنے لگا، میں نے اس دن اپنی گاڑی واہس کی، اپنے سارے سوت، سارے جوتے لوگوں میں تقسیم کیے اور اپنے آپ کو

لوگوں کیلئے وقف کر دیا وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے کبھی بڑی گاڑی استعمال نہیں کی۔ میں نے ہمیشہ چھوٹی گاڑی میں سفر کیا اور صرف ضرورت کے دو جوڑے کپڑے بنائے، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا میں جب تک ان جیسے لوگوں کو ایک پر وقار زندگی نہیں دوں گا میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میں اپنے ملک کو تبدیل کئے بغیر دنیا سے نہیں جاؤں گا میں اللہ تعالیٰ سے روز دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ مجھے ہمت اور موقع دے اور میں ان لوگوں کیلئے وہ سب کچھ کروں گا جس کیلئے یہ لوگ ترس رہے ہیں۔

میں نے پوچھا "آپ نے چیف منسٹر کی حیثیت سے پہلے دن کیا کیا" وہ مسکرائے "میں سب سے پہلے اپنے والد کے پاس گیا اور میرے والد نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی دلچسپ نصیحت کی، انہوں نے فرمایا "اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو تو تم پنجاب کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم اتفاق کروپ کے ساتھ کرتے تھے" میں نے پوچھا "وہ کیسے؟" وہ بولے "یاد کرو تم اتفاق فاؤنڈری کیلئے راتوں کو جاگتے تھے تم نے اس کہنی کیلئے پوری دنیا سے بہترین مشینری خریدی تم نے اس کیلئے دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی حاصل کی تھی، تم نے ٹیکسٹری کے لیے بہترین ورکرز کا بندو بست کیا تھا، تم نے اپنی زندگی کا سب سے اہم اور بہترین وقت ٹیکسٹری کو دیا تھا اور تم سال کے آخر میں یہ دیکھا کرتے تھے تم نے اس سال کیا کھویا اور کیا پایا لہذا آج اتفاق کا شمار پاکستان کے بڑے گروپوں میں ہوتا ہے میری نصیحت ہے اگر تم اس محنت، لگن اور اخلاص کے ساتھ پنجاب کیلئے کام کرو گے تو تم یہاں بھی وہی نتائج حاصل کرو گے، تم پاکستان کی تاریخ کے سب سے اچھے چیف منسٹر ثابت ہو گے"



شہباز شریف سے دوسری ملاقات

میاں شہباز شریف کے ساتھ میری دوسری ملاقات سات مارچ کو انجیو پروڈ کے ایک ایٹائی ریستوران میں ہوئی۔ میاں صاحب نے مجھے دعوت دی تھی، اس دعوت کے دوران وہ ساڑھے تین گھنٹے بولتے رہے تھے اور میں بڑے غور سے ان کی بات سنتا رہتا تھا، مجھے ان کے لہجے میں سچائی اور خلوص دکھائی دے رہا تھا، ان کا کہنا تھا "ہمارا چار نظامی ایجنڈا تھا 'اخلاص' میرٹ' بھرپور مائنٹرنگ اور عام شہری کو فائدہ پہنچانا، ہم نے پورے پاکستان سے جن جن کرایماندار اڈا جن اور تخلص افسروں کو اہم عہدوں پر تعینات کیا، ان افسروں کی مائنٹرنگ کیلئے ایک فول پروف سسٹم بنایا اور پھر ایسی پالیسیاں بنانا شروع کیں جن سے عام شہریوں کو فائدہ ہو سکتا تھا، میرا ایمان ہے سمجھوتے اور کرپشن کا آغاز ہمیشہ بالائی سطح سے ہوتا ہے اگر چیف منسٹر کرپٹ ہوگا تو وہ صوبے سے کبھی کرپشن ختم نہیں کر سکے گا، میں نے سب سے پہلے خود کو تخلص وقت کا پابند میرٹ پر کاربند اور غیر جانبدار ثابت کیا، آپ یقین کیجئے سارا سرکاری نظام ٹھیک ہو گیا، میرے ازحالی برسوں میں میرے بچے چیف منسٹر ہاؤس نہیں آئے، ایک بار حزرہ کو ایمر جنسی میں وہاں آنا پڑا تھا لیکن میں نے اسے اسی وقت باہر نکال دیا اس کے بعد اس نے کبھی وہاں قدم نہیں رکھا، میری گاڑی ہمیشہ سگنل پر رکھی تھی، میں نے کبھی دو سے زائد گاڑیاں استعمال نہیں کیں، میرے خاندان کے کسی فرد نے ان ازحالی برسوں میں کوئی سرکاری گاڑی نہیں لی، ہمارے دور میں پورے پنجاب میں کوئی نئی گاڑی

نہیں خریدی مگر نائیرنگ کا یہ عالم تھا میرے بیٹے سلیمان نے میٹرز کا امتحان دینا تھا ہم نے ان دنوں بوٹی مافیا کے خلاف آپریشن شروع کر رکھا تھا میں نے لاہور کے ڈپٹی کمشنر کو ہدایت کی وہ تاشی کا سلسلہ میرے بیٹے سے شروع کرے 'سلیمان کی تھلائی ہوئی جس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ ناراض ہو گیا لیکن میں نے پرواہ نہ کی 'میٹرز میں سلیمان کی سیکنڈ ڈویژن آئی تھی 'میں نے اسے ڈانٹا تو اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا ابو میں نقل کے بغیر پاس ہوا ہوں 'ہم میرٹ میں اسے سخت تھے کہ وزیر اعظم نواز شریف کی سپریم کورٹ کی سٹوڈنٹ تھی میرے اوپر اس کی مائیکریٹن کیلئے دباؤ آیا لیکن میں نے انکار کر دیا میرے پورے دور میں اس کی مائیکریٹن نہیں ہوئی 'ہم نے لاہور اور راولپنڈی کی پبلک ٹرانسپورٹ کیلئے ٹینڈر مانگے 'دونوں شہروں کے ٹینڈر ہمارے سیاسی مخالفین نے جیتے 'لاہور کا ٹیکسٹائل خانہ کوٹلا اور راولپنڈی کیلئے جنرل حیدر گل کی بیٹی عظمیٰ گل نے کو ایفائی کیا 'ہماری پارٹی نے اعتراض کیا لیکن میں نے میرٹ کے اصول کو مجروح نہ ہونے دیا 'ہم نے لاہور شہر سے تجاویزات ختم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو سب سے پہلے اپنی پارٹی اور اپنے

خانہ خانہ کی تجاویزات صاف کیں 'جیل روڈ پر میرے ایک قریبی رشتہ دار کا چہرول چپ تھا 'میں نے اپنی مگرابی میں یہ چپ کرایا تھا اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار سفارش کے بغیر نوجوانوں کو پولیس میں نوکری ملی تھی 'مجھے معلوم ہوا عبدالستار لالیکا مرحوم نے اپنے عزیز کے ذریعے ایک امیدوار کو قہ کی حد میں رعایت دلائی تھی 'میں نے نہ صرف بھرتی ہونے والے نوجوان کو فارغ کر دیا بلکہ لالیکا صاحب کے اس عزیز کو بھی صوبہ بدر کر دیا 'عبدالستار لالیکا اس وجہ سے آخری وقت تک میرے ساتھ ناراض رہے جب بیورو کرہی نے دیکھا میرے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہیں تو اس نے بھی اپنا قبلہ درست کر لیا چنانچہ ہم نے اڑھائی سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو کسی دور میں نہیں ہو سکا 'میری کامیابی کی دوسری وجہ فالو اپ تھا 'میں رات کو اٹھ کر کسی سامیٹ پر چلا جاتا تھا اور کام کی کوائٹی اور رفتار کا خود جائزہ لیتا تھا 'شروع شروع میں افسروں نے اسے میرا دتی ابال سمجھا لیکن جب یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ جاری رہا تو وہ بھی سنجیدہ ہو گئے 'میں فجر کی نماز کے بعد کام شروع کرتا تھا اور رات دو بجے تک دفتر میں رہتا تھا 'میں سمجھتا تھا میرے پاس وقت بہت کم ہے اور میں نے اس وقت میں وہ سب کچھ کرنا ہے جو پہلے نہیں ہو سکا "

میں نے پوچھا "آپ نے پنجاب کا سیاسی کلچر بدلنے کی کوشش بھی کی" وہ ڈر اور ریر کے اور آہستہ آہستہ بولے "ہم نے سیاست سے چالوسی اور خوشامد ختم کرنے کی کوشش کی تھی 'ہم

رمضان کے دوران آنا سنا کر دیتے تھے ایک رمضان میں ہم نے آٹا سات روپے سے پانچ روپے گھو کر دیا میں دورے پر تھا میں واپس آیا تو میں نے اپنے دفتر کے راستے میں کمال علی آغا اور لاہور کے منتر حسان کی طرف سے ایک خیر مقدمی بیئر دیکھا اس بیئر پر لکھا تھا ہم آنا سنا کرنے پر وزیر اعلیٰ پنجاب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں میں نے گاڑی رکوائی بیچے اترا اور اپنی عمرانی میں یہ بیئر اترا دیا اور لاہور کے ڈپٹی کمشنر کو حکم دیا اگر آئندہ شہر میں اس قسم کا کوئی بیئر لگا تو تم لوگوں کی خیر نہیں میں جب تک چیف منسٹر ہالاہور میں کسی کو دوبارہ ایسا بیئر لگانے کی جرأت نہ ہوئی میں نے اڑھائی سال میں کسی ایم این اے یا ایم پی اے کا کوئی لفظ کام کیا اور نہ ہی ہونے دیا میں پارٹی کے کسی لیڈر کو چند منٹوں سے زیادہ اپنے پاس نہیں بیٹھنے دیتا تھا ہم نے بیٹھک اور کپ شپ کا کلچر ختم کر دیا تھا ہم صرف اور صرف کام پر توجہ دیتے تھے ہم نے سرکاری خزانے کا غیر سرکاری استعمال بھی بند کر دیا میں نے اڑھائی برسوں میں اپنے تمام اخراجات اپنی جیب سے کئے تھے میں نے اڑھائی سال میں چیف منسٹر ہاؤس کا قالین تک نہیں بدلنے دیا تھا وہ خاموش ہو گئے میں نے عرض کیا "فوج کو جو تھی باؤسیاست میں مجھ سے کی گئی تھی" وہ ڈوہا دلہ کے اور ہاں میں سر ہلا کر بولے "یہ درست ہے ہم نے گھوٹ سکولوں کے لئے فوج کو استعمال کیا تھا اور اس کے بعد فوج کے لئے راستہ کھل گیا تھا میں نے گھوٹ سکولوں کا ٹاسک شروع میں پنجاب کے وزیر تعلیم چودھری اقبال کو دیا تھا چودھری صاحب ہمارے پرانے ساتھی اور بھلے انسان تھے وہ ہمیں چھوڑ گئے لیکن میں آج بھی ان کا احترام کرتا ہوں چودھری صاحب نے دو ماہ تک کوشش کی لیکن ناکام ہو گئے اس کے بعد میں نے جنرل جہانگیر کرامت سے مدد مانگی جنرل جہانگیر کرامت انتہائی شاعر اور سلیجے ہوئے انسان تھے انہوں نے میرے اصرار پر یہ ذمہ داری اٹھائی میں اس کے زمانے میں فوج کے سول استعمال کا حامی ہوں امریکا کا سارا روڈ نیٹ ورک فوج نے بنایا تھا چنانچہ اس تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے گھوٹ سکولوں کے بعد سڑکوں کی تعمیر اور واڈا کا کام بھی فوج کو دے دیا لیکن یہ ہماری غلطی تھی اور اس کا ہم نے بعد ازاں نقصان اٹھایا میں نے پوچھا "آپ پنجاب کو فوجی شناخت دینا چاہتے تھے" وہ مسکرائے "ہاں میں پنجاب کو پسماندگی جہالت اور بیماری سے آزاد کرنا چاہتا تھا" 12 اکتوبر 1999ء کو جب ہماری حکومت ختم ہوئی تو اس وقت کراچی پورٹ پر ہماری بسوں کی پہلی کھپ اتری تھی یہ بیس ہم نے لاہور میں چلائی تھیں اور ہمارا منصوبہ تھا پہلی بس میں چیف منسٹر کا بیڈ کے ارکان آئی جی اور چیف سیکرٹری سڑکیں اور اس

کے بعد روز کوئی نہ کوئی وزیر کسی بس کے ذریعے دفتر جائے گا اس سے لاہور کی ٹرانسپورٹ کا سارا نقشہ بدل جاتا۔ ٹرانسپورٹ کا یہ سسٹم ہم نے پنجاب کے تمام بڑے شہروں میں بھی شروع کرنا تھا۔ میں نے ایک ایسے پنجاب کا خواب دیکھا تھا جس میں امن و امان ہوتا، انصاف ہوتا، میرٹ ہوتا، تعلیم اور صحت ہوتی اور جس میں خوشحالی ہوتی، ہم نے اڑھائی برسوں میں ان سب چیزوں کی بنیاد رکھ دی تھی، اگر مجھے مزید اڑھائی سال مل جاتے تو آج پنجاب ایسا پنجاب نہ ہوتا۔

وہ رے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، انہوں نے نشو سے آنکھیں صاف کیں اور روندی ہوئی آواز میں بولے "میں جب تک ایک رئیس زادہ، ایک بزنس مین اور دنیا دار قسم کا صنعت کار تھا اس وقت تک سسٹم نے مجھے قبول کئے رکھا لیکن جس دن میں بدل گیا جس دن میں نے اپنی ساری صلاحیتیں عام شہری کے لئے وقف کر دیں اس دن اس سسٹم نے مجھے اٹھا کر سمندر پار پھینک دیا۔" وہ رے کے اور دوبارہ بولے "لیکن آپ لکھ لیں، میں واپس آؤں گا اور ملک کو ایک آئیڈیل شکل دینے کے سارے خواب پورے کروں گا اللہ نے چاہا تو میں اپنا رول ادا کئے بغیر دنیا سے نہیں جاؤں گا۔ میرا ایمنا بھی ہے اور ایمان بھی۔"

Kashif Azad@OneOrdu.com



ایک صد روہ بھی تھا

سردار محمد چودھری مرحوم پنجاب کے سابق آئی جی تھے 'پنجاب کے موجودہ آئی جی جی. چودھری احمد نسیم اور چودھری صاحب مرحوم میں دو لاکھ لاکھ شریک ہیں دونوں کا تعلق ایک ہی قبیلے سے ہے اور دونوں انتہائی سیلف میڈ 'انتہائی پروفیشنل اور نیک نام افسر ہیں' میرا دونوں کے ساتھ بڑا قریبی تعلق رہا 'چودھری سردار کے ساتھ میری سٹوڈنٹ ایف میں ملاقاتیں شروع ہوئیں اور یہ ملاقاتیں ان کے انتقال تک جاری رہیں جبکہ چودھری احمد نسیم کے ساتھ پہلی ملاقات 1996ء میں ہوئی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے 'سردار محمد چودھری نے ریٹائرمنٹ کے بعد تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا 'انہوں نے چند برسوں میں پانچ چھ انتہائی معیاری کتابیں لکھیں یہ کتابیں جہاں ادبی لحاظ سے شاندار ہیں وہاں یہ پاکستان کی تاریخ بھی ہیں 'میں پچھلے چند دنوں سے چودھری صاحب کی سوانح عمری پڑھ رہا ہوں 'یہ ایک چشم کشا کتاب ہے 'اس کتاب کے ہر صفحے پر کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ درج ہے جو پڑھنے والے کو اندر سے بلا دیتا ہے 'میں جب اس کتاب کے مشرقی پاکستان کے باب پر پہنچا تو چودھری صاحب کے انکشافات سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے افسروگی میں کتاب بند کر دی۔

چودھری صاحب 1971ء میں سیکرٹری برائے ایس پی تھے 'صدر یحییٰ خان اور ایوان صدر کی سیکورٹی ان کی ذمہ داری تھی 'وہ صدر کے مسلح محافظوں کے انچارج بھی تھے لہذا انہیں صدر

اور ایوان صدر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، انہوں نے اپنی آبِ ہتی کے صفحہ 127 پر لکھا "پولیس کے سپاہی ان دنوں ایوان صدر کو گنجر خانہ جی ایچ کیو کوڈ گنجر خانہ اور اپنی پولیس لائنوں کو کنٹرول خانہ کہتے تھے" چودھری صاحب کا فرمانا تھا "صدر پر لے دے جے کا شرابی اور عورتوں کا رسیا تھا" اس کا سکیورٹی انچارج کرنل ہم جنس پرست تھا، ایوان صدر میں دلال اور طولانی تھیں اور ان میں سے بعض کو انتہائی اہم مرتبہ حاصل تھا، ان میں اقلیم اختر رانی، مسز کے این حسین اور لیٹی مظفر سرفہرست تھیں، یہ خواتین سردار دن تمباکو نوشی، شراب نوشی اور پینے کوونے میں مصروف رہتی تھیں، پاکستان ٹونے کے بعد چودھری سردار کو اقلیم اختر عرف جنرل رانی کے خلاف تفتیش کا موقع ملا، انہوں نے 23 روز تک اس سے پوچھ گچھ کی، اس تفتیش کے دوران بڑے ہوش ربا انکشافات ہوئے مثلاً چودھری سردار نے اپنی آبِ ہتی کے صفحہ 128 پر تحریر کیا "مجھے جنرل رانی نے بتایا میجر جنرل خدا داد لاہور کے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے، جنرل رانی اور میجر جنرل خدا داد نے دولت جمع کرنے کا منصوبہ بنایا، ان دنوں رفیق سہگل، سہگل گروپ آف انڈسٹریز کے سربراہ تھے، ان دونوں نے اسے ایک سوڈے کی پیشکش کی، اگلے دن رانی نے رفیق سہگل سے ملاقات کی، اسے 10 لاکھ روپے اور ایک نئی نیوٹا کار پیش کی، سہگل کے روانہ ہوتے ہی جنرل خدا داد کمرے میں داخل ہوا، اس نے کار رانی کو روکے دی اور رقم خود لے کر چھپت ہو گیا، جنرل رانی نے چودھری سردار کو بتایا، رفیق سہگل بہت خوبصورت تھا اور وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا مگر سہگل نے اسے مثبت جواب نہ دیا، اس انکار کی اس بے چارے کو بڑی دلچسپ سزا بھگتنا پڑی، ایک دن گورنر ہاؤس پشاور میں پارٹی تھی وہاں جنرل رانی نے نجی خان سے شکایت کی "آغا جی رفیق سہگل میرے نال محبت نہیں کروا، نجی خان نے گورنر ہاؤس کے نگران کو طلب کیا اور اس سے پوچھا "جب ملکہ الزبتھ یہاں آئی تھی تو وہ کس کمرے میں سوئی تھی" نگران نے کمرے کی نشاندہی کر دی، جنرل نجی نے رفیق سہگل کو حکم دیا "آج رات تم مارشل لاء حکم کے تحت اسی کمرے میں سوؤ گے" رفیق اس حکم کی تعمیل سے انکار کی جرات نہ کر سکا، اس کے بعد نجی خان رانی سے مخاطب ہوئے "سوئی تم اس کے پیچھے جاؤ۔ خدا حافظ" رانی رفیق کے پیچھے روانہ ہو گئی، دونوں کے داخل ہوتے ہی کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا، (صفحہ 129) رانی نے پوچھ گچھ کے دوران ایک اور واقعہ بھی سنایا، اس نے بتایا شاہ ایران پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے، انہوں نے کراچی سے واپس روانہ ہونا تھا، جنرل نجی نے انہیں الوداع کہا تھا، شاہ کے جانے کا وقت ہو گیا لیکن جنرل نجی ابھی تک خواب

گاہ سے نہیں نکلے تھے، شاہ لیٹ ہونا شروع ہو گئے مگر کسی کو صدر کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی جرات نہیں تھی اس کڑے وقت میں جنرل رانی کام آئی، صدر کے ملٹری سیکرٹری جنرل اسحاق نے رانی سے درخواست کی تم اندر جاؤ اور صدر کو باہر لاؤ، وہ اندر گئی، اس روز ملک کی ایک مشہور ترین گلوکارہ صدر کی خواب گاہ میں تھی اندر کا منظر اس قدر کراہت انگیز تھا کہ رانی تک کی طبیعت خراب ہو گئی اس نے بڑی مشکل سے صدر کو باہر آنے کے قابل بنایا۔

چودھری صاحب کا کہنا تھا رانی نے جرنیلوں، سیاستدانوں اور سینئر افسروں کے ساتھ میل ملاپ کے نتیجے میں بے پناہ دولت اکٹھی کر لی تھی۔ جنرل یحییٰ خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد گجرات کے ایک مشہور سیاستدان نے اسے چھ ہزار روپے ماہوار الاؤنس دینا شروع کر دیا تھا۔ چودھری صاحب نے انکشاف کیا جب جنرل رانی کے بیانات کی روشنی میں جنرل یحییٰ سے جواب مانگا گیا تو انہوں نے جواب دیا "میں اس خاندان کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میرے والد آغا

سعادت علی کی بطور ایس پی گجرات میں پوشنگ ہوئی تھی یہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے، رانی میری

میں کی طرح ہے۔ چودھری صاحب نے انکشاف کیا جنرل یحییٰ ہر رات اپنی بیٹی کو محلوں میں سے کسی ایک کو ساتھ لے کر اداپنڈی اور اسلام آباد کی سڑکوں پر ڈرائیوگ کے لئے نکل جاتا تھا۔

ان سڑکوں پر سکیورٹی کے افراد پہلے سے متعین کر دیے جاتے تھے۔ بعض اوقات صدر اپنی کار میں جس کی چھت نہیں تھی سیدھا کھڑا ہو جاتا اور محافظ دستے کے سامنے اپنی داشتہ کے ساتھ چھینر

خانیاں کرنے لگتا۔ مسلح محافظوں کو ایک مسلم ریاست کے سربراہ کی ایسی حرکتوں پر زبردست غصہ آتا تھا، میں نے سکیورٹی کے اس مسئلہ کا ذکر اپنے پاس ڈی آئی جی قاضی محمد اعظم سے کیا تو وہ صدر کے خلاف باتیں کرنے پر ناراض ہو گئے۔ ان کا کہنا تھا "صدر کو سنگین قسم کے مسائل کا سامنا ہے

انہیں اس کے بعد آرام اور تفریح کی ضرورت ہوتی ہے۔" چودھری صاحب نے تحریر کیا "یحییٰ خان کے پاس پیش و عشرت کے لئے بہت سی داشتائیں اور کئی ٹھکانے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض تھا۔ ایک شام وہ سبز کے این حسین کے گھر گیا، یہ خاتون عرف عام میں

"بلیک بیوٹی" کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے شوہر مشرقی پاکستان پولیس اکیڈمی میں ہمارے پرنسپل رہ چکے تھے اور ان دنوں پشیل پولیس اسٹیشن شملٹ کے آئی جی تھے۔ صدر نے تین دن اور تین

راتیں وہاں گزاریں اور اس دوران کوئی بھی ان سے ملاقات نہ کر سکا۔ چوتھے روز وہ سبز حسین کو شیٹ گیٹ ہاؤس لے گیا جہاں اسے اندرونی آرائش کرنے والی کے طور پر مستقل ملازم رکھا لیا

زیر پوائنٹ 3.....0.....83

میا اور اس کے شوہر کو سوئزر لینڈ میں سفیر بنا دیا گیا۔ یحییٰ خان کے مستعفی ہونے پر سز حسین شیٹ
گیٹ ہاؤس سے اسلام آباد منتقل ہو گئی اور اپنے بہنوئی کمال حسین کے ساتھ رہنے لگی کمال حسین
وزارت خارجہ میں افسر تھا۔ یحییٰ خان کی معطلی کے بعد میں اس خاتون کو ایئر پورٹ چھوڑنے گیا۔
راستہ میں میں نے اس سے پوچھ لیا فلاں موقع پر یحییٰ خان مسلسل تین دن اور تین راتیں تمہارے
پاس کیوں ٹھہرا تھا؟ اس نے جواب دیا وہ صدر کو بنگالی میوزک سکھا رہی تھی۔

یہاں پہنچ کر میرا بیٹا لبریز ہو گیا میں نے کتاب بند کی اور سوچا کیا 1971ء اور
2006ء میں صرف سن کا فرق نہیں کیا ہم آج بھی یحییٰ خان کے دور سے نہیں گزر رہے ہیں
پاس اپنے اس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں تھا۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

عبرت ناک انجام

سر راجہ چودھری نے اپنی کتاب میں بھئی خان کے خلاف ہونے والے ٹرائل پر بھی روشنی ڈالی۔ چودھری صاحب کا کہنا تھا "جنرل بھئی خان دنیا کے دیگر آسروں کی طرح کبھی "پاپولیریٹی" کے خط میں مبتلا تھا، اس کا خیال تھا "عوام اسے بے انتہا پسند کرتے ہیں" وہ اقتدار سے فراغت کے بعد اس غلط فہمی کا شکار تھا، لوگ اس کی محبت میں سڑکوں پر آ جائیں گے اور موجودہ حکمران اسے ایک بار پھر تخت پر بٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے، اس کا خیال تھا اس کا دور پاکستان کی تاریخ کا سنبھرا ترین دور تھا اور تاریخ کبھی اس کے کارنامے نہیں بھلا پائے گی، چودھری صاحب نے بھئی خان کی اس غلط فہمی کے بارے میں بڑا عبرت ناک واقعہ بیان کیا۔

"بھئی خان کو کمیشن کے سامنے پیش کرنے کی فرض سے لانے اور لے جانے کے لئے مجھے دو کاریں اور ایک بیل کی کا پٹر دیا گیا تھا۔ ہم اسے صبح سویرے بنی بنگلہ (کھاریاں) سے بذریعہ بیل کی کا پٹر پنڈی لاتے تھے اور شام کو واپس لے جاتے تھے۔ آخری دن اس نے بیل کی کا پٹر میں سفر کرنے سے انکار کر دیا اور وہ بذریعہ سڑک جانے پر اصرار کرنے لگا۔ مجھے نہ تو ایسا کرنے کا اختیار تھا اور نہ ہی میں اس کے لئے تیار تھا کیونکہ ایسا کرنے میں سکیورٹی کا زبردست خطرہ تھا لیکن وہ سہالہ ریٹ ہاؤس کی سیزھیوں پر بیٹھ گیا اور اس نے بیل سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے بیل کی کا پٹر میں جبراً سوار کرانے سے گریز کیا اور اسے سمجھانے لگا کہ قابل اعتماد رٹسپورٹ سکیورٹی اور حفاظتی

دست و غیرہ فوری طور پر دستیاب نہیں ہیں لہذا ایلی کا پٹر پر ہی چلے جائیں مگر اس نے ایک نہ سخی اور ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ شور سن کر چیف جسٹس اور کمیشن کے دیگر ارکان باہر آ گئے۔ چیف جسٹس نے بجٹی خان کے ساتھ طویل بحث کے بعد مجھے حکم دیا اسے سڑک کے راستے کھاریاں لے جاؤ۔ میں عدالت کا حکم بجالانے پر مجبور تھا میں اسے کار میں لے کر نکل کھڑا ہوا بجٹی خان راستے میں کہنے لگا۔ "مجھے راولپنڈی لے چلو"۔ میں نے پوچھا "کیوں؟" اس نے جواب دیا "میں اپنے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں"۔ اس کا لہجہ قطعی تھا "یہ ناممکن ہے" میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ "کیوں؟" اس نے بڑے تند لہجے میں سوال کیا۔ بجٹی خان کا رد عمل ایسے شخص کا تھا جس نے زندگی میں کبھی حرف انکار نہ سنا ہو۔ "اس لئے کہ لوگوں نے آپ کو دیکھ لیا تو وہ آپ کی تکابوئی کر دیں گے"۔ "لوگ میرے خلاف کیوں ہوں گے؟" اس نے پوچھا "شرقی پاکستان میں شکست اور سقوط ڈھاکہ کے باعث وہ بہت براہم ہیں"۔ میں نے وضاحت سے بتایا۔ "اس انسوسٹاک واقعہ کے ذمہ دار سیاستدان تھے میں نہیں"۔ اب اس کے لہجہ میں احتجاج کا عنصر نمایاں تھا۔ "عوام ایسی باریکیوں کو نہیں سمجھتے وہ عام طور پر بے خبر ہوتے ہیں"۔ میں نے دوبارہ نرمی سے جواب دیا "کیا میں زفر خراسانی ہوں؟" وہ چار حانہ انداز میں بولا "نہیں آپ میری بھانجی تھیں لیکن ہیں" اس نے انکار میں سر ہلایا "مجھے تمہاری حفاظت کی ضرورت نہیں میں راولپنڈی جانا چاہتا ہوں"۔ وہ اپنی بات پر ڈٹ گیا۔ "سر میں آپ کو لوگوں کے غیظ و غضب سے بچانا چاہتا ہوں"۔ میں نے قدرے سختی سے کہا۔ "کیا میں اچھوت ہوں"۔ بجٹی خان نے بڑے طیش کے عالم میں کہا۔ اس کے بعد اس نے پنجابی میں وہی تباہی بکنا شروع کر دی اور بولا "کیا میں نے کسی کی گدھی کو چھیڑا ہے؟"

چودھری صاحب تحریر کو سنتے ہیں یہ خرافات سن کر مجھے بے حد غصہ آیا تاہم میں نے ضبط سے کام لیا اور خاموشی اختیار کر لی کیونکہ میرے ساتھ ایک ایسا شخص بیٹھا تھا جو پاکستان کا صدر اور پاک فوج کا کمانڈر انچیف رہ چکا تھا۔ وہ ملک کی تباہی کا سب سے بڑا ذمہ دار تھا لیکن اسے اس چیز کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ واضح فوجی شکست کے باوجود وہ سیاستدانوں کو موروثی الزام ٹھہرا رہا تھا۔ مجھے اس وقت اس کی حکومت کے وہ تمام منصوبے یاد آ گئے جن میں اس نے سیاستدان کو لیسرا راستہ فراہم کرنے کا پروگرام بنایا تھا تا کہ وہ نئے آئین کی تیاری کی جان جو حکم مشق میں الجھ کر خود کو ہلاک کر لیں بعد ازاں اس نے اس کام کو یکسر ناممکن بنانے کیلئے "ایک شخص"

ایک ووٹ“ کا حربہ بھی استعمال کیا تھا اور اس نے دن یونٹ کو بھی توڑ دیا تھا۔ مجھے یوسف چانڈیو کے ساتھ اس کی وہ گفتگو بھی یاد آگئی جس میں اس نے بھٹو کو مجیب کے خلاف صف آراء کرنے کا عندیہ دیا تھا۔ نجی خان مجھے سچ سچ شیطان لگنے لگا۔ میں انہی خیالات میں غلطیاں و بیجاں تھا جب ہمارے سامنے سے گزرنے والی ٹرین کے شور نے مجھے چونکا دیا اور پتہ چلا ہم سہالہ کے ریلوے پھانک پر رک گئے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اس ویران جگہ میں بھی نجی خان کو پہچان لیا، اس کے بعد میں نے دیکھا ہماری کار کو پتھر مارے جا رہے ہیں۔ نجی خان کی خوش قسمتی سے پھانک جلد ہی کھل گیا اور ہم نے بھگڑوں کی طرح رفتار تیز کر دی۔ نجی خان کا رنگ فق ہو گیا اور وہ بری طرح کانپنے لگا جیسے اس کا دم نکل رہا ہو۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں خاصی دیر تک اس کی اس حالت سے محظوظ ہوتا رہا۔ اس موقع پر میں نے اس سے کہا ”سر راولپنڈی چلیں۔“ اس نے انکار میں سر ہلا دیا ”نہیں، ہمیں بنی بنگلہ جانا چاہئے“ تم ایک سرکاری ملازم ہو اور میں تمہارے لئے مشکلات پیدا نہیں کرنا چاہتا“ وہ مجھ پر احسان جتانے کی کوشش کر رہا تھا اس چیز نے میرے دل میں اس کے خلاف مزید نفرت پیدا کر دی لہذا میں نے بدتمیزی سے جواب دیا ”میں نہ صرف تمہیں راولپنڈی کے جاؤں گا بلکہ اپنی گاڑی راجہ بازاں کے سچ سے گزاروں گا“ میری بات سن کر وہ اب تھر تھر کانپنے لگا اس نام نہاد ”غدر سپاہی“ کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ شخص جو پوری دنیا بلکہ بڑی طاقتوں کے خلاف بھی انتہائی غلیظ زبان استعمال کرتا تھا۔ وہ صرف چند پتھروں سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ وہ آخر میں میری منتیں کرنے لگا۔ ”مجھے بنی بنگلہ لے چلو۔“ ظاہر ہے میں اسے کسی صورت راولپنڈی نہیں لے جا سکتا تھا۔ بنی ریٹ ہاؤس پہنچنے پر اس نے خواہش ظاہر کی کہ اسے ایٹ آباد منتقل کر دیا جائے۔ ”کیوں؟“ میں نے اس سے پوچھا ”براہ کرم کسی سے کہیں میں اس جگہ کو بالکل پسند نہیں کرتا یہاں گیدڑوں کی بھرمار ہے جو رات کو بہت زیادہ شور مچاتے ہیں۔“ اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا ”میں نے جواب دیا ”سر آپ کو بہت اچھے ہاتھی میسر ہیں“ وہ میرے ریمارکس پر چہیں چہیں تو ہوا لیکن اس نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ جب میں راولپنڈی واپس پہنچا تو میں انتہائی غصے اور پریشانی کی حالت میں تھا میں اس کا کمرہ چہرہ دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا میں نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا ”میں اس کی حفاظت کیلئے آئندہ اپنے کسی ماتحت کو بھیج دیا کروں گا“ میں ایسا ہی کرتا رہا جب اس سے بھی شک آ گیا تو میں نے آخر کار اس کی خواہش تعمیل جنس بیورو کے ڈائریکٹر تک پہنچا دی“

میں نے چودھری سردار صاحب مرحوم کی کتاب میں یہ سارے واقعات پڑھے تو میرے دل میں ایک نمس سی اٹھی اور میں نے سوچا اگر آجروں کی زندگی سے عبرت ناک انجام نکال دیا جائے تو دنیا میں ان سے زیادہ آئیڈیل حالات کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھتا، بچی خان ایک شاندار حکمران تھا اگر اس کی زندگی میں 1971ء نہ آتا تو شاید وہ اب تک ملک پر حکمران ہوتا اور ملک دن و گنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہوتا اور ہمارے سیاستدان اسے اب تک دس بار یونیفارم میں صدر منتخب کرا چکے ہوتے، میں نے سوچا ہم کیسے شاندار لوگ ہیں، ہم تاریخ تک سے سبق نہیں سیکھتے، ہم دیوار پر لکھی تحریریں تک نہیں پڑھتے۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

انسان آخر انسان ہے

ڈاکٹر الابر عیراق کے مشہور فزیشن اور سرجن تھے وہ بغداد یونیورسٹی کے پلاسٹک سرجری اور ری کنسٹرکٹو سرجری کے شعبے کے سربراہ بھی رہے تھے۔ انہوں نے 20 برس تک صدام حسین اور ان کے خاندان کے ذاتی معالج کی حیثیت سے کام کیا۔ ان 20 برسوں میں انہیں صدام فیملی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ سقوط بغداد کے بعد انہوں نے صدام کے بارے میں ایک چشم کشا کتاب لکھی اس کتاب میں انہوں نے صدام حسین کی ذاتی زندگی کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی جو اس سے پہلے منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ مثلاً ڈاکٹر بشر نے انکشاف کیا صدام حسین اپنی موٹھوں کے بارے میں بہت حساس تھے وہ ان کا خصوصی خیال رکھتے تھے وہ اپنی موٹھیں رکھتے تھے لیکن ان کی پوری کوشش ہوتی تھی لوگ ان کی موٹھوں کے رنگ کو قدرتی سمجھیں ڈاکٹر نے انکشاف کیا صدام حسین ایک بار اپنے بیٹے اووے حسین سے ناراض ہو گئے۔ انہوں نے اووے کی ساری کاریں جمع کرانیں خود کرسی پر بیٹھے اور ان کاروں کو آگ لگانے کا حکم دے دیا خادمین نے کاروں کو آگ لگا دی اور یوں کروڑوں ڈالر کی کاریں جل کر راکھ ہو گئیں۔ جتنی دیر کاریں جلتی رہیں صدام حسین اطمینان سے بیکار پیتے رہے۔ ڈاکٹر نے انکشاف کیا صدام حسین کا بیٹا اووے حسین نفسیاتی مریض تھا وہ خواتین کو سنگریٹ سے داغتا تھا ان کے جسم کو چاقو سے چھید ڈالتا تھا اور اس کے بعد ان خواتین کا علاج ڈاکٹر کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ صدام حسین وہی اور

ضعیف الاعتقاد بھی تھے اگر انہیں راستے میں کالی بلی نظر آ جاتی تھی تو وہ اپنے کانوائے کا راستہ بدل دیتے تھے وہ پلاسٹک کے سیاہ شاہنگ بیٹوں سے بھی خائف تھے۔ اگر انہیں راستے میں سیاہ بلی نظر آ جاتے تھے تو بھی وہ راستہ بدل لیتے تھے۔ ڈاکٹر نے انکشاف کیا صدام حسین اور ان کا خاندان خوبصورت نظر آنے کے فطرت میں جٹا تھا۔ ڈاکٹر کو ایک بار صدام حسین کی دوسری بیگم سیرہ شاہ بندر کی "فیس لفٹنگ" کا حکم ملا یہ ایک خفیہ آپریشن تھا صدام حسین اور ان کی بیگم اس آپریشن کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی لہذا جتنے دن یہ کام ہوتا رہا ڈاکٹر اتنے دن منظر سے غائب رہا۔ صدام حسین کی ایک نو اسی اپنی ناک کو ستواں بنانے کے شوق میں جٹا تھی وہ روز میں پچیس لڑکیوں کے ساتھ کلیٹک آ جاتی اور ڈاکٹر سے پوچھتی ان میں سے کس کی ناک اچھی ہے۔ ڈاکٹر جس کی طرف اشارہ کر دیتا وہ کہتی میری ناک ایسی بنا دیں ڈاکٹر کا کہنا تھا وہ لڑکیوں کی قطار میں ایسے بیٹھتی تھی جیسے وہ مقابلہ حسن میں شرکت کیلئے آئی ہو۔ صدام حسین عوام میں اپنے بیٹے کے بارے میں بھی بہت حساس واقع ہوئے تھے۔ 1991ء میں وہ حادثے کا شکار ہو گئے ان کے چہرے پر چونٹیں آئیں جس کے بعد ڈاکٹر ان کے چہرے پر چونٹیاں لگانے لگا تو صدام حسین نے منع کر دیا ان کا خیال تھا وہ اس حالت میں کمزور اور لاغر نظر آئیں گے اور وہ اسے دن میں دویرن پر بھی نہیں سکیں گے اس حادثے میں ان کی چھوٹی انگلی پر چونٹ لگ گئی وہ کئی دنوں تک اس چونٹ کے بارے میں متکثر اور پریشان رہے اور ڈاکٹر نے انکشاف کیا صدام حسین نے پورے ملک میں اپنے پوسٹر اپنے پورٹریٹ اپنی ہیٹنگز اور اپنے جیسے لگوار کئے تھے عراق کی کرنسی تک پر صدام حسین کی تصویر تھی آپ جس سرکاری سکول 'کالج' انرپورٹ پر جاتے تھے جس سڑک 'جس شاہنگ سنٹر اور جس بازار میں آتے تھے آپ کو ہر طرف صدام حسین کی تصویر جیسے اور پورٹریٹس نظر آتے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا عراق کا کوئی شہری صدام کی نظروں سے اوجھل نہیں۔

میں نے جب صدام حسین کی نفسیاتی اور جذباتی زندگی کے بارے میں یہ ساری باتیں پڑھیں تو میرے ذہن میں صدام حسین کی ایک ایسی تصویر بنی جس میں وہ نازک مزاج سیلف سینئرڈ اور شاہانہ عادات کے مالک ایک آزاد منش انسان تھے۔ اس کے بعد میں نے صدام حسین کی شخصیت اور حالات زندگی کے بارے میں مختلف کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس دوران میں نے کوہن کوہن کی تحریریں پڑھیں 'کوہن کوہن صدام حسین کا سرکاری سوانح نگار تھا۔ وہ بڑا عرصہ صدام حسین کے قریب رہا تھا اس سال جون میں لندن کے ایک اخبار نے صدام حسین کی چند

برہنہ تصاویر شائع کی تھیں۔ یہ تصاویر صدام حسین کے "سیل" سے کھینچی گئی تھیں۔ ان تصاویر میں وہ اپنا "اغز روئیز" تلاش کرتے دکھائے گئے تھے، کوہن کوہلن نے اس واقعے سے متاثر ہو کر برطانیہ کے اخبار "ڈیلی میل" میں بڑا شاندار مضمون لکھا، اس مضمون میں اس نے لکھا، صدام حسین ایک ایسا شخص تھا جس کی خوش لباسی کے چہ پہے پوری دنیا میں ہوتے تھے۔ ان کے سوٹ لندن کے مشہور اور معروف ٹیلر سے تھے ایک وقت تھا جب دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی سوٹ صدام حسین کے پاس تھے ان کی وارڈ روپ میں 300 قیمتی سوٹ اور دوڑا حائی ہزار جوتے ہوتے تھے ان کے 48 محلات تھے جن کی دیواریں سنگ مرمر کی تھیں ہاتھ روہڑی ٹوٹیوں اور دروازوں کے ہینڈ لوں پر سونے کا پانی چڑھا تھا اور محلات کے اندر آبشاریں گرتی تھیں۔ ان کی سرکاری رہائش گاہوں کی تعداد بھی 70 سے 80 تھی اور وہ بھی اتنی ہی شاہانہ اور افسانوی تھیں صدام حسین کی تین بیویاں تھیں اور وہ اور ان کی اولادیں بھی اسی شاہانہ انداز سے زندگی گزارتی تھیں۔ کوہن کوہلن کی تحریروں سے صدام حسین کے بارے میں میرا تاثر مزید گہرا ہو گیا۔

صدام حسین کی زندگی کا ایک فتر تھا، اس فتر کو گزرے اب اڑھائی برس ہو چکے ہیں۔ صدام حسین پچھلے دو برسوں سے اپنے عمل کے لان میں پندرہ گھنٹے کے سیل میں بند ہیں، وہ اس سیل کو خود صاف کرتے ہیں ہاتھ روم تک خود دھوتے ہیں انہیں کپڑوں کے دو جوڑے پلاسٹک کے پلیپر اور ایک عربی چوغڑا فراہم کیا گیا ہے اور کمرے کے مرکزی دروازے کے تالے کا سوراخ ان کا بیرونی دنیا سے واحد رابطہ ہے، وہ جب کمرے کی زندگی سے اکتا جاتے ہیں تو وہ تالے کا سوراخ پر جھک کر بہرہ دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ صدام حسین کی زندگی کا دوسرا فتر ہے جو انتہائی افسوسناک اور قابل رحم ہے لیکن آپ افسوس کے اوپر ایک اور افسوس ملاحظہ کیجئے میں نے 14 دسمبر 2005ء کے اخبارات میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھی یہ خبر پاکستان کی سرکاری نیوز ایجنسی نے جاری کی تھی اس خبر میں انکشاف ہوا، صدام حسین کو دو برسوں میں جوتوں کا صرف ایک جوڑا فراہم کیا گیا اور صدام حسین نے پچھلی پیشی کے دوران عدالت سے مطالبہ کیا انہیں اور ان کے ساتھیوں کو سنبھلنے کے لئے فراہم کئے جائیں۔ عدالت نے سرکاری وکیل کا موقف پوچھا، سرکاری وکیل نے عدالت کو یقین دلایا صدام حسین کو چند دنوں میں جوتوں کا ایک نیا جوڑا فراہم کر دیا جائے گا۔ صدام حسین نے عدالت کو بتایا انہیں کپڑے دھونے اور سگریٹ پینے کی بھی اجازت نہیں تاہم ان معاملات کے بارے میں عدالت نے کوئی فیصلہ نہیں کیا، میں نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے یقین نہ آیا جوتوں کے

ایک جوڑے کا مطالبہ کرنے والا صدام حسین عراق کا وہی حکمران ہے جو دو برس پہلے تک 48 کھلات تین سو تسی سو نوں اڑھائی ہزار جوتوں خوشبو کی آٹھ دس ہزار بوتلوں اور گیارہ سو تسی کاروں کا مالک تھا جس نے اپنی موٹھیں رٹھنے کیلئے بارہ ماہرین کی ٹیم رکھی ہوئی تھی جس کے سار ہونا سے آتے تھے جس کیلئے مشروبات فرانس کی کمپنیاں بنا تی تھیں اور جس کے سوٹوں کیلئے ٹیکسٹریوں میں خصوصی کپڑا بنایا تھا جس کا ماپ لینے کیلئے ٹیلر لندن سے آتے تھے جس کے کپڑے دھونے کیلئے بغداد میں "رائٹل واشنگ سینٹر" بنایا گیا تھا جس کے ایک سوٹ کی باری ایک سال بعد آتی تھی اور جس کے لباس جوتوں اور خوشبوؤں کی حفاظت کیلئے ایک پورا سیکرٹریٹ تھا۔ مجھے یقین نہ آیا وہ صدام حسین آج جوتوں کے ایک جوڑے کیلئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہے۔ افسوس کیا بلندی تھی اور صدام افسوس اب کیا پستی ہے۔ میں نے برسوں پہلے کسی کتاب میں پڑھا تھا اقتدار ایک ایسا نشہ ہوتا ہے جو انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور بہرہ بھی جو انسان کو یہ یقین دلا دیتا ہے تم اس کائنات کے لئے ناگزیر ہو۔ عجیب بات ہے دنیا کا ہر حکمران زندگی میں کبھی نہ کبھی اس مغالطے کا ضرور شکار ہوتا ہے۔

Kashif Azad@OneUrdu.com

میرا حق چاہتا ہے مگر صدام حسین کے عمل کی تصویر بناؤں اور یہ تصویر دنیا کے تمام حکمرانوں کے بیڈروم میں لگا دوں اور اس کے بعد ان سے عرض کروں "حضور انسان آخر انسان ہے وہ کبھی خدا نہیں بن سکتا اور دنیا میں اللہ کے سوا ہر صاحب اقتدار کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے حضور دنیا کا ہر حکمران ایک بار اپنی کرسی سے نیچے ضرور اترتا ہے اور وہ اپنے محل سے باہر ضرور آتا ہے کبھی اپنے قدموں پر اور کبھی دوسروں کے کندھوں پر۔"



”افسوس میں مر رہا ہوں“

گبریل گارسیا مارکیز کولمبیا میں پیدا ہوا کولمبیا ہی میں رہا اور اب وہ کولمبیا ہی میں مر رہا ہے۔ حالیہ برس کی دہائی میں اس نے اپنے کیریئر کا آغاز اخبار سے کیا تھا لیکن پھر جلد ہی چشمِ صحافت میں گہری دلچسپی اور ادب کی وادی پر حمار میں داخل ہو گیا۔ ابھی اس کے چند افسانے اس کی وجہ تو قیر بنے لیکن اسے اصل شہرت اس کے عظیم ناول ”ہنڈرڈ اینڈ فو آف سالٹی چیوز“ سے ملی یہی وہ ناول تھا جسے نقد تاریخ کا عظیم ترین ناول کہتے ہیں اور اسی ناول کی بنیاد پر مارکیز کو 1982ء میں ادب کا نوبل پرائز ملا۔

بڑھے گبریل گارسیا مارکیز کا شمار دنیا کے ان خوش نصیب لکھاریوں میں ہوتا ہے جنہیں قدرت نے زندگی ہی میں عالمگیر شہرت بھی بخشی، دولت بھی دی، آسائش سے بھی نوازا اور محبت بھی ودیعت کی۔ مارکیز بلاشبہ ایک ایسا خوش بخت انسان تھا جس کے ہونٹوں پر پہنچ کر خواہش قبولیت کا روپ دھار لیتی تھی، جس نے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں نازک ہتھیالیوں پر آٹو گراف دیئے تھے اور جس کی ایک ایک کتاب کے ملین ملین ایڈیشن فروخت ہوئے تھے لیکن آج یہی مارکیز اپنے اواس خاصوش اور ویران بیڈروم میں موت کی چاب سن رہا ہے۔ اس کا کینسر بگڑ چکا ہے اس کا جسم بے حس اور دماغ سن ہو چکا ہے اور اس کے پاؤں سہکتے اور ہاتھ بے حرکت ہو چکے ہیں۔ یہی بیگانگی تو وہ اب اپنی خوابناک آنکھوں سے صرف دھوپ اور چھاؤں میں تیز کر سکتا

ہے آپ اس کی بے بسی کی انتہا دیکھتے وہ آنکھیں جو کبھی چہروں کی جھریوں میں لکھی کہانیاں پڑھ لیتی تھیں اور جو آنکھوں میں چھپے کس دیکھ لیتی تھیں وہ آنکھیں اب کھڑکی سے اندر جھانکتی بلیں اور سوپ کے پیالے سے اڑتی بھاپ تک نہیں دیکھ سکتیں آپ ستم دیکھنے دنیا کا عظیم لکھاری اب برسوں پرانے ملازمین کو پہچاننے کیلئے ان کی آوازوں کا محتاج ہو چکا ہے گھبریل گارسیا مارکیز زندگی اور زندگی کی گرم جوشیوں سے رہناڑ ہو چکا ہے اس نے جنوری 2001ء میں اپنے سیکرٹری کو اپنا آخری پیغام لکھوایا یہ پیغام مارکیز کے کمپیوٹر سے جاری ہونے والی اس کی آخری تحریر ہے یہ پیغام یہ خط مارکیز کی اپنے چاہنے والوں کے نام وصیت بھی ہے ایک مرتے ہوئے انسان کا نوحہ بھی اور انسانی زندگی کا مرثیہ بھی یہ ایک زندہ انسان کا اعتراف شکست بھی ہے اور ایک مرتے ہوئے انسان کی حسرت بھی مجھے یہ خط برادر بزرگ افتخار عارف نے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر کے بھجوایا تھا جسے میں پورے ایک مہینے سے روزانہ رات سونے سے پہلے پڑھ رہا ہوں اور پھر وہ رات جاگتا رہتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں کیا زندگی کے مشکول میں حسرتوں کے سوا بھی کچھ

Kashif Azad@OneUrdu.com

میں یہ پیغام یہ خط یہ وصیت آپ کی نذر کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ نظم اور نثر کے اس عظیم شاہکار کو اپنی میز کے شیشے کے نیچے رکھ لیں گے اور پھر اسے روز ایک بار جی ہاں صرف ایک بار ضرور پڑھیں گے۔

”اے میرے خدا مجھے ایک لمحے کیلئے بے حس و حرکت گنڈے سے انسان بنا دے ایک جیسا جاگتا انسان مجھے قسم ہے تمہاری میں پھر کبھی وہ نہیں کہوں گا جو میں سوچتا ہوں میں صرف اور صرف سوچوں گا اس کے بارے میں سوچوں گا جو میں کہتا رہتا ہوں یا پھر میں کہتا چاہتا ہوں۔“

اے میرے خدا تو مجھے ایک بار پھر حرکت دے دے مجھے تمہاری قسم میں زندگی میں کبھی چیزوں کی قیمت نہیں دیکھوں گا میں ان کی اہمیت دیکھوں گا میں ان کی قدر کروں گا اے میرے خدا میں کم سوؤں گا اور زیادہ خواب دیکھوں گا کہ میں جان چکا ہوں ایک منٹ کیلئے آنکھیں بند ہوں تو ہم روشنی کے کتنے سینکڑے کھو دیتے ہیں۔

اے میرے خدا تو اگر مجھے ایک لمحے کی زندگی بخش دے تو میں اس وقت چلوں گا جب لوگ رک جائیں گے میں اس وقت جاؤں گا جب لوگ سو جائیں گے اور میں اس وقت خاموش رہوں گا جب لوگ بولیں گے اے میرے خدا میں چاکلیٹ کھاؤں گا آکس کریم کھاؤں گا تو

پورے لطف پورے مزے کے ساتھ کھاؤں گا' اے میرے خدا تو اگر مجھے تھوڑی سی زندگی دے دے تو میں ہمیشہ سادہ کپڑے پہنوں گا اور اپنا جسم اور اپنی روح سورج کے سامنے کھول دوں گا' اے میرے خدا اگر مجھے تھوڑی دیر کیلئے اپنا دل واپس مل جائے تو میں اپنی نفرت برف پر لکھ دوں گا اور پھر اسے سورج کی تمازت میں کھیلنے' کھیل کر بھاپ بننے اور بھاپ بن کر اڑتے دیکھوں گا' اے میرے خدا میں ستاروں پر "دین گاف" کے خواب پیٹ کروں گا' چاند کیلئے ایک بنی ڈیڑھی نظم ایک "سیرات" نغمہ لکھوں گا' میں سرخ گلاب چوسوں گا اور اپنی آنکھوں اور اپنے آنسوؤں سے پھولوں کے وہ تمام درد و رنج لوں گا جو کائناتوں نے انہیں دیئے تھے۔

اے میرے خدا تو اگر مجھے تھوڑی سی زندگی دے دے تو میں کوئی ایسا دن نہیں گزارنے دوں گا جب میں لوگوں کو اپنی محبت کا یقین نہ دلا دوں' میں دنیا کے ہر مرد و ہر عورت کو سمجھاؤں گا' مجھے ان سے محبت ہے' میں محبت میں محبت کے ساتھ رہوں گا اور میں لوگوں کو بتاؤں گا جو لوگ سمجھتے ہیں بوڑھے ہو کر وہ محبت کے قابل نہیں رہتے' وہ بڑے بے وقوف ہیں' انسان تو بوڑھا ہی اس وقت ہوتا ہے جب دل سے وہ محبت ترک کر دیتا ہے' میں بچوں کو پر لگا دوں گا لیکن انہیں اپنی اذان خود لینے کا موقع دوں گا' میں بوڑھوں کو بتاؤں گا موت بڑھاپے سے نہیں آتی' فراموشی سے آتی ہے' بے حسی سے آتی ہے

اور اے انسان! اے میرے پڑھنے والے انسان! یہ سب کچھ میں نے تم سے سیکھا تھا' میں نے تم سے سیکھا تھا دنیا کا ہر شخص چوٹی پر پہنچنا چاہتا ہے' یہ جانے بغیر کہ چوٹی کچھ نہیں اصل چیز تو مسافت ہے' وہ مشقت ہے جو پہاڑ سر کرنے کیلئے کی جاتی ہے' میں نے سیکھا جو بچہ باپ کی انگلی تمام لے لے وہ سباروں کا عادی ہو جاتا ہے' میں نے سیکھا' نفرت کا حق صرف اسی کو حاصل ہے جس نے زندگی بھر لوگوں کو سہارا دیا ہو اور جس نے لوگوں کو کھڑا ہونے میں مدد دی ہو۔

اے لوگو! میں نے آپ سے اور مجھی بہت کچھ سیکھا لیکن اس وقت جب موت میری پابندی پر کھڑی ہے تو میرا دل اداس ہے' میں اداس ہوں کہ میں وہ سب کچھ آپ کو نہیں سونپ پایا جو مجھے سونپنا چاہیے تھا اور افسوس میں زندگی کی اصل حقیقتیں اپنے سینے میں لے کر جا رہا ہوں افسوس میں وہ سب کچھ نہیں کہہ پایا جو مجھے کہنا تھا جو مجھے آپ کو بتانا چاہیے تھا۔

"افسوس میں مر رہا ہوں"



محبت، توجہ اور وقت

کرشنیا سٹڈ سٹوڈنٹس کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے یہ قصبہ کوہستان میں ہے ایک سو دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے لہذا لوگ یہاں پہنچنے کے لیے سڑک کا کامیاب بنانے کا اہم کام تھا۔ استعمال کرتے ہیں میرے دوست محمد عباس نے تین سال پہلے چودھری جہانزیب کے ساتھ مل کر یہاں چاولوں کی صفائی اور پیکنگ کی فیکٹری لگائی یہ تجربہ کامیاب ہو گیا چنانچہ میرے دوست پورے یورپ کو باسٹی چاول سپلائی کرنے کے لیے لوگ اب پولینڈ میں کئی گنا بڑا کارخانہ لگا رہے ہیں میں شیخ مبشر کے ساتھ 12 مارچ 2007ء کو وہاں پہنچا کر سٹیا سٹڈ میں ابھی تک سردی کے آثار باقی تھے سڑکوں کے کناروں پر برف کی اکا دکا ڈھیریاں بھی مل جاتی تھیں، قصبے کی گلیاں بازار اور کافی شاہیں سرشام بند ہو جاتی تھیں اور لوگ اندر چھپنے سے پہلے گھروں میں محبوس ہو جاتے تھے ہم لوگ ایک ویلا سٹول میں ٹھہرے تھے سٹول میں بھی ہمارے سوا کوئی گاہک نہیں تھا جبکہ کرشنیا سٹڈ اور اس کا ساحل بھی ویران اور سنسان تھا ہم لوگ لندن اور پیرس کی رونقوں سے وہاں پہنچنے سے پہلے دن کرشنیا سٹڈ کے ٹھہراؤ اور سستی نے پریشان کر دیا لیکن دوسرے دن ہم اس شہر کے عادی ہو گئے اور ہمیں محسوس ہوا کہ کرشنیا سٹڈ کا ٹھہراؤ اور سستی بنیادی طور پر اس کا سکون تھا یہ ایک دھیرا اور پرسکون قصبہ ہے یہاں کے لوگ ہلے گلے اور شور شرابے کی بجائے پرسکون فیملی لائف گزارتے ہیں میرا دوست محمد عباس قدرتی اور فطرتاً پائرس میں ہے اسے اللہ تعالیٰ نے بے

تماشہ "پرنس سلیس" دے رکھی ہے وہ مجھ سے دو برس چھوٹا ہے لیکن اس نے چند برس میں ملٹی ملین ڈالرز کی پرنس ایپارٹمنٹ کھری کر دی مجھے اس کی گروتھ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے وہ چند برس بعد بیسٹ وے کے انور پرویز ڈائریکٹرز کے طابق بھی اور برطانوی رکن اسمبلی چودھری سردر کے لیول تک پہنچ جائے گا۔

مخدوم عباس مہرشیخ اور میں 13 مارچ کی شام کرسٹینا سٹڈ کے ایک ریسٹوران میں کافی پینے کیلئے گئے مخدوم نے ایک برطانوی جوڑے کو بھی وہاں بلوایا 'فرینک اور اس کی پولش بیوی مارکینٹنگ کنسلٹنٹ تھے اور دونوں کی عمریں ساٹھ برس سے زائد تھیں ہم لوگ گلفنڈ بھر گپ شپ کرتے رہے شام کے چھ بج گئے تو فرینک کی بیوی نے گھڑی دیکھی اور اپنے شوہر کو اٹھنے کا اشارہ کر دیا 'فرینک نے معذرت خواہانہ انداز سے ہماری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا "ہم دونوں نے چیرنی کیلئے جانا ہے آپ لوگ ہمیں اجازت دے دیں" میں نے مسکرا کر پوچھا "آپ لوگ کیا چیرنی کرتے ہیں" فرینک کی بیوی بولی "ہم ہفتے میں دو دن چرچ کے اولڈ سٹیل ہوم جاتے ہیں

اس ہوم میں لاوارث اور لاپرواہی رہتے ہیں ہم دونوں ان کے ساتھ بیٹھ کر دو گھنٹے گپ کھاتے ہیں لیڈی فرینک نے یہ بتایا اور مجھ کو گھڑی دیکھی فرینک نے اسے کوٹ پہنایا اور دونوں

ہمارے ساتھ ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے ان کے جانے کے بعد مخدوم نے مجھ سے پوچھا "کیا یہ لوگ دوزخ میں جا سکتے ہیں" میں مخدوم کے سوال پر خاموش رہا مخدوم کے سوال کا جواب کوئی عالم دین ہی دے سکتا تھا لیکن جہاں تک چیرنی کا تعلق ہے میں ان دونوں میاں بیوی کی اپروچ پر حیران رہ گیا تھا دنیا کا ہر شخص پیسے کی خیرات کرتا ہے ہم سب لوگ کسی نہ کسی شکل میں محروموں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کی مالی مدد کرتے رہتے ہیں لیکن ہم میں سے بہت کم لوگ کسی کو وقت دیتے ہوں گے ہم کسی کے پاس بیٹھتے ہوں گے ہم کسی کی بات غور سے سنتے ہوں گے اور ہم کسی کو بڑی محبت سے تازہ ترین حالات کے بارے میں آگاہ کرتے ہوں گے 'مجھے لیڈی فرینک کی بات سن کر اندازہ ہوا دنیا کی سب سے بڑی خیرات صدقہ اور چیرنی کسی کا ساتھ دینا کسی سے کہنی کرنا اور کسی کو اپنے قیمتی وقت میں شامل کرنا ہوتا ہے اور انسان کو بڑھاپے، بیماری اور بے چارگی میں روٹی اور کپڑے سے زیادہ کہنی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم لوگوں نے چیرنی یا خیرات کو صرف روپے پیسے تک محدود کر دیا ہے مجھے محسوس ہوا چیرنی کے معاملے میں بھی ہماری اپروچ غلط ہے ہم پوری دنیا کو وقت دیتے ہیں ہم صدر ہل کی تقریر تک کو بے تماشا وقت دیتے ہیں لیکن اگر ہمارے پاس

وقت نہیں ہوتا تو اپنے بوڑھے ماں باپ چاچا چاہے خالہ خالو بھوپھی بھوپھا اور تائی تائے کیلئے نہیں ہوتا ان لوگوں کے ساتھ ہماری محبت صرف روٹی پانی کپڑے اور دوادار دیکھ دو رہتی ہے ہم انہیں اپنے وقت اپنی توجہ اور اپنی محبت میں شریک نہیں کرتے جبکہ فریک اور اس کی بیوی بنتے میں دو دن کر سفینا سڈ کے بوزھوں کے ساتھ اپنی محبت توجہ اور وقت شیئر کرتے ہیں چنانچہ میں بھدوم کے سوال پر تو خاموش رہا لیکن میں نے دل میں سوچا "کیا یہ لوگ ہم سے زیادہ مسلمان نہیں ہیں؟"

یورپ کی چیرنی کا ایک منظر میں نے بیس میں بھی دیکھا تھا "بھوشن مجھے دریائے سین کے کنارے لے گیا اور یا کے کنارے دور دور تک خوبصورت نیسے لگے تھے اور مختلف عمروں کے سینکڑوں لوگ ان خیموں کے باہر بیٹھ کر دھوپ سینک رہے تھے "بھوشن نے بتایا یہ تمام لوگ شرابی اور نشئی ہیں یہ دن رات نشے میں دھت رہتے ہیں ان لوگوں کی شراب ختم ہو جائے تو یہ لوگ بوتل لے کر شہر میں نکل آتے ہیں یہ لوگ ریستورانوں باروں اور دوکانوں میں چلے جاتے ہیں اور بیس کے زیادہ تر دوکاندار انہیں مفت شراب دے دیتے ہیں یہ لوگ بوتل لے کر واپس آتے ہیں اور آپس میں ایک ایک گھونٹ شراب تقسیم کر لیتے ہیں "فریج حکومت کے مطابق اس وقت فرانس میں ان لوگوں کی تعداد ایک لاکھ سے قریب ہے یہ لوگ کئی جگہوں پر رہتے ہیں اور بے کار ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے شراب اور صرف شراب یہ لوگ گرمیاں فٹ پاتھوں میٹروپولیٹنوں اور پارکوں میں گزار دیتے ہیں ان لوگوں کیلئے سردیاں بڑی دشمن اور مشکل ہوتی ہیں حکومت نے ان کے مسائل کو سمجھتے ہوئے اس سال ان کیلئے دریائے سین کے کنارے خیمے لگا دیئے ہیں ان خیموں میں بڑے شاعر گدے اور کبل ہیں یہ لوگ سارا دن سڑکوں پر پھرتے ہیں لیکن رات کو ان خیموں میں آ جاتے ہیں حکومت نے ہر دو پندرہ خیموں کے بعد ایک "ڈائننگ ٹینٹ" لگا دیا ہے اس ٹینٹ میں کھانے پینے کا سامان پڑا رہتا ہے ان لوگوں کو جب بھوک لگتی ہے تو یہ لوگ ڈائننگ ٹینٹ سے اپنی مرضی کی چیزیں اٹھا کر کھا لیتے ہیں بیس میں اس وقت 13 این جی اور ان لوگوں کیلئے کام کر رہی ہیں یہ این جی اور انہیں کبل گدے اور سلپنگ بیگز فراہم کرتی ہیں اور ان کے کھانے پینے اور کپڑوں کا بھی خیال رکھتی ہیں "میوہل کار پوریشن کی گاڑیاں دن میں چار بار ان خیموں کا چکر لگاتی ہیں اور ان کے لئے کھانے پینے کا سامان چھوڑ جاتی ہیں سردیوں کی راتوں میں کار پوریشن اور پولیس کے ساتھ ساتھ عام لوگ بھی یہاں آتے جاتے رہتے ہیں اور ان لوگوں کی ضروریات کا بندوبست کرتے رہتے ہیں میں نے "بھوشن" سے پوچھا "یہ

لوگ معاشرے کیلئے بیمار ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود حکومت اور عوام ان کا کیوں خیال رکھتے ہیں " مبشر کا کہنا تھا "فرانس کے لوگ سمجھتے ہیں 'نشہ کرنے کے باوجود انسان انسان رہتا ہے اور شراب نوشی کسی انسان سے اس کے انسان ہونے کا حق نہیں چھینتی' یہ لوگ نشہ کو گناہ یا جرم کی بجائے بیماری سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے بیمار کو نگہداشت، حفاظت اور نرسنگ کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ حکومت سے لے کر عام شخص تک فرانس کا ہر شہری ان لوگوں کی نرسنگ کرتا ہے"

مجھے مبشر کی بات پر بھی حیرت ہوئی کیونکہ میں کروڑوں پاکستانیوں کی طرح نشیوں سے نفرت کرتا تھا اور میں نے آج تک کسی نشی کی طرف بھردری سے نہیں دیکھا تھا' میں ان لوگوں کو گناہ گار مجرم اور حیوان سمجھتا تھا لیکن دریاے سین کے کنارے نصب یہ خیمے دیکھ کر مجھے پہلی بار شرمندگی کا احساس ہوا اور میں نے سوچا پاکستان کے ہر شہر ہر قصبے اور ہر گاؤں میں ایسے بے شمار لوگ بکھرے پڑے ہیں یہ لوگ گرمیوں سردیوں اور بارشوں میں کھلے آسمان تلے پڑے رہتے ہیں ان کے جسم سے بدبو کے پھھکے اٹھتے ہیں اور انہیں دس دس دن تک روٹی نصیب نہیں ہوتی

لیکن ہم میں سے کسی شخص نے آج تک ان لوگوں کے بارے میں نہیں سوچا' ہم نے آج تک کوئی روٹی گئے دونوں کے اور پانی کے دو گھونٹ نہیں دیئے ہم نے آج تک ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ نہیں رکھا اور ہم نے انہیں اپنی دعا تک کے قابل نہیں سمجھا' مجھے اس وقت یورپ کے لوگوں پر خدا کے کرم اور پاکستان کی محرومی کی اصل وجہ سمجھ آئی اور مجھے محسوس ہوا اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں پر کرم کرتا ہے جو اس کے بندوں پر مہربانی کرتے ہیں جو بڑھے اور نشی کو بھی انسان سمجھتے ہیں جو انسانوں سے نفرت نہیں کرتے اور جو لوگوں کو محبت، توجہ اور وقت دیتے ہیں' میں نے سوچا' کیا ہم 16 کروڑ مسلمانوں کے ملک میں ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں کر سکتے جو فریبک اور اس کی بیوی کی طرح بوزھوں کو وقت دے اور جو پاکستان کے کسی ایک شہر میں نشیوں کیلئے کھانے کا بندوبست کر سکے آپ انسوس کا مقام دیکھئے' ہم اس بے حسی کے باوجود خود کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور خود کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ قوم بھی۔



”میرا کیا قصور تھا“

”آپ کا سفر کیسا رہا“ میں آواز نہیں پہچان سکا، میں نے پوچھا ”کون صاحب بول رہے ہیں؟“ نرم اور بھاری آواز میں جواب آیا ”کیا یہ کافی نہیں؟“ 6 مارچ کو کون میں ایک شخص نے دوسرے شخص کو یاد رکھا اور آٹھ برس بعد اس سے مخاطب ہوا ”میں حیرت سے پریشانی کے فیز میں داخل ہو گیا، میں نے عرض کیا ”میرا اس کے باوجود اگر آپ نام بتادیں گے تو مجھے بات کرنے میں سہولت ہوگی“ دوسری طرف چند سیکنڈ کا وقفہ ہوا، مخاطب نے لمبا سانس بھرا جذباتی لہجے میں بولا ”جاوید، میں پرویز رشید بول رہا ہوں“ میرے منہ سے جوش میں ایک طویل ”جواب عالی“ نکلا اور لندن کی اجنبی نضا چاکم مہربان ہو گئی۔

پرویز رشید سے میری پہلی ملاقات 1997ء میں غلیل ملک صاحب کے دفتر میں ہوئی تھی، پرویز رشید حس جمال اور حس مزاح سے لہریز ایک خوبصورت شخص تھے وہ ان دنوں تازہ تازہ سینئر بنے تھے اور میاں نواز شریف نے انہیں پی ٹی وی کا چیئرمین لگا دیا تھا، پرویز صاحب سے میری ملاقاتیں 1998ء تک جاری رہی تھیں، 1998ء میں پرویز صاحب مجھے سینئر سیف الرحمن کے پاس لے گئے، سیف الرحمن کے ساتھ میری سنجی ہو گئی اور اس کے بعد پرویز صاحب سے میری ملاقاتوں میں وقفہ آنے لگا، 12 اکتوبر 1999ء کے ”لٹری کو“ کے بعد خبر آئی، پرویز رشید پی ٹی وی ہیڈ کوارٹر سے گرفتار ہو گئے ہیں، پھر خبر ملی وہ قید تہائی میں ہیں، پھر ان کی رہائی کی تصویریں شائع

ہوئیں پتہ چلا وہ لاہور چلے گئے ہیں وہاں انہوں نے 12 اکتوبر کے قبضے کے خلاف پریس کانفرنس بلانی اس کے بعد پتہ چلا وہ ایک بار پھر گرفتار ہو گئے ہیں اور اس کے بعد ایک طویل خاموشی چھا گئی وہ آٹھ برس تک گوشہ گشائی میں رہے لیکن پھر چاکا 3 مارچ 2007ء کو مجھے لندن میں ان کا فون آیا اور نونا ہوار ابلہ ایک بار پھر بحال ہو گیا پرویز رشید نے مجھے چار مارچ کی شام بلنا تھا اور میں اس شام کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔

لندن میں چار مارچ کو شدید بارش ہو رہی تھی سرد ہوا میں چل رہی تھیں میرا خیال تھا شاید وہ نہ آسکیں لیکن ٹھیک آٹھ بجے تل ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو باہر پرویز رشید کھڑے تھے میں انہیں دیکھ کر سکتے میں آ گیا 1999ء اور 2007ء کے پرویز رشید میں زمین آسمان کا فرق تھا میں نے 1998-99ء میں جس پرویز رشید کو چھوڑا تھا وہ شاندار سوٹ پہنے قیمتی خوشبو لگانے اور پائپ پینے والا "سیالکوٹی منڈا" تھا لیکن اس وقت میرے سامنے ایک ضعیف مفلوک الحال اور بیمار پرویز رشید کھڑا تھا میرے دل میں درد کی ایک لکیری آگنی میں نے انہیں اندر

بلایا انہیں بٹھا اور بڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا وہ بھی چپ چاپ میرے سامنے بیٹھ گئے ہم خاموش رہے وہ دیر تک مجھے تو وہ مسکرا کر بولے "چلو کھانا کھانے کیلئے چلے ہیں" میرے ساتھ محمد رؤف کلاسرا تھا ہم دونوں ان کے ساتھ چل پڑے وہ ہمیں ایجویری روڈ کے ایک لبنانی ریسٹوران میں لے گئے پرویز صاحب نے کھانے کا آرڈر دیا پائپ نکالا اور اس میں تمباکو بھرنے لگے ان کے ہاتھ میں عیش تھا انہیں تمباکو بھرنے میں دقت ہو رہی تھی وہ پائپ جلا چکے تو میں نے عرض کیا "میں 1999ء سے 2007ء تک کی کہانی سنا چاہتا ہوں" پرویز رشید مضطرب ہو گئے انہوں نے آنکھوں پر نشور رکھا اور نرم آواز میں بولے "جاوید میں کھانے کے قابل نہیں رہوں گا" مجھے ان پر بہت ترس آیا لیکن میرے اندر کا صحافی ماننے کیلئے تیار نہیں تھا میں انہیں بار بار کہہ رہا تھا یہاں تک کہ انہوں نے پیٹ سرکائی اور آہستہ آواز میں بولے "آپ کو لاہور میں میری دوسری گرفتاری تک کے واقعات تو معلوم ہیں" میں نے ہاں میں گردن ہلا دی وہ بولے "مجھے پریس کانفرنس کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا مجھے ایک عقوبت خانے میں لے جایا گیا تھا اور اس کے بعد مجھے شدید روحانی نفسیاتی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا میرے جسم کا ایک ایک پور ہلا دیا گیا" میرے سر سے خون چلتا تھا اور اڑبڑوں تک آتا تھا یہ دس دن تھے یا پندرہ جس مجھے کچھ یاد نہیں میں صرف اتنا جانتا ہوں مجھے انسانیت کے مقام سے کہیں نیچے گرا دیا گیا تھا دنیا کا ہر انسان ایک حد

تک جسمانی تشدد سہہ جاتا ہے لیکن اخلاقی تشدد برداشت کرنا کسی شخص کیلئے ممکن نہیں ہوتا انسان اپنے سامنے شرمندہ ہو جاتا ہے مجھے اس کے بعد جیل میں پھینک دیا گیا میری دو بیٹیاں جس میری بیٹی مجھے جیل میں ملنے آئی ان ظالم لوگوں نے مجھے اس کے سامنے بیٹھا دیا اس وقت میرے کپڑے پھنسنے ہوئے تھے سر میں خاک تھی اور منہ دس پندرہ دنوں سے نہیں دھلا تھا میں جب بیٹی کے سامنے بیٹھا تو میری شلوار پنڈلیوں سے اوپر اٹھ گئی بیٹی نے میری ایزویوں تک خون کی لکیریں دیکھیں تو اس نے رو تا شروع کر دیا اس منظر نے اس کی نفسیات بدل دی وہ دن ہے اور آج کا دن ہے اسے رات کو نیند نہیں آتی "دور رک گئے" ان کی آواز میں آنسوؤں کی ٹہنی باہر شدید بارش ہو رہی تھی لیکن اندر کا موسم انتہائی گرم تھا میں خاموشی سے ان کی داستان سن رہا تھا۔

وہ دوبارہ گویا ہوئے "میں نے 1979ء میں لاہور میں پانپ بنانے کا ایک چھوٹا سا یونٹ لگایا تھا یہ یونٹ آہستہ آہستہ کارخانہ بن گیا تھا یہ میرا واحد اثاثہ تھا حکومت نے پہلے اس کی بجلی کالی اور اس کے بعد میرے ہول سیلز کو مال نہ خریدنے کا حکم دے دیا میں جیل سے باہر آیا تو

میرا کاروبار تباہ ہو چکا تھا میں کوڑی کوڑی کا محنت تھا میرے پاس الہور سے اسلام آباد تک کا گریا نہیں ہوتا تھا میں نے پاسپورٹ بنوایا اور امریکہ چلا گیا میں امریکہ میں ایک نفسیات دان سے علاج کرانے لگا میرے اعصاب نارمل ہوئے تو اس نے ایک دن مجھے ڈنر پر بلایا اور مجھ سے کہنے لگا "مسٹر رشید میں سٹاڈیو ہوں میرا والد منظر کے کپ میں نازی تشدد کا شکار ہوا تھا میں نے یہ منظر نہیں دیکھا لیکن جب میں نے تمہاری کہانی سنی تو مجھے محسوس ہوا میرے بزرگوں پر بھی اسی نوعیت کا ظلم ہوا ہوگا" اس کے بعد اس نے جیب سے ایک لٹافٹ نکانا اور میرے ہاتھ پر رکھ کر بولا "تم نے آج تک مجھے جتنی فیس دی میں تمہیں وہ واپس لوٹا رہا ہوں" میں نے ہر رار کیا تو وہ بولا "میں نے اگر تم سے فیس لی تو مجھے محسوس ہوگا میں نے اپنے مظلوم باپ سے فیس لی تھی؟" پرویز رشید کی آواز بھرا گئی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے شیشے سے باہر دیکھنا شروع کر دیا وہ بولے "میں امریکہ سے لندن آ گیا میرا علاج ابھی جاری ہے میں بڑی حد تک بہتر ہوں لیکن اب بھی دروازے پر دستک ہوتی ہے تو میں خوف کا شکار ہو جاتا ہوں میں بند کمرے میں نہیں رہ سکتا اور میں سینما اور ٹی وی نہیں دیکھ سکتا میں فلموں کا بہت شوقین تھا لیکن میں اب چند منٹ سے زیادہ سکرین کے سامنے نہیں بیٹھ سکتا میں اپنے ڈاکٹر سے کہتا ہوں اگر تم مجھے میری فلمیں واپس کر دو تو یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا" دور کے اور دو بارہ دیکھنے لگا تو بہت اچھا لگتا تھا

لیکن میں یہاں بھی تین چار دن سے زیادہ نہیں رہا مجھے اپنا ملک بہت عزیز تھا لیکن آج جب کوئی شخص میرے سامنے پاکستان کا نام لیتا ہے تو مجھے اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی میں محبت وطن تھا لیکن ان میں دنوں نے میری وطن پرستی ختم کر دی میں اب دنیا کے کسی ملک کا شہری نہیں رہا میں دن گومیاں صاحب کے دفتر چلا جاتا ہوں شام تک کام کرتا ہوں شام کے بعد سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہوں تھک ہار جاتا ہوں تو کمرے میں آ کر تا ہوں میری ایک بیٹی پاکستان میں ہے اسے رات کو نیند نہیں آتی دوسری بیٹی مانچسٹر میں پڑھتی ہے وہ میرے پاس آتی ہے تو مجھے دیکھ کر رونا شروع کر دیتی ہے اور میں ہنستے ہنستے دو دن ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں ڈاکٹر مجھے کہتا ہے تم لوگوں کو اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے بارے میں بتاؤ تمہارا دل ہلکا ہو جائے گا لیکن میں سوچتا ہوں میں کس کو بتاؤں اور اس بتانے کا کیا فائدہ ہوگا گھر میں اگر دروازے پر دستک ہو جائے تو منہ سے چیخ نکلی جاتی ہے اور باقی رات کھڑکی میں کھڑے ہو کر گزار دیتا ہوں پرویز رشید نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

روئے کلاس اور میری آنکھوں میں آنسو تھے رستوران میں بابا کار بھی تھی لوگ چیخ رہے تھے نتیجہ نکار ہے تھے لیکن اس ٹیبل کے مین سٹار ایک دوسرے سے آنکھیں چرا رہے تھے ہمارا کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا البتانی ویٹرز بار بار آتی تھی ہمیں دیکھتی تھی اور واپس چلی جاتی تھی میں نے پرویز رشید صاحب کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور ان کا ہاتھ دبا کر عرض کیا "میں آپ سے محبت کرتا تھا لیکن اب مجھے آپ پر فخر ہے" پرویز صاحب نے دوسرے ہاتھ سے آنکھیں صاف کیں اور سسکی لے کر بولے "کیا تمہاری محبت تمہارا فخر میری پاکستانیت واپس کر سکتا ہے کیا میری خود اعتمادی میرا فخر اور میری حب الوطنی واپس آ سکتی ہے کیا یہ مجھے میرا پرانا پرویز رشید واپس کر سکتا ہے کیا یہ میری بیٹی کی نیند واپس لا سکتا ہے کیا یہ میری بیٹیوں کے آنسوؤں کے داغ مٹا سکتا ہے اور کیا یہ میری ہنسی میری مسکراہٹ واپس کر سکتا ہے" میں خاموش رہا وہ بولے "میں ہر بات بھولنے کیلئے تیار ہوں لیکن جب میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں میرا قصور کیا تھا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا اور میں اپنے آپ سے الجھنے لگتا ہوں" وہ کہنے لگا "میرا فخر میری طرف دیکھ کر بولے" تم بتاؤ میرا کیا قصور تھا" میں نے ہاں میں سر ہلایا اور آہستہ سے جواب دیا "آپ نے مجھ سے انکار کر دیا تھا اور کامیاب خریداروں کے سامنے جب کوئی کہنے سے انکار کرتا ہے تو وہ اسے توڑ دیا کرتے ہیں یا اسے روند دیا کرتے ہیں"

جو چلنا جانتے ہیں

وہ مزدور کا مقدر لے کر پیدا ہوا تھا لیکن اس نے اپنے وژن، محنت اور ایمانداری سے
 Kashif Azad@OnlineLibrary.com

وہ 1926ء میں سویڈن کے ایک گاؤں Agonnaryd میں پیدا ہوا اس کے
 والدین ایک فارم ہاؤس ایلٹریڈ (Elmtaryd) میں مزدوری کرتے تھے اس کے والدین
 نے پانچ برس کی عمر میں اسے بھی مزدوری پر لگا دیا لیکن اس نے مزدور کی بجائے کاروبار کا فیصلہ کیا
 اس کا نام تین سال کی عمر میں رکھا گیا اس کے نام کے دو حصے تھے انگوار اور کیمپارڈ اس نے گیارہ
 سال کی عمر میں ماچیس بیچنا شروع کیں وہ ماچسوں کے ڈبے لیتا اور سائیکل پر گلی ماچیس بیچتا
 رہتا وہ یہ کام چھ ماہ تک کرتا رہا پھر اسے ایک دن معلوم ہوا اگر وہ شہر سے تھوک میں ماچس خرید لے
 اور یہ ماچس گاؤں کے دکانداروں اور پھیری بازوں کو بیچ دے تو وہ زیادہ منافع کما سکتا ہے انگوار
 اگلے دن سناک ہوم چلا گیا اور وہاں سے تھوک میں ماچس خرید لایا اس نے یہ ماچیس تھوڑا سا
 منافع رکھ کر بیچ دیں اس نے اگلے سال تک ماچسوں کے کاروبار کو پھیلی کرکس ٹری کرکس کارڈز
 پھولوں کے بیج، پال پوائنٹس اور سینسلوں تک پھیلا دیا وہ یہ ساری اشیاء تھوک میں خریدتا تھا اور بعد
 ہزاروں گاؤں کے دکانداروں کو فروخت کرویتا تھا وہ 17 سال کا ہوا تو اس کے والد نے اسے
 تھوڑے سے پیسے دیئے اس نے اس معمولی سی رقم سے ایک ایسی کمپنی کی بنیاد رکھ دی جس نے

آنے والے دنوں میں پوری دنیا کاائف سٹائل تبدیل کر دیا انگواری نے اس رقم سے وزن میں ہلکا لیکن رنگوں میں تیز فرنیچر بنا شروع کر دیا لوگوں کا خیال تھا اس کا آئیڈیا نا کام ہو جائے گا کیونکہ اس وقت کئی کے بھاری بھر کم فرنیچر کاروان تھا لوگ ایک مرتبہ فرنیچر بنواتے تھے اور یہ فرنیچر تین نسلوں تک ان کا ساتھ دیتا تھا چنانچہ اس وقت یورپ میں فرنیچر ایک ایسی پراڈکٹ سمجھا جاتا تھا جس کی مانگ نہ ہونے کے برابر تھی اس وقت تک فرنیچر کے سنورز اور شورومز بھی شروع نہیں ہوئے تھے لوگ ترکھانوں سے اپنی ضرورت کا فرنیچر بنا لیتے تھے لیکن انگواری نے فرنیچر کو کاروباری شکل دینے کا فیصلہ کیا اس کا خیال تھا آنے والے دنوں میں پوری دنیا میں نقل مکانی شروع ہو جائے گی لوگ روزگار کیلئے آبی شہروں سے باہر نکلیں گے لہذا اس نقل مکانی کے دوران بھاری فرنیچر کی نقل و حمل مشکل ہو جائے گی اس کا خیال تھا مستقبل قریب میں بڑے شہروں پر آبادی کا دباؤ بڑھ جائے گا جس کے نتیجے میں مکانوں اور فلینوں کا سائز چھوٹا ہو جائے گا چنانچہ لوگوں کو چھوٹے سائز کے مکانوں کیلئے فرنیچر بھی چھوٹے سائز کا چاہیے اس کا خیال تھا مستقبل رنگوں کا دور ہو گا تاکہ نئے نئے لوگوں میں ہر چیز رنگین ہو جائے گی چنانچہ انہوں نے ان تمام کامات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایسا (ikea) کے نام سے یورپ میں فرنیچر سازی کی کمپنی کی بنیاد رکھی۔

"ایسا" ایک لاطینی لفظ تھا یہ چار حرف آئی کے ای اور اے کا مجموعہ تھا اس نے چار حرف اپنے نام اور اپنے گاؤں سے لئے تھے آئی اس کے نام انگواری کو ظاہر کرتا تھا کے سے مراد کیسپارڈ تھی ای کا تعلق اس فارم ہاؤس ایٹلر یا ڈ سے تھا جس میں اس نے پرورش پائی تھی اور اے اس کے آبائی گاؤں Agunnaryd کا پہلا حرف تھا انگواری نے جب اپنی کمپنی کا نام "ایسا" رکھا تو لوگوں کا خیال تھا اس کے بزنس کی طرح اس کی کمپنی کا نام بھی لاطینی ہے لہذا یہ کاروبار اور یہ کمپنی دونوں چند ماہ میں ماضی کا قصہ بن جائیں گے لیکن انگواری نے آنے والے دنوں میں لوگوں کے سارے خدشات باطل ثابت کر دیئے اس نے سائز میں چھوٹا وزن میں ہلکا اور رنگوں میں تیز فرنیچر بنوایا اور یہ فرنیچر آنے والے دنوں میں دنیا کاائف سٹائل بن گیا اس نے دنیا کی نفسیات اور طرز رہائش بدل کر رکھی "ایسا" بیس برس بعد یورپ کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی اس کی یہ کامیابی اس کے ڈٹن محنت اور ایمانداری کا نتیجہ تھا اس نے وقت کی تبدیلی کو بھانپ لیا تھا وہ سمجھ گیا تھا چھوٹی اور کارآمد چیزوں کا دور آنے والا ہے لہذا مستقبل میں صرف وہی چیزیں کامیاب ہوں گی جو سائز میں چھوٹی وزن میں ہلکی اور استعمال میں وسیع ہوں گی 1980ء میں اس نے بزنس کو ایک

اور کروت دی اس نے گھر میں استعمال ہونے والی ہر قسم کی مشینری بنانا شروع کر دی وہ اس وقت کچن میں استعمال ہونے والی چھوٹی چھج سے لے کر گھر میں استعمال ہونے والے ہاتھ تک ہر چیز بنا رہا ہے اس کا کاروبار یورپ سے لے کر امریکہ تک اور دعویٰ سے لے کر نیوزی لینڈ تک دنیا کے 34 بڑے ممالک میں پھیلا ہوا ہے اس کے سنورز پر روزانہ 900 ملین ڈالر کی سیل ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے یورپ میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جس میں "اکیا" کی کوئی نہ کوئی چیز نہ ہو مارچ 2007 کے تیسرے ہفتے میں فوربس انٹرنیشنل نے مزدور کے اس بیٹے کو دنیا کا چوتھا امیر ترین شخص ڈیکلیر کر دیا اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں 33 بلین ڈالر جمع تھے جبکہ اس کی دولت میں روزانہ ایک بلین ڈالر اضافہ ہو رہا تھا۔

انگوار کیمیا روڈ ایک انتہائی دلچسپ شخص ہے وہ دنیا کا چوتھا امیر ترین شخص ہونے کے باوجود انتہائی سادہ زندگی گزارتا ہے وہ پندرہ سال پرانی والو گاڑی استعمال کرتا ہے اپنی گاڑی خود چلاتا ہے ہمیشہ جہاز کی اکانومی کا اس میں سفر کرتا ہے اور اس نے سات سال کی عمر میں کرسس بھیہ بیٹے کا کام شروع کیا تھا وہ اب تک یہ کاروبار کر رہا ہے وہ ہر سال کرسس بھیہ بھیجتا ہے اور کرسس کے بعد ان بھیہ کی سیل لگاتا ہے اس نے "اکیا" کے تمام ملازمین کو کاغذ کی دونوں حالتیں استعمال کرنے کا حکم دے رکھا ہے اس کے کسی دفتر میں اگر کوئی شخص ایک سمت استعمال کر کے کاغذ روٹی کی نوکری میں پھینک دے تو وہ لڑنے مارنے پر تیار ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ سے ریستورانوں میں کھانا کھاتا ہے اس نے چالیس برس قبل "اکیا" کے دفاتر اور فیکٹریوں میں ملازموں کیلئے سستا کھانا شروع کر لیا تھا وہ اگر کھانے کے وقت اپنی کسی فیکٹری یا دفتر کے نزدیک ہو تو وہ ہمیشہ "اکیا" کے کیفے ٹیریا میں کھانا کھاتا ہے اور دو تین ڈالر پانڈا مارک یا کراؤن بچا کر خوش ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی فراخ دل شخص بھی ہے اس نے INGKA Fondation کے نام سے ایک فلاحی ادارہ بنا رکھا ہے وہ اس ادارے کے ذریعے اب تک 36 بلین ڈالر کی چیرٹی کر چکا ہے دنیا کے نامور میگزین انکوائسٹ کے مطابق انگوار فلاح عام میں بل ٹیش کے مقابلے میں کہیں زیادہ رقم خرچ کرتا ہے لیکن وہ اپنی چیرٹی کے کاموں کی تشہیر نہیں کرتا ہندو دنیا اس کی خیرات اور فلاحی کاموں سے پوری طرح واقف نہیں اگر انگوار کیمیا روڈ کی ذات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ایک "کنجوس بنی" محسوس ہوتا ہے وہ ایک طرف اپنے کسی ورکر کو ایک ڈول ضائع کرنے کی اجازت نہیں دیتا وہ کاغذ کی دوسری پرت ضائع کرنے کے جرم میں اپنے ایم ڈی تک کو فارغ کر دیتا ہے جبکہ دوسری طرف وہ اربوں کھربوں ڈالر خیرات کر دیتا ہے اور دوسرے ہاتھ تک کو شہر نہیں ہوتی وہ

شاید اس وقت دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد شخص ہوگا۔

مجھے انگوار کا ایک انٹرویو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اس انٹرویو میں اس نے دو دلچسپ باتیں کی تھیں اس نے بتایا "دنیا میں تو کمری کرنے والا کوئی شخص خوشحال نہیں ہو سکتا انسان کی معاشی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ اپنے کام کا آغاز کرتا ہے" اس کی دوسری بات اس سے بھی دلچسپ تھی اس کا کہنا تھا "کامیابی اور ترقی کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس کا کہنا تھا "اگر تعلیم سے روٹی کمانی جاسکتی تو آج دنیا کے تمام پروفیسر ارب پتی ہوتے" اس کا کہنا تھا "اس وقت دنیا میں ساڑھے نو سو ارب پتی ہیں لیکن ان میں ایک بھی پروفیسر ڈاکٹر یا ماہر تعلیم شامل نہیں" اس کا کہنا تھا "دنیا میں ہمیشہ درمیانے پڑھے لکھے لوگوں نے ترقی کی یہ لوگ وقت کی قدر و قیمت سمجھتے ہیں چنانچہ یہ لوگ ڈگریاں حاصل کرنے کی بجائے طالب علمی کے دور ہی میں کاروبار شروع کر دیتے ہیں چنانچہ ان کی کامیابی انہیں کانٹا یا یونیورسٹی سے مشورہ کارخانے یا منڈی میں لے جاتی ہے" اس کا کہنا تھا وہ زندگی میں کبھی کالج نہیں گیا لیکن اس وقت اس کی کتنی میں 30 ہزار اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین و حضرات کام کر رہے ہیں یہ تعلیم یافتہ لوگ وٹن، علم اور دانش میں اس سے کہیں بہتر ہیں بس ان میں ایک خامی تھی ان میں تو کمری چھوڑنے کا حوصلہ نہیں تھا انہیں اپنے اور اپنی صلاحیتوں پر اکتفا نہیں تھا" اس کا کہنا تھا "اگر کوئی شخص انگوار کیلئے مزدوری کر سکتا ہے تو وہ خود اپنے لئے بھی کام کر سکتا ہے بس اس کیلئے ذرا سا حوصلہ چاہیے" اس نے دنیا بھر کے نوجوانوں کو پیغام دیا "ترقی پیوٹی کے پاؤں لے کر پیدا ہوتی ہے لیکن جوان ہونے تک اس کے پاؤں ہاتھی جتنے بڑے ہو جاتے ہیں" اس کا کہنا تھا "دنیا میں ہر چیز کا متبادل موجود ہے لیکن محنت کا کوئی شارٹ کٹ نہیں" اس نے کہا "دنیا کا کوئی کیمیائی عمل لوہے کو سونا نہیں بنا سکتا لیکن انسانی ہاتھ وہ طاقت ہیں جو دنیا کی ہر دھات کو سونے میں بدل سکتے ہیں" اس نے کہا "دنیا میں نکلے لوگوں کیلئے کوئی جائے پناہ نہیں جبکہ کام کرنے والوں کیلئے پوری دنیا کھلی پڑی ہے" اس نے کہا "بہتر منہ شخص کا ہنر اس کا پاسپورٹ ہوتا ہے" میں نے جب انگوار کے یہ خیالات سنے تو میں نے سوچا کاش میں یہ خیالات پاکستان کے ان تمام بے روزگار نوجوانوں تک پہنچا سکوں جو دن رات بے روزگاری کا دردناک تجربہ کرتے ہیں کاش میں ان نوجوانوں کو متا سکوں اگر فارم ہاؤس کا ایک مزدور مسلسل محنت سے انگوار بن سکتا ہے تو پاکستانی نوجوانوں کے ماتے میں کیا رکاوٹ ہے؟ یہ لوگ کامیاب کیوں نہیں ہو سکتے انگوار نے کہا تھا "آگے بڑھنے کا راستہ انہیں ملتا ہے جو چلنا جانتے ہیں" میرا خیال ہے ہمارے نوجوانوں کو چلنے کا ہنر نہیں آتا۔

امن وامان

میں جوں ہی اندر داخل ہوا، مجھے محسوس ہوا میں ایک نامہر بان دنیا سے مہربان دنیا میں آ گیا ہوں۔ عمارت کے اندر سکون، اطمینان، خوبصورتی، کھٹائی، تراوانی اور شاندار آبی تھی۔ ہر شخص کے چہرے پر سکون اور آواز میں اطمینان تھا، تمام لوگ ترتیب، سلیقے اور اخلاص کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ پورے دفتر میں مساوات تھی، چیف ایگزیکٹو سے چپڑا ہی تک اور ڈائریکٹر سے سوپر تک سب لوگوں کو یکساں حقوق حاصل تھے۔ دفتر میں کوئی شخص کسی کو حکم دے رہا تھا اور نہ ہی کوئی ملازم ہاتھ باندھ کر کھڑا تھا، چیف ایگزیکٹو سے چپڑا ہی تک سب ایک ہی کینے ٹیریا سے کھانا کھا رہے تھے، تمام لوگ تھار میں کھڑے ہو کر اپنی ٹرے خود اٹھاتے تھے اور سب کا کھانا یکساں تھا۔ تمام لوگوں کے پاس اپنی اپنی ذمہ داریاں تھیں اور ہر شخص اپنے کام کا ذمہ دار تھا۔ اس پوری عمارت میں اونٹنی آواز میں بات کرنا، تھمنی، بجا کر دوسرے کو بلانا اور شوکا ز نوٹس جاری کرنا ممنوع تھا، تمام لوگوں کے پاس چھٹیوں کے یکساں حقوق تھے لیکن چھٹی سے پہلے کام مکمل کرنا ضروری تھا۔ اس دفتر کا پہلا اور آخری اصول سچ تھا، کوئی شخص کسی سے جھوٹ نہیں بولتا تھا، وہ بڑی سے بڑی غلطی کا اعتراف کرتا تھا اور اس کی اصلاح کا وعدہ کر کے دوبارہ کام پر لگ جاتا تھا۔ میں ساری عمارت میں گھوما، میں نے گیٹ سے چھت تک ہر جگہ دیکھی اور مجھے تمام جگہوں پر صفائی، خوبصورتی اور ڈسپلن ملا۔ میں اپنے دوست کے کمرے میں آ گیا۔

میرا دوست کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا، اس کی میز پر پانی کا گلاس پڑا تھا، وہ گلاس سے ایک گھونٹ پانی پیتا تھا اور پھر دوبارہ کمپیوٹر پر مصروف ہو جاتا تھا۔ میرا دوست دس برس پہلے بے روزگار تھا، یہ اپنی ڈگریاں اٹھا کر نوکری کیلئے دھکے کھاتا تھا لیکن اسے کوئی کمپنی، کوئی فرم گھاس نہیں ڈالتی تھی، پھر اس نے اپنی فرم بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت اس کے پاس صرف دس ہزار روپے تھے، اس نے دس ہزار روپے لگا کر کمپنی رجسٹر کرائی اور اپنے گھاس فیلو کے دفتر میں میز لگا کر بیٹھ گیا لیکن صرف دس سال بعد اس کا "ٹرن اوور" دس ارب روپے سالانہ تھا، دنیا میں اس کے 25 دفتر ہیں اور اس کے ہیڈ کوارٹر میں اڑھائی سو لوگ کام کرتے ہیں، گراچی میں اس کا بہت بڑا آپٹیکس ہے، اس کا کاروبار پاکستان سے افریقہ، چین، آسٹریلیا، کینیڈا اور یو اینٹ تک پھیل چکا ہے اور وہ بجزی جہاز خریدنے کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا اور میں اس کی کمپنی پر اتنی سفیدی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے بالوں میں ذرا ذرا سی برف اترنا شروع ہو گئی تھی لیکن اس کے چہرے پر ابھی تک تازگی اور لڑکھن تھا اور وہ کسی بھی طرح اتنے بڑے کاروبار کا مالک دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے اس کے سڑا بے کا جائزہ لیتے ہوئے سلاخا پڑھ لیا، پاکستان کا نوجوان ترین لارڈ ہے جی ہونگا۔

وہ میرے اوپر توجہ دینے بغیر کمپیوٹر کے سٹنوں سے کھیل رہا تھا۔ میں اس کی اس بے توجہی کی وجہ جانتا تھا، میں اپنے مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے پہنچ گیا تھا۔ میں جانتا تھا وہ ان دس منٹوں میں اپنا کام مکمل کرے گا اور اس کے بعد پورا آدھ گھنٹہ میرے ساتھ گپ لگائے گا۔ میں نے یہ دس منٹ اس کے دفتر کے جائزے میں صرف کرنا تھے، میں نے ایک بار پھر حدود دار کا معائنہ شروع کر دیا۔ یہ دس باقی بارہ کا ایک درمیانے درجے کا دفتر تھا جس میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی لیکن وہاں بے تھا شامستانی اور روشنی تھی۔

دس منٹ بعد وہ میری طرف مڑا، مجھے مسکرا کر دیکھا، میرے ساتھ ہاتھ ملا یا اور ہم دونوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئے، اس نے کافی مشین سے کافی کے دو گم بنائے، دونوں گم میرے سامنے رکھے اور ہماری گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے اس سے اس ترقی کاراز پوچھا، وہ اٹھا، کمپیوٹر کے پاس پڑی ایک تصویر اٹھائی اور لا کر میرے سامنے رکھ دی۔ یہ چند ٹیلوں کی تصویر تھی، وہ دوبارہ واپس گیا اور ایک اور تصویر اٹھالایا۔ یہ خشک پہاڑوں کے درمیان گھرے ایک پسماندہ گاؤں کا کھنڈ تھا۔ وہ واپس گیا اور تیسری تصویر اٹھالایا یہ مکہ شہر کا فضائی دیکھ تھا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ بولا یہ نیلے حضرت ابراہیم کی جائے پیدائش ہیں۔ ان ٹیلوں کی

جگہ بھی وہ شہر آباد تھا جس میں حضرت ابراہیم نے پرورش پائی تھی۔ اس نے دوسری تصویر پر انہی رنگی یہ وہ چھوٹی سی ہستی ہے جس جگہ آج دنیا کا سب سے بڑا روحانی مرکز قائم ہے۔ یہ مکہ کا چند سو سال پرانا کھنڈ ہے اور وہ تیسری تصویر کی طرف مڑا یہ آج کا مکہ شہر ہے، یہ شہر آج دنیا کے خوشحال ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس سے پوچھا "لیکن ان تینوں تصویروں کا تمہاری کامیابی کے ساتھ کیا تعلق؟" وہ مسکرایا اور بولا "بہت گہرا تعلق ہے، میں نے جب یہ کہنی شروع کی تھی تو میرے پاس صرف ایک ملازم تھا، اس دور میں مجھے حضرت ابراہیم کی دعا پڑھنے کا اتفاق ہوا، حضرت ابراہیم جب حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو مکہ کی بے آب و گیاہ اور ویران زمین پر چھوڑ کر واپس جا رہے تھے تو انہوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر دعا کی تھی "اے پروردگار تو اس جگہ کو امن و امان کا شہر بنا دے اور اپنے فضل و کرم سے اس شہر میں بسنے والے ان تمام لوگوں کو ہر قسم کا رزق عطا فرما دے جو تجھ پر اور آخرت پر ایمان لے آئیں" وہ رکا اور دوبارہ گویا ہوا "میں نے جب یہ دعا پڑھی تو مجھے محسوس ہوا حضرت ابراہیم نے مکہ کی خوشحالی سے پہلے امن و امان کی دعائیں ہی لہذا خوشحالی اور ترقی امن و امان کی دوسری شے ہے جس نے فوراً اپنی کھینچ لی اس لئے امان قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں جب امن و امان کا فارمولا طے کرنے لگا تو مجھے محسوس ہوا کسی بھی ادارے، شہر اور کہنی میں اس وقت تک امن و امان قائم نہیں ہو سکتا جب تک وہاں میرٹ نہ ہو، جب تک وہاں مساوات نہ ہو، جب تک وہاں یکساں مواقع اور یکساں سہولتیں نہ ہوں، جب تک وہاں مالک اور ملازم کے حقوق برابر نہ ہوں اور جب تک وہاں گورے اور کالے، ادنیٰ اور اعلیٰ کے لیے ایک قانون نہ ہو۔ میں نے محسوس کیا جب تک لوگوں کو روزگار، تربیت، صحت اور انصاف نہیں ملتا اس وقت تک لوگ خود کو محفوظ نہیں سمجھتے اور جب تک لوگوں کو تحفظ کا احساس نہیں ہوتا اس وقت تک امن و امان قائم نہیں رہتا اور جب تک امن و امان قائم نہیں ہوتا اس وقت تک اس ادارے میں خوشحالی نہیں آ سکتی، میں نے اپنے ادارے میں امن و امان قائم کر دیا چنانچہ آج تمہیں اس دفتر میں خوشحالی بھی نظر آ رہی ہے اور ترقی بھی۔"

وہ ذرا دیر رک کر بولا "آج سے ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم نے دنیا میں خوشحالی، ترقی اور رزق کی فراوانی کا فارمولا طے کر دیا تھا چنانچہ جب تک کسی ملک میں امن و امان نہیں ہوتا، اس وقت تک وہ ملک خوشحالی اور ترقی یافتہ نہیں ہو سکتا۔ تم امریکہ سے لے کر جاپان اور ملائیشیا سے دوغنی تک دنیا کے تمام خوشحال ملکوں کا پر وقائل دیکھ لو تمہیں ان سب میں امن و امان

مشترک ملے گا اور تم روائعہ سے افغانستان اور برازیل سے پاکستان تک تمام غیر ترقی یافتہ ممالک کا مطالعہ کر لو تمہیں یہ تمام ملک "لائینڈ آرڈر" کے مسائل کا شکار ملیں گے لہذا فرد ہو یا ملک ہوں وہ دنیا میں اس وقت تک خوشحالی اور ترقی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے جب تک وہ امن و امان قائم نہیں کرتے "وہ رکا اور نس کر بولا" ہم ترقی اور خوشحالی کے لیے دنیا بھر کے ماڈل کاپی کر رہے ہیں لیکن ہم نے آج تک قرآن مجید کی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 126 نہیں پڑھی جس میں حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ سے مکہ کے شہریوں کے لیے رزق سے پہلے امن و امان کی دعا کی تھی، ہم کتنے بے وقوف ہیں ہم قرآن مجید کو چھوڑ کر اس صدر رش کے پیچھے پھر رہے ہیں جس کی اپنی ترقی امن و امان کی مرہون منت ہے" میں نے شخصی سانس بھری اس کے خوشبو دار اور روشن دفتر کی طرف دیکھا اور باہر آ گیا باہر بدبو بھی تھی اندھیرا بھی اور افراتفری بھی میں نے محسوس کیا اگر ایک شخص امن کی بنیاد پر اتنی بڑی تبدیلی لاسکتا ہے تو حکومت اس اصول کو قانون بنا کر پورا معاشرہ کیوں نہیں بدل سکتی مجھے سمجھ نہیں آئی لہذا میں آگے بڑھ گیا۔

Kashif Azad@OneUrdu.com



عصر کی قسم

میں نے عرض کیا "خوبصاحب سائنس نے کمال کر دیا" قدرتی آفتیں اور بیماریاں انسان کے درپے سکتے تھے لیکن سائنس ان دونوں کے مل کے قریب پہنچ گئی ہے اب وہ وقت دور نہیں جب انسان آفتوں اور غذا بوں کے ہاتھ سے نکل آئے گا، وہ سکلر کر میری طرف دیکھتے رہے وہ نرم آواز میں بولے "مثلاً سائنس نے کیا کر دیا" میں نے عرض کیا "سر زلزلے، آتش فشاں، آندھیاں، طوفان اور سیلاب پانچ بڑی آفتیں ہیں سائنس نے ان آفتوں کی پیش گوئی کا سہم بنالیا ہے سائنس دانوں نے ایک ایسا کیمبرہ بنایا ہے جو آتش فشاں کے پیندے میں چلا جاتا ہے اور وہاں آنے والی تبدیلیاں نوٹ کر لیتا ہے ماہرین یہ تبدیلیاں دیکھ کر آئندہ پیش گوئی کر سکیں گے فلاں آتش فشاں فلاں دن اور فلاں وقت اہل پڑے گا اس سہم کے بعد آتش فشاں کے قریب آباد لوگ وہاں سے بروقت نقل مکانی کر سکیں گے یوں بے شمار لوگوں کی جانیں اور املاک بچ جائیں گی" خوبصاحب سکون سے سنتے رہے میں نے عرض کیا "زلزلے کے ماہرین نے ایک ایسی سلاخ بھی بنائی ہے جو زمین کی تہہ میں پچاس ساٹھ کلومیٹر تک چلی جائے گی اور یہ زمین کے اندر موجود پلیٹوں کی حرکت نوٹ کرے گی لہذا جو کسی کسی پلیٹ میں کسی قسم کی حرکت ہوگی ماہرین زلزلے سے کہیں پہلے زلزلے کی شدت اس کے مرکز اور اس سے متاثر ہونے والے علاقے کا تخمینہ لگا لیں گے ماہرین اس علاقے کے لوگوں کو بروقت مطلع کر دیں گے اور وہ لوگ

ززلے سے پہلے گھروں اور دفنوں سے باہر آ جائیں گے، یوں ہزاروں لاکھوں زندگیاں بچ جائیں گی، ماہرین نے عمارتوں کے ایسے ڈھانچے بھی بنائے ہیں جو ساڑھے نو درجے کی شدت سے آنے والے ززلے میں بھی عمارت کو نقصان نہیں پہنچتے دیں گے چنانچہ وہ وقت دور نہیں جب ززلے آئیں گے لیکن لوگ اطمینان سے اپنے معمول کے کام کرتے رہیں گے، خواجہ صاحب بڑی توجہ سے میری بات سنتے رہے، میں نے عرض کیا، "بیماریاں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہیں، سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے ہمارے جینز میں ساڑھے چار ہزار بیماریاں ہوتی ہیں، ہر بیماری کا ایک الگ جین ہوتا ہے، سائنس دانوں نے اڑھائی ہزار مہلک بیماریوں کے جینز تلاش کر لئے ہیں لہذا اب وہ وقت دور نہیں جب سائنس دان تکلیف شروع ہونے سے پہلے کسی شخص کا معائنہ کریں گے، اس میں پروان چڑھنے والے جینز دیکھیں گے اور ان جینز کو صحت مند جینز کے ساتھ بدل دیں گے، یوں مریض مرض کے حملے سے پہلے ہی صحت مند ہو جائے گا، انسانی کلوننگ کا عمل بھی شروع ہونے والا ہے، اگلے دس بیس بیس میں انسان مرنے سے پہلے دوبارہ جنم لینا شروع کر دے گا، خواجہ صاحب نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا، میں نے عرض کیا، "اس طرح سائنس دانوں نے آنے والی بیماریوں اور مسائل کی پیدائش کے مراکز بھی تلاش کر لئے ہیں ان کا کھانا ہے اگر ان آفتوں کے مراکز تباہ کر دیئے جائیں تو یہ آفتیں پیدا نہیں ہو سکیں، سائنس دان ایسے آلے بھی بنا رہے ہیں جو ان ہواؤں، ان پانیوں اور ان موجوں کو اکٹھا نہیں ہونے دیں گے جو اکٹھی ہو کر آندھی، سیلاب اور طوفان بنتی ہیں چنانچہ اگلے بارہ برسوں میں انسان ان تینوں آفتوں پر بھی قابو پالے گا لہذا خواجہ صاحب آنے والا وقت انسان کے لئے بڑا آئیڈیل ہوگا، دنیا میں انسان کے لئے کوئی چیلنج نہیں ہوگا، لوگ مطمئن آرام دہ اور سکھی زندگی گزاریں گے۔"

خواجہ صاحب نے قہقہہ لگایا اور مجھے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ کر بولے، "تم بڑے بے وقوف ہو، یہ قدرتی آفتیں اتنی بڑی دشمن نہیں ہیں جتنا انسان انسان کا دشمن ہے۔ آج تک انسان نے انسان کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان پچھلے دس ہزار سال میں قدرتی آفتیں مل کر انسان کو نہیں پہنچا سکیں، تم یہ دیکھ لو 18 اکتوبر کے ززلے میں جتنے لوگ مارے گئے تھے اس سے پانچ گنا زیادہ لوگ ہماری سڑکوں پر حادثوں میں مارے جاتے ہیں، ہر سال ہسپتالوں کے ہاتھوں جتنے مسائے قتل ہوتے ہیں، جتنے بچے اپنے باپ قتل کرتے ہیں، آتشاؤں کے ہاتھوں جتنے خاندان مارے جاتے ہیں، جتنے خاندان اپنی بیویوں کو قتل کرتے ہیں، ڈاکوؤں کے ہاتھوں جتنے راگبیر مارے جاتے

ہیں اور جتنے دوست ہر سال دوستوں کو قتل کرتے ہیں، یہ ساری بلاکتیں قدرتی آفتوں میں مرنے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں، بیش جیسے لوگ اپنی انا کی تسکین کے لئے کتنے لوگ مار دیتے ہیں، دہشت گردوں کے ہاتھوں کتنے لوگ مارے جاتے ہیں، کشمیر، فلسطین، افغانستان، سری لنکا، عراق اور چین میں انسانوں کے ہاتھوں کتنے انسان مارے گئے، گورے کے ہاتھوں کتنے کالے مارے گئے اور سرخ رو انسان کتنے پیلے انسانوں کو قتل کرتے ہیں یہ تعداد قدرتی آفتوں کا لقمہ بننے والے انسانوں سے کہیں زیادہ ہے، ناگاساکی پر بم کس نے پھینکا تھا، ایک انسان نے! اس کا نشانہ کون بنے دوسرے انسان، دوسری اور پہلی جنگ عظیم کس نے شروع کی تھی، ایک انسان نے، اس جنگ کا لقمہ کون بنے دوسرے انسان، کوریا کی جنگ کس نے پھیرنی تھی، ویتنام پر حملہ کس نے کیا تھا، روس افغانستان جنگ کس نے شروع کی تھی، افغانستان اور عراق پر حملہ کس نے کیا تھا؟ انسان نے، اور ان جنگوں سے کس کو نقصان پہنچا، انسان کو؟ بارہ اکتوبر کا واقعہ کس کا کمال تھا؟ انسان کا اور اس کا نقصان کس کو پہنچا؟ انسان کو؟ اس دنیا میں بھائی کے ہاتھوں بھائی اور دوست کے ہاتھوں دوست مارا جاتا ہے، لہذا انسان کا لہذا انسان کو لہذا انسان اور لہذا انسان سے مشابہ نہیں، انسان کا انسان سے مقابلہ ہے اور جب تک انسان کی شرست میں تبدیلی نہیں آتی، یہ دنیا دارا میں نہیں بن سکتی، اس زمین پر تجزیہ کا عمل نہیں رک سکتا۔

میں خوبصورت صاحب کی بات غور سے سنتا رہا، انہوں نے فرمایا، "انسان، انسان سے خائف ہے، وہ جب بھی ڈرا سا خوشحال ہوتا ہے، اسے جب بھی ڈرا سا اقتدار یا اختیار ملتا ہے، وہ جب بھی ڈرا سی کامیابی پاتا ہے تو وہ دوسرے انسان کو تکلیف دینا شروع کر دیتا ہے، وہ آم کھا کر گھنٹیاں مسمائے کے گھر پھینک دے گا، وہ دو لاکھ کا کتا خریدے گا اور یہ کتا دوسرے کے دروازے پر باندھ دے گا، وہ اینٹیم بم بنا کر چاہے گا ساری دنیا اس کے قدموں میں جھک جائے اور وہ بادشاہ کا مصاحب بن کر چاہے گا سب لوگ اسے سلام کریں، سب لوگ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں، اب دوسری طرف بھی انسان ہوتا ہے، اس کے اندر بھی وہی خون، وہی انا اور وہی ہٹ دھرمی ہوتی ہے، لہذا انسان انسان کے ساتھ نگر ا جاتا ہے اور آخر میں دونوں فنا ہو جاتے ہیں چنانچہ انسان کی انسان کے ساتھ جنگ میں پورس بھی مارا جاتا ہے اور سکندر بھی، دونوں خسارے میں رہتے ہیں، یہ اس زمین کا قانون ہے، لہذا انسان جب تک مقدونہ، سرقد اور دانشمن کے اقتدار تک محدود نہیں رہتا، وہ جب تک دوسرے انسان پر حکمرانی کی خواہش ختم نہیں کرتا اور وہ جب

تک دوسرے لوگوں سے چھیڑ چھاڑ بند نہیں کرتا اس وقت تک انسان کے ہاتھوں انسان مارا جاتا رہے گا اس وقت تک اس زمین پر امن نہیں ہوگا۔ میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا انہوں نے فرمایا "سائنس دانوں کو قدرتی آفتوں کی بجائے انسانی شرمست کا کوئی علاج دریافت کرنا چاہیے انہیں کوئی ایسی دوا ایجاد کرنی چاہیے جسے کھانے کے بعد صدر بٹش اور صدر ام حسین کی انا پر سکون ہو جائے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکراتا بند کر دیں جسے کھانے سے صدر پرویز مشرف اور نواز شریف کے اختلافات ختم ہو جائیں اور وہ دونوں خود کو کمزور اور چند سانسوں کے مہمان انسان سمجھ لیں جسے کھانے سے طالبان اور امریکہ ایک دوسرے کو تسلیم کر لیں جسے کھانے سے ایران اور امریکہ ایک دوسرے کی آزادی اور زندہ رہنے کا حق مان لیں جسے کھانے سے افسان انسان کو معاف کر دے اور جسے کھانے سے انسان انسان سے ٹکراتا بند کر دے"

میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا انہوں نے فرمایا "یقین کرو ایک جنگل میں دو شیر

سکون اور آرام سے رہ سکتے ہیں لیکن ایک چھت کے نیچے دو انسان لڑنے، ٹکرائے اور مرے بغیر

زندگی نہیں گزار سکتے۔ یہاں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہاری جسم انسان تمہارے جسم ہے۔"



سات جمع سات جمع ایک

بادشاہ نے عجیب خواب دیکھا اس نے دیکھا "سات سوئی تازی گلہ میں سات دہلی
 چنگی کا تیل کو کھاری ہیں اور گندم کی سات ہری بھری بالیاں ہیں اور مان کے قریب سات سوئی
 بالیاں ہیں" بادشاہ نے اپنے درباریوں کو تعبیر لانے کا حکم دیا اور بارہوں نے بے شمار تعبیریں پیش
 کیں لیکن بادشاہ مطمئن نہ ہوا آخر میں بادشاہ کے ایک ساتی نے عرض کیا "حضور میں ایک قیدی کو
 جانتا ہوں وہ تعبیروں کا ماہر ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے خواب کی شرح پوچھ لوں"
 بادشاہ نے اجازت دے دی ساتی قید خانے میں چلا گیا اللہ کے بندے نے خواب سنتے ہی فرمایا
 "ملک پر سات سال خوش حالی کے بعد خشک سالی کا ایک خوفناک دور آئے گا یہ دور سات سال
 جاری رہے گا ان سات برسوں کے بعد بارشوں کا ایک سال آئے گا اس سال خوب بارشیں ہوں
 گی تم بادشاہ سے کہو وہ سات برس تک مسلسل بھتی بازی کرانے اس سے جو فصل حاصل ہو اسے
 بالیوں سمیت ذخیرہ کرنے جب خشک سالی کے سات سال آئیں تو وہ یہ ذخیرہ شدہ اناج عوام میں
 تقسیم کر دے اس حکمت سے لوگ قحط سے بچ جائیں گے" ساتی یہ پیغام لے کر بادشاہ کے پاس
 چلا گیا اس کے بعد کہانی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے مگر یہ دور ہمارا موضوع نہیں ہمارا موضوع
 سات جمع سات جمع ایک سال ہے۔

یہ واقعہ حضرت یوسف سے متعلق ہے اور قرآن مجید سمیت تمام آسمانی کتب اس کی

حقانیت کی گواہی دیتی ہیں اس واقعے میں سائنس، ٹیکنالوجی، علم اور عبرت کی بے شمار نشانیاں پوشیدہ ہیں ان نشانوں میں سے ایک نشانی "ویدر سائیکل" یا موسمیاتی دور ہے سائنس دانوں نے اس واقعے سے ہزاروں سال بعد یہ اندازہ لگایا دنیا کے مختلف خطوں میں سات سے پندرہ سال پر محیط دو قسم کے موسمیاتی سائیکل ہوتے ہیں پہلی قسم کے سائیکل کو ویدر سائیکل یا مرطوب موسم کہتے ہیں جبکہ دوسری قسم ڈرائی سائیکل یا خشک موسم کہلاتی ہے یہ دونوں سائیکل ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں ویدر سائیکل کے ابتدائی سات برسوں میں خوب بارشیں ہوتی ہیں اس کے بعد بارشوں کی شرح کم ہونا شروع ہو جاتی ہے یہ سلسلہ سات سال تک جاری رہتا ہے اور اس کے آخر میں ڈرائی سائیکل شروع ہو جاتا ہے اس سائیکل کے ابتدائی سات برسوں میں بارشیں تقریباً ختم ہو جاتی ہیں اور اس خطے میں قحط سالی اور خشک سالی کا آغاز ہو جاتا ہے یہ سلسلہ سات سال تک جاری رہتا ہے ان سات برسوں کے آخر میں بارشوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اگلے سات برسوں میں بارشوں کی رفتار اور سائز میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جاتا ہے جب یہ سات سال پورے ہوتے ہیں تو دوبارہ ویدر سائیکل شروع ہو جاتا ہے موسموں کے سائیکل تو ہمیں کا مستقبل میں طے کرتے ہیں جو تو میں ان سائیکلوں کو مد نظر رکھ کر آبی ذخائر کا بندوبست کرتی ہیں جو تو میں ویدر سائیکل میں اپنے ڈیم اور جمیلیں بھر لیتی ہیں جو تو میں آنے والے موسموں کو سامنے رکھ کر فصلیں بولتی اور کاشتی ہیں اور جو تو میں قدرت کے اس فارمولے کو سامنے رکھ کر خوراک کے ذخیرے تیار کر لیتی ہیں وہ تو میں پوری آبرو کے ساتھ مشکل وقت سے عہدہ برآ ہو جاتی ہیں وہ خشک سالیوں اور قحط سے بچ جاتی ہیں لیکن جو تو میں قدرت کے اس نظام کے تیر نہیں سمجھتیں اور جو قدرت کے نظام کو سامنے رکھ کر اپنی حکمت عملی تیار نہیں کرتیں وہ خشک سالی اور قحط کا شکار ہو جاتی ہیں وہ مسائل میں گھر جاتی ہیں اور ان کا حال مستقبل کے اندیشوں میں چپکولے لینے لگتا ہے۔

پاکستان میں 1998ء تک ویدر سائیکل تھا اس دور میں پاکستان میں بے تہاشہ بارشیں ہوئیں ہم نے اس وقت سے پہلے قدرت کے نظام کو سامنے رکھ کر آبی ذخائر تشکیل نہیں دیئے تھے لہذا جب اللہ تعالیٰ کی رحمت ہماری زمین پر نازل ہوئی تو ہماری بے توفانی کے باعث اس رحمت نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی اس دور میں پاکستان میں بے شمار سیلاب آئے ہمارے کئی شہر قہیے اور دیہات اس سیلاب میں بہہ گئے ہم دنیا میں آفت زدہ علاقہ قرار پائے اس دور کے آخر میں 1999ء سے ہمارا ڈرائی سائیکل یا خشک دور شروع ہو گیا ہمارا یہ سائیکل پندرہ سال

جاری رہے گا 1999ء سے ہمارے ملک میں بارشوں میں کمی آنا شروع ہو گئی 2006ء سے اس ڈرائی سیزن کی پیک شروع ہو رہی ہے مئی 2006ء سے ہماری خشک سالی کے سات سال شروع ہو رہے ہیں ان سات برسوں میں ہمارا بلوچستان، سندھ اور جنوبی پنجاب خشک سالی سے بری طرح متاثر ہوگا یہ سلسلہ 2014ء تک جاری رہے گا اس کے بعد ہم ایک بار پھر دہت سیزن میں داخل ہو جائیں گے 2014ء سے بارشوں کا ہلکا پھلکا سلسلہ شروع ہوگا یہ سلسلہ 2021ء تک چلتا رہے گا 2021ء سے ہماری بارشیں شروع ہوں گی اور اس کے بعد 2028ء تک اس خطے میں انتہائی خوفناک بارشیں ہوں گی ہمارے ملک میں اس قدر سیلاب اور طوفان آئیں گے کہ ہمیں پاؤں تک رکھنے کیلئے خشک زمین نہیں ملے گی لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں ہمارا فوری مسئلہ انتہائی خوفناک ڈرائی سائیکل ہے اور ہم اس سائیکل کے دہانے پر کھڑے ہیں مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے حکومت کو اس سائیکل کا احساس ہے لہذا حکومت نے آنے والے برسوں میں صرف ان فصلوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے جنہیں کم پانی کی ضرورت ہوتی ہے اس دور میں زیادہ پانی چوسنے والی فصلوں کی حوصلہ دہنی کی جائے گی حکومت اس سال کپاس کے علاقے کو پانی دے گی جبکہ چاول اور گنے کی فصل کو زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی مجھے ان صاحب کی گفتگو سے اندازہ ہوا تھا یہ آنے والے برسوں میں چینی اور چاول کی قیمتوں میں مزید اضافہ ہو جائے، مجھے مزید محسوس ہوا یہ ڈرائی سائیکل جیج جیج کر رہا ہے ہمیں ملک میں نئے ڈیز اور جھیلوں کی اشد ضرورت ہے اگر ہم نے فوری طور پر بڑے فیصلے نہ کئے تو ہم آنے والے چند برسوں میں پانی کی ایک ایک بوٹہ اور روٹی کے ایک ایک ٹوالے کو ترس جائیں گے جن لوگوں کو یقین نہ آئے وہ راول ڈیم کا ایک پتھر لگائیں انہیں راول ڈیم کی خشک سطح سے ہمارے مستقبل کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا یقین کیجئے اگر ہم نے قدرت کا نظام نہ سمجھا تو یہ صورتحال پورے ملک میں پھیل جائے گی ہمارا پورا ملک راول ڈیم بن جائے گا۔

میں واپس حضرت یوسف کے واقعے کی طرف آتا ہوں جب انہیں قید سے نکال کر بادشاہ کے دربار میں لے جایا گیا تھا اور بادشاہ نے انہیں وزارت کی پیش کش کی تھی تو حضرت یوسف نے اپنے لیے پیداوار اور خزانے کی وزارت پسند فرمائی تھی بادشاہ نے اس کی وجہ پوچھی تو حضرت یوسف نے فرمایا "کیونکہ میں دیانت دار بھی ہوں اور صاحب علم بھی" اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قوموں کی ترقی کی بنیاد وضع کر دی ہے یہ بنیاد دیانت اور علم پر استوار ہے اللہ تعالیٰ کی نظر

میں جب کسی قوم کی پیداوار اور خزانے کی وزارت دیانت دار اور صاحب علم لوگوں کے پاس ہو تو وہ قوم ترقی کی معراج کو چھو لیتی ہے، کاش ہمیں بھی خزانے اور پیداوار کے شعبوں میں ایسے لوگ مل جائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم اور دیانت کی دولت سے نوازا رکھا ہو جو قدرت کا سات جمع سات جمع ایک کا فارمولا سمجھتے ہوں جو اللہ کے نظام کو سامنے رکھ کر اس ملک کے وسائل کی تشکیل کریں جو دہلی پتلی گائیوں کو سوئی تازی گائیوں سے بچائیں جو سات ہری بالیوں اور سات خشک بالیوں کا فرق سمجھتے ہوں اور جو اس ملک کے ساتھ تعلق ہوں۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

باب وولمر جیسا دل

راہٹ انڈریو وولمر عرف باب وولمر اور پاکستانی قوم میں ایک واضح فرق تھا اور یہ فرق

قیامت تک برقرار رہے گا۔ Kashif Azad@OneUrdu.com

باب وولمر نے تین سال کی عمر میں بیسٹ سکولر اور 24 اگست 1972ء کو ٹیسٹ کرکٹرز بنا

اور 17 مارچ 2007ء تک کرکٹ کی دنیا میں رہا۔ باب وولمر کا کرکٹ کیریئر عملی طور پر 1984ء میں ختم ہو گیا جس کے بعد اس نے ساؤتھ افریقین ہائی سکول کی کوچنگ شروع کر دی وہ 1991ء میں وارک شائر کا کوچ بن گیا۔ وارک شائر نے اس کی کوچنگ میں چار ٹورنامنٹ کھیلے اور ان میں سے تین ٹورنامنٹ جیت لئے وہ 1994ء میں ساؤتھ افریقہ کی کرکٹ ٹیم کا کوچ بن گیا۔ باب نے آنے والے دنوں میں ساؤتھ افریقہ کو کرکٹ کنٹری بنا دیا 1994ء سے 1999ء ساؤتھ افریقہ کی کرکٹ ٹیم کا سنبری دور تھا اس دور میں کروٹے، جوتی روڈ اور شان پولاک ایسے بہترین کھلاڑی پیدا ہوئے یہ کھلاڑی باب وولمر کی محنت کا نتیجہ تھے باب وولمر کی کوچنگ میں ساؤتھ افریقہ نے 73 فیصد ون ڈے انٹرنیشنل اور 10 ٹیسٹ سیریز جیتیں 1999ء کے ورلڈ کپ میں باب وولمر ساؤتھ افریقہ کا کوچ تھا اس نے ورلڈ کپ کو اپنے لئے ہدف مقرر کر رکھا تھا لیکن بد قسمتی سے ساؤتھ افریقہ اور آسٹریلیا کے درمیان میچ ہائی ہو اور ساؤتھ افریقہ کسی فائل ہار گیا۔ باب وولمر نے اسے اپنی ناکامی سمجھا لیا اس نے کوچنگ سے استعفیٰ دے دیا۔ پاکستان نے 2004ء میں باب

دولمر کی خدمات حاصل کیں، وہ پاکستان آیا اور اس نے ہماری کرکٹ ٹیم کی کوچنگ سنبھال لی، باب کا خیال تھا پاکستانی ٹیم اس کی قیادت میں 2007ء کا ورلڈ کپ جیت لے گی لیکن مارچ 2007ء میں ورلڈ کپ شروع ہوا تو پاکستانی ٹیم نے باب دولمر کو ہلا کر رکھ دیا، 13 مارچ کو پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان پہلا میچ تھا، پاکستان یہ میچ 54 سکور سے ہار گیا، دوسرا میچ 17 مارچ کو آئرلینڈ کے ساتھ ہوا، آئرلینڈ تاریخ میں پہلی بار ورلڈ کپ کے میدان میں اترا تھا لہذا ماہرین آئرلینڈ کی ٹیم کو "بے بی ٹیم" کہتے تھے، میچ شروع ہوا تو آئرلینڈ کی بے بی ٹیم نے دنیا کی بہترین کرکٹ ٹیم کو 132 سکور پر اڑا دیا، پاکستان نے باؤلنگ شروع کی تو آئرلینڈ نے 41 اوررز میں 132 سکور بنائے، یوں پاکستان بچوں کے ہاتھوں ورلڈ کپ سے باہر ہو گیا، مبصرین نے پاکستان کی ناکامی کو "میچ گلٹنگ" قرار دے دیا، ماہرین کا خیال تھا آئرلینڈ "کرکٹ نوراژم" کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب آئرلڈ ٹیم پاکستان جیسے کسی بڑے ملک کو شکست دے دیتی چنانچہ آئرلینڈ نے خزانے کے من کھول دیئے۔ باب دولمر نے اس ناکامی کو سنجیدگی سے لے لیا، وہ ہونٹل کے کمرے میں گیا، کرسی پر بیٹھا، اس نے ناکامی کی وجوہات پر سوچنا شروع کیا اور اسے

دوست ایک ہو گیا اور وہ چنانچہ کے ہاتھ میں دم توڑ گیا، باب دولمر کا یہ حادثہ اس وقت پیش آیا جب ہماری کرکٹ ٹیم اپنی ناکامی کو اللہ تعالیٰ کا امتحان قرار دے رہی تھی اور قوم کو سیاہ بکرے ذبح کرنے اور کفارہ ادا کرنے کے مشورے دیئے جا رہے تھے۔

میں نے جب سے باب دولمر کے انتقال کی خبر پڑھی ہے، میں اس وقت سے سوچ رہا ہوں پاکستان کی شکست پر ایک برطانوی کوچ کیوں مر گیا اور اس تاریخی ہزیمت پر جناب ڈاکٹر نسیم اشرف اور مولانا انضمام الحق کیوں زندہ ہیں؟ یہ سوال وہ فرق ہے جو پاکستانی قوم کو باب دولمر جیسے لوگوں سے الگ کرتا ہے، ہم لوگ بنیادی طور پر شیخ رشید کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں، پچھلے دنوں ٹرین کے ایک حادثے کے بعد لوگوں نے شیخ رشید سے ریلوے کی وزارت سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا تھا تو ہمارے سدا بہار وزیر نے فرمایا تھا "میں وزیر ہوں ٹرین کا ڈرائیور نہیں، شیخ رشید صاحب کے یہ خیالات پاکستانی قوم کا ڈرٹن اور فلسفہ حیات ہیں اور یہ فلسفہ حیات ہماری بقاء کی وجہ بھی ہے لہذا آپ دیکھ لیجئے 1971ء کے سانحے سے چیف جسٹس کی باعزت حراست تک ہم لوگ ہر قسم کے بحران میں نہ صرف زندہ رہے بلکہ شیخ رشید کی طرح سینہ تان کر دنیا میں چلتے پھرتے بھی ہیں، یہ باب دولمر کی بد قسمتی تھی وہ پاکستان میں رہنے کے باوجود ہم سے سینہ تاننے کا فن نہ سیکھ سکا، اگر وہ

یہ فن سیکھ لیتا تو وہ ہونٹوں کے تہا کمرے میں یوں نہ مارا جاتا، وہ نیول چیف منصور الحق کی طرح وکٹری کا نشان بناتا ہوا اسلام آباد انٹیر پورٹ پر اترتا، کیمروں کی طرف دیکھ کر مسکراتا اور زیادہ بہتر سراعات پر زندگی گزارتا رہتا لیکن میں نے عرض کیا ناں باب دولہرا اور پاکستانی قوم میں ایک فرق تھا اور باب دولہر کی جان اس فرق نے لی تھی یہ فرق اخلاقیات کی اعلیٰ میں نمبر کہلاتا ہے، باب دولہر کا نمبر زندہ تھا وہ اپنے دل کے "نیب" کا سامنا نہ کر سکا لہذا اس نے جان دے دی۔

آپ باب دولہرا اور پاکستانی معاشرے کو مارچ کے مہینے میں رکھ کر دیکھئے، 13 اور 17 مارچ کے مہینوں سے پہلے پاکستان میں 9 مارچ کا "ورلڈ کپ" ہوا تھا اس ورلڈ کپ میں یونیفارم میں لمبوس جمہوریت جنرل پرویز مشرف نے چیف جسٹس آف پاکستان افتخار رحیم چوہدری کو گھر بنا کر غیر فعال کر دیا تھا، نو مارچ تک دنیا میں 245 ممالک تھے۔ ان میں سے 202 ممالک آزاد ہیں اور ان میں سے 193 ممالک اقوام متحدہ کے رکن ہیں، دنیا کے ان 245 ممالک 202 آزاد ملکوں اور اقوام متحدہ کی 193 ریاستوں میں پاکستان واحد ملک تھا جس کی تاریخ میں 9 مارچ کا دن آیا تھا لیکن اس 9 مارچ کو پاکستان کے 16 کروڑ عوام شیخ رشید بن گئے اور انہوں نے مسکرائے، ہم ان دنوں کے فلائنگ ڈون میں چٹا چٹا مہم کیا کر سکتے ہیں، آپ حریف دلچسپ امر مہم ملاحظہ کیجئے اس وقت پاکستان میں تیرہ ہزار شعبے، 7 کروڑ 67 لاکھ 41 ہزار 3 سو جوان شہری اور 16 کروڑ 4 لاکھ 21 ہزار 5 سو 12 لوگ ہیں لیکن ان لوگوں ان جوانوں اور ان تیرہ ہزار شعبوں میں صرف وکیلوں، بچوں اور میڈیا کے کارکنوں نے 9 مارچ کے ظلم پر احتجاج کیا جبکہ باقی تمام لوگ گھر میں بیٹھ کر بارش سے لطف اندوز ہوتے رہے، طلعت عباس اسلام آباد کے نامور وکیل اور میرے دوست ہیں، نکل شام ان کا فون آیا تو میں نے ان سے عرض کیا "مارچ باب دولہرا اور دکھا، کامیاب ہے، آپ لوگوں نے پوری قوم کا فرض کفایہ ادا کر دیا، انہوں نے مسکرا کر جواب دیا "اگر ہمارے ساتھ چند ہزار عام لوگ بھی شامل ہو جاتے تو ہم ملک میں انقلاب لے آتے۔" طلعت عباس کی بات درست تھی، 21 مارچ تک چیف جسٹس کی معطلی پر صرف 18 بچوں نے استعفیٰ دیے تھے اور دکھا، نے صرف پانچ بڑے ججوں نکالے لیکن اس کے باوجود ان استعفوں اور ان مارچوں پر نہ صرف حکومت کی ٹائٹس کا پگھل گیا بلکہ حکومت کو ٹیلی ویژن پر جموت ہونے کے لئے کوئی وزیر نہیں مل رہا تھا، ذرا تصور کیجئے اگر پوری عدلیہ استعفیٰ دے دیتی یا پاکستان کے تمام جوان لوگ سڑکوں پر نکل آتے تو حکومت کا کیا بنتا؟ حکومت کہاں جاتی؟ لیکن بات

پھر باب دولر اور پاکستانی قوم کے فرق پر آ کر رک جاتی ہے باب دولر نے ٹیم کی شکست پر جان دے دی لیکن ہم لوگ جمہوریت اخلاقیات اور ضمیر کے سارے سچے ہارنے کے باوجود نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اپنے کندھوں پر جرأت اور بہادری کے تمغے بھی سجا رہے ہیں۔

میرا بس چلے تو میں پاکستان کے ہر شہر میں باب دولر کا مجسمہ بناؤں اور لوگوں سے درخواست کروں وہ روزانہ گھر سے نکلنے کے بعد ایک منٹ کے لئے اس مجسمے کے قریب رک جایا کریں اور اس مجسمے کو دیکھ کر سوچا کریں کیا قوموں کے لئے ڈری سکی زندگی قیمتی ہوتی ہے یا ایک عزت دار موت؟ لیکن شاید یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ زندہ ضمیر لوگوں کے مجسمے صرف ان ملکوں میں بنائے جاتے ہیں جہاں لوگوں کے دل زندہ ہوتے ہیں اور بد قسمتی سے ہم لوگ ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس میں 16 کروڑ لوگ تو ہیں لیکن کسی شخص کے جسم میں باب دولر جیسا دل نہیں۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

ایک منٹ چودہ سیکنڈ

ولیم ہیلیم امریکہ کا ایک ناکام نکلکاری تھا۔ اس کے والدین پولینڈ سے امریکہ آئے اور پوری زمینگی خوش حال ہونے کی کوشش کرتے رہے لیکن کامیاب نہ ہو سکے وہ مرنے سے پہلے یہ خواہش ولیم ہیلیم کو کر کے میں دے گئے، ولیم ہیلیم نے اکاؤنٹنگ کی تعلیم حاصل کی، اسے کانج سے واجبی سی ڈگری ملی، وہ مختلف دفاتروں میں دھکے کھاتا رہا لیکن اسے اپنی منشاء کے مطابق نوکری نہ مل سکی، اس نے تنگ آ کر امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کر لی، وہ دفتر خارجہ کے کپیوٹر سیکشن میں نچلے درجے کا کلرک بھرتی ہو گیا، ویت نام کی جنگ شروع ہوئی تو اسے امریکی حکومت کا ملازم ہونے پر شرمندگی ہونے لگی، اس نے استعفیٰ دے دیا، اس کے بعد اس نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک خفیہ اخبار "واشنگٹن فری پریس" نکالا، یہ ایک باغی اخبار تھا لہذا یہ اخبار اس کا ذریعہ روزگار نہ بن سکا، یہ مشغلہ ختم ہوا تو اس نے لکھنے لکھانے کا پیشہ اختیار کیا، امریکی حکومت کی استعماری پالیسیاں اس کا موضوع تھیں، اس نے "کنگ ہوپ" کے نام سے کتاب لکھی لیکن یہ کتاب کامیاب نہ ہو سکی، اس کے بعد وہ مختلف اخبارات، رسائل اور میگزینز میں مضامین لکھتا رہا لیکن اسے زیادہ قارئین نہ ملے، تاہم ایون کے بعد اس نے "روگ سٹیٹ" کے نام سے ایک اور کتاب لکھی مگر یہ کتاب بھی اس کی چھٹی کتابوں کی طرح ناکام ہو گئی، وہ تھک گیا، اس کی عمر 74 سال ہو گئی تھی لہذا اس نے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کیا، اس نے واشنگٹن ڈی سی میں ایک کمرے کا سٹوڈیو

فلٹ لیا اور اس فلٹ میں تنہائی کی زندگی گزارنے لگا، دو سارا دن ٹیلی ویژن دیکھتا، اخبارات اور کتابیں پڑھتا اور سو جاتا، اس کی واحد تفریح کنکئی کت ایونٹو کا چکر لگانا تھا، وہ اپنے فلٹ سے اترتا اور پکے پکے قدموں سے اس ایونٹو کے ایک سرے سے دوسری سمت تک جاتا اور وہاں سے واپس آ جاتا، اس کی خوداک انتہائی کم اور ضروریات زندگی نہ ہونے کے برابر تھیں، لہذا پیشین اور کچھنا کام کتابوں کی کمائی سے اس کا گزارہ ہو جاتا تھا، لیکن پھر اچانک اس کے مقدر کا ستارہ چکا اور وہ امریکہ کا مشہور ترین شخص ہو گیا، ایک دن میں اس کے لئے دو ہزار ایک سو اکیس ٹیلی فون کالز آئیں، یہ اتنی بڑی تعداد تھی کہ ٹیلی فون کہنی کی لائیں جام ہو گئیں، فردری کے مہینے میں امریکی اخبارات میں اس کے فلٹ کی اتنی تصویریں شائع ہوئیں کہ کنکئی کت ایونٹو پر پراپٹی کی قیمتیں دو گنا ہو گئیں، ولیم ہیلیم اس کے مقدر کے پیچھے اسامہ بن لادن کا ہاتھ تھا۔ جی ہاں، یہ اسامہ بن لادن تھا جس نے بوڑھے ولیم ہیلیم کی قسمت بدل دی۔

جنوری کے آخری ہفتے میں اسامہ بن لادن نے اپنی نئی کیسٹ جاری کی تھی، اس کیسٹ میں انہوں نے بٹس سمیت تمام امریکیوں کو مخاطب کیا، اس خطاب میں انہوں نے ولیم ہیلیم اور اس کی کتاب "روگس سٹیٹ" کا ذکر کیا اور پوری امریکی قوم کو مشورہ دیا، "اگر آپ لوگ امریکہ کو چھوڑنا چاہتے ہیں تو آپ ولیم ہیلیم کی کتاب پڑھیں، یہ شخص تمام امریکیوں سے زیادہ ذہین اور محمد ہے" اسامہ بن لادن نے ولیم ہیلیم کا لکھا ہوا ایک بیروگراف بھی پڑھا، اس بیروگراف میں ولیم ہیلیم نے لکھا تھا، "اگر میں امریکہ کا صدر ہوتا تو میں چند دنوں میں امریکہ پر ہونے والے حملے کو اسکتا تھا" میں سب سے پہلے ان تمام بیروخواتین اور ختم بچوں سے معافی مانگتا جو امریکی حملوں کا شکار ہوئے، اس کے بعد میں امریکی بربریت اور تشدد کے شکار لوگوں سے معافی مانگتا اور اس کے بعد میں ان کروڑوں لوگوں سے معذرت کرتا جو امریکہ کی نوآبادیاتی سوچ کا نشانہ بن رہے ہیں، یوں میں چند دنوں میں امریکہ کے خلاف موجود نفرت مٹا دیتا، اسامہ بن لادن کے ان الفاظ کی دہر تھی ولیم ہیلیم چند گھنٹوں میں امریکہ کا "ہاٹ کیک" بن گیا، اسامہ بن لادن کی اس مہربانی سے پہلے ولیم ہیلیم کی کتاب "ایمازاں ذات کام" پر دو لاکھ 5 ہزار 7 سو 65 ویں نمبر پر تھی، لیکن جوں ہی اسامہ بن لادن کے منہ سے ولیم ہیلیم کا نام نکلا تو 24 گھنٹے میں ولیم ہیلیم کی کتاب 26 ویں نمبر پر آئی، امریکہ کے گیارہ بڑے پرنٹنگ پریسوں نے دو دو سٹشوں میں کام کیا اور جب جا کر اس کتاب کی مانگ پوری ہوئی، ولیم ہیلیم نے صرف ایک مہینے میں ایک سو نو ملین ڈالر کمائے، وہ شخص جو چندہ جنوری تک دوسری ذیل روٹی کا رو اور نہیں تھا، وہ چندہ فردری تک ارب پتی بن چکا تھا اور اس کے گھر کے

سامنے پبلشروں کی لائن لگی تھی یہ تمام لوگ اس کے ساتھ ہی کتابوں کا معاہدہ کرتے چاہتے تھے لیکن ولیم ہیلیم ان لوگوں کو اپنے تین میگزینوں کے حوالے کر کے گائف کھیلنے چلا جاتا تھا، ولیم ہیلیم کو اس وقت تک امریکہ کی 18 اور یورپ کی 21 یونیورسٹیوں سے خطاب کی دعوت مل چکی ہے جبکہ سو کے قریب نوخیز خواتین اس کے ساتھ شادی کی تمنی ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے وہ شہرت، دو نیک نامی اور وہ دولت جو اسے چالیس برس کی مسلسل محنت سے نڈل سکی وہ دولت اور وہ شہرت اسے اسامہ بن لادن کے ایک منٹ چودہ سیکنڈ کے ذکر نہ دے دی، ولیم ہیلیم دنیا کی مشہور شخصیت بن گیا۔

میں نے جب ولیم ہیلیم کا یہ واقعہ پڑھا تو یقین کر لیا مجھے بڑی جلن ہوئی، مجھے ولیم ہیلیم اپنا ڈیٹن محسوس ہوا اور میں نے سوچا میں بھی دو کتابوں کا مصنف ہوں اور یہ کتابیں بچپن سے پانچ برس سے ٹھیک ٹھاک بزنس کر رہی ہیں لیکن انیس اسامہ بن لادن کو یہ کتابیں دیکھنے کی توفیق نہ ہوئی، اگر وہ ان پر ایک نظر ڈال لیتے اور اپنی اس کیسٹ میں آدھا منٹ میرا ذکر کر دیتے تو آج میں بھی ارب پتی ہوتا، میرے گھر کے سامنے بھی گھر سے نصب ہوتے اور دنیا جہان کے رپورٹرز میرے

تعاقد میں ہوتے اور سبھی انہیں اپنے تین میگزینوں کے حوالے کر کے گائف کھیلنے چلے جاتا

میں بھی کیوں کے انتہائی مہنگے ساگر خریدتا اور یہ ساگر ساگا کر پوری دنیا کو شیخ رشید کی طرح نفرت سے دیکھتا، مجھے محسوس ہوا اگر اسامہ بن لادن کے دل میں اپنے پاکستانی بھائیوں کے لئے ذرا سی بھی بھدروی ہوتی تو آج میں بھی امیر ہوتا لیکن انیس انہوں نے جب کسی غریب مصنف کو فائدہ پہنچانے کا فیصلہ کیا تو ان کی نظر انتخاب بھی امریکی رائیٹر پر ہی پڑی، انیس بھی امریکی ہی پسند آیا،

گو اس سارے کھیل میں مجھے اربوں روپے کا نقصان پہنچ چکا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے خوشی ہے عالمی مارکیٹ کے ہاتھ اپنی مصنوعات کی پبلسٹی کے لئے ایک نیا طریقہ آ گیا ہے، اب اگر کوئی جو تے بنانے والی کمپنی ڈیٹاٹ کے قریب پہنچے گی تو اس کی کوشش ہوگی وہ کسی نہ کسی طریقے سے اسامہ بن لادن کو قائل کر لے اور وہ اپنے خطاب میں امریکیوں کو اس کمپنی کے جو تے استعمال

کرنے کا مشورہ دے دیں، اسی طرح وہ جو کمپیوٹرز استعمال کرتے ہیں، وہ جس کمپنی کے مشروبات اور قبوہ ہوتے، وہ جس کمپنی کا ٹوٹھ برش اور پیسٹ استعمال کرتے ہیں، وہ جس کمپنی کا تولیہ، انڈر ویئر، بنیان اور کھنگھی استعمال کرتے ہیں، وہ جس کمپنی کا آئل آئل لگاتے ہیں، وہ جس کمپنی کا شہد اور گھوڑوں کھاتے ہیں، جس نسل کی بکری کا دودھ پیتے ہیں، جس ٹیکسٹائل کا کھدہ پہنتے ہیں، جس برانڈ کا کونگ آئل استعمال کرتے ہیں۔ جس کمپنی کا سوبائل اور ریڈیو خریدتے ہیں اور وہ جس

کچھنی کا سائیکل اور موٹر سائیکل استعمال کرتے ہیں یہ تمام کپنیاں بھی کسی نہ کسی طرح اسامہ بن لاڈن کو اپنے اپنے برانڈ کا نام لینے پر قائل کر لیں گی اور اس کے بعد ان کے شورز کے سامنے خریداروں کی نظار میں لگ جائیں گی، مجھے یقین ہے اگر ایک ہاریر ٹرینڈ چل نکلا تو مستقبل میں ایڈور ٹائزنگ کا سارا اسٹائل بدل جائے گا، کپنیاں، چھوٹی، موٹی اور کالی مائز کی بجائے اشتہارات میں اسامہ بن لاڈن کی تصویر شائع کریں گی اور اس کے بعد اعلان کریں گی یہ وہ صابن ہے جس نے اسامہ بن لاڈن کو چستی دی اور وہ تیس برس تک امریکہ کے قابو میں نہ آئے یہ وہ اگر تھی ہے جسے سٹاک کروہ تو راہ اور کے پہاڑوں میں سکون کی نیند سوتے تھے یہ وہ درری ہے جسے لے کر وہ کابل سے فرار ہوئے تھے اور یہ وہ تیل ہے جس کی ماش نے انہیں ہر قسم کی شرمندگی سے بچائے رکھا اور اس بوجھ میں وہ دینا منتر ہیں جو ان کی اصل طاقت ہیں وغیرہ اور لوگ ان چیزوں پر نوٹ پڑیں گے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں میں اس ٹیم میں اربوں روپے کا "لوڈز" ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے فخر ہے وہ اسامہ بن لاڈن جنہیں اس وقت امریکہ سمیت پوری دنیا دہشت گرد کہتی ہے ان کے عقلموں میں اتنی طاقت آتی تو تہ موجود ہے کہ وہ امریکہ کے 74 سال کے ایک غریب ناکام اور دیگر کمزور مصنف کو ایک منٹ 14 سیکنڈ میں ارب تہی بنا سکتے ہیں وہ ایک کم نام شخص کو شہرت کی بلند یوں تک پہنچا سکتے ہیں وہ ایک گمشدہ، پسماندہ اور محروم شخص کو ٹیلی ویژن سکرین پر لے آتے ہیں اور وہ دو لاکھ 5 ہزار 7 سو 65 ویں درجے پر پڑی کتاب کو چوبیس گھنٹوں میں 26 دیں پوزیشن پر لاسکتے ہیں وہ رووی کی دکانوں میں کپنے والی کتاب کو کاؤنٹر اور بک شیلف میں لاسکتے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے یہ وہ طاقت ہے جس سے ہش سمیت دنیا کے تمام حکمران محروم ہیں اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت صرف اسامہ بن لاڈن کو بخشی ہے۔

صرف ایک پلے کارڈ

جبران ہاشمی پاکستانی برطانوی شہری تھا وہ 20 برس کی عمر میں برطانوی فوج میں بھرتی ہوا وہ 2004ء میں افغانستان میں تعینات ہوا اور 2006ء میں طالبان کے خلاف لڑتے ہوئے جاں بحق ہو گیا۔ جبران ہاشمی کی ہلاکت کی خبریں برطانوی میڈیا میں آئیں تو برطانیہ کی پاکستانی کیونٹی میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی پاکستانیوں کا خیال تھا امریکہ اور برطانیہ افغانستان میں مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں لہذا کسی مسلمان کو ظالموں کا ساتھ نہیں دینا چاہیے 2006ء کے آخر میں کسی رکن اسمبلی نے برطانوی پارلیمنٹ میں حکومت سے پوچھ لیا 'برطانوی فوج میں کتنے مسلمان افسر ہیں؟' حکومت نے انکشاف کیا برطانوی فوج میں 330 مسلمان سپاہی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر لوگ پاکستانی برطانوی شہری ہیں پاکستان کیونٹی نے اس انکشاف پر بھی برا متایا پاکستانیوں نے میڈیا 'مساجد اور کیونٹی فنکشنز کے ذریعے برطانیہ کی فوج میں موجود مسلمان فوجیوں کے خلاف تحریک شروع کر دی وہ پاکستانی برطانوی فوجیوں کو افغانستان اور عراق میں مسلمانوں کے خلاف لڑنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے' مسلمانوں کی یہ مہم بہت جلد برطانوی پولیس اور ایجنسیوں کی نظر میں آ گئی یہاں تک کہ 31 جنوری 2007ء کو میڈ لینڈز کا ڈسٹرکٹ رازم یونٹ نے ویسٹ میڈ لینڈ پولیس اور لندن میٹرو پولیٹن پولیس کی مدد سے برصغیر شہر میں پاکستانیوں کے 12 گھروں پر ریڈ کیا اور 8 پاکستانی نوجوان گرفتار کر لئے برطانوی پولیس کا کہنا تھا یہ نوجوان برطانوی فوج میں

موجودگی مسلمان فوجی کو اغواء کرنے اس کا سرتار نے اور اس کی ویڈیو شیپ نشر کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے یہ نوجوان اس عمل سے برطانوی فوج میں موجود مسلمان سپاہیوں میں خوف پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن پولیس ابتدائی آفتیش میں نوجوانوں کے خلاف الزامات ثابت نہ کر سکی مقامی آبادی نے بھی نوجوانوں کے کردار اور اچھی عادات کی گواہی دے دی برطانوی تجزیہ نگاروں کا بھی کہنا ہے نونی پلیئر کی حکومت اپنی ناکامیوں سے عوام کی توجہ بنانے کیلئے اس قسم کے جھکنڈے استعمال کر رہی ہے وہ امریکہ کی طرح برطانوی عوام کو بھی سیکورٹی کے بخار میں جھکا کرنا چاہتی ہے اور وہ برطانیہ میں بیسیائیوں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا کرنا چاہتی ہے یہ ایک صورتحال تھی اب دوسری صورتحال ملاحظہ کیجئے۔

31 جنوری کو جب پولیس نے پاکستانی مسلمانوں کے گھروں پر ریڈ کیا اور پوری دنیا کے میڈیا پر اس کی کوریج شروع ہوئی تو برصغیر کے گوروں نے پولیس کی اس حرکت پر شدید غصے کا اظہار شروع کر دیا برصغیر کی چار بڑی تنظیموں نے حکومت کے اس اقدام کے خلاف پلے کارڈز بنائے اور یہ کارڈز لے کر فٹ پاتھوں پر گھومنے لگے اور شاہک سنگھ کے سامنے کھڑے ہو گئے ان لوگوں کا کہنا تھا حکومت نہ صرف ان کے شہر کو بدنام کر رہی ہے بلکہ وہ برصغیر کے مسلمانوں اور بیسیائیوں میں کشیدگی بھی پیدا کر رہی ہے میں نے دو فروری کے ایک پاکستانی انگریزی اخبار میں اس نوعیت کی ایک تصویر دیکھی یہ برصغیر شہر کے ایک فٹ پاتھ کی تصویر تھی تصویر میں چند طالب علم فٹ پاتھ سے گزر رہے تھے جبکہ ان کے سامنے ایک بزرگ خاتون ہاتھ میں سفید رنگ کا پلے کارڈ اٹھا کر کھڑی تھی پلے کارڈ پر لکھا تھا "I am Offended" یہ خاتون انگریزی تھی اور تھیں بیسیائی بھی ہوگی میں نے جب سے یہ تصویر دیکھی ہے وہ منظر وہ پلے کارڈ اور وہ بزرگ خاتون میرے دماغ میں بیٹھ گئی ہے میں بری طرح اس منظر کا حصہ بن گیا ہوں میں پچھلے چار پانچ دنوں سے جہاں بھی جاتا ہوں یہ تصویر اور یہ منظر میرے ساتھ جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں معاشرے اور ملک اس بزرگ خاتون جیسے لوگوں کی وجہ سے زندہ اور تابندہ رہتے ہیں جن ملکوں جن معاشروں میں لوگ زیادتی پر احتجاج کرتے ہیں جن میں لوگوں کا ضمیر اور احساس زندہ ہوتا ہے صرف انھیں معاشروں کو حساس اور متحرک قرار دیا جاسکتا ہے ہم برطانیہ اور امریکہ کے اقدامات کو برا کہتے ہیں ہم امریکی اسرائیلی اور برطانوی سازشوں کی خدمت بھی کرتے ہیں لیکن ہم اس بزرگ خاتون جیسے لوگوں کو بھلا دیتے ہیں ہم بھول جاتے ہیں امریکہ اور برطانیہ کی

حکومتوں اور عوام کی سوچ میں بڑا فرق ہے، صدر ریش اور نوٹی پلیئر خالم ہیں ان کی پالیسیاں زیادتی پر مبنی ہیں لیکن برطانیہ اور امریکہ کے عوام کا رویہ مختلف ہے 2003ء میں امریکہ اور برطانیہ میں عراق پر حملے کے خلاف تاریخی جلوس نکلے لندن میں 12 لاکھ لوگوں نے جلوس نکالا جبکہ واشنگٹن اور نیو یارک میں 25 لاکھ لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے امریکہ میں رہ کر صدر ریش کے پتے جلانے مجھے اچھی طرح یاد ہے برطانیہ میں نکلنے والے جلوسوں میں لوگوں نے ایسے پلے کارڈ اٹھاد رکھے تھے جن پر صدر ریش اور نوٹی پلیئر کی تصویر تھی صدر ریش کے پاؤں میں ایک کتابیٹھا تھا صدر ریش نے اس کی ذبحیہ تمام کرکھی تھی اور کتے کی شکل برطانوی وزیر اعظم سے ملتی تھی۔

ہم اس کے مقابلے میں اگر مسلمان بالخصوص پاکستانی عوام کے احتجاج کا ذمہ داری سمجھیں تو ہمیں معلوم ہوگا ہماری نفرت صرف زبان تک محدود رہتی ہے ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر حکومتی اقدامات کی مذمت کرتے ہیں، ہم صرف ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی کرتے ہیں اور اس سرگوشی کو اپنا فرض سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں، پچھلے پانچ برسوں میں پاکستان میں کیا کچھ نہیں ہوا؟ لیکن اس پر عوام کا رد عمل کیا تھا، مکمل خاموشی پاکستان میں 128 لوگ گھروں سے غائب ہیں ان لوگوں کا کیا جرم تھا؟ ان کا جرم نماز روزہ اور راکھی تھی لہذا یہ لوگ گھروں سے غائب کر دیئے گئے ان لوگوں کی تشددی پر امریکہ اور برطانیہ کے اخبارات شور مچا رہے ہیں، غیر ملکی ٹیلی ویژن چینل ان پر فلمیں چلا رہے ہیں لیکن ہمارے اپنے لوگوں نے اس پر مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے آپ کراچی سے لے کر طورخم تک پاکستانی عوام کا رد عمل دیکھ لیجئے، کیا کسی طرف سے کوئی آواز کوئی چیخ اٹھ رہی ہے بد قسمتی سے کوئی نہیں! ہم لوگوں سے تو اتنا بھی نہیں ہو پایا کہ ہم دس روپے کا پلے کارڈ لیں اس پر سیاہ مار کر سے "I am Offended" لکھیں اور اپنے گھر کے سامنے کھڑے ہو جائیں، ہم مقامی سیاستدانوں کے دفتروں، پولیس سٹیشنوں اور بس سٹاپوں کے باہر کھڑے ہو جاتے، ہم اس طرح اپنا احتجاج ریکارڈ کرا سکتے تھے، ہمارے وزیرستان میں کیا ہو رہا ہے؟ وہاں دہشت گردی کی مذمت میں دہشت گردی ہو رہی ہے، وانا میں دھوکہ کرتے بچوں پر میزائلوں کی بوچھاڑ کر دی جاتی ہے اور اس بوچھاڑ میں نوے نوے لوگ شہید ہو جاتے ہیں لیکن اس ظلم اس زیادتی پر ہمارا رد عمل کیا ہوتا ہے؟ کیا ہم نے آج تک ان لوگوں کیلئے کسی قسم کا احتجاج کیا؟ کیا ہم نے انہیں اپنی ہمدردی اور محبت کا یقین دلایا؟ کشمیر پر پاکستانی حکومت کیا قدم اٹھانے والی ہے پوری دنیا اب تک اس قدم سے واقف ہو چکی ہے لیکن ہم نے عوامی سطح پر اس کا

کتنا نوٹس لیا؟ ملک میں مہنگائی اور بے روزگاری کا کیا عالم ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس پر احتجاج کیا؟ حق تو یہ ہے ہم میں سے کسی نے آج تک سراٹھا کر نہیں دیکھا؟ ہم نے کبھی سوچا اور دی کا مسئلہ کس سطح پر پہنچ چکا ہے اور ہر سال ہسنت کے موقع پر لاہور میں کتنے بچے ذبح ہو جاتے ہیں؟ اور کیا ہم نے آج تک ہسنت کے خلاف کوئی جلوس نکالا؟ سچ تو یہ ہے ہم بنیادی طور پر بے حسی کے اس مقام تک پہنچ چکے ہیں جہاں غیرت، ضمیر اور احساس جیسے لفظ دم توڑ جاتے ہیں جہاں انسان گوشت کا ایک بے حس ٹکڑا بن کر رہ جاتا ہے۔

مجھے برصغیر شہر کے فٹ پاتھ پر کھڑی اس بزرگ گوری نے احتجاج کا ایک نیا طریقہ سکھا دیا میں نے سوچا کاش ہم لوگ اس عورت کی پیروی کریں ہم آج سے انفرادی سطح پر یہ فیصلہ کر لیں ہم جب بھی کسی ظلم کسی زیادتی سے متاثر ہوں گے جب بھی ہمارا دل نولے گا تو ہم ایک پلے کارڈ لیں گے اس پر مجھے یہ فیصلہ منظور نہیں یا میں اس سے اتفاق نہیں کرتا یا یہ زیادتی بند کریں جیسے الفاظ لکھیں گے اور ایک آدھ گھنٹے کیلئے باہر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو جائیں گے ہم منہ سے کچھ نہیں بولیں گے کوئی نعرہ نہیں لگائیں گے کوئی گالی نہیں دیں گے ہم کوئی پتھر نہیں پھینکیں گے اور ہم کسی کو دھکی نہیں دیں گے نہیں ایک آدھ گھنٹہ پلے کارڈ تھا ہے زمین گے اور واپس چلے جائیں گے مجھے یقین ہے ہمارا یہ خاموش احتجاج ظلم کی بنیادیں تک بلا دے گا یقین کیجئے جو کام دس لاکھ بددعا میں مل کر نہیں کر سکتیں وہ کام ایک پلے کارڈ ایک گھنٹے میں سرانجام دے دیتا ہے۔



رائٹ اپروچ

احتجاج کا ایک طریقہ انڈونیشیا کے لوگوں نے اپنایا، انڈونیشیا میں پنڈ ویرنٹاس نام کی ایک گیس کیمپ قائم کرتی تھی۔ یہ کیمپ ہڈر ساگھی، ہوسد، ایلوڈیا، ناس، الیکٹریک، ملکیت، تھی، ان کے قریبی رشتے دار اس کیمپ کا انتظام و انصرام چلا رہے تھے پنڈ ویرنٹاس نے جاوا میں گیس کے کنوینٹور میں رکھے تھے، پچھلے سال جولائی میں جاوا کا ایک کنواں پھٹ گیا اور کنوینٹور سے مٹی اڑنے لگی، یہ کیمپ مٹی تھی اور یہ گارے کی صورت میں فضاء میں تیرنے لگی تھی، یہ مٹی جاوا کے پانچ سو دیہات میں پھیل گئی، لوگوں کے کھیت، دکانیں، گاڑیاں اور گھر برباد ہو گئے، فضاء میں گیس اور مٹی کی آلودگی سے آکسیجن کے مسائل پیدا ہوئے اور لوگوں کے لئے سانس لینا دو بھر ہو گیا، فضائی آلودگی کی وجہ سے دس ہزار دیہاتی جاوا سے نقل مکانی کر گئے، یہ ایک سنگین مسئلہ تھا، متاثرین نے کیمپ کے خلاف جلوس نکالے، اخبارات میں بیان دیے اور جلسے کئے، حکومت نے عوام کو مطمئن کرنے کے لئے متاثرہ علاقوں میں ماہرین کی ایک ٹیم بھجوا دی، پنڈ ویرنٹاس کو ایک آدھ ٹونس بھی جاری کر دیا گیا لیکن مسئلہ حل نہ ہوا، لوگوں نے جب حکومت کی سردمہری دیکھی تو انہوں نے احتجاج کا یہ انوکھا طریقہ وضع کر لیا۔

انڈونیشیا کے وفاقی دارالحکومت میں متاثرہ علاقوں کے بے شمار لوگ رہتے تھے، ان لوگوں نے ایک یونین بنائی، 26 ستمبر 2006ء کا دن متعین کیا، اس دن جاوا کے ہزاروں لوگ

گھروں سے نکلے ان کے ہاتھوں میں گارے اور کوزا کرکٹ سے بھرے شاپنگ بیگ تھے یہ لوگ سماجی بید کے وزیر ابور یاض الیکری کی رہائش گاہ کے سامنے پہنچے اور انہوں نے یہ شاپنگ بیگ وزیر کے گیٹ کے سامنے الٹ دیے ایک گھنٹے میں وزیر کے گھر کے سامنے کوزے کرکٹ کا پہاڑ کھڑا ہو گیا، پولیس نے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن بعد ازاں وہ بھی اس انوکھے احتجاج کو "انجوائے" کرنے لگی، ابور یاض الیکری نے میونسپل کارپوریشن کے عملے کو طلب کر لیا، کارپوریشن کا عملہ سارا دن کوزا کرکٹ صاف کرتا رہا، شام تک کوزا کرکٹ اور گارا صاف ہو گیا لیکن اس کی بدبو باقی رہی، مظاہرین نے اس کے بعد میڈیا سے خطاب کیا، ان کا کہنا تھا جاوا کے پانچ سو دیہات کے ہزاروں شہری پچھلے دو ماہ سے اس صورتحال کا شکار ہیں، اگر حکومت ایک وفاقی وزیر کے گھر سے کوزا کرکٹ اور گارا اٹھا سکتی ہے تو وہ متاثرین کے مکانوں سے گارا کیوں صاف نہیں کر سکتی، متاثرین کا کہنا تھا اگر حکومت نے پنڈ ویرنٹاس پر پابندی نہ لگائی اور اگر حکومت نے متاثرین کو ہر جانہ ادا نہ کیا تو وہ تمام وزیروں کے گھروں کے سامنے کوزے کے ڈبھر لگا دیں گے، لوگوں کا کہنا تھا وہ جاوا سے لے کر جکار تھک انسانی زنجیر بنائیں گے تمام لوگ شاپنگ بیگز میں گارا بھر لیں گے، یہ شاپنگ بیگ ایک سے دوسرے سے دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے شخص سے ہوتے ہوئے جکار تھک نہیں گے اور یوں ہم جاوا کا سارا گارا جکار تھک منتقل کر دیں گے۔ حکومت کے لئے یہ دھمکی "الارمنگ" تھی چنانچہ کابینہ کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا اور اگلے ہی روز مظاہرین کے تمام مطالبات مان لئے گئے، انڈونیشیا میں فضائی آلودگی کا قانون پاس ہوا اور متاثرین کی بحالی تک پنڈ ویرنٹاس کے تمام "آپریشن" روک دیے گئے، پنڈ ویرنٹاس نے مشینری منگوائی اور اس مشینری کے ذریعے جاوا کی نفاصا صاف کر دی۔

انڈونیشیا کے اس احتجاج کی دو بڑی خوبیاں تھیں ایک، مظاہرین نے احتجاج کے دوران شہر کی کوئی حق توڑی، کوئی جائز جھلایا، کسی دکان، مکان اور گاڑی پر حملہ کیا اور نہ ہی ٹریفک بلاک کی، لوگ اپنی اپنی گاڑیوں، موٹر سائیکلوں اور سائیکلوں پر آئے، اپنے شاپنگ بیگ وزیر کے گھر کے سامنے لائے اور پیچھے ہٹ کر چپ چاپ کھڑے ہو گئے، یونین کے صدر نے اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندوں کو اپنے لائحہ عمل کے بارے میں بتایا اور یہ لوگ پرامن طریقے سے منتشر ہو گئے، اس احتجاج کی دوسری خوبی نفسیات تھی، جاوا کے لوگ جانتے تھے حکومت اور حکومت کے کارندے جکار تھک میں بیٹھ کر گارے، کوزے کرکٹ اور بدبو کی سنگینی کا اندازہ نہیں لگا سکتے لہذا

جب تک وہ حکومتی عہدیداروں کو ان مسائل سے نہیں گزاریں گے حکومت متحرک نہیں ہوگی چنانچہ جاوا کے لوگوں نے سماجی وزیر کے گھر کے سامنے کوزا کرکٹ اور گارے کا پھاڑ کھڑا کر دیا اور حکومت کو مسئلے کی سنگینی کا فوراً اندازہ ہو گیا۔ اگر یہ لوگ اس کے برعکس پاکستانی طریقہ استعمال کرتے یہ ٹریفک بلاک کرتے 'شیشے توڑتے' گاڑیاں جلا دیتے اور سڑکوں پر نکل کر گالیاں دیتے تو اس کا وہی نتیجہ نکلتا جو پاکستان میں نکلتا ہے 'پولیس آتی' آنسو گیس چلتی 'لاٹھی چارج ہوتا' سٹیکروں ہزاروں لوگ زخمی ہوتے اور مسئلہ جوں کا توں رہتا۔

مجھے پچھلے دنوں برادر میں فیصل صالح حیات کے شہر جھنگ جانے کا اتفاق ہوا مجھے وہاں چند لوگ ملے ان لوگوں نے بتایا انگریز نے 1904ء میں جھنگ کو سرگودھا سے ملانے کے لئے دریا پر پل بنایا تھا 'یہ برج' 'چنڈ پل' کہلاتا ہے 'یہ پل ریلوے کے ذریعے جھنگ کو باقی ملک سے ملاتا ہے 'یہ اس علاقے کا واحد پل تھا لہذا جب موزگاڑیاں شروع ہوئیں تو یہ بھی اس پل سے گزرنے لگیں 'سانحہ برسوں میں گاڑیوں کی تعداد میں ہزار گنا اضافہ ہو گیا لیکن نیا پل نہیں بنا 'یہ پل اپنی طبیعت پروری کر چکا ہے۔ یہ کسی بھی وقت بڑے حادثے کا باعث بن سکتا ہے 'جھنگ کے عوام سانحہ برسوں سے نئے پل کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ صدر پرویز مشرف 'سابق وزیر اعظم میاں ظفر اللہ جمالی 'گورنر پنجاب اور وزیر اعلیٰ پنجاب پل کی تعمیر کا وعدہ بھی کر چکے ہیں لیکن یہ پل نہ بن سکا 'ان لوگوں کا کہنا تھا جو حکومت ایک پل نہیں بنا سکی وہ کالا باغ 'ذیم کیا بنائے گی 'میں ہنس پڑا اور میں نے ان سے عرض کیا 'اسلام آباد اور جھنگ میں بڑا فاصلہ ہے 'ہماری آدمی حکومت جھنگ کے نام سے واقف نہیں ہوگی 'ہمارے صدر اور ہمارے وزیر اعظم آج تک جھنگ نہیں آئے 'ہذا ان لوگوں کو جھنگ کے مسائل کا کیسے علم ہو سکتا ہے! اگر اسلام آباد میں کوئی پل نونا ہوتا 'کوئی سڑک خراب ہوتی یا کسی تالے سے بدبو اٹھ رہی ہوتی تو شام سے پہلے اس کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے 'کیوں؟ کیونکہ اسلام آباد حکمرانوں کا شہر ہے اور حکمران ان سڑکوں اور ان پلوں سے روز گزارتے ہیں 'اگر آپ چنڈ پل بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو پہلے اپنا مسئلہ حکمرانوں تک پہنچانا ہوگا اور اس کیلئے آپ کو انڈینیشیا کے لوگوں کی تقلید کرنی چاہئے۔

اگر ہم غور کریں تو جھنگ کے لوگ ہوں 'شہنشاہ پورہ' ننکانہ صاحب 'فیصل آباد' مظفر گڑھ 'راجن پور' اوکاڑہ 'رحیم یار خان' ذریعہ قازی 'بنوں' لنڈی کوتل 'حیدر آباد' دادو' تربت' پانچر جنم کے لوگ انہیں سب سے پہلے حکومت کی توجہ حاصل کرنی چاہیے 'انہیں اپنا مسئلہ مہذب اور شائستہ

طریقے سے حکومت تک پہنچانا چاہیے، انہیں چاہئے یہ جا دا کے لوگوں کی طرح متعلقہ وزیر کے دروازے کے سامنے گارے کا پہاڑ کھڑا کریں اور جب وزیر صاحب گھر سے باہر آئیں تو بڑی عاجزی سے عرض کریں ”سرسی ڈی اے کا عملہ ابھی آئے گا اور یہ گندا اٹھا کر لے جائے گا لیکن سر ہمارے شہر کا گند کون صاف کرے گا“ ان لوگوں کو چاہیے یہ اسلام آباد لاہور کراچی پشاور اور کونڈ کی کسی اہم سڑک کے کنارے بیٹھ جائیں اور اس سڑک سے گزرنے والے ہر اہم شخص سے عرض کریں ”جناب آپ کی سڑک اور پل تو بن چکا ہے لیکن ہمارا چنڈ پل اور ہماری سڑک کون بنائے گا“ اس سے بھی اچھا نسخہ پازنر شپ ہے مثلاً جنگ کے تمام لوگ ”پل فنڈ“ قائم کریں، سارا شہر اس فنڈ میں پیسے ڈالے اور اس کے بعد حکومت سے درخواست کرے ”جناب ہم نے اتنے پیسے جمع کرائے ہیں باقی پیسے آپ ڈالیں اور مہربانی فرما کر ہمارا پل بنادیں“ یہ مسائل حل کرنے کی ”رائٹ اپروچ“ ہے دنیا میں سب سے بڑا اور مضبوط رشتہ بچے اور ماں کا تعلق ہوتا ہے لیکن ماں بھی اس وقت تک بچے کو دودھ نہیں دیتی جب تک وہ روتا نہیں، ہمارے ملک کو بھی ایسے عوام چاہئیں جو تہذیب اور شائستگی کے دائرے میں روک روک دینے والے بچے بن جائیں۔

Kashii Azad@OneUrdu.com



صرف چند نو جوان چاہئیں

یہ آئیڈیاس کا تھا اس آئیڈیے پر کام کس نے شروع کیا کسی کو معلوم نہیں! اگر کسی کو معلوم بھی ہے تو بھی اتنی تفصیلی اتنی گہرائی میں جانے کی کیا ضرورت ہے، ہمیں تو صرف آئیڈیے تک محدود ہونا چاہیے۔ اس آئیڈیے تک جو داخلی لاجواب ہے جو حقیقتاً بے مثال ہے۔

امریکہ میں ایک این جی او ہے اس کا نام "فوڈ بینک" ہے۔ اس این جی او کے کارکنوں نے دیکھا امریکہ میں روزانہ ہزاروں ٹن خوراک ضائع ہوتی ہے لوگ ریستورانوں میں آتے ہیں کھانے کا آرڈر دیتے ہیں تموزا سا کھاتے ہیں اور باقی "ڈسٹ بن" میں پھینک کر چلے جاتے ہیں فائو سٹار ہونٹوں میں صورتحال اس سے بھی کہیں زیادہ افسوسناک ہے وہاں کو انٹی اور سٹینڈرڈ کے نام پر روزانہ لاکھوں ٹن خوراک ضائع ہوتی ہے۔ اس کی وجہ فائو سٹار ہونٹوں کا عالمی قانون ہے فائو سٹار ہونٹوں میں اگر گاہک کو کوئی ڈش سرو کر دی جائے اور گاہک اسے بغیر چھوئے واپس کر دے تو بھی وہ ڈش ضائع کر دی جاتی ہے۔ انہیں معلوم ہوا فائو سٹار ہونٹوں کی خوراک کو ضائع کرنے کیلئے ہر ماہ لاکھوں ڈالر خرچ کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف اسی امریکہ میں ہزاروں لاکھوں لوگ خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔ ہر سال امریکہ میں سینکڑوں واقعات سامنے آتے ہیں جن میں لوگ بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں جب یہ دونوں حقیقتیں ان لوگوں کو معلوم ہوتیں تو ان لوگوں نے سوچا ہم کیوں نہ ایک ایسا ادارہ بنائیں جو خوراک کی زیادتی سے پریشان لوگوں

سے غذا جمع کر کے ان لوگوں تک پہنچائے جو ذیبل روٹی کے سونے ٹکڑوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور اس انتظار میں ان کی آنکھوں کا پانی خشک ہو جاتا ہے اور ان کی رگیں ان کی نسیں پٹ من کی رسیاں بن جاتی ہیں۔ خیال اچھا تھا یہ لوگ سید ان میں کود پڑے این جی اور جسز کرائی انہوں نے اس کا نام فوڈ بینک رکھا فائو سٹار ہوٹلوں میں گئے اور انتظامیہ کو سمجھایا، مگر ”آپ لوگ خوراک ضائع کرنے کی بجائے ہمیں دے دیا کریں تو لاکھوں لوگوں کا بھلا ہو سکتا ہے“ انتظامیہ کو کیا چاہیے تھا؟ انہیں ہر ماہ اس کام کیلئے ہزاروں لاکھوں ڈالر خرچ کرنا پڑتے تھے لہذا وہ فوراً مان گئے اب یہ ہوتا تھا ”فوڈ بینک“ کے کارکن مخصوص اوقات میں مختلف ہوٹلوں میں جاتے تھے وہاں سے خوراک کے پیکٹ اٹھاتے تھے انہیں دفتر لاتے تھے کھولتے تھے صاف کرتے تھے گرم کرتے تھے دوبارہ پیک کرتے تھے گاڑیوں میں رکھتے تھے اور ان بستیوں میں چلے جاتے تھے جہاں زندگی شرمندگی کا کبیل اوڑھے کسی نجات دہندہ کی خشک ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ جاری رہا فوڈ بینک کا نیت درک وسیع ہوتا گیا ہوٹلوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا خوراک وصول کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی این جی او کے کارکنوں میں بھی اضافہ ہوا۔ محتر حضرات بھی توئے اور یوں یہ ادارہ بڑے بڑے نرالوں اور وسیع و عریض پھرنے کا مالک بن گیا۔ ان کے نرالوں میں کھانوں کو محفوظ رکھنے انہیں گرم کرنے اور انہیں پیک کرنے کی مشینیں لگی ہوئی ہیں کھانا آتا ہے نرالے کے اندر ہی صاف ہوتا ہے گرم ہوتا ہے پیک ہوتا ہے اور پھر منزل مقصود پر پہنچ کر تقسیم ہو جاتا ہے جو باقی بیچ جاتا ہے وہ ان نرالوں کے فریجوں میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ این جی او ہر سال تین لاکھ ٹن خوراک ضرورت مندوں تک پہنچاتی ہے۔

یہ ایک ”کافر ملک کی بات ہے ایک ایسے ملک کی بات جس سے 156 اسلامی ممالک کے عوام نفرت کرتے ہیں لیکن اس نفرت کے باوجود اگر ہم یہ آئیڈیالے لے لیں اس پر عملدرآمد شروع کر دیں تو میرا خیال ہے ہمارے ایمان پر لکیر نہیں آئے گی ہمارے ملک میں بھی روزانہ سینکڑوں ہزاروں ٹن خوراک ضائع ہوتی ہے۔ ہم صرف رمضان میں سحری اور افطاری کے وقت کتنی خوراک ضائع کرتے ہیں۔ اگر کوئی ادارہ ریسرچ کرے تو مجھے یقین ہے اعداد و شمار ہزاروں ٹن سے اوپر چلے جائیں گے۔ ہمارے ریستورانوں ہمارے فائو سٹار ہوٹلوں ہماری دھوتوں اور ہماری پارٹیوں میں کتنا رزق ضائع ہوتا ہے اگر کوئی شخص جائزہ لے تو کانوں کو ہاتھ لگانے پر مجبور ہو جائے ہم لوگ رمضان میں جتنا مہین گھی اور چینی استعمال کرتے ہیں اتنا ہم جموئی طور پر سال بھر میں خرچ نہیں

کرتے اور ہم اس ایک مہینے میں جتنی بھجور کھاتے ہیں اتنی ہم پانچ سال میں استعمال نہیں کرتے' ایک طرف تو یہ عالم ہے اور دوسری طرف ہر شہر کے اندر اور ہر شہر کے باہر ایسی ہزاروں کچی آبادیاں ہیں جن میں زندگی کا ایک ہی مقصد ہے روٹی کی چاپ سنا اور خوراک کا راستہ دیکھنا۔ ہمارے ملک میں اس وقت ڈیڑھ کروڑ کے قریب ایسے لوگ ہیں جو گرمی اور سردی میں کھلے آسمان تلے بھوکے پڑے رہتے ہیں ان لوگوں کو زندگی کی حرارت کے لئے کھانا چاہیے ان لوگوں سے ذرا پر سے پورا افغانستان بھوکا ہے دو کروڑ لوگ درختوں کی چھال اور کچا چمرا کھانے پر مجبور ہیں ان لوگوں کو خود کو کھسرف زندہ رکھنے کیلئے ہر مہینے 62 ہزار ٹن خوراک چاہیے جبکہ امریکی ہم افغانستان کی ستر فیصد زمین بھجور بنا چکے ہیں اور پچھلے دو برس سے ان کی زمینوں پر کچھ نہیں اگا ان حالات میں یہ لوگ ہماری عمریوں اور ہماری انظار یوں کے صحیح صحیح حق دار ہیں۔

یہ درست ہے ہمارا ملک بہت پسماندہ ہے ہم فریب بے وسیلہ اور غیر منظم لوگ ہیں ہم "نوڈ بینک" جیسے ادارے نہیں بنا سکتے لیکن ہم نوڈ بینک جیسی چھوٹی چھوٹی "کمپنیاں" تو ڈال سکتے ہیں ہر شہر ہر قصبہ ہر محلے کے چند نو جوان مل کر اپنے چھوٹے چھوٹے "نوڈ بینک" تو بنا سکتے ہیں جو کھر کھر جا کر لوگوں کو بچھا سکیں کہ آپ لوگ انظار پر سو روپے خرچ کرتے ہیں اگر آپ اس پر نوے روپے خرچ کر لیں گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا ہر محلے سے ایسے نو جوان باہر آئیں جو یہ سالانہ یہ روٹیاں اور یہ دس دس روپے ان لوگوں تک پہنچا سکیں جو اپنی اپنی دہلیزوں پر بیٹھ کر سحری اور انظاری کا لطف لینے والوں کے دل نرم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں جو اللہ کے دیئے رزق سے تمہوڑا سا حصہ ان لوگوں تک پہنچا سکیں جو زندگی کی سخت چکی میں ٹیس رہے ہیں اور اللہ کی مدد کا انتظار کر رہے ہیں لیکن شاید ہمیں 16 کروڑ لوگوں سے چند ایسے نو جوان بھی نہ مل سکیں جو اللہ کیلئے باہر نکلیں ہم کتنے بد نصیب لوگ ہیں پہلے ہم میں مطالبہ کرنے اٹھا کر کرنے اور حق کو حق کہنے کی جرأت ختم ہوئی اور اب ہم میں نیکی کرنے قربانی دینے اور خدمت کرنے کا جذبہ بھی مفقود ہو جا جا رہا ہے۔



چنوں کالفاف

میں نے چنوں کے آخری دانے سڑ میں ڈالنے کا نذ کے لفافے کی گیندی بنائی آگے بچھے نہ لکھا وہ کوئی ناس نہیں لکھتا یعنی کسی میں اس وقت تک کی طرف سے چل پڑا کر رہا ہے۔
پہنچا کچھ سوچا اور واپس آ گیا لفافے کی گیندی اسی طرح میری سٹی میں دبی تھی۔

مجھ سے کانچ اور یونیورسٹیوں کے اکثر نوجوان مطالعہ کرنے کا طریقہ پوچھتے ہیں وہ پوچھتے ہیں ہمیں کون کون سی کتابیں پڑھنی چاہئیں ہمیں کون سا علم کہاں سے حاصل کرنا چاہیے اور ہم پڑھی ہوئی چیزوں کو کیسے یاد رکھ سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس قسم کے سوال ہمیشہ میری دلچسپی کا موضوع رہے ہیں میں ان سے کہتا ہوں بھائیو اور بہنو مطالعہ ایک شوق نہیں ایک عادت ایک لت ہوتی ہے جس شخص کو یہ لت پڑ جائے اسے پھر اس قسم کے سوال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی آپ مجھ سے یہ پوچھ سکتے ہیں یہ لت کیسے پڑتی ہے؟ ہم مطالعے کو اپنی عادت کیسے بنا سکتے ہیں؟ اس کا صرف ایک طریقہ ہے آپ اپنی زندگی کا ہر اضافی لمبا ہر اضافی لمحہ مطالعے کو دے دیں میں نے ایک لمبی جدوجہد کے بعد مطالعے کو عادت بنا لیا ہے میرے سامنے جو چیز پڑتی ہے میں اسے اٹھا تا ہوں اور پڑھنا شروع کر دیتا ہوں میں ڈائمنگ نیپل پر بیٹھا ہوں تو پلیٹس اٹھی کر کے کھینچ کا نام پڑھنے لگتا ہوں چچوں چچریوں اور کانتوں پر کھدے مار کے اور نشان دیکھنے لگتا ہوں اخبار کا ٹکڑا مل جائے نشتہ پیر کا ڈبہ ہو وہ اوکا کر دھر ہو گولیوں کی ذلی ہو کوئی بیگزین ہو سامنے کوئی ساکن

بورڈ ہونے کے سینے پر لگی نیم پلیٹ ہو یا عینک کے فریم پر کندہ لفظ ہوں میں فوراً پڑھنا شروع کر دیتا ہوں میری یہ عادت اس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ میں غیر ممالک کے سفر کے دوران مقامی اخبارات اور میگزین تک پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں ان کی زبان میرے لئے اجنبی ہوتی ہے لیکن میں تصویروں اور نکتوں کی مدد سے انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں ایک بار میں نے ہسپانوی زبان کا اخبار خریدا اور ایک دوست کی مدد سے اس کی ساری سرخیاں پڑھ گیا اس مشقت کے دوران میں خود کو ہسپانوی زبان کا ٹھیک ٹھاک "عالم" سمجھنے لگا میں جہاں جاتا ہوں وہاں کوئی نہ کوئی کاغذ دریافت کر لیتا ہوں اور نکتوں کے دوران آنے والے وقتوں میں وہ کاغذ پڑھ جاتا ہوں میری جیب اور میری ڈائری میں بھی اکثر کوئی نہ کوئی تراشا کوئی نہ کوئی مضمون پڑا ہوتا ہے میں اگر ٹریک میں پھنس جاؤں یا مجھے کسی کا انتظار کرنا پڑے تو میں فوراً یہ تراشا نکالتا ہوں اور اسے پڑھنا شروع کر دیتا ہوں رہی کتابیں اور اخبارات تو ان کے بارے میں میرا خیال ہے دنیا کی کوئی کتاب فضول اور کوئی اخبار بیکار نہیں ہوتا اور جو شخص روزانہ دو گھنٹے مطالعہ نہیں کرتا اسے خود کو پڑھا لکھا نہیں کہنا چاہیے اس کی ساری سندس اور ساری ڈگریاں مضطرب ہو جاتی ہیں یہ تو تہیٰ مطالعے کی بات اب میں آپ کو ایک اور دلچسپ عادت بتانا ہوں پچھلے بیس برس سے میں جب بھی بازار سے کوئی سودا خریدتا ہوں اور دوکاندار مجھے یہ سودا کسی اخباری کاغذ میں لپیٹ کر دیتا ہے یا یہ سودا مجھے کسی کتاب یا اخبار کے ورق سے بنے لٹافے میں ملتا ہے تو میں واپسی پر وہ لٹافہ کاغذ سیدھا لے کر لاتا ہوں اور اس کا ایک ایک لفظ پڑھ جاتا ہوں اس عجیب و غریب عادت کی وجہ میری عجیب و غریب سوچ ہے میں سمجھتا ہوں خوراک کی طرح فقرے اور لفظ بھی آپ کا رزق ہوتے ہیں اور قدرت مختلف جیلوں اور بہانوں کے ذریعے یہ رزق آپ تک پہنچاتی ہے چنانچہ یقین کیجئے آج تک وہ تمام لفظ وہ تمام فقرے جنہوں نے میری زندگی میں بنیادی کردار ادا کیا جنہوں نے میری سوچ میرے عمل کے سادے و سادے بدل دیئے وہ فقرے وہ لفظ مجھے انہیں لٹافوں اخبار کے انہیں کئے پڑے کاغذوں سے ملے چنانچہ میری زندگی میں یہ لٹافے بڑے قیمتی ہیں۔

دیکھئے بات کہاں سے چلی اور کدھر نکل گئی میں آپ سے عرض کر رہا تھا میں جنوں کا لٹافہ ڈسٹ بین میں بھینکنے لگا لیکن کچرے کی نوکری کے قریب پہنچ کر واپس آ گیا مجھے چاہئے یا آ یا میں یہ لٹافہ پڑھے بغیر بھینک رہا ہوں میں واپس گاڑی میں بیٹھا کاغذ کی گیند کوئی لٹافہ سیدھا کیا اس کے کنارے کھولے اور اسے جمبولی میں پھیلا کر پڑھنے لگا یہ نفسیات کی کسی کتاب کا

ایک ورق تھا اس ورق پر ولیم جیمز کا ایک نہایت خوبصورت فلسفہ درج تھا میں ولیم جیمز کے بارے میں بس اتنا جانتا تھا یہ ایک معروف نفسیات دان تھا اور خود کو سگنڈ فریڈ کا شاگرد کہتا تھا باقی اس نے زندگی میں کیا کیا کام کئے ہیں ان سے نا بلد تھا لیکن اس کاغذ پر درج وہ فلسفہ کمال تھا اس نے کہا "انسان کے ہر جذبے کے ساتھ ایک فعل وابستہ ہوتا ہے مثلاً اگر وہ دیکھی ہو تو وہ روتا ہے وہ خوش ہو تو وہ ہنستا ہے وہ غصے میں آئے تو وہ چیختا چلاتا ہے وہ محبت کرے تو وہ پچکارتا ہے بوسا لیتا ہے وہ خوفزدہ ہو تو وہ بھاگتا ہے وہ کامیاب ہو تو چھٹا کھس لگاتا ہے تالیاں دیتا ہے اور وہ بھوکا ہو تو نمدید پن کا مظاہرہ کرتا ہے" ولیم جیمز کی یہ بات یہاں تک تو عام روزمرہ کا مشاہدہ تھا لیکن آگے چل کر وہ کہتا ہے "اگر انسان اس عمل کو الٹا دے وہ کسی جذبے سے وابستہ فعل یا عمل دہرانا شروع کر دے تو تھوڑی ہی دیر میں اس میں اس عمل یا اس فعل سے وابستہ جذبہ پیدا ہوتا جاتا ہے مثلاً کوئی شخص بزار پلیکس بیٹھا ہو وہ اٹھے اور اٹھ کر ناراضگی اور غصے کی ایک تنگ شروع کر دے وہ چیخنے چلانے لگے تو تھوڑی دیر بعد اس کے جسم میں حقیقتاً غصہ پیدا ہو جائے گا اسی طرح اگر کوئی شخص غصے سے بھرا بیٹھا ہو لیکن وہ اوپر ہی دل سے خوش مزاجی اور وضع داری کی ایک تنگ شروع کر دے وہ ہر ملاقاتی سے اچھے سرائے اور نہ کو اس سے ناگوار بات بھی اس کی بڑا دست کرے تو ذرا دیر بعد خوش مزاجی اس کے غصے کی جگہ لے لے گی وہ حقیقتاً خوشگوار اور ہلکا پھلکا ہو جائے گا" ولیم جیمز کے ان الفاظ نے میرے اوپر چادوئی کام کیا ان دنوں سیری شوگر عروج پر تھی شوگر کا ایک اثر انسانی مزاج پر بھی مرتب ہوتا ہے انسان پڑمردہ ادا اس اور چڑا چڑا رہنے لگتا ہے وہ مرکورس ہو جاتا ہے پل میں تولیہ میں ماشہ ذرا ذرا سی بات اسے بد مزاج اور زار کا بنا دیتی ہے ان دنوں میری شوگر آؤٹ آف کنٹرول تھی لہذا میں ان دنوں خود کو تنہا اور ادا محسوس کرتا تھا لوگوں کی ہنسی لوگوں کا مذاق گوئی کی طرح میرے سینے پر لگتا تھا اس وقت ولیم جیمز کے یہ الفاظ الہام کی طرح میرے اوپر اترے لہذا اس لغافے نے میرا مقدر میری زندگی بدل دی اس کے بعد میں نے برے لمحات میں خوشی اور خوشی کے عمل کو اپنا معمول بنا لیا لہذا میں چند ہی دنوں میں نادل اور خوش گوار زندگی گزارنے لگا وہ دن ہے اور آج کا دن ہے مجھے جب بھی غصہ آتا ہے میں جب بھی چڑچڑے پن کا شکار ہوتا ہوں تو میں ہنستا شروع کر دیتا ہوں میں لوگوں کو لطائف سنانا شروع کر دیتا ہوں میں جب بے زار اور ادا ہوں تبہائی اور اکلپے کا شکار ہونے لگتا ہوں تو میں دن میں دو بار شیو کرتا ہوں بہترین سوٹ پہنتا ہوں اعلیٰ خوشبو لگاتا ہوں گاڑی کی سروں کراتا

ہوں اسے پالش کرتا ہوں اور اپنے دوستوں سے ملاقات کیلئے نکل کھڑا ہوتا ہوں لوگوں کو دعوت دیتا ہوں نوجوان بچے اور بچیوں سے کپ لگاتا ہوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زندگی کے مثبت پہلوؤں پر لیکچر دیتا ہوں مزاحیہ لٹریچر پڑھتا اور کارٹون قلمیں دیکھتا ہوں شاپنگ کرتا ہوں اچھی فلمیں دیکھتا ہوں دوستوں کے ساتھ لمبی لمبی سیریں کرتا ہوں اور نیکی کے کام کرتا ہوں اور چند ہی گھنٹوں چند ہی دنوں میں میرا مورال کہیں سے کہیں چلا جاتا ہے میں اپنے اندر نئی قوت نئی حرارت محسوس کرتا ہوں میرے برے موڈ کے دنوں میں اگر گلاس ٹوٹ جاتا ہے تو میں یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں "چلو اچھا ہوا اب پرانے گلاس کی جگہ نیا آئے گا" اس سوچ کے باوجود اگر میرا افسوس ختم نہ ہو تو میں شام کو نئے گلاس لے آتا ہوں یہ نئے گلاس پرانے گلاس کا دکھ دور کر دیتے ہیں ان دنوں اگر بچے شور کرنے لگیں اور ان کا شور میرے مزاج پر تیزاب کی طرح گرنے لگے تو میں انہیں ڈانسنے کی بجائے ان کے ساتھ مل کر شور کرنے لگتا ہوں میں ان کے کھیل میں شامل ہو جاتا ہوں یقین کیجئے بچوں کے یہ کھیل میری مجیدی میری اداسی کو ہالے جاتے ہیں میں نارمل

ہو جاتا ہوں۔
Kashif Azad@OneUrdu.com

چنوں کا وہ لفظ اور ولیم جیمز دونوں میرے محسن ہیں ان دونوں نے مجھے زندگی کا نیا رخ نیا پہلو دکھایا زندگی کے اس پہلو اس رخ نے مجھے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایا لہذا میں دن رات ولیم جیمز اور چنوں کے اس لفظ نے کا شکر یہ ادا کرتا ہوں میں اپنے رب کا شکر گزار ہوتا ہوں۔



طاقت

نئی یارک میں مین مین تھا، مین مین کی 42 منزلہ عمارت تھی اور اس 42 منزلہ عمارت کے 40 ویں فلور پر اس کا دفتر تھا، میں اس کے دفتر میں داخل ہوا تھا تو اس کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گیا، یہ پانچ ہزار سکوئرز کا دفتر تھا جس کا سارا عملہ امریکی تھا، سیکورٹی گارڈ سے لے کر ریپبلیکن تک، ریپبلیکن سے لے کر آفس سیکرٹری تک اور آفس سیکرٹری سے لے کر ٹیلی فون آپریٹر تک سب لوگ امریکی تھے، اس سارے دفتر میں وہ واحد ایسی شخص تھا، اس نے قیمتی اطالوی سوٹ پہن رکھا تھا، اس کے ہاتھ میں کیوبا کا سگار تھا اور اس کے جسم سے فرانسسی خوشبو آ رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس کا ویسی پن الٹا نہ کر رہا تھا اور اس کے لہجے اور اس کی چال و حال سے اس کے سیا لگوئی ہونے کا صاف پتہ چلتا تھا، سیڈی اس کی سیکرٹری نے میرے سامنے کافی کا گم رکھا اور چوہدری کو میرے حوالے کر کے چلی گئی، دفتر کے چاروں اطراف شیشے کی بڑی بڑی کمرے تھے اور ان کمرے کیوں کے نیچے نئی یارک شہر بکھرا ہوا تھا، شہر میں ابھی روشنیاں جاگنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔

وہ مسکرایا، "تم پوچھ رہے تھے میں نے یہ ترقی کیسے کی" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی، اس کی مسکراہٹ میں بڑی جان تھی، وہ مخاطب کی طرف غور سے دیکھتا تھا، اس کے بعد آہستہ سے اس کے ہونٹ کھلتے تھے اور اس کے بعد اس کے چہرے پر

اپنائیت، محبت اور ہمدردی کے سارے رنگ آجاتے تھے، میں نے پوری زندگی اتنی خوبصورت، مکمل اور جوشیلی مسکراہٹ نہیں دیکھی، اس کی مسکراہٹ میں مقناطیسی کشش تھی، وہ تھوڑی دیر تک کر بولا، "مجھے اس مقام پر میری مسکراہٹ نے پہنچایا۔ میں پاکستان کا ایک "ان ٹیج ایبل" شہری تھا، میرے بزرگ کئی نسلوں سے سیالکوٹ کی نائیاں اور نواکٹ صاف کر رہے تھے، میں جوان ہوا تو میں نے یہ کام کرنے سے انکار کر دیا، لوگ ایک "چوہڑے" کو دوسرا کام دینے کیلئے تیار نہیں تھے لہذا میں بے روزگار ہو گیا، میں بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آ کر لاہور چلا گیا، میرے جیسے لوگ جب چھوٹے شہر سے بڑے شہر پہنچتے ہیں تو وہ ہر ماں ہو جاتے ہیں، ان کا دل خوف اور کسرتی کے احساس سے بھر جاتا ہے لہذا وہ لوگ شہر پہنچ کر سب سے پہلے اپنی مسکراہٹ سے محروم ہوتے ہیں، میں بھی شہر پہنچ کر ہنسا اور مسکراتا بھول گیا، میرے چہرے پر ہر وقت سنجیدگی اور غصہ رہنے لگا، پھر مجھے ایک شخص ملا، یہ شخص ریگل چوک پر فالسوں کی ریڑھی لگاتا تھا، اس نے مجھے دیکھ کر کہا، "باؤ جب تک تم مسکراتا نہیں سیکھو گے تم کامیاب نہیں ہو گے، میرے لئے یہ عجیب بات تھی، میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا، اس نے ہنسی کے نیچے سے شیشہ نکالا اور شیشہ میرے سامنے رکھ دیا، میں نے اپنی شکل دیکھی، میری شکل پر بے تحاشا ہنس نکلتی اور سنجیدگی تھی، اس نے میرے سامنے سے شیشہ ہٹا دیا اور اس کے بعد بولا، "اب تم میری فرمائش پر ذرا سا مسکراؤ" میں بے اختیار مسکرا پڑا، اس نے شیشہ دوبارہ میرے سامنے کر دیا، میری شکل پر ٹھیک ٹھاک فرق پڑ گیا تھا، اس کے بعد اس فالسے والے نے مجھے بتایا، "جس شخص کے پاس کوئی ہنر نہ ہو وہ اگر صرف مسکراتا سیکھ لے تو اس کا مقدر بدل سکتا ہے۔ اس کی بات میرے دل کو گئی اور میں نے مسکراہٹ کا فن سیکھنا شروع کر دیا، میں نے مسکراہٹ کے بارے میں کتابیں خریدیں اور ان کتابوں کی روشنی میں مسکراتا سیکھنے لگا، مجھے پتہ چلا انسان کے چہرے پر ایسے دو سواوے یا پوائنٹس ہوتے ہیں جو اس کے چہرے پر تاثرات پیدا کرتے ہیں، ہمارے چہرے کا ہر تاثر ان چند پوائنٹس کا مرکب ہوتا ہے، مسکراہٹ ہمارا واحد عمل ہے جس میں چہرے کے تمام پوائنٹس حرکت میں آتے ہیں، جو شخص دن میں دس مرتبہ مسکراتا ہے اس کے چہرے کے تاثرات ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، وہ چہرے کے ذریعے اپنے تمام جذبات کا اظہار کر سکتا ہے لیکن جو لوگ کم مسکراتے ہیں ان کا چہرہ آہستہ آہستہ مرنے لگتا ہے۔ وہ لوگ "ایکسپریشن لیس" ہو جاتے ہیں، مجھے پتہ چلا ہماری مسکراہٹ سے ہمارے جسم میں ایک کیمیکل پیدا ہوتا ہے، یہ کیمیکل ہمارے تھے ہوئے اعصاب، ہمارے سگتے ہوئے احساسات اور

ہمارے اچھے ہوئے جذبات کو سکون پہنچاتا ہے یہ ہمیں بھی خوشی دیتا ہے اس کی وجہ سے ہم خود کو ہکا بھکا اور مطمئن محسوس کرتے ہیں اور یہ ہماری کام کرنے کی صلاحیت اور استعداد میں بھی اضافہ کرتا ہے میں ان تمام چیزوں کو سامنے رکھ کر مسکرایا سیکھنے لگا میں شیشے کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور عکسوں مسکرانے کی پریکٹس کرتا رہتا۔

وہ اپنی مسکراہٹ کی پوری تاریخ دہرانے لگا میں خاموشی سے سنتا رہا وہ بولا مجھے چہ چلا مسکراہٹ کی 21 قسمیں ہوتی ہیں آپ مسکرا کر سلام کرتے ہیں آپ مسکرا کر دوسروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں آپ مسکرا کر معذرت کرتے ہیں آپ مسکرا کر شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں آپ مسکرا کر اپنی کامیابی کا اعلان کرتے ہیں اور آپ مسکراہٹ کے ذریعے اپنی ناکامی کا اعتراف بھی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ میں نے ایک سال میں مسکراہٹوں کی 21 اقسام پر عبور حاصل کر لیا جس کے بعد مجھے محسوس ہوا میرے حلقہ احباب میں اچانک اضافہ ہو گیا ہے ہر شخص مجھے پسند کرنے لگا ہے میں سوٹس ڈانڈے شخص ہو گیا لوگ میرا انتظار کرنے لگے ہیں مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی وہ اپنی داستان کی رو میں بہتا چلا جا رہا تھا میں نے اسے ٹوکا آپ اپنی کامیابی کی وجہ بتا رہے تھے تو وہ مسکرایا اس کی مسکراہٹ میں معذرت تھی میں اسی طرف آ رہا ہوں میں ان دنوں بے روزگار تھا میں سارا دن نوکری تلاش کرتا تھا اور شام کو یاغ جناح میں واک کرتا تھا وہاں ایک گورا بھی واک کرتا تھا ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے لیکن جب ہم لوگ واک کرتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے سے گزرتے تھے تو میں اسے "سائل پاس" کرتا تھا وہ میری مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتا تھا یہ میرا روزانہ کا معمول تھا یہ سلسلہ ایک برس تک چلتا رہا اس ایک برس میں مجھے کہیں نوکری نہ ملی میں نے سینکڑوں درخواستیں دیں لیکن مجھے کسی طرف سے کوئی جواب نہ ملا اس دوران مجھے کسی دوست نے مشورہ دیا تم امریکہ چلے جاؤ وہاں بے تحاشا مواقع موجود ہیں مجھے اس کا مشورہ اچھا لگا مگر میرے پاس وسائل نہیں تھے میں اپنی جیب سے پاسپورٹ تک نہیں بنا سکتا تھا لیکن میں نے کوشش کرنے کا فیصلہ کیا میں نے دوستوں سے ادھار لیا پاسپورٹ بنوایا اور اگلے دن صرف پاسپورٹ لے کر امریکہ کی تفصیل خانے کے سامنے کھڑا ہو گیا وہاں لوگوں کی ایک طویل قطار لگی تھی سب لوگوں نے ہاتھوں میں لمبی چوڑی بینک ٹیٹ منٹس اور کارڈ پار کے کاغذات اٹھا رکھے تھے جبکہ اس ساری قطار میں میں واحد شخص تھا جس کے پاس پاسپورٹ کے سوا کچھ نہیں تھا میری کامیابی کا رتی برابر امکان نہیں تھا میرے آگے کھڑے

تمام لوگ ناکام ہو کر کھڑکی سے بیٹے جا رہے تھے لیکن جب میں کھڑکی کے سامنے پہنچا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، شیشے کی دوسری طرف وہی گورا بیٹھا تھا جو روزانہ باغ جناح میں واک کرتا تھا، اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، میں نے بھی مسکراہٹ سے اس کا جواب دیا، اس نے میرا پاسپورٹ پکڑا، ایک منٹ انتظار کرنے کی ہدایت کی، کھڑکی سے اٹھا، اندر گیا، ایک منٹ بعد واپس آیا اور مجھے پاسپورٹ واپس کر دیا، میں نے پاسپورٹ کھول کر دیکھا تو اس میں پانچ سال کا ویزہ لگا تھا، میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا، اس نے تجاہد لگایا اور ہاتھ ہلا کر بائی بائی کر دیا۔

اس کی کہانی دلچسپ ہو گئی، اس نے بتایا، "میں جب نیویارک ایئر پورٹ پر اترا تو میری جیب میں صرف دس ڈالر تھے، میں نے جو پہلا کام کیا وہ فرش کی صفائی تھی، اس کے بعد میں ایک فیکٹری میں لوڈر بھرتی ہو گیا، میں سونو سکول کے کارٹن اٹھا کر ٹرک میں لوڈ کرتا تھا، پھر میں سٹریٹ میں ہو گیا، پھر میں نے کیسٹ کی دکان پر کام کیا، پھر میں لوگوں کے گھروں میں اخبار بھینکنے لگا اور میں آخر میں سول ایوی ایشن کی ایک کمپنی میں بھرتی ہو گیا۔ غرض کوئی ایسا کام نہیں تھا جو میں نے نہ کیا ہو، ہر کام میں میری مسکراہٹ نے میرا ساتھ دیا، مسکراہٹ مجھے ہر جاب میں آگے سے آگے لے جاتی رہی، میں کامیاب ہوتا چلا گیا، پھر میں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا، میرا کاروبار چل نکلا، آج میں برس بعد میرا شمار نیویارک کے امیر ترین ایشیائی باشندوں میں ہوتا ہے، میری کارگو کمپنی ہے، میرے پاس پاکستان کے کل ہوائی جہازوں سے زیادہ کارگو جہاز ہیں، لوگ گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں جبکہ میں اپنے ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہوں، وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے کہا، "اس کا مطلب ہے آپ صرف مسکراہٹ کو اپنی کامیابی قرار دیتے ہیں؟" اس نے اثبات میں سر ہلادیا، اس نے کہا، "تم یقین کرو، میں جب فون اٹھاتا ہوں تو پہلو کہنے سے پہلے مسکراتا ہوں، لوگ میری اس عادت پر میرا مذاق اڑاتے ہیں، میں بھی جانتا ہوں دوسری طرف موجود شخص میری مسکراہٹ نہیں دیکھ رہا لیکن جب میں مسکراتا ہوں تو میری آواز میں ایک خوشگوار تاثر پیدا ہو جاتا ہے، میں سمجھتا ہوں یہ تاثر دوسری طرف موجود شخص تک ضرور پہنچتا ہے، یقین کرو اللہ تعالیٰ نے انسان کو مسکراہٹ کی شکل میں ایک ایسی صلاحیت دے رکھی ہے جس سے وہ پوری دنیا فتح کر سکتا ہے، لیکن ہم میں سے بے شمار لوگ اس صلاحیت اور اس طاقت کی طاقت سے ناواقف ہیں، وہ اس صلاحیت کے کمال سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اگر یہ لوگ اس طاقت سے آگاہ ہو جائیں تو یقین کرو یہ دنیا ان کے قدموں میں آگرے۔"

کاشفِ اناج

ناں کہنے کا ہنر

بچی کی آنکھ میں آنسو تھے اس نے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور روتی سسکتی آواز میں بولتا "سر میں بھیڑ سگری ہوں میں سگری ہوں جس کیڑے کا تھان ہوں یا پھر میں ہالٹی یا پلٹ ہوں میں کیا ہوں" میں نے شفقت سے جواب دیا "بچیا آپ ایک مکمل انسان ہو اس کی عمر ایس بائیس برس ہوگی وہ کالج میں پڑھتی تھی اور بے شمار دوسری ماؤں کی طرح اس کی ماں بھی اس کی شادی کرنا چاہتی تھی" پچھلے دنوں اس کیلئے ایک رشتہ آیا لڑکا امریکہ میں انجینئر تھا لڑکے کے والدین دیہاتی پس منظر سے تعلق رکھتے تھے لہذا وہ بہادر گائے میں خاص فرق نہیں سمجھتے تھے بچی جب ان لوگوں کے سامنے آئی تو لڑکے کی ماں نے اس کا اسی طرح جائزہ لیا جس طرح عموماً دیہات میں جانوروں کا مشاہدہ کیا جاتا ہے ماں نے اس کے ہاتھ پاؤں دیکھے اس کی نظر ٹیسٹ کی اسے اپنے سامنے چلا پھر اور بٹھا کر دیکھا اس کا قد اس کا وزن معلوم کیا منہ کھلوا کر اس کے دانت گنے اور اسے سونگھ کر دیکھا بچی حساس تھی ان حرکتوں سے اس کا دل ٹوٹ گیا وہ شاید یہ سب کچھ برداشت بھی کر جاتی لیکن آخر میں لڑکے کی ماں نے ایک اور عجیب حرکت کی وہ لڑکی کو باہر لے کر گئی اور اسے دھوپ میں کھڑا کر کے اس کا رنگ دیکھنا شروع کر دیا یہ انتہائی بچی روتی ہوئی اندر گئی اس نے دروازے کو اندر سے چنٹی لگائی اور پھر پورا دن اندر بند رہی اس کے والدین میرے جاننے والے تھے انہوں نے دوسرے دن بچی کو میرے پاس بھیج دیا وہ اب میرے سامنے

بٹھی تھی میں نے کہا "بیٹا آپ ایک مکمل انسان ہو" اس نے سکتے ہوئے پوچھا "پھر انہوں نے میرے ساتھ ایسے کیوں کیا" میں ہنس پڑا "بیٹا اس لئے کہ وہ لوگ ادھر سے تھے ان لوگوں نے زندگی کو کبھی جانوروں سے اور پرائیوٹ کر نہیں دیکھا ہم لوگ دوسرے لوگوں کو دوسری چیزوں کو اپنے معیار اور اپنے نقطہ نظر سے پرکھتے ہیں ایک گائے دنیا کی ہر چیز کو گائے کی نظر سے دیکھے گی اور ایک چڑیا پوری کائنات کو چڑیا کی آنکھ سے پرکھے گی وہ لوگ کیونکہ انسانوں کے ہمیں میں جانور تھے لہذا انہوں نے جانوروں کی طرح تمہارا جائزہ لیا" اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں، تم خود سوچو اگر کوئی شخص گھاس کی پلیٹ میں ہیرا ڈال کر گدھے کے سامنے رکھ دے اور گدھا اس ہیرے کو زمین پر پھینک دے تو ہیرے کو تو اس سلوک پر طمان نہیں ہوتا چاہیے "بچی نے آنسو پونچھے اور تھوڑا سا مسکرا کر بولی "سرا آپ اس موضوع پر ضرور لکھیں" لڑکوں کے ماں باپ کو یہ ضرور بتائیں لڑکیاں بھی انسان ہوتی ہیں اور اللہ نے ان کو بھی دل اور انا دے رکھی ہے سرائی نہیں سمجھائیں اللہ کی مخلوق کو بھڑکھڑایاں نہ بنائیں انسان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کریں" میں نے بچی کے ساتھ وعدہ کر لیا "بچی واپس چلی گئی۔

Kashif.Azad@OneUrdu.com

شام کو میرے ایک دوست آئے میں اور اس جیسا تھا انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے ان کو یہ سارا قصہ سنایا وہ بھی دکھی ہو گئے انہوں نے مجھے اپنے محلے کی ایک بچی کا واقعہ سنایا "بچی ذرا واجبی شکل و صورت کی تھی اس کے گھر جو بھی لوگ آتے تھے بچی کو دیکھنے کے بعد واپس چلے جاتے تھے یہ سلسلہ دو تین سال تک چلتا رہا یہاں تک کہ بچی نفسیاتی مرئیض بن گئی علاج شروع ہوا لیکن افادہ نہ ہوا آج کل وہ بچی پاگل خانے میں ہے ہم دونوں مزید دکھی ہو گئے اسی دوران ہمارا ایک تیسرا دوست بھی آ گیا اس نے سارا قصہ سنایا تو اس نے قہقہہ لگایا "ہم نے اس کی طرف غصے سے دیکھا مگر وہ ہنستا چلا گیا وہ کئی منٹوں کی ہنسی کے بعد بولا "بے وقوف! صرف افسوس کرنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا" اس مسئلے کے حل کیلئے اس ملک کے تمام لڑکے والوں کو آگے آنا چاہیے انہیں بولڈ سٹیپ لینا ہوگا "ہم نے پوچھا "وہ کیسے" وہ مسکرا کر بولا "میں نے اپنے بیٹے کی شادی کرنی تھی" ہم نے اس سلسلے میں کم از کم بیس بچپس رشتے دیکھے لیکن ہم نے کسی بچی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی "ہم نے پوچھا "وہ کیسے" وہ مسکرایا "ایک تو ہم براہ راست کسی کے گھر نہیں جاتے تھے کسی دوست نے اگر کوئی رشتہ بتایا تو ہم اس دوست کے گھر چلے جاتے اور وہ دوست بہانے سے بچی اور اس کے والدین کو وہاں بلا لیتا ہم غیر محسوس طریقے سے بچی کو دیکھ لیتے اس

کے والدین کے ساتھ بھی گپ شپ لگا لیتے ہم نے کسی تقریب میں بچیوں اور ان کے والدین کو بلا لیتے تھے اور غیر محسوس طریقے سے ان کا جائزہ لے لیتے تھے، اس چالاکی کے دوران صرف ایک موقع ایسا آیا جب ہم کسی کے گھر گئے اور اس خاندان نے ہماری آمد کو "لاڑکے والے آئے ہیں" قسم کا تاثر دے دیا، ہم وہاں جا کر پریشان ہو گئے، بچی اور بچے کا میل مشکل تھا، ہم لوگ بچی اور اس کے والدین کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتے تھے لہذا وہاں میں نے ایک عجیب تکنیک استعمال کی، میں نے بچی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس سے کہا "بھئی تم جس گھر بھی جاؤ گی وہ لوگ بہت خوش قسمت ہوں گے، مجھے تم بہت اچھی لگی ہو، تم بالکل میری بیٹیوں کی طرح ہو لہذا میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا، میرا بیٹا تمہارے قابل نہیں ہے اس کا آئی کیو لیول اس کی تعلیم اور اس کے رویے تم سے بہت چھوٹے ہیں، وہ خوبصورتی میں بھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ میں تمہارے ساتھ ظلم نہیں کر سکتا" میرے ان الفاظ نے بچی اور اس کے خاندان کی ڈھارس بندھائی، وہ آج تک ہمارا احترام کرتے ہیں، ہمیں اپنے دوست کی یہ ادا بہت اچھی لگی، وہ ذرا دیر کا اور پھر مسکرا کر بولا "ہم دوسروں کو پسند کرنے کیلئے شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، لیکن ہمیں لوگوں کو مسترد کرنے کیلئے اس سے چار ہزار گنا زیادہ شائستگی کی ضرورت ہوتی ہے، ہاں تو دنیا میں سب ہی کہہ سکتے ہیں لیکن ہاں کہنا ایک آرٹ، ایک ہنر ہے اور یہ آرٹ یہ ہنر ہمارے ملک کے ہر اس شخص کو اس وقت سیکھ لینا چاہیے جس وقت نرس اس کی گود میں اس کا بیٹا لا کر ڈالے ہے، وہ ذرا سار کا اور پھر مسکرا کر بولا "ہمیں اس ملک کے تمام لڑکے والوں کو یہ آرٹ یہ ہنر سکھانا ہوگا۔"



غربت انعام ہے

”میں تین نسلوں سے غریب ہوں، میرا دادا ہاری تھا، باپ منڈی میں مزدوری کرتا تھا اور میں گریجویٹ ہونے کے باوجود سڑکیوں کی دکان پر کام کر رہا ہوں، غربت میری دو نسلوں کا چل چل ہے، مجھے یقین ہے، میں بھی اس گڑھے سے نہیں نکل سکوں گا،“ نو جوان کی آنکھوں سے پانی کی دھار نکلی، دھار نے اس کے گال پر لکیری بنائی اور یہ لکیر ٹھوڑی پر آ کر رک گئی، وہاں ٹھوڑی کے بالکل نیچے پانی کا ایک بلب چمک رہا تھا، وہ جب سانس لیتا تھا تو یہ بلب آہستہ سے لرزتا تھا اور اس میں بے شمار رنگ سے گزر جاتے تھے، میں نے اس سے کہا، ”بیٹا، غربت تو اللہ کا سب سے بڑا عطیہ ہوتی ہے، تم ایک لاکھ 24 ہزار اہلیا کو دیکھو، چند ایک کے سوا باقی سب نے غربت میں آنکھ کھولی تھی اور سب نے بھوک، غربت اور غریب الوطنی سے ابتدا کی تھی، تم تمام صوفیا، کرام کو دیکھو، یہ سب لوگ غریب، نادار اور محروم طبقوں سے تعلق رکھتے تھے، انہیں بھی کئی کئی دن ایک لقمہ نصیب نہیں ہوتا تھا، انہوں نے پوری زندگی اچھے کپڑے نہیں پہنے، یہ اچھے گھروں میں نہیں رہے تھے اور انہیں اچھی سواری نہیں ملی تھی، تم دنیا کے بڑے بڑے عالموں کو دیکھو، ان میں کون امیر تھا، کس نے بادشاہ کی گود میں آنکھ کھولی تھی، کون منڈی سونے کا بیج لے کر پیدا ہوا تھا، تم دنیا بھر کے سائنس دانوں، شاعروں، ادیبوں، دانشوروں، موسیقاروں اور اداکاروں کو دیکھو، ان میں کون امیر تھا، کون تھا جس کی پیدائش پر سارے شہر میں منگنی تقسیم ہوئی تھی، کون تھا جس کا بچپن نوکروں کی فوج

میں گزرا تھا تم نیا اکرم کی حیات طیبہ دیکھو ایک یتیم بچہ جس کی زندگی کا آغاز ہی محرومی سے ہوا تھا آپ کے اصحاب گود کھڑوان میں کون امیر تھا پورے مدینہ میں پانچ لوگ تھے جنہیں خوشحال کہا جاسکتا تھا تم اسلام کی پہلی جنگ دیکھو اللہ کے لشکر کے پاس کمواریں تک نہیں تھیں جس وقت اللہ کی سلطنت کا پیغام سات براہمنوں تک پہنچ رہا تھا اس وقت اللہ کے حبیب کے دسترخوان پر کھجور تک نہیں ہوتی تھی آپ تک سے روزہ افطار فرماتے تھے اور شکر کر کے نماز کیلئے کھڑے ہو جاتے تھے اس وقت دنیا کے فاتحین بھوک سے اتنے غمناک ہوتے تھے کہ چلتے چلتے گر پڑتے تھے نماز میں ان کے قیام لمبے اور بچہ سے طویل ہو جاتے تھے میرے عزیز یہ بھوک کی غربت تو اللہ اپنے مقرب بندوں کو دیتا ہے وہ جسے پسند کرتا ہے اسے غربت، علم اور عزت سے نوازتا ہے۔

نوجوان نے غصے سے آنسو پونچھے اور زہریلے لہجے میں بولا "آپ بھی مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کر رہے ہیں آپ بھی مجھے مذہب دانش اور دلیل کی انون دے رہے ہیں میں اگر آپ کی بات مان لوں تو اس کا مطلب ہے مجھے سمیت دنیا کے تمام غریبوں کو غربت سے سمجھوتہ

کر لینا چاہیے انہیں یہ مان لینا چاہیے دنیا میں دولت آسمانوں اور زمینوں میں صرف آپ جیسے لوگوں کیلئے ہیں اور محرومی ہے کسی اور غربت ہم جیسے لوگوں کا مقدر اور ہم اپنے مقدر کا شکوہ کر کے اللہ کی نعمتوں اللہ کے کرم سے انکار کر رہے ہیں" میں نے قہقہہ لگایا "میرے بچے تم دوسری غلطی کر رہے ہو تم چیزوں کو دوسری مرتبہ غلط زاویے غلط انداز سے دیکھ رہے ہو بیٹا غربت اللہ کا کرم اللہ کا انعام ہوتی ہے لیکن صرف اور صرف اس شکل میں جب آپ اس سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں جب آپ اس سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں تو یہ کرم عذاب اور یہ نعمت زحمت میں تبدیل ہو جاتی ہے اب تم تمام انبیائے کرام کی حیات کا دوسرا پہلو دیکھو انہوں نے غربت میں آنکھ کھولی تھی لیکن انہوں نے ایک طویل جدوجہد اور کوشش کے بعد ان تمام لوگوں کے حالات بدل دیئے جنہوں نے اللہ کے پیغام پر بلیک کہا تھا تم مدینہ کی سلطنت دیکھو جس شہر میں کبھی کھجور تک نہیں ملتی تھی وہاں صرف 30 برس بعد زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں تھا حضرت عمر فرمایا کرتے تھے "خزائنہ بہت بڑھ گیا ہے اب اس کے خرچ کی بھی کوئی راہ نکالو" تم صوفیہ کرام کو بھی دیکھو ان کی حیات ہی میں دنیا جہان کی دولت ان کے دروازے پر آگئی تھی انہوں نے زندگی میں ایک چولہا چڑھایا تو ہزار سال تک ان کا لشکر چلا رہا دنیا کے سارے مصوروں سارے موسیقاروں اداکاروں دانشوروں مشاعروں مصنفوں اور ماہرین دانوں نے اپنی زندگی ہی میں شہرت عزت اور بڑی حد تک دولت کا مزہ چکھ لیا تم آج

بھی دیکھو پکا سوکی تصویروں کی مالیت دنیا کے 30 ممالک کے بجٹ کے برابر ہے، الفریڈ ٹوٹل کی آمدنی سے دنیا میں ہر سال میں تیس لوگوں کو کئی ملین ڈالر دیئے جاتے ہیں، بینکھون کی صفحوں کی رائٹٹی ایک وقت میں جرمنی کے ٹوٹل مالیاتی ذخائر سے زیادہ تھی، سوہرے بچے اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو غربت دیتا ہے، یہ غربت اس کیلئے تحریک بھی ہوتی ہے، حوصلہ بھی اور عزم بھی، یہ اس کے ہاتھ بھی ہوتی ہے اور پاؤں بھی، دنیا میں عقل ہو یا ہمت، یہ وہ فصلیں ہیں جو صرف اور صرف غربت کی کھا د میں پیدا ہوتی ہیں، اب یہ ہم پر ہے ہم اس غربت کو اپنے لئے تحریک بناتے ہیں، اسے حوصلے اور عزم کی شکل دیتے ہیں یا پھر صبر اور سمجھوتے کی چادر تان کر چپ چاپ لیٹ جاتے ہیں، یہ اختیار اللہ تعالیٰ نے انسان کو دے رکھا ہے، تم یقین کرو اللہ تعالیٰ جتنا فن، جتنی صلاحیت غریب کو دیتا ہے اتنی صلاحیت، اتنا فن دس ہزار امیروں کو، اجتماعی طور پر نصیب نہیں ہوتا لیکن اس صلاحیت، اس فن سے فائدہ اٹھانا یہ تمہارے اور میرے جیسے لوگوں کا کام ہوتا ہے۔

میں رکا اور ذرا سا سوچ کر کہا، "اچھا تم مجھے ایک سوال کا جواب دو، تم نے کبھی شہد کی مکھی

کو شہر سے میں پھرتے دیکھا ہے؟" نوجوان نے کہا، "میں سر بلاؤ بیٹھی نے کہا، "کبھی وہ شہر سے نکلنے کی کوشش کرتی ہے، یہ کوشش شہر بننے کے عمل کا حصہ ہے، جب یہ مکھی شہر سے آزاد ہوتی ہے تو اس کا شہر دوسری مکھیوں سے سوگنا گاڑھا، شیریں اور صحت افزا ہوتا ہے، یہ اس مکھی کو قدرت کی طرف سے انعام ملتا ہے، اگر یہ مکھی جدوجہد کے دوران ہمت ہار دے تو یہ اس شہر سے محروم ہو جاتی ہے، یہ مر جاتی ہے،" میں نے نوجوان سے ہاتھ ملایا، "نوجوان نے فہم کر آکھیں صاف کیس اور سلام کر کے چلا گیا، ہر زندگی ایک نئے زاویے سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔



دو گھنٹے اپنے لئے

حکومتی نظام میں سیکرٹری سب سے بڑا عہدہ ہوتا ہے اس عہدے پر متمکن شخص ایک بڑا اختیار اور ہارورٹ اشر ہو جائے جو لوگ حکومتی سسٹم سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں صدر ہو یا وزیر اعظم گورنر ہو یا وزیر اعلیٰ وزیر ہو یا وزیر مملکت تمام اکامات سیکرٹری سے ہو کر نیچے آتے ہیں یہ تمام لوگ سیکرٹری کو فون کرتے ہیں اور نہایت ادب سے عرض کرتے ہیں شاہ جی زیدی صاحب انور صاحب طارق صاحب یا جنرل صاحب میں یہ چاہتا ہوں میری یہ خواہش ہے یا فلاں صاحب بڑے ماہر اور ذہین ہیں آپ مہربانی فرما کر انہیں فلاں پوسٹ پر لگا دیں وغیرہ سیکرٹری اسی وقت اپنے پی ایس کو بلاتے ہیں اور اسے صدر وزیر اعظم یا وزیر کی خواہش سے مطلع کرتے ہیں اور پھر حکم جاری کرتے ہیں "ابھی اسی وقت لیٹر تیار کر کے لائیں" یہ خط عموماً اس قسم کا ہوتا ہے "میں وزیر اعظم صدر یا وزیر کی ہدایت پر یہ حکم دیتا ہوں فلاں صاحب کو فلاں عہدہ دے دیا جائے اور فلاں کو فلاں ٹھیکہ دے دیا جائے" وغیرہ وغیرہ حکومتی نظام سے واقف لوگ جانتے ہیں وزیر اعلیٰ گورنر وزیر اعظم اور صدر کی اصل طاقت سیکرٹری صاحبان ہوتے ہیں پورے ملک کی بیورو کریسی سارے سیاستدان سفیر اور صنعت کار ان کے محتاج ہوتے ہیں ان کے ایک اشارے سے ادھر کی دنیا ادھر اور ادھر کی کائنات ادھر ہو جاتی ہے اگر دیکھا جائے تو یہ لوگ بہت مصروف ہوتے ہیں ان کا دن عموماً فجر سے پہلے طلوع ہوتا ہے اور رات دو تین بجے تک جاری رہتا ہے یہ

روزانہ سینکڑوں لوگوں سے ملتے ہیں سینکڑوں فون کرتے اور سنتے ہیں سینکڑوں خط لکھتے ہیں اور سینکڑوں خط وصول کرتے ہیں ان لوگوں کی زندگی بہت خوفناک اور قابلِ رحم ہوتی ہے یہ عام طور پر کئی دن اپنے بچوں سے ملاقات نہیں کر پاتے اخبار نہیں پڑھ سکتے اور ٹی وی نہیں دیکھ سکتے۔

میں ایک سیکرٹری کو جانتا ہوں وہ جب ایڈیشنل سیکرٹری تھے تو میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی یہ ملاقات آہستہ آہستہ دوستی میں بدل گئی اس دوستی کی بنیاد لطیفہ گوئی اور حیران کن قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں وہ مجھے اکثر بلایا کرتے تھے میں ان کے دفتر میں داخل ہوتا تھا تو وہ فروٹ سلاد منگواتے تھے اور پی اے کو حکم جاری کر دیتے تھے میں ایک گھنٹہ مصروف ہوں کوئی بندہ اندر آتا چاہے اور نہ ہی کسی کا فون اور اس کے بعد لطیفوں کا سیشن شروع ہو جاتا تھا ہم دنیا جہان کے لطیفے سناتے تھے دنیا جہان کے چٹکے اور دلچسپ باتوں کا تبادلہ ہوتا تھا ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ گھڑی کی طرف دیکھتے اور میں ہاتھ ملا کر وہاں آ جاتا تھا ایک سال کی رفاقت کے بعد وہ سیکرٹری بن گئے میں نے ان سے رابطہ منقطع کر دیا ایک روز ان کا فون آیا "بھئی تم کہاں ہو؟" میں نے

مخبر کیا "میں اسی شہر میں ہوں لیکن اب آپ کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں لہذا میں رابطہ نہیں

کرتا" انہوں نے چند سیکنڈ سوچا اور پھر قبہ لگا کر بولے "تم آج دو بجے میرے پاس آ جاؤ" ان کا فون بند ہو گیا میں دو بجے ان کے دفتر پہنچ گیا فروٹ سلاد میز پر پڑا تھا انہوں نے پی اے کو حکم جاری کیا اور میرے ساتھ گپ شپ کا سلسلہ شروع کر دیا میں نے ان سے پوچھا "شاہ جی آپ جس پوسٹ پر ہیں اس پر تو اپنی کمر پر خارش کی باری تیسرے دن آتی ہے آپ مجھ پر اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہیں" وہ بخجیدہ ہو گئے اور ذرا سا آگے جھک کر بولے "میرے چودہ گھنٹوں میں میرا اپنا وقت صرف یہی ایک گھنٹہ ہے باقی سارے گھنٹے حکومت کے ہیں بیورو کرکسی اور عوام کے ہیں یہ ایک گھنٹہ مجھے ری لیس کرتا ہے مجھے حقیقی خوش اور مسرت دیتا ہے اگر میں ایک گھنٹہ قہقہے نہ لگاؤ تمہارے سامنے ناخمس پھیلا کر دل کھول کر بکواس نہ کروں تو شاید ایک ہفتے بعد میرا ہارٹ ٹیل ہو جائے" مجھے ان کی یہ بات عجیب لگی میں نے ان سے پوچھا "لیکن اس نیک کام کیلئے آپ نے صرف مجھے ہی کیوں منتخب کیا آپ جانتے ہیں میں جرنلسٹ ہوں اور کسی جرنلسٹ کا قرب بہت خطرناک ہوتا ہے آپ بخوبی جانتے ہیں" انہوں نے قبہ لگا دیا اور سب کی قاش اٹھا کر بولے "بے وقوف شخص آخر میرا بھی کوئی تجربہ ہے آخر میں بھی لوگوں کو سمجھتا اور جانتا ہوں تمہارے ساتھ دوستی کی تمن و جو بات ہیں نمبر ایک تم ایک وسیع المطالعہ شخص ہو تم دنیا جہاں کی

چیزیں پڑھتے ہو، دو تم ایک اتنا پرست شخص ہو میں جانتا ہوں جس دن میں تمہیں نہیں بلاؤں گا تم اس دن نہیں آؤ گے اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہم حکومت میں رکھ کر ترس جاتے ہیں، ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں ہمیں کوئی ایسا شخص ملے جس کے پیچھے ہم پھریں، وہ ہمارا عقاب نہ کرے اور تیسری بات میں جانتا ہوں تمہیں میری پوزیشن میرے عہدے سے کوئی غرض نہیں، پچھلے ایک برس میں ہم کم از کم دو سو بار ملے ہوں گے لیکن تم نے آج تک مجھے کوئی کام نہیں کہا، تم نے کبھی کسی کی سفارش نہیں کی، یہ بات بھی حیران کن ہے اور ہم ایسے لوگوں کو بھی ترس جاتے ہیں اور آخری بات میں نے محسوس کیا تم یاری دوستی کے معاملے میں اپنی صحافیانہ حس قربان کر دیتے ہو۔

میں نے ان کی باتوں سے کم و بیش اتفاق کیا اور ان سے پوچھا، "لیکن آپ کو اس سارے کھیل کی ضرورت کیا ہے؟" شاہ جی ہنسے اور لٹو سے موٹھے صاف کر کے بولے، "دیکھو یار زندہ رہنے کیلئے رنی لیکس ہونا، تھقبے لگانا اور بے لوث دوستوں کی کہنی ضروری ہوتی ہے، میں جب زیور کر سکی میں آیا تو میں نے ایک توازن قائم کر لیا، میں جہاں بھی جاتا ہوں ایک آدھ ایسا شخص ملائی کر لیتا ہوں، ان کے ساتھ میں ہی جھگڑا لپٹا لگا لیتا ہوں، ان سے لپٹنے سٹاؤں اور سٹوٹاؤں کا رونا پڑا ہوتی کتابوں پر بحث کروں، اس کے بعد میں اپنے آفس کو وقت دیتا ہوں اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارتا اور لمبی واک کرتا ہوں، یہ سلسلہ میں نے پوری زندگی جاری رکھا، میں آج تک اس پر کار بند ہوں، میرے لئے یہ بات بھی ایک دلچسپ انکشاف تھا، میں نے پوچھا، "شاہ جی آپ آج کل بھی واک کرتے ہیں؟" شاہ جی نے اثبات میں گردن ہلائی، "روز ایک گھنٹہ، میں نے پوچھا، "اس کیلئے وقت کہاں سے نکالتے ہیں؟" انہوں نے پھر تہجد لگایا، "ذرا سی شیطانی سے کام لینا پڑتا ہے، یہاں دفتر میں لوگ بیٹھے ہوں تو میں پاؤں کے نیچے لگا ٹین واپاتا ہوں، اچانک گرین ٹیلی فون بج اٹھتا ہے، لوگ سم جاتے ہیں، میں فون اٹھا کر موبائل انداز سے بات سننے کی ادکاری کرتا ہوں اور پھر ایس سرکہ کر فون رکھ دیتا ہوں، مہمانوں کی طرف بے چارگی سے دیکھتا ہوں اور معذرت کر کے کہتا ہوں، مجھے پی ایم صاحب نے بلا لیا ہے، آپ لوگ کافی عیش میں ابھی آتا ہوں، سب لوگ بڑی خوشی سے مجھے اجازت دے دیتے ہیں، میں اٹھتا ہوں، گاڑی میں بیٹھتا ہوں، سوٹ اتار کر پانچام شرت پہنتا ہوں، چاگرز چڑھاتا ہوں اور گراؤڈ میں جا کر جاگنگ شروع کر دیتا ہوں، گھنٹے بعد واپس جاتا ہوں تو وہ لوگ ناراض ہوئے بغیر میرا انتظار کر رہے ہوتے ہیں، میں ہنس پڑا، "اور اگر میٹنگ ہو رہی ہو تو؟" انہوں نے ایک اور تہجد لگایا، "وہاں اچانک مجھے ایک چٹ لاکر دی جاتی

ہے میں حاضرین سے کہتا ہوں بھائیو معاف کرنا مجھے پی ایم بلا رہے ہیں آپ مینٹگ جاری رکھیں میں ان کی بات سن کر ابھی واپس آتا ہوں اور میں گراؤنڈ کی طرف بھاگ جاتا ہوں مجھے معلوم ہے اب تم پوچھو گے اگر میں پی ایم کے دفتر میں ان کے سامنے بیٹھا ہوں تو میں کیا کرتا ہوں "میں نے ہاں میں گردن ہلا دی انہوں نے دائیں آنکھ دبائی اور ہنس کر بولے "میں پی ایم سے کہتا ہوں "سر آپ کے احکامات بہت ضروری ہیں مجھے آپ ایک گھنٹہ دے دیں میں ابھی احکامات ٹائپ کرا کے واپس آتا ہوں وہ میری بات سے اتفاق کرتے ہیں میں واپس آتا ہوں اور وہ احکامات اپنے پی ایس کے حوالے کر کے گراؤنڈ بھاگ جاتا ہوں "باہا باہا۔"

شاہ جی کی باتیں بہت دلچسپ تھیں میری حیرتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا ایک گھنٹہ بچکا تھا میں جانے کیلئے کھڑا ہوا تو وہ اٹھو سے ہاتھ رگڑ کر بولے "یاد رکھو اگر تم صحت مند ہو چست و چالاک ہو اگر تم زندہ ہو تو یہ ساری دنیا تمہاری ہے لیکن جس دن تم بیمار ہو گئے معذور ہو گئے یا کام کی ٹینشن سے فوت ہو گئے یہ دنیا اسی دن تمہیں بھلا دے گی آج مجھے جلا پوریشنر ہو گئے میری آنکھیں ختم ہو جائیں یا پھر مجھے فائیو ہو جائے تو کل اس کرسی پر کوئی دوسرا صحت مند شخص بیٹھا ہوگا میں اس حقیقت سے واقف ہوں لہذا میں تم جیسے دوستوں اور ایک گھنٹے کی واک سے توانائی حاصل کرتا ہوں اور خود کو اگلے روز کیلئے کرسی کا اہل بنا لیتا ہوں "انہوں نے ہاتھ ملایا اور میں باہر آ گیا لفٹ سے اترتے ہوئے میں نے سوچا "شاہ جی واقعی بہت چالاک ہیں وہ جانتے ہیں ذہنوں پر حکومت کرنے کیلئے حکمرانوں کے ذہن تازہ اور جسم طاقتور ہونے چاہئیں وہ جانتے ہیں زندہ لوگوں پر صرف زندہ لوگ ہی حکومت کر سکتے ہیں لہذا وہ اپنے لئے بھی روزانہ دو گھنٹے نکال لیتے ہیں اپنے آپ کو بھی قرض دیتے رہتے ہیں"

ترقی کا سٹیڈیم

قلب امریکہ میں میرا گائیڈ تھا میں نے اس کے ساتھ امریکہ کی چھ ریاستوں میں سفر کیا وہ مجھے درہمیان لے کر گیا اس نے مجھے نیو یارک لیکساں اور واشنگٹن دکھایا اور کینیڈا بھی دکھایا ہم 25 دن اگلے رہے میں نے جب واشنگٹن میں قلب کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو مجھے بہت مایوسی ہوئی تھی وہ ایک کمزور بوڑھا تھا اور ذرا سا بیمار بھی دکھائی دیتا تھا میرا خیال تھا وہ شاید ہی واشنگٹن سے باہر نکل سکے اور اس کے بعد مجھے ایک مردے کے ساتھ سفر کرنا پڑے گا لیکن جب ہم نیو یارک پہنچے تو میں قلب کی چستی، معاملہ فہمی، وقت کی پابندی اور ان تھک شخصیت سے متاثر ہو چکا تھا وہ پیدل چلتے ہوئے ہمیشہ مجھ سے آگے نکل جاتا تھا اور اس کی سانس تک نہیں پھولتی تھی میں ایئر پورٹس پر اپنا سامان پورٹرز کے حوالے کر دیتا تھا جبکہ وہ اپنے دونوں بیگ خود اٹھاتا تھا مجھے آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد ریٹ کی ضرورت پڑتی تھی جبکہ قلب بغیر رکے بغیر دم لئے چلتا رہتا تھا وہ صبح سا چھ بجے آنے کا وعدہ کرتا تھا تو ٹھیک چھ بج کر 14 منٹ پر وہ میرے دروازے پر ہوتا تھا اس نے 25 دنوں میں مجھے کسی فلاحیت، کسی ٹرین سے لیٹ نہیں ہونے دیا وہ صبح سے رات تک با تھکان میرے ساتھ گھومتا تھا میں اس کی ایلی ٹینسی پر حیران تھا میں نے ایک بار اس سے عمر پوچھی تو وہ مسکرایا اور مجھے لہجے میں بولا "79 سال" میں نے اس کی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں پوچھا شروع کر دیا اس کا بائیو ڈیٹا بہت دلچسپ تھا اس نے 15 سال کی عمر میں ایک ریستوران پر

کا مشورہ کیا تھا وہ شام کو کام کرتا تھا اور دن میں سکول جاتا تھا اس نے نوکری کے ساتھ ساتھ گریجویٹیشن کی پونہ روشنی کیا وہاں سے پلینٹج ڈی کی اور پڑھانا شروع کر دیا پانچ سال پڑھایا اور پھر ایک فرم میں ملازمت کرنی ملازمت چھوڑی اور اپنا کاروبار شروع کر دیا کاروبار سے وہ سیاست میں آیا اور فلوریڈا کی پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہو گیا پارلیمنٹ کی مدت ختم ہوئی تو وہ فارن سروس میں چلا گیا اس نے اس سروس میں رہ کر لبنان، سوڈان، امریکان اور پاکستان میں کام کیا وہ 4 سال کراچی رہا فارن سروس چھوڑنے کے بعد اس نے این جی او بنالی اور جب این جی او چل نکلی تو اس نے واشنگٹن میں فوراً پریٹنگ فرم بنالی مجھے اس وقت پتہ چلا میں جس فرم کے ذریعے امریکہ کی سیر کر رہا ہوں قلم اس فرم کا مالک ہے میرے لئے خیر انکشاف کی حیثیت رکھتی تھی میں نے اس سے پوچھا ”تم مالک ہو کر میرے ساتھ کیوں دھکے کھا رہے ہو؟“ اس نے تہقید لگایا ”میں سال میں ایک بار گائیڈ کا کام بھی کرتا ہوں اس سے میری استطاعت بھی بڑھتی ہے“ میری معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور مجھے سیاست اور ضروریات کا اندازہ بھی ہوتا ہے یوں میں اپنے تجربات کی روشنی میں اپنی کہنی کے کام میں تبدیلیاں لاتا رہتا ہوں“

میں نے ایک دن قلم سے پوچھا ”تم چار سال پاکستان میں کام کر چکے ہو تم اپنے تجربے کی روشنی میں بتاؤ“ کیا پاکستان بھی ترقی کر سکتا ہے“ اس نے ذرا سا سوچا اور مسکرا کر بولا ”ہاں لیکن ایک سرائز کے ساتھ اگر تم لوگ ورزش شروع کر دو تو تم کمال کر سکتے ہو“ میرے لئے اس کا جواب ہم بلاست تھا وہ مسکرایا ”تم میرے جواب کو غیر سنجیدہ سمجھ رہے ہو لیکن میں انتہائی سنجیدہ ہوں میں بچپن اور جوانی میں ایک سرائز نہیں کرتا تھا میں 6 گھنٹے ریستوران پر کام کرتا تھا اور وہ گھنٹے پڑھتا تھا لہذا میرے پاس ورزش کیلئے وقت نہیں بچتا تھا میں پڑھائی کے بعد صبح میں مصروف ہو گیا وہاں بھی مجھے وقت نہیں ملتا تھا لیکن جب میں پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا تو مجھے معلوم ہوا ہماری پارلیمنٹ کے تمام ارکان روزانہ ورزش کرتے ہیں فلوریڈا کی پارلیمنٹ میں 160 ارکان تھے ان میں سے 132 مختلف ”ٹیمز“ کے ممبر تھے جبکہ 28 رکن روزانہ ایک گھنٹہ جاگنگ کرتے تھے مجھے وہاں جا کر علم ہوا امریکہ کی تمام ریاستوں کے 98 فیصد ارکان پارلیمنٹ اور سو فیصد سیاستدان ورزش کرتے ہیں اور جو شخص سیاست میں آنے کے بعد ایک سرائز نہیں کرتا اسے سیاست میں سنجیدہ نہیں سمجھا جاتا میں نے ذرا سی تحقیق کی تو پتہ چلا امریکی عوام کا خیال ہے جو سیاستدان اپنے آپ کو اہمیت نہیں دیتا وہ ملک اور حلقے کے لوگوں کو بھی اہمیت نہیں دے گا چنانچہ امریکہ میں سیاست کا آغاز انسان کے اپنے وجود سے ہوتا ہے شاید یہی وجہ ہے امریکہ کا ہر

سیاستدان ورزش کا پابند ہے تم ہمارے صدر بل کلنٹن (اس وقت کلنٹن امریکہ کے صدر تھے) کو دیکھو کلنٹن روزانہ ڈیڑھ گھنٹے جاگنگ کرتے ہیں اس وقت صدارت کے تین بڑے امیدوار ہیں جارج بلیش جان کیری اور الگور۔ یہ تینوں ورزش کے عادی ہیں بلیش دن میں تین بار ایکسرسائز کرتے ہیں وہ صبح کے تین دن اپنے فارم ہاؤس پر گزارتے ہیں وہ اپنے ہاتھ سے کٹڑیاں کاٹتے ہیں زمینوں میں ٹریکٹر چلاتے ہیں جانوروں کا دودھ دھوتے ہیں اور پودوں کو پانی دیتے ہیں الگور کوہ پیما ہیں وہ کوہ پیما کی کرتے ہیں اور جان کیری جاگنگ کرتے ہیں لہذا میں نے دوسرے سیاستدانوں کی پیروی میں ورزش شروع کر دی میں نے سیاست کے بعد کاروبار شروع کیا تو پتہ چلا امریکہ کے بزنس میں سیاستدانوں سے زیادہ ورزش کے پابند ہیں اس وقت امریکہ میں 1000 بڑے بزنس میں ہیں ان میں سے چار سو ارب پتی ہیں پوری دنیا میں سب سے زیادہ ارب پتی امریکہ میں پائے جاتے ہیں اور یہ تمام ارب پتی نو دہائیے ہیں ان میں کوئی ایسا شخص نہیں جو تیسری نسل سے امیر ہو یہ سب پہلی اور دوسری نسل کے امراء ہیں لہذا ہم ان تمام ارب پتیوں کو سیلف میڈ کہہ سکتے ہیں اس وقت دنیا کے 14 بڑے ادارے امریکہ کے ارب پتیوں پر تھیں کرڈ ہے ہیں وہ ان کی مشترکہ عادتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں مجھے چین کے ایک ادارے کی شخصیت پڑھنے کا اتفاق ہوا اس نے امریکہ کے 1000 کامیاب بزنس مینوں کی عادتوں کا چارٹ بنایا اس چارٹ کے مطابق ان لوگوں میں 23 عادتیں مشترک تھیں تم شاید یہ جان کر حیران ہو جاؤ ان 23 عادتوں میں پانچویں عادت ورزش تھی امریکہ کی ہزار بڑی کاروباری شخصیات ورزش کی عادی ہیں لہذا جب میں کاروبار کی دنیا میں داخل ہوا تو مجھے پتہ چلا ورزش کے بغیر کوئی شخص اچھا بزنس مین نہیں بن سکتا چنانچہ میں نے روزانہ ایک گھنٹہ جاگنگ شروع کر دی اور آدھ گھنٹہ سٹریٹ ٹینگ اس کے بعد میں آج تک روزانہ ورزش کرتا ہوں اور صبح کے آخری دو دن کسی پہاڑ پر گزارتا ہوں میں وہاں کیسٹنگ کرتا ہوں پیدل چلتا ہوں اور فطرت کے ساتھ 48 گھنٹے گزار کر واپس آ جاتا ہوں یہ اسی ورزش کا کمال ہے میں 79 برس کی عمر میں بھی فٹ ہوں مجھ میں تم سے زیادہ توانائی ہے وہ خاموش ہو گیا۔

ہمارے درمیان بڑی دیر تک خاموشی کا وقفہ رہا وہ دوبارہ بولا "تو صوم کی ترقی سیاست اور صحیبت پر استوار ہوتی ہے اور اس کیلئے سیاستدانوں اور بزنس مینوں کا صحت مند مثبت اور فعال ہونا ضروری ہوتا ہے امریکہ کے تمام سیاستدان اور بزنس مین صحت مند بھی ہیں اور فعال بھی لہذا ہم دنیا کی سب سے بڑی سیاسی اور اقتصادی قوت ہیں تم اگر ہماری طاقت کے پیچھے

جھانک کر دیکھو تمہیں اس میں ورزش نظر آئے گی اس وقت دنیا میں ورزش کی سب سے زیادہ مشینیں امریکہ میں خریدی جاتی ہیں دنیا میں سب سے زیادہ ٹریک سوٹ جاگرز اور ٹی ٹریکس امریکہ میں کھتی ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ نوڈسٹی منس امریکہ میں لئے جاتے ہیں امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے جس میں ورزش انڈسٹری کی شکل اختیار کر چکی ہے امریکہ میں سٹیکڑوں کمپنیاں ورزش کے نئے آلات اور نئی ورزشیں ایجاد کر رہی ہیں دنیا میں سب سے زیادہ جم امریکہ میں ہیں اور امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے جس میں ورزش کیلئے باقاعدہ نیلی ویشن جیمل ہیں جس میں ورزش کرانے کے ٹکڑے اور کمپنیاں ہیں لہذا یہی وجہ ہے ہم دنیا سے بہت آگے ہیں جبکہ میں نے پاکستان میں ایسا نہیں دیکھا میں کراچی کے ایک پارک میں جاؤنگ کرتا تھا مجھے اس پورے پارک میں کوئی دوسرا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا میں نے اپنے چار سالہ قیام میں پاکستان کے سیاستدانوں اور بزنس مینوں کو جتنا ست اور بیمار دیکھا اتنا مجھے دنیا کا کوئی دوسرا بزنس مین اور کوئی دوسرا سیاستدان دکھائی نہیں دیا تم پاکستان جاؤ اور جا کر تحقیق کرو تمہارے ملک کے کتنے سیاستدان اور کتنے بزنس مین ورزش کرتے ہیں مجھے یقین ہے تمہیں ماہیتی ہوگی لہذا جس ملک کا سیاست دان اور بزنس مین اپنے ساتھ دو گاؤں دارندہ ہونے جس کا رویہ خود کش ہو وہ ملک کیسے ترقی کرے گا ترقی کیلئے مثبت سوچ کی ضرورت ہوتی ہے اور ورزش کے بغیر کسی شخص کی سوچ مثبت نہیں ہو سکتی اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر پوچھا "تمہاری عمر کتنی ہے" میں نے مسکرا کر جواب دیا "35 برس" اس نے قہقہہ لگایا اور اپنے بازو پر ہاتھ پھیر کر بولا "جس ملک کا 35 برس کا نوجوان مجھ جیسے 79 سال کے بوڑھے کے ساتھ بیدل نہ چل سکتا ہو وہ ملک جدید دنیا کے چیلنجوں پر کیسے پورا اترے گا وہ ترقی کے شیلڈ میں کیسے آگے بڑھے گا" میں نے مسکرا کر دیکھے اور شرمندہ ہو کر سر تھکا لیا۔

KashifAzad@jalilou.com

کرے گا کون

نوجوان بہت پریشان تھا وہ بار بار ہاتھ ملتا اور پھر ہماری طرف دیکھ کر کہتا "اٹ از نو لیٹ سر وہاں تو لوگ سردی سے مر جائیں گے" وہ پریشانی میں گردن ہلاتا "ہاتھ ملتا اور گھر سے باہر نکلتا تھا" شخص کل یہاں سے اٹھیں گی اس دن بعد اسلام آباد پھینکیں گی اور وہاں سے بارغ پہنچنے میں دو دن لگ جائیں گے" اٹ از نو لیٹ "ہم اس کی پریشانی کو دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔

اس کا نام روجر ڈین تھا وہ آئر لینڈ کا رہنے والا تھا اور اس کی عمر بمشکل 28 برس تھی اس نے اپنے کیریئر کا آغاز بی بی سی سے کیا تھا کیریئر کے شروع میں اس کی ڈیوٹی افریقہ لگ گئی وہاں اس نے انسانیت کا ایک انوکھا روپ دیکھا اس نے غربت، بیماری، جہالت، پریشانی، جنگ اور نقل مکانی کو ایک جگہ اکٹھے دیکھا وہ جوں جوں انسانی مسائل اور مصیبتوں کا مشاہدہ کرتا گیا تو اس سے اپنی معاشرت سے نفرت ہوتی گئی یہ نفرت آنے والے دنوں میں اتنی بڑھی کہ اس نے نوکری چھوڑ دی ان دنوں آئر لینڈ کی ایک این جی او "گول" یوگنڈا میں کام کر رہی تھی روجر ڈین اس "این جی او" میں شامل ہو گیا اور اس کے بعد وہ چھ سال تک گھر نہیں گیا وہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور دوسرے ملک سے تیسرے ملک سفر کرتا رہا 18 اکتوبر کو پاکستان میں زلزلہ آیا تو وہ رضا کاروں کے ایک گروپ کے ساتھ پاکستان آ گیا ان لوگوں نے آزاد کشمیر میں کام شروع کر

دیا، نومبر کے وسط میں سر دی شروع ہوئی تو ”گول“ نے بھارت سے چھتوں کی جستی ٹیٹس در آمد کرنے کی درخواست دی، یہ ٹیٹس کراچی آتا تھیں، رو جڑوین ان کی ٹیکسٹس کے لئے کراچی آیا تھا، میں اس وقت کراچی کسٹم ہاؤس میں اپنے ایک دوست کے پاس بیٹھا تھا، ہم دونوں مپ لگا رہے تھے، کافی پی رہے تھے اور عالمی سیاست پر گفتگو کر رہے تھے لیکن رو جڑوین مسلسل ہاتھ مل رہا تھا اور باغ کے ان متاثرین کے لئے پریشان ہو رہا تھا جو شدید سر دی میں ان ٹیٹس کا انتظار کر رہے ہیں۔

میں نے توجہ ہانپنے کیلئے اس سے پوچھا ”تم کتنی تنخواہ لیتے ہو“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”تنخواہ کیا مطلب؟“ میں نے وضاحت کی ”میرا مطلب ہے تمہارا کچھ کتنا ہے“ وہ مسکرایا ”گول“ میں آئیئر لینڈ کے 1100 رضا کار کام کرتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی شخص تنخواہ نہیں لیتا، ہم سب لوگ ایک دو کمروں میں فرش پر سوتے ہیں، دن میں دو بار کھانا کھاتے ہیں اور صبح کے آخر میں ہمارا ادارہ ’بیس ٹوتھ پیٹن‘ شیونگ کے سامان یا کپڑوں کے ایک آدھ جوڑے کے لئے تھوڑی سی پاکٹ منی دے دیتا ہے“ میں اور میرا دوست پریشان ہو گیا، ڈین نے

کا گول ایک آئرش لاجان جان اوشلین نے 1977 میں قائم کی تھی، وہ ابھی تک اس میں ہی سے وابستہ ہے، اس این جی او کا مقصد آئرش حکومت کو تیسری دنیا کے مسائل سے آگاہ کرنا تھا، اس ادارے نے سب سے پہلے افریقہ میں کام کیا، یہ لوگ آفت زدہ علاقوں کے لئے خوراک، پانی، پناہ گاہوں، ادویات اور پرائمری تعلیم کا بندوبست کرتے تھے، یہ لوگ تیسری دنیا کے متاثرہ علاقوں میں جاتے تھے اور اپنی حکومت کو مقامی مسائل کے بارے میں مطلع کرتے تھے اور اسے فائل کرتے تھے، وہ سرکاری سطح پر اس علاقے کی مدد کا اعلان کرے، اس ادارے کا کہنا تھا ”آئرش حکومت کو دنیا کے غریبوں کا چیمپین ہونا چاہیے، یہ لوگ اپنی حکومت پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہے یہاں تک کہ 2003ء میں آئر لینڈ کی حکومت نے پہلی بار یوگنڈا کے متاثرین کے لئے دس ملین پاؤنڈ امداد کا اعلان کیا، گول ایک چھوٹی سی تنظیم ہے لیکن یہ اس وقت دنیا کے 15 غریب ملکوں میں کام کر رہی ہے، اس کے پاس ایک ہزار ایک سو رضا کار اور 2 ہزار مقامی لوگوں کا مملہ ہے، یہ لوگ ہر سال 350 ملین پونڈ خرچ کرتے ہیں اور ان کے ذاتی اخراجات محض پانچ فیصد ہیں، ہمارے لئے یہ ساری معلومات حیران کن تھیں۔ رو جڑو نے بتایا ”گول“ کے گیارہ سو رضا کار دس برس سے اپنے گھر نہیں گئے، یہ لوگ ایک جگہ جاتے ہیں وہاں حالات ٹھیک ہوتے ہیں تو انہیں کسی دوسرے ملک کسی دوسرے علاقے میں آفت کی اطلاع مل جاتی ہے اور یہ لوگ اپنا سامان باندھ کر اس علاقے میں

چلے جاتے ہیں۔ خود روجر کو گھر سے نکلے چھ سال ہو چکے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا "تم پاکستان کے بارے میں کیا جانتے تھے" اس نے ہنس کر جواب دیا "میں نے آٹھ اکتوبر 2005ء سے پہلے پاکستان کا نام نہیں سنا تھا" یہاں زلزلہ آیا تو ہینڈ کوارٹر نے ہمیں پاکستان جانے کا حکم دیا، ہم لوگ یہاں آ گئے یہاں حالات بہت خراب تھے ہم نے آئرلینڈ سے فنڈ منگوا دیا، اس فنڈ سے بھارت سے شیش خریدیں اور اب ہماری کوشش ہے ہم برہماری سے پہلے باغ کے لوگوں کو گھر بنا دیں، ابھی روجر کی گفتگو جاری تھی میرے دوست کا اسٹنٹ اندر داخل ہوا اور روجر کو اس کا ٹیکسٹس سرٹیفکیٹ دے دیا۔ روجر نے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔

روجر کے جانے کے بعد ہم بحث کے ایک نئے فیئر میں داخل ہو گئے، میرا دوست مجھ سے کہنے لگا "دنیا میں 156 اسلامی ممالک ہیں، تم ان اسلامی ممالک کا پر دفاں نکال کر دیکھ لو تمہیں کسی اسلامی ملک میں گول جیسی کوئی تنظیم نہیں ملے گی، ہم پاکستانی ایک جذباتی اور ردول رکھنے والی قوم ہیں لیکن ہمارے ملک میں بھی کوئی ایسی تنظیم نہیں" میں نے اس کی تائید میں سر ہلا دیا "نہیں یہ حیران کن بات ہے، لوگ ان کا وہ مقصد جس کی بنیاد رکھی اور تیار تھی اس میں آج عالمی سطح کا ایک بھی ویٹیفائر ادارہ نہیں" میرے دوست نے کہا "لیکن ہم اگر چاہیں تو گول جیسے سینکڑوں ادارے بنا سکتے ہیں، تم ایڈمی فاؤنڈیشن کی مثال لے لو، ایک ان پڑھ شخص نے کام شروع کیا اور آج ایڈمی دنیا کی سب سے بڑی پرائیویٹ ایجوکیشن سروس ہے، یہ ادارہ پچھلے چار سال سے گینو بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ہے، اس کا مطلب ہے ہم میں پرنٹیشنل موجود ہے، بس نیت اور ہمت کرنے کی دیر ہے" میں نے اس سے پوچھا "ہم یہ کیسے کر سکتے ہیں" اس نے قہقہہ لگایا "جان اوشیا اور روجر ڈین کی طرح ہم لوگ بھی چھوٹی چھوٹی تنظیمیں بنائیں، مختلف شعبوں کی تربیت حاصل کریں اور اس کے بعد نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر کام شروع کر دیں، مجھے یقین ہے چند برسوں میں ہماری تنظیمیں بھی عالمی سطح پر پہچانی جائیں گی" میں نے اس کی تائید کی "واقعی تم صحیح کہہ رہے ہو، تم حالیہ زلزلے میں ہماری تنظیموں کی کارکردگی دیکھ لو، ہماری مذہبی تنظیموں نے ہنگامی بنیادوں پر متاثرین کی مدد شروع کی اور کمال کر دیا، یورپ اور امریکہ تک کے ادارے اللہ مت ٹرسٹ، جماعت الدعوة، الرحمت ٹرسٹ اور الرشید ٹرسٹ کی خدمات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے، عالمی ایجنسیوں کے تجزیے کے مطابق ان اداروں نے پانچ ارب روپے سے زیادہ فنڈ جمع کئے اور یہ فنڈ متاثرین تک پہنچائے، چنانچہ اگر ہم صرف ان اداروں کو مضبوط بنا دیں، ہم ان کی سرکاری

زیر پبائنت 3 - 0 - 163

سر پرستی شروع کر دیں اور ان کے کارکنوں کو ٹریننگ دے دیں تو یہ ادارے دنیا میں کمال کر سکتے ہیں یہ ہمارا ایجنڈا تبدیل کر سکتے ہیں" میرے دوست نے سر ہلایا اور قبضہ لگا کر جواب دیا "لیکن کرے گا کون ہم لوگ فارورڈ بلاکوں سے باہر نکلیں گے تو ان چیزوں پر توجہ دیں گے نا جو قوم آج تک کالا باغ ذیم کا فیصلہ نہیں کر سکی، تم اس سے توقع رکھتے ہو وہ گول جیسے ادارے بنائے گی تم بڑے بے وقوف ہو۔"



Kashif Azad@OneUrdu.com

مرہم کون لگائے گا

1992ء میں راولپنڈی میں پولیس کا عالمی سطح کا ایک سیمینار ہوا تھا، اس سیمینار میں

مقررہ کیلئے بیرون ملک سے بے شمار پولیس افسر پاکستان آئے۔ ان افسروں میں جاپان کا پولیس

چیف بھی شامل تھا۔ سیمینار کے بعد ڈنرتھا، ڈنر میں راولپنڈی کے ڈی آئی جی اور جاپان کے پولیس

چیف ایک میز پر بیٹھ گئے اور دونوں نے گفتگو شروع کر دی، گفتگو کے دوران ڈی آئی جی نے

جاپانی چیف سے پوچھا "آپ لوگوں پر کبھی سیاسی دباؤ نہیں آتا؟" جاپانی پولیس چیف نے تھوڑی

دیر سوچا اور اس کے بعد جواب دیا "صرف 1963ء میں ایک بار آیا تھا" ڈی آئی جی صاحب ہم

تن گوش ہو گئے چیف نے بتایا "1963ء میں برطانیہ کے وزیر خارجہ جاپان کے دورے پر آئے

تھے، وہ ایک دن کیلئے اوسا کا شہر چلے گئے، دوسرے دن ان کی جاپانی وزیر اعظم کے ساتھ ملاقات

تھی، انہوں نے اوسا کا سے سیدھا پرائیم منسٹر ہاؤس آتا تھا، راستے میں ٹریفک جام ہو گئی، ان کے

ساتھ موجود پروٹوکول افسروں نے ہمارے پولیس چیف سے رابطہ کیا اور ان سے درخواست کی،

پولیس کسی خصوصی بندوبست کے ذریعے انہیں نوکیو پہنچا دے، پروٹوکول افسروں کا کہنا تھا برطانوی

وزیر خارجہ کی وزیر اعظم سے ملاقات انتہائی ضروری ہے اگر وہ انہیں وقت پر نہیں ملتے تو یہ ملاقات

ملتی ہو جائے گی کیونکہ ایک گھنٹے بعد وزیر اعظم چین کے دورے پر روانہ ہو جائیں گے، پولیس

چیف نے ان کی بات سن کر معذرت کر لی، اس کے بعد وزیر اعظم نے بذات خود پولیس چیف سے

درخواست کی لیکن پولیس چیف کا کہنا تھا "ہمارے پاس وی آئی بیگز کوٹریفک سے نکالنے کا کوئی بندوبست نہیں" یوں یہ ملاقات منسوخ ہوگئی اس ملاقات کی منسوخی کی وجہ سے جاپان اور برطانیہ کے تعلقات میں شدید کشیدگی پیدا ہوگئی "جاپان کے پولیس چیف خاموش ہو گئے ہمارے ڈی آئی جی نے شدت جذبات میں پہلو بدلا اور ان سے پوچھا "اس کے بعد کیا ہوا" پولیس چیف مسکرائے "اس کے بعد کیا ہوتا تھا، یہ خبر اخبارات میں شائع ہوگئی، لوگوں نے وزیراعظم کے رویے پر شدید احتجاج کیا اور وزیراعظم کو قوم اور پولیس دونوں سے معافی مانگنا پڑی "ہمارے ڈی آئی جی کیلئے یہ انوکھی بات تھی چنانچہ انہوں نے حیرت سے پوچھا "اگر پولیس چیف کے انکار سے وزیراعظم برامتا جاتے اور دونوں کے درمیان لڑائی شروع ہو جاتی تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا" پولیس چیف نے تمویزی دیر سوچا اور اس کے بعد مسکرا کر بولا "پہلی بات تو یہ ہے ہمارا وزیراعظم کبھی پولیس چیف کے ساتھ لڑائی نہ کرتا لیکن بالفرض مجال اگر دونوں میں جنگ چمک بھی جاتی تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا" پولیس چیف سانس لینے کیلئے رکا اور سنجیدگی سے بولا "وزیراعظم کو استعفیٰ دینا پڑتا" ہمارے ڈی آئی جی صاحب کا رنگ پیلا ہو گیا اور انہوں نے حیرت سے پوچھا "کیا جاپان میں پولیس چیف کا مضبوط ہوتا ہے؟" جاپانی پولیس چیف نے مسکرا کر جواب دیا "نہیں ہمارے ملک کا قانون، انصاف اور سلامتی کا نظام بہت مضبوط ہے۔ ہم نے عوام کی حفاظت کیلئے پولیس بنا رکھی ہے، وی آئی بیگز کو پروڈکول دینے کیلئے نہیں لہذا جاپان کا ہر شخص جانتا ہے اگر وزیراعظم اور پولیس چیف میں لڑائی ہوگی تو اس میں وزیراعظم ہی کا تصور ہوگا لہذا استعفیٰ بھی اسے ہی دینا پڑے گا۔"

مجھے یہ بات اس ڈی آئی جی نے سنائی تھی، یہ ڈی آئی جی بعد ازاں آئی جی بنے اور آج یہ پیش پولیس بیورو کے ڈی جی ہیں اور ان کا نام ڈاکٹر شعیب سڈل ہے۔

میں نے پچھلے دس برسوں میں بے شمار سیاستدانوں، وزراء اور پولیس کے اعلیٰ افسروں کو یہ واقعہ سنایا اور اس کے بعد ان سے عرض کیا جب تک آپ لوگ پاکستان میں جاپان جیسی پولیس نہیں بناتے اس وقت تک ملک ترقی نہیں کر سکتا، مجھے اچھی طرح یاد ہے میاں نواز شریف سے لے کر شوکت عزیز تک سب حکمرانوں نے اس واقعے پر سردھنا تھا اور اس کے بعد پاکستان میں جاپانی پولیس سسٹم کے مفاد کا عزم کیا تھا لیکن عملی طور پر نواز شریف نے کوئی قدم اٹھایا اور نہ ہی شوکت عزیز صاحب نے رو گئے پولیس کے اعلیٰ حکام تو میں نے جب بھی انہیں "سوئی ویٹ" کرنے کی کوشش کی ان کا ایک ہی جواب ہوتا تھا جب تک ہمارے سیاستدان پولیس کا سیاسی

استعمال ترک نہیں کرتے یہ نظام ٹھیک نہیں ہو سکتا، میں جب ان کے ساتھ اصرار کرتا تو وہ بے شمار ایسی مثالیں دیتے جن میں کسی پولیس اہلکار یا افسر نے کسی سیاستدان یا کسی سیاسی خاندان کے کسی فرد پر قانون نافذ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے بعد کانسٹیبل سے لے کر ذی آئی جی تک سب لوگ معطل ہو گئے تھے یا انہیں بیک جنبش قلم بدل دیا گیا تھا، ان افسروں کا کہنا تھا جس ملک میں ایم پی اے کے ملزم بھائی کے لئے چیف منسٹر تھانوں پر حملہ آور ہو جائے، جس میں اشتہاری ملزم کی رہائی کے لئے وزیراعظم کا بھائی تھا، نہ پر حملہ کر دے، ایک آپ کا تالہ توڑ دے اور تھانیدار کو سر سے عام پینا شروع کر دے، جس ملک میں گاڑی کے شیشوں سے کالے کاغذ اتارنے پر کانسٹیبل کو ہتھکڑی لگا کر جزل صاحب کے سامنے پیش کر دیا جائے اور جس ملک میں وی وی آئی پی سوہونٹ کے دوران ایسیٹنس کو راستہ دینے پر ایس ایس پی فارغ ہو جائے اس ملک کی پولیس میں جاپان جیسی سپرٹ کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ میں جب پولیس افسروں کے یہ دہاکے سنتا تھا تو میں انہیں "شیطان کی جواز" کہتا تھا، میرا خیال تھا ان لوگوں نے کام نہ کرنے کے بہانے گھڑ رکھے ہیں اگر یہ لوگ اجتماعی طور پر فیصلہ کر لیں، ہم نے آج سے کسی سیاستدان کا قتلہ حکم نہیں ماننا تو یہ نظام دو دن میں ٹھیک ہو جائے لیکن شایان کوکل ایس ایس پی اور ایم ایس ایس ایس اور یہ جو کچھ کہنا چاہئے۔

میں اپنے اس نظریے پر 28 جون 2006ء تک قائم تھا لیکن 28 جون 2006ء کو ہمارے ایک محترم ایم این اے سردار طفیل نے مجھے اپنے نظریے کو "ری ٹھیک" کرنے پر مجبور کر دیا اور میں نے پہلی بار سوچا جب تک ہمارے سیاستدانوں کا قبلہ درست نہیں ہوتا اور جب تک ان کی گردنوں کا سر یا نہیں سر کتا اس وقت تک اس ملک کا قانون اور پولیس ٹھیک نہیں ہو سکتی، سردار طفیل کا واقعہ بہت دلچسپ ہے، سردار صاحب 28 جون کو مری تشریف لے گئے، مری کی انتظامیہ گرمیوں کے سیزن میں شہر میں بڑی گاڑیوں کا داخلہ بند کر دیتی ہے لیکن سردار طفیل ایک بڑی کونٹر اور دو دوسری گاڑیوں کے ساتھ مری میں داخل ہو گئے، ان کی کونٹر نے ٹریفک باک کر دی، پولیس کانسٹیبل آگے بڑھا اور اس نے سردار طفیل سے عرض کیا "جناب مری میں بڑی گاڑیوں کا داخلہ بند ہے" سردار صاحب کو کانسٹیبل کی یہ جسارت پسند نہ آئی لہذا انہوں نے اسے ڈانٹ دیا، جس پر کانسٹیبل محمد یوسف نے اصرار شروع کر دیا، سردار صاحب کے بیٹوں اور سکیورٹی گارڈز کو یہ اصرار اچھا نہ لگا، وہ لوگ نیچے اترے اور انہوں نے سینکڑوں لوگوں کے سامنے کانسٹیبل کو مارنا شروع کر دیا، ان لوگوں نے کانسٹیبل کو مار مار کر اس کے دانت، ٹانگ کی ہڈی اور بازو توڑ دیا، لوگ یہ ظلم

برداشت نہ کر سکے تو آگے بڑھے اور انہوں نے بڑی مشکل سے کانسٹیبل کی جان بچائی، کانسٹیبل محمد یوسف اس وقت تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال مری میں زیر علاج ہے جبکہ سردار صاحب فتح یاب ہو کر واپس اسلام آباد پہنچ گئے ہیں، میں نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے محسوس ہوا سردار طفیل کے گارڈز اور بیٹوں نے یہ کئے یہ تمہرا اور یہ ٹھنڈے صرف کانسٹیبل محمد یوسف کو نہیں مارے بلکہ انہوں نے یہ تمہرا ملک کے آئین، قانون، روایات اور پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو مارے ہیں، یہ طمانچہ بنیادی طور پر ہمارے کلچر، ہماری پارلیمنٹ اور ہماری سیاسی الٹ کے منہ پر آیا ہے، یہ ٹھنڈے ثابت کرتے ہیں ہمارے سیاستدان کس قدر مضبوط اور اتمرے ہیں اور ان کی نظروں میں ہمارے قانون، ہمارے نظام اور ہماری پولیس کی کیا اہمیت ہے؟ یہ ثابت کرتے ہیں ہم ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس میں ہرزور آور شخص قانون سے جوتے صاف کرتا ہے اور اسے کوئی شخص نہیں پوچھتا، ہم ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس میں کوئی بڑا شخص قانون اور قانون نافذ کرنے والوں کو تسلیم نہیں کرتا، جس میں قانون صرف غریبوں کیلئے ہوتا ہے اور جس میں مضبوط لوگ ہر ضابطہ بر قاعدے کو روند ڈالتے ہیں، میں نے جب سے واقعہ پڑھا ہے ہر اہل کرتا ہے میں اس واقعے کے گواہوں کو اکٹھا کروں اور ان لوگوں کو چکر لڑی، اسٹیٹس پروف ہڈی، ایمر، سٹین کے سامنے کھڑا کر دوں اور ان سے عرض کروں: "تجربہ دار ملک میں اگر کوئی ادارہ، اگر کوئی پولیس اہلکار کسی ایم این اے کے سامنے چھینک بھی مار دیتا ہے تو پورے ایوان کا استحقاق مجروح ہو جاتا ہے لیکن جب اس ایوان کے کارندے پورے ملک کا استحقاق پورے ملک کی عزت اور آبروروند ڈالتے ہیں تو کسی ایوان، کسی پارلیمنٹ اور قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کے کان پر جوں تک نہیں رہتی" میں ان سے عرض کروں "حضور اس ملک کے عوام کے کئے چہئے اور نونے استحقاق پر مرہم کون لگائے گا حضور سردار طفیل صاحب جیسے لوگوں کا ہاتھ کون روکے گا۔"



ترقی کی شاہراہ

امیر تیمور اسلامی تاریخ کا ایک عجیب کردار تھا، وہ سر قند کے ایک گاؤں کیش میں پیدا ہوا۔ اس کے والد ایک معمولی زمیندار تھے۔ قدرت نے تیمور کو بلا کے حافظے اور پختہ اہول و علا جہوں سے نوازا۔ وہ نہ صرف حافظ قرآن تھا بلکہ وہ آخری آیت سے پہلی آیت کی طرف آئی ترتیب سے قرآن مجید پڑھ سکتا تھا۔ وہ فقہ اور تاریخ کا بھی ماہر تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے یکساں مہارت سے کام کر سکتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا سکتا تھا۔ گرز کھما سکتا تھا۔ تیر پھینک سکتا تھا اور لکھ سکتا تھا اور وہ شریعت کا اس قدر پابند تھا کہ اس نے پوری زندگی نماز قضا نہیں کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بلا کا وحشی اور ظالم بھی تھا۔ وہ پچاس برس تک جنگیں لڑتا رہا، اس نے سارا سنٹرل ایشیا، ایک تہائی ہندوستان، افغانستان، ایران اور عراق فتح کیا، اس نے ترکی اور یورپ کے کئی ملک بھی روند ڈالے وہ اپنی فتوحات کے باعث ”تیموردی گرینٹ“ کہلایا وہ قتل کر کے خوش ہوتا تھا اس کا کہنا تھا دنیا میں کئی ہوئی گردن سے اچھے خون جیسا جیسی نگارہ کوئی نہیں۔ وہ جو شہر فتح کرتا تھا اس کی ساری آبادی کو قتل کر دیتا تھا، عمارتیں ڈھا دیتا تھا اور فصلیں گرا دیتا تھا اس نے ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ لوگوں کے سر کنوا کر کھوپڑیوں کے مینار بنائے لیکن اس تمام تر ظلم اور وحشت کے باوجود اس میں ایک عجیب عادت تھی وہ جو شہر، جو ملک فتح کرتا تھا وہاں کے علماء، دانشوروں، شاعروں اور صنعت کاروں کو امان دے دیتا تھا اس نے اپنی فوج کو حکم دے رکھا تھا ”تم مفتوحہ شہر کی آبادی

سے جو چاہو سلوک کرو لیکن خبردار تنہا ہی آواز اور تنہا ہی گوار کسی صنعت کار، کسی شاعر، دانشور اور عالم پر نہیں اٹھنی چاہیے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی فرقے، مذہب اور طبقے سے کیوں نہ ہو، وہ جنگ کے بعد مفتوح مملکتوں کے علماء سے گفتگو بھی کرتا تھا، ان سے علم اور معلومات حاصل کرتا تھا، انہیں انعام و اکرام سے نوازتا تھا اور پھر انہیں عزت کے ساتھ سرفرد میں آباد کرتا تھا، اس کی اس عادت کا یہ نتیجہ نکلا، چودھویں اور پندرہویں صدی کے وسط میں دنیا میں سب سے زیادہ شاعر، دانشور، عالم اور صنعت کار تیمور کی سلطنت میں تھے، دنیا میں سب سے زیادہ درس گاہیں، مسجدیں، بازار اور کارخانے بھی سرفرد اور بخارا میں تھے اور دنیا میں سب سے خوشحال لوگ بھی سنٹرل ایشیا میں آباد تھے، اس وقت عالم یہ تھا، دنیا جہان کے ماہرین تیمور کے پاس آتے تھے، اسے اپنا فن، اپنی مہارت دکھاتے تھے اور وہ انہیں جوہرات سے لادو دیتا تھا، وہ انہیں اپنے ملک کے بہترین علاقوں میں آباد کرتا تھا کوئی آکر اس سے کہتا تھا "میں دنیا میں سب سے اچھا چاول اگا سکتا ہوں" تو وہ اس سے بحث پوچھتا تھا، اس کے مطالبے کے مطابق اسے رقم دے دیتا تھا اور اسے پورے اختیارات کے ساتھ کام کرنے کا موقع فراہم کرتا تھا، شاہی سبکی وجہ تھی تیمور کا اور سنٹرل ایشیا کا سہری ترین عہد تھا۔

Kashif Azad@OneUrdu.com

تیمور کا یہ اصول آج تک دنیا میں کارفرما ہے، دنیا کا ہر وہ معاشرہ جس میں صنعت کاروں، شاعروں، عالموں اور دانشوروں کی تعداد زیادہ ہے اس کا شمار ترقی یافتہ اور خوشحال معاشروں میں ہوتا ہے اور ہر وہ حکومت کامیاب اور کامران ہے جس کی کابینہ میں دانشور اور ماہرین ہیں، آپ امریکہ کی مثال لیجئے، ہش کی کابینہ کے بیس ارکان ہیں، ان ارکان میں سے صرف پانچ رکن سیاستدان ہیں جبکہ باقی تمام ارکان عالم اور فاضل ہیں ان میں وزیر داخلہ، ٹارن، وزیر محنت، ایٹن ایل چاؤ، چیف آف سٹاف، اینڈریو ایچ کارڈ، نائب صدر ڈک جینی اور ہوم لینڈ سکیورٹی کے وزیر نام راج جیسے لوگ شامل ہیں، ہش کی کابینہ کے تین رکن جان پی والٹرز، توٹائی کے وزیر سوسائٹی ڈیپو یوڈمین اور وزیر خارجہ کونڈولیزا رائس تو باقاعدہ یونیورسٹیوں کے پروفیسر تھے۔ مس رائس 1981ء سے 1989ء تک اسٹین فورڈ یونیورسٹی میں پالیٹیکل سائنس کی پروفیسر رہی تھیں، انہوں نے تدریس کے قومی سطح کے دو بڑے ایوارڈ بھی حاصل کیے تھے، وہ اس وقت بھی یونیورسٹیوں میں لیکچرر رہتی ہیں، یوڈمین ایم آئی ٹی کے کمپیوٹل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھے، انہوں نے وہاں چھ سال پڑھایا تھا اور نیشنل ڈرگ کنٹرول پالیسی کے ڈائریکٹر

جان پی والنز زمینی گن شیٹ یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر تھے، ان کے علاوہ کابینہ کے ہاتھی ارکان صنعت کار، تاجر، بڑی کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو اور زندگی کے مختلف شعبوں کے ماہرین ہیں مثلاً آپ امریکہ کے وزیر زراعت مائیک جوبائز کو لیجئے وہ ایک زمیندار ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے ہاتھوں سے فارمنگ کی تھی بلکہ انہوں نے زرعی کمپنیاں بھی چلائیں۔ وزیر تجارت کارلوس گیونیرز امریکہ کی ایک مشہور تجارتی کمپنی میں ملازم رہے ہیں انارنی جنرل الیونگوزالیس مختلف کمپنیوں کے مشیر تھے۔ وزیر دفاع ڈونلڈ رامزفیلڈ نیوی میں پاکت رہے، نائٹو کے سفیر رہے اور دنیا کی تین بڑی کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو رہے، منجمنٹ اور بجٹ کے ڈائریکٹر جاسٹا اور تجارت کے نمائندے رابرٹ بی نے لیک Zoellick سرکاری ملازم تھے۔ خصوصی امور کے وزیر جم ٹیکولسن ایک عام سپاہی تھے، ہاؤسنگ کے وزیر القاضو جیکسن امریکن الیکٹریک پاور کے عام سے ملازم تھے، وزیر خزانہ جان ڈبلیو سنو امریکہ کے نامور بزنس مین ہیں، سماجی بہبود اور صحت کے وزیر مائیکل لیوٹ طویل عرصے تک سماجی بہبود اور عوامی صحت کے غیر سرکاری اداروں سے وابستہ رہے۔ انہوں نے عوامی صحت کے بے شمار منصوبوں پر کام کیا بڑا سپورٹ کے وزیر ٹارکس وائی پانچ ایک کاروباری شخصیت ہیں، وہ ٹرا سپورٹ کے کاروبار سے منسلک رہے اور امریکہ کی وزیر تعلیم مارگریٹ سٹیونسنز طویل عرصے تک نیکساس کی سکول بورڈ ایجو ایٹیشن کی ڈائریکٹر رہی ہیں۔

آپ دیکھ لیجئے یہ تمام لوگ اپنے اپنے شعبے کے ماہر ہیں۔ ان کی زندگیاں ان شعبوں میں گزریں جن کے وہ آج وزیر ہیں لہذا یہ لوگ حلف اٹھانے سے پہلے اپنے شعبوں کے مسائل اور مشکلات سے واقف تھے انہیں معلوم تھا ان کے نیچے کتنے دفتر کام کر رہے ہیں اور ان میں کس افسر کے پاس کیا اختیارات ہیں اور کس شعبے میں کیا تبدیلی کی جائے تو سسٹم زیادہ بہتر طریقے سے کام کر سکتا ہے، یہ حقیقت ہے زراعت کی وزارت کو ایک زمیندار زیادہ بہتر طریقے سے چلا سکتا ہے اور ایک ڈاکٹر وزارت صحت اور ایک صنعتکار انڈسٹری کی وزارت کو زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہے وہ اس میں زیادہ بڑا انقلاب لاسکتا ہے۔ اسی طرح کسی یونیورسٹی کا ایسا وائس چانسلر جس نے عملی زندگی کا آغاز سکول ٹیچر کی حیثیت سے کیا ہو وہ تعلیم کی وزارت کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، وہ اس میں زیادہ بڑا انقلاب لاسکتا ہے چنانچہ کہنے کا مطلب ہے اگر ہم ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں، اگر ہم ملک کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں امیر تیمور کی طرح یا پھر امریکی نظام کی طرح سیاست اور حکومت میں پروفیسروں اور ماہرین کی تعداد بڑھانی چاہیے۔ ہمیں تمام شعبوں

کی قیادت ماہرین کے حوالے کر دینی چاہیے۔ اگر ایک شوکت عزیز کے آنے سے خزانے کی صورت حال بہتر ہو سکتی ہے، ملک ڈیفالٹ سے نکل سکتا ہے اور ہمارے قرضوں میں کمی آ سکتی ہے تو کیا ہم اپنی انڈسٹری، تعلیم، صحت اور تجارت کے شعبے جناب شوکت عزیز جیسے ماہرین کے حوالے نہیں کر سکتے، کیا ہم ان شعبوں میں یہ تجربہ نہیں کر سکتے۔ مجھے ایک پروفیسر صاحب بتا رہے تھے وہ جب امریکہ میں تھے تو انہیں مشاورت کیلئے بیٹناگان تک میں بلایا جاتا تھا لیکن جب وہ پاکستان آئے تو وہ اپنی تنخواہ کیلئے چھ مہینے تک دفتروں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ انہیں کلرک تک اپنے دفتر میں گھسنے نہیں دیتا تھا۔ ذرا سوچئے کیا بلندی ہے امریکہ میں پروفیسر وزیر ہیں اور کیا پستی ہے پاکستان میں پروفیسر تنخواہوں اور پینشنوں کیلئے دھکے کھا رہے ہیں، امیر تیمور نے کہا تھا وہ ملک کبھی قائم نہیں رہ سکتا جو اپنے عالموں، دانشوروں اور صنعتکاروں کی عزت نہیں کرتا۔ امیر تیمور کے چھ سو سال بعد ہنری کسنجر نے امریکہ میں اعلان کیا تھا "امریکہ اس وقت تک سپر پاور رہے گا جب تک یونیورسٹی کے پروفیسر، دانشور اور بزنس مین اس کی پالیسیاں بناتے رہیں گے"

Kashif Azad@OneUrdu.com

ہم نے زندگی کے ہر شعبے میں اصلاحات کی ہیں کیا ہم اس معاملے میں کوئی اصلاح نہیں کر سکتے؟ پاکستان کی تمام جماعتیں 2007ء کو الیکشن کا سال قرار دے رہی ہیں۔ صدر پرویز مشرف بھی "الیکشن مہم" کے سلسلے میں پورے ملک کے دورے کر رہے ہیں، پنجاب حکومت بھی صدر صاحب کو اگلے دس سال تک دردی میں رکھنے کی خواہش مند ہے، یہ سارے کام ہونے چاہئیں کیونکہ یہ پاکستان کے بے شمار لوگوں کی بقا کیلئے ضروری ہے لیکن ہمیں اس کے ساتھ ساتھ ملک کی حقیقی ترقی پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ اگر صدر صاحب دردی کے ساتھ ساتھ یہ قانون بھی بنوا دیں کہ تمام سیاسی جماعتیں اپنی مرکزی قیادت میں ماہرین کو پچاس فیصد کوڑے لگیں اگر صدر آج اعلان فرمادیں ملک کی اگلی کابینہ کے پچاس فیصد وزراء، ماہرین اور پروفیسر ہوں گے تو ملک کے حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ ہم اس شاہراہ پر آ سکتے ہیں جو ملک کو ترقی کی انتہا تک لے جاتی ہے، جو قوموں کو خوشحال قوم بناتی ہے۔



ہم بھکاری ہیں

ٹانگ شان (TANG SHAN) چین کا ایک تاریخی شہر ہے یہ شہر جنگ سے 95 میل دور شمال چین میں واقع ہے، 1976ء تک اس کا شمار چین کے چھ بڑے صنعتی اور کاروباری شہروں میں ہوتا تھا، اس وقت اس کی آبادی دس سے چندرو لاکھ تھی یہ ایک ہنستا کھینتا شہر تھا لیکن 28 جولائی 1976ء کو رات تین بج کر 42 منٹ پر اس شہر پر قیامت ٹوٹ پڑی، صوبہ میں زلزلہ آیا، زلزلے کی مختلف لہریں ”ٹانگ شان“ میں جمع ہوئیں اور پورا شہر زمین بوس ہو گیا، ریکٹر سکیل پر اس زلزلے کی شدت 17 اعشاریہ 8 تھی، اس زلزلے میں ٹانگ شان کے 6 لاکھ 55 ہزار لوگ مارے گئے جبکہ 7 لاکھ 80 ہزار شدید زخمی ہوئے، اس شہر میں سات ہزار 2 سو 18 خاندان ایسے تھے جن کا کوئی فرد زندہ نہیں بچا، یہ چین کی ایک ہزار سالہ تاریخ کا دوسرا جبکہ 20 ویں صدی کا سب سے بڑا زلزلہ تھا، اس وقت ماؤزے تنگ زندہ تھے، ان کی عمر 83 سال تھی اور وہ طویل تھے لیکن وہ فوراً ٹانگ شان پہنچ گئے، اس وقت پوری دنیا نے چین کو امداد کی پیشکش کی لیکن ماؤزے تنگ نے امداد قبول کرنے سے انکار کر دیا، ان کا کہنا تھا ”قدرت نے یہ آفت صرف چین پر اتاری ہے لہذا اسے برداشت بھی صرف چین کرنے کا“ اس دور میں کسی نے ماؤزے تنگ کو مشورہ دیا، زلزلے کے باعث ٹانگ شان کی زمین کمزور ہو چکی ہے لہذا ہمیں اب اس جگہ شہر آباد نہیں کرنا چاہیے، ماؤ نے یہ مشورہ ماننے سے انکار کر دیا، انہوں نے فرمایا ”ہم ٹھیک اسی جگہ ایک ایسا ٹانگ شان آباد

کریں گے جو پچھلے شہر سے خوبصورت اور مضبوط ہو گا" اس اعلان کے چند دن بعد 9 ستمبر 1976ء کو ماؤزے تنگ انتقال کر گئے اور ان کی جگہ کوئٹہ کو چین کی کیونٹ پارٹی کا جیڑ میں بنا دیا گیا، کوئٹہ سیدھے تاٹنگ شان گئے اور انہوں نے بلے پر کھڑے ہو کر اعلان کیا "ماؤ کے بیٹے اپنے باپ کے قول کا پاس کریں گے" ماؤ کے بیٹوں نے واقعی اپنے باپ کے قول کا پاس کیا آج تاٹنگ شان کا شمار چین کے چند بڑے شہروں میں ہوتا ہے اس کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے اس میں بے شمار فلک بوس عمارتیں، فیکٹریاں، فارم ہاؤسز اور ٹینس ہیں دنیا آج اس شہر کو چین کا بہاؤ شہر (بروشی آف چائنا) کہتی ہے۔

تاٹنگ شان کی تعمیر نو بیسویں صدی کا معجزہ ہے، چینی قوم نے یہ معجزہ کیسے دکھایا یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ یہ کہانی ریلیف کے کاموں سے شروع ہوتی ہے زلزلے کے بعد شہر میں تین قسم کے لوگ تھے ایک وہ لوگ جو زلزلے میں انتقال کر گئے، دوسرے وہ جو زخمی ہو گئے اور تیسرے وہ لوگ جو اس سانحے میں پوری طرح بچ گئے، چینی حکومت نے فوری طور پر نیشنل کوڈنا دیا، زخمیوں کو علاج ان کی مرہم پٹی کی اور زلزلے میں بچ جانے والوں کو طبی امداد اور شہر کی تعمیر نو پر لگا دیا، دوسرا مرحلہ بحالی کا تھا اس زلزلے میں تاٹنگ شان کے چار لاکھ خاندان متاثر ہوئے تھے ان متاثرین کے پاس رہنے کے لئے جگہ نہیں تھی، چینی حکومت نے متاثرہ خاندانوں کی خواتین، بچوں، بوڑھوں اور زخمیوں کو پورے ملک میں پھیلا دیا، حکومت ایک خاندان کے لوگوں کو جمع کرتی، ان کے ہاتھ میں ریل کا ٹکٹ پکڑاتی اور انہیں حکم دیتی تھی لوگ فلاں شہر کے فلاں محلے میں چلے جاؤ وہاں فلاں شخص تمہارا انتظار کر رہا ہے، وہ خاندان وہاں پہنچ جاتا، جس کے بعد میزبان اس خاندان کے نان نلٹھے کا ذمہ دار ہو جاتا، یہ میزبان رضا کار تھے، حکومت نے زلزلے کے دوسرے دن ملک بھر میں اعلان کر دیا تھا ہمارے پاس چار لاکھ متاثرہ خاندان ہیں جو لوگ متاثرین کو اپنے پاس پناہ دے سکتے ہیں وہ اپنا اپنا نام لکھوادیں۔ لوگوں نے نام لکھوادینے۔ اس کے بعد انتظامیہ متاثرہ خاندان کے افراد کو دیکھ کر رضا کار کا تعین کرتی اور اس خاندان کو رضا کار گھرانے کے پاس بھجوا دیتی، اس سکیم کے نتیجے میں 8 ہفتوں میں تمام متاثرہ خاندان سہل ہو گئے، دوسری طرف حکومت نے پورے ملک سے رضا کار جمع کئے اور ان رضا کاروں کو تاٹنگ شان سے ملنا تھا، ان کی ذمہ داری سونپ دی، رضا کاروں نے چار ماہ میں پورا شہر صاف کر دیا۔ تیسرا مرحلہ شہر کی تعمیر نو تھی، تعمیر نو میں تاٹنگ شان کے زلزلہ بچ جانے والے شہریوں نے دل و جان سے حصہ لیا۔ یوں ٹھیک ایک سال بعد تاٹنگ شان اپنے پورے قد کے ساتھ

زمین پر کھڑا تھا، آج جو بھی شخص تاگم شان جاتا ہے وہ شہر کی خوبصورتی اور پائیداری دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اور وہ یہ یقین کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتا یہ شہر کبھی موت اور لعنتوں کا قبرستان تھا۔

میں نے تاگم شان کی یہ کہانی چین کی ایک کتاب میں پڑھی تھی اور جب 8 اکتوبر 2005ء کو پاکستان میں زلزلہ آیا اور بالا کوٹ سے مظفر آباد تک 25 لاکھ گھرانے اس زلزلے کا شکار ہو گئے تو مجھے فوراً تاگم شان یاد آ گیا اور میں نے سوچا ہمیں بھی تاگم شان سے سبق سیکھنا چاہیے، ہمیں چاہیے ہم پورے ملک سے ایسے خاندانوں کے نام جمع کریں جو چند ماہ کے لئے زلزلے سے متاثرہ خاندانوں کی کفالت کر سکتے ہیں، ہمارے ملک میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جن کے پاس ایک سے زائد مکان ہیں، یہ لوگ زلزلہ زدگان کی مدد بھی کرنا چاہتے ہیں اگر حکومت متاثرہ خاندانوں کو ان کے حوالے کر دے تو یہ لوگ بڑی آسانی سے سال چھ مہینے ان لوگوں کی کفالت کر سکتے ہیں، اس ضمن میں پنجاب گورنمنٹ کی مثال دی جا سکتی ہے، جناب پرویز الہی پنجاب میں

”ایک خاندان اپنا بیٹے سکیم“ کا اعلان کر چکے ہیں، مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے چوہدری صاحب

ان سکیم کا آغاز اپنے آپ سے کریں گے، دو اپنے خواتین اور لڑکوں کے گھروں میں زلزلہ زدگان کو آباد کریں گے، یہ ایک قابل تقلید روایت ہے، دوسرے صوبوں میں بھی ایسی سکیمیں شروع کی جا سکتی ہیں، اسی طرح میں نے نکل اخبار میں پڑھا، ناسمہ باغ اور دادا لاکوٹ میں پرائمری سکولوں کی تعمیر اور بحالی کا کام ایم کیو ایم نے اپنے ذمے لے لیا ہے، یہ بھی ایک اچھی روایت ہے، اس وقت پاکستان میں چھوٹی بڑی 127 سیاسی جماعتیں ہیں، اگر یہ تمام سیاسی جماعتیں ایم کیو ایم کی طرح متاثرہ علاقوں کے مختلف منصوبے اپنے ذمے لے لیں، کوئی ہل بنا کر شروع کر دے، کوئی صاف پانی کے پلانٹ لگا دے، کوئی کالج اور ہسپتالوں کی تعمیر شروع کر دے، کوئی دس کلومیٹر سڑک اپنے ذمے لے لے، کوئی بجزی لادنے کوئی سینٹ لے آئے اور کوئی کھڑکیاں دروازے فراہم کر دے تو زلزلے سے متاثرہ لوگ ایک آدھ سال میں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہو سکتے ہیں۔

مظفر آباد باغ دادا لاکوٹ اور ناسمہ کے تمام شہر قبے اور دیہات تعمیر ہو جائیں گے، ہم متاثرین کے سلسلے میں ایک اور غلطی کر رہے ہیں، ہم اس آفت میں زندہ بچ جانے والوں کو بھی امداد دے رہے ہیں، میں نے امدادی کیمپوں میں ایسے بے شمار لوگ دیکھے ہیں جنہیں زلزلے کے دوران خراش تک نہیں آئی لیکن یہ لوگ اب کیمپوں میں روٹیاں توڑ رہے ہیں، حکومت کو چاہیے وہ ان صحت مند لوگوں کو بحالی کے کاموں پر لگا دے، ان کے بچوں، خواتین اور بزرگوں کو رضا کار خاندانوں کے حوالے

کرے اور ان لوگوں کو متاثرہ دیہات میں لے جا کر امدادی سرگرمیوں پر لگا دے انہیں اپنے اپنے گھر تعمیر کرنے کی ذمہ داری سونپ دے مجھے خطرہ ہے اگر یہ لوگ اسی طرح کیپوں میں پڑے رہے تو یہ لوگ آہستہ آہستہ بے کار ہو جائیں گے اور یہ لوگ واپس جانے سے انکار کر دیں گے۔

میں ایک بار پھر واپس تاگ شان کی طرف آتا ہوں۔ چین کی حکومت نے جب تاگ شان کی تعمیر نو کا اعلان کیا تھا تو لوگوں نے اس کا بڑا خوبصورت ریسپانس دیا انہوں نے "ایک چینی ایک اینٹ" کا فارمولا اپنالیا چین کے تمام شہریوں نے ایک ایک اینٹ خریدی اور یہ اینٹ اپنے خرچے پر تاگ شان پہنچادی، صرف ایک ہفتے میں تاگ شان میں 50 کروڑ اینٹیں جمع ہو گئیں یہی عالم سینٹ 'بجری اور سرے' کا تھا لوگوں نے ایک ایک پاؤ سینٹ، ایک ایک ہائی بجری اور ایک ایک سریا اکٹھا کیا اور تاگ شان جھجھو ادیا، ہم بھی یہ کر سکتے ہیں پچھلے ماہ تک جو لوگ کپڑے جوتے، خیمے اور خوراک جمع کر رہے تھے وہ لوگ اب تعمیراتی سامان جمع کر سکتے ہیں وہ لوگ سریا، بجری، سینٹ اینٹیں، کٹڑی، کھڑکیاں اور وائے اور فرنیچر جمع کریں، ترکوں میں ڈالیں

اور ایک ایک گاؤں تعمیر کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جائیں۔ یقین کیجئے صرف ایک ماہ میں آزاد کشمیر اور ہزارہ کے تمام متاثرہ علاقے آباد ہو جائیں گے ہر گھر سے قبیلوں کی آوازیں آرہی ہوں گی اور ہر گھر میں زندگی اور ہر مکان میں خوشیاں ہوں گی ذرا سوچئے اگر چین یہ سب کچھ کر سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے دوسری بات پاکستان کے اس زلزلے نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہم میں اور چین میں بڑا فرق ہے چین نے 1976ء میں امداد لینے سے انکار کر دیا تھا جبکہ ہماری فوجی قیادت 2005ء میں سکول لے کر پوری دنیا میں نکل پڑی تھی، ہم نے جموں لیاں پھیلا کر لوگوں سے امداد طلب کی تھی، ہم نے ثابت کر دیا تھا ہم اخلاقی لحاظ سے بھکاری ہیں۔

کوے کے انڈوں سے ہنس نکلنے کا انتظار

دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی فوجیں یورپ کو تاراج کرتی ہوئی دنیا کے دوسرے
 کوے جنگ بندی پہلی جنوری 1918ء کو دو سالہ عرصے پر چل کر ایکس کی "انٹرا اتحادی فوج برطانیہ سے دو
 بڑے تعلیمی اداروں ہائینڈل برگ اور گوٹن جن پر حملہ نہ کرنے کا وعدہ کرے تو نازی فوج برطانیہ کی
 دو یونیورسٹیوں آکسفورڈ اور کیمبرج پر بمباری نہیں کرے گی" چرچل نے یہ آفر قبول کر لی۔ اس
 دور میں برطانوی وزیراعظم کے ایک ساتھی نے ان سے یہ آفر قبول کرنے کی وجہ پوچھی تھی تو
 چرچل نے مسکرا کر جواب دیا تھا "اگر پورا برطانیہ تباہ ہو گیا لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج بچ گئی تو ہم
 سمجھیں گے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن اگر کیمبرج اور آکسفورڈ تباہ ہو گئیں اور برطانیہ بچ گیا تو
 جان لیں پورا برطانیہ تباہ ہو گیا" اس معاہدے کے بعد دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کے
 نوے فیصد بچوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں جنم لیا کیونکہ برطانوی والدین سمجھتے تھے ان کے
 بچوں کی پیدائش کیلئے اگر اس وقت کہہ ارض پر کوئی محفوظ ترین جگہ ہے تو وہ آکسفورڈ اور کیمبرج ہیں
 بالکل اسی طرح اس دور میں پیدا ہونے والے زیادہ تر جرمن بچوں کی پیدائش کے خانے میں بھی
 ہائینڈل برگ اور گوٹن جن لکھا گیا۔

تاریوں اور اتحادیوں کا یہ معاہدہ بنیادی طور پر تعلیم اور تعلیمی اداروں کی افادیت کا
 اعتراف تھا۔ یہ معاہدہ ثابت کرتا تھا دنیا کا کوئی ملک کوئی قوم تعلیم اور وہ بھی پیدہ تعلیم کے بغیر ترقی

تہیں کر سکتی اور یہ بھی حقیقت ہے جب تک کسی قوم کی یونیورسٹیاں کالج اور سکول آباد رہتے ہیں ان کے لیکچرہالوں میں علم اور ادب پر گفتگو جاری رہتی ہے اس وقت تک اس قوم پر زوال نہیں آتا۔ آج سے پانچ ہزار سال پہلے کا دور ہو یا آج سے ڈیڑھ دو سو برس بعد کا زمانہ قوموں کے عروج و زوال کی داستان کلاس روموں میں لکھی جاتی رہی اور کلاس روموں ہی میں لکھی جائے گی اس سلسلے میں مصر کی مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ 1952ء میں جب مصر میں انقلاب آیا اور انقلابیوں نے شاہ فاروق کو ملک بدر کر دیا تو ملک میں شاہ کے 70 بلین پاؤنڈ کے اثاثے تھے۔ انقلابیوں نے یہ اثاثے اور بدتماش جاگیرداروں کی جاگیریں بیچ کر سکول بنانے شروع کر دیئے۔ اس دور میں مصر میں دو دو نوں میں تین تین سکول کھولے گئے تاریخ بتاتی ہے مصر کے اندر صرف چھ ماہ میں اتنے سکول بنے جتنے پچھلے 50 برسوں میں تعمیر نہیں ہوئے تھے۔ اس حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا آج چوٹی کے عالمی اداروں میں کام کرنے والے مسلم ماہرین میں مصریوں کا 70 فیصد حصہ ہے۔ ایک طرف تو یہ صورتحال ہے جبکہ دوسری طرف پاکستان کے 70 فیصد پرائمری سکولوں میں آج بھی لوائٹس نہیں ہیں۔ پاکستان میں ایسے 65 ہزار سکول ہیں جن میں طالب علم اپنے ٹاٹ اپنے گھروں سے لاتے ہیں۔ صرف سندھ میں ایسے گیارہ ہزار سکول ہیں جو استاد نہ ہونے کے باعث بند پڑے ہیں۔ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں شمار ہوتا ہے جن کے اساتذہ کا آئی کیو لیول اور تعلیمی معیار پست ترین ہے۔ پاکستان ایشیا کا وہ ملک بھی ہے جو تعلیم پر سب سے کم خرچ کرتا ہے اور جس میں استاد کی تنخواہ فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور سے کم ہے جس کی سب سے بڑی یونیورسٹی ایک سال میں ایشیا کی یونیورسٹیوں میں 39 ویں درجے سے 61 ویں گریڈ پر آگئی اور جسے دنیا تعلیم کے شعبے میں سب سے کم سرمایہ کاری کرنے والا ملک ڈیکلیر کرنے کی تیاری کر رہی ہے لیکن ہمارا اکمال دیکھئے ہم اس صورتحال کے باوجود نتائج کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں ہم اسرائیل سے لبنان پر بمباری کا بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہے ہیں ہم لال قلعے پر قبضہ لہرانے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور ہم جاپان بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں ذرا سوچئے ایک ایسا ملک جس میں کل 60 یونیورسٹیاں ہوں وہ اس جاپان کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے جس کے صرف ایک شہر ٹوکیو میں ایک ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔

ہم جاپان بن سکتے ہیں اگر ہماری حکومت اپنا بیجنا مختصر کر کے صرف تعلیم اور تعلیمی اداروں کو اپنا نوکس بنا لے۔ ملک میں جدید ترین تعلیمی اداروں کا جال پھیلانے سے ٹیکنالوجی کی

پچاس ساٹھ نئی یونیورسٹیاں بنائے، شیروں، قصبوں اور دیہات سے جن جن کریٹلٹ جمع کرے اور انہیں مفت تعلیم دے، بھاری معاوضے پر باہر سے پاکستانی ماہرین منگوائے، انہیں تعلیمی اداروں میں نوکریاں دے اور ایک ایسی نئی پود پیدا کرے جو علم، ہنر اور صلاحیت میں کسی سے کم نہ ہو، حکومت یہ کام بڑی آسان سے کر سکتی ہے، احتساب بیورو نے ڈیفنسز اور لیٹروں سے 200 ارب روپے برآمد کئے تھے، یہ وہ رقم ہے جس کی ریکوری کا کوئی امکان نہیں تھا، حکومت یہ سمجھے یہ رقم لیٹروں سے واپس نہیں ملی، وہ مصر کی تقلید کرتے ہوئے اس رقم سے پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ایسے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں کھول دے جن میں صرف سائنس کی تعلیم دی جائے تو مجھے یقین ہے اس سے ملک میں انقلاب آ جائے گا، مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے پاکستان کو پیشکش کی تھی اگر حکومت تعلیم اور صحت کا بجٹ بڑھا دے تو یہ ادارے اس اضافی بجٹ کے برابر پاکستان کا سود معاف کر دیں گے۔ حکومت اس آفر کا فائدہ بھی اٹھا سکتی ہے لیکن اس کے باوجود بنیادی سوال وہیں کھڑا ہے کہ یہ سب کون کرے گا اور کیوں کرے گا؟

ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات میں صرف وہ چیزیں اور وہ کام شامل ہیں جن میں انہیں ذاتی فائدہ نظر آتے ہیں لہذا یہ لوگ کسی ایسے منصوبے، کسی ایسی پالیسی کو جگہ نہیں دیتے جس سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچ سکے، جس سے قوم کا مقدر بدل جائے۔ حکومت نے اگر نواب اکبر خان کیٹی کو موت کے گھاٹ اتارنا ہو یا تحفظ حقوق نسواں کا بل پیش کرنا ہو تو وہ دو دن لگاتی ہے لیکن اگر تعلیم، روزگار، صحت اور عوامی بہبود کا کوئی منصوبہ ہو تو دو دو سال تک فائل ہی جنم نہیں لیتی لہذا جس ملک، جس معاشرے میں حکومت کی ترجیحات کا یہ عالم ہو اس میں روشنی کی کرن کہاں سے چمکے گی، اس میں لوگوں کے حالات کیسے بدلیں گے؟ ہم بڑے دلچسپ لوگ ہیں، کوئے کے انڈوں سے جنس نکلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔



دو نعشیں

زندگی میں بعض اوقات یوں ہی چلتے پھرتے کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے، کوئی ایسا حادثہ پیش آ جاتا ہے جو آپ کے ذہن میں گھس ہو کر رہ جاتا ہے اور پوری زندگی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا، میری زندگی میں بھی دو ایسے واقعات پیش آئے تھے جو ہر گلد کی جڑوں کی طرح میرے شعور میں پیوست ہو کر رہ گئے تھے اور میں پوری کوشش کے باوجود انہیں اپنے ذہن سے نہیں جھٹک سکا۔

پہلا واقعہ 2001ء میں پیش آیا، ان دنوں حکومت اخبارات میں انتہائی مطلوب مجرموں کے بارے میں ایک اشتہار شائع کرایا کرتی تھی، اس اشتہار میں سب سے اوپر ایک نوجوان کی تصویر ہوتی تھی، یہ نوجوان حکومت کو دہشت گردی کی بے شمار وارداتوں میں مطلوب تھا، حکومت نے اس کے سر کی قیمت ایک کروڑ روپے مقرر کر رکھی تھی، یہ نوجوان اس وقت افغانستان میں روپوش تھا اور اس کی وجہ سے پاکستان میں شدید قسم کی فرقہ وارانہ کشیدگی پائی جاتی تھی، یہ نوجوان بعد ازاں گرفتار ہوا اور ایک پولیس مقابلے میں جاں بحق ہو گیا، اس نوجوان نے ایک رات مجھے فون کیا اور مجھ سے درخواست کی، آپ حکومت تک میری ایک ایپل پہنچائیں، میں نے پوچھا "کیا؟" اس نے کہا "اگر حکومت یہ وعدہ کرے وہ ہمیں پولیس مقابلے میں نہیں مارے گی، وہ ہمیں عدالت میں پیش ہونے اور اپنے اور اپنے اور پر لگائے گئے تمام الزامات کی صفائی کا موقع دے گی تو ہم لوگ

گرفتاری دینے کیلئے تیار ہیں" میں نے اس سے وعدہ کیا میں ان کی یہ پیشکش حکومت کے کسی اہلی عہدیدار تک پہنچا دوں گا اس کے بعد میں نے اس سے وہ سوال پوچھا جو عموماً ایسی صورت حال میں میرے جیسے لوگ پوچھا کرتے ہیں میں نے اس سے پوچھا "وہ کیا وجہ تھی جس نے ایک عام سے نوجوان کو اتنا بڑا دہشت گرد بنا دیا" اس نے تہتہ لگا کر جواب دیا "نواز شریف کے پہلے دور میں حکومت نے ہر روز گارنوجوانوں کو چھوٹے قرضے دینے شروع کئے تھے میں ان دنوں غربت اور بے روزگاری کے انتہائی دور سے گزر رہا تھا" میں نے پچاس ہزار روپے کے قرضے کیلئے اپلائی کیا میرا خیال تھا میں اس رقم سے چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر لوں گا میں پورا سال اس قرضے کے پیچھے خوار ہوتا رہا لیکن مجھے قرضہ نہ ملا آنے والے دنوں میں غربت بے روزگاری مذہبی شدت پسندی اور حکومتی رویے مجھے اس طرف لے آئے میں دہشت گرد مشہور ہو گیا" میں نے اس کی بات پر انہوس کیا اس نے ایک اور تہتہ لگایا اور ہتے ہتے بولا "انہوس کی بات تو آگے آئے گی جس حکومت نے مجھے 50 ہزار روپے قرضہ نہیں دیا تھا آج اسی حکومت نے میرے سر کی قیمت لیک کر دو روپے مقرر کر دی ہے" میں نے ان الفاظ کے ساتھ ہی فون بند کر دیا لیکن وہ الفاظ اس کا لہجہ اور اس کے لہجے کی سنگینی آج تک میرے ذہن میں تازہ ہے مجھے ہر روز کسی نہ کسی وقت اس کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں اور میں سوچتا ہوں ہم وہ لوگ ہیں جو کسی بے روزگار کو 50 ہزار روپے قرضہ نہیں دیتے لیکن بعد ازاں اسی کے سر کی قیمت ایک کروڑ روپے مقرر کر دیتے ہیں۔

دوسرا واقعہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے میں ایک دوست کے دفتر میں بیٹھا تھا ایک درمیانی عمر کا بیمار شخص وہاں آیا کرسی پر بیٹھا پانی کا گلاس مانگا پانی پیا اور اس کے بعد درخواست کی میں بے روزگار ہوں میرے پانچ چھ بچے ہیں گھر میں دو تین دن سے قاتے ہیں مجھے کوئی ایسی نوکری چاہیے جس سے میں بال بچوں کا پیٹ پال سکوں میرے دوست نے اس سے فوراً معذرت کرنی میرے دوست کا کہنا تھا اس کا چھوٹا سا کاروبار ہے جس میں کسی نئے ملازم کی گنجائش نہیں انہی نے منت کرنے کے انداز میں چند فقرے بولے لیکن میرے دوست نے اس سے سخت لہجے میں معذرت کرنی وہ شخص اٹھا اور چپ چاپ باہر چلا گیا چند لمحے بعد میرے دوست کا نوکر بھاتا ہوا اندر آیا اور ہانپتے ہوئے بولا "ابھی ابھی جو شخص باہر نکلا تھا وہ دفتر کی دلہیز پر بے ہوش پڑا ہے" ہم لوگ گھبرا کر باہر نکلے وہ شخص حقیقتاً دلہیز پر گر پڑا تھا ہم نے اسے اٹھایا لیکن وہ اس وقت تک مٹی کا ڈھیر بن چکا تھا وہ فوت ہو چکا تھا دفتر کے سامنے مجمع لگ گیا ہم نے پولیس کو بلایا انہیں کو ہسپتال

لے کر گئے ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد سوت کی ویدل کا دورہ قرار دیا ہم نے اس کی جھیلوں کی تلاش لی اندر سے تین چار روپے کی ریز کارمی اور ایک چھوٹی سی ڈائری نگلی ہم نے اس ڈائری کی مدد سے اس کا پتہ تلاش کیا وہ داؤ پلنڈی کے نالہئی کے کنارے ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا ہم جب اس کی تلاش لے کر اس کے گھر پہنچے تو پتہ چلا واقعی اس گھر کا چولہا بجھے ایک ہفتہ ہو چکا تھا میرے دوست نے اسی وقت دفتر سے پچاس ہزار روپے منگوائے اور بیوہ کی ہتھیلی پر رکھ دینے دو دن ہے اور آج کا دن ہے میرا دوست اس گھرانے کو پانچ ہزار روپے ماہانہ دے رہا ہے میں جب بھی اس سے ملتا ہوں میں اس سے کہتا ہوں ہم لوگ کتنے بے وقوف ہیں ہم نے اس شخص کو دو تین ہزار روپے کی نوکری نہیں دی لیکن ہم اس کے خیم بچوں کو ہر مہینے پانچ ہزار روپے دے رہے ہیں اگر ہم اس وقت اس کی حالت پر غور کر لیتے تو شاید اس کی جان بچ جاتی شاید اس کے بچے خیم نہ ہوتے میرا دوست اس وقت اپنے آنسو پونچھتا ہے اور ڈوبی ہوئی آواز میں کہتا ہے "میں پانچ ہزار میں ایک زندگی خرید سکتا تھا لیکن میں نے پچاس ہزار روپے دے کر ایک فحش خرید لی۔"

ایک کروڑ روپے کی گردن کا مالک وہ تو جوان اور 50 ہزار کی یہ فحش آج تک میرے کندھے پر چڑھی ہے جس روز یہ فحش اٹھا کر اس کا جنازہ میں پھرنا ہوں میں روز کسی ایسے قبرستان کی تلاش میں نکلتا ہوں جہاں میں ان دونوں کو دفن کر سکوں جہاں میں یہ بوجھ اتار سکوں لیکن مجھے اس ملک میں کوئی ایسی جگہ نہیں ملتی مجھے زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا نہیں ملتا جہاں میں یہ دونوں فحشیں پھینک کر آؤں جہاں میں ان دونوں کو دفن کر سکوں۔



لوگ بھی ضروری ہیں

مریم کا سر پکرایا، اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں نہیں مگردن کو جھٹکے دیئے لیکن

بھی مہنگا تھا اور اس سکول میں پڑھنے والے بچے بھی امیر طبقے سے تعلق رکھتے تھے لہذا ایسے سکول میں کسی بچی کا بے ہوش ہو جانا خطرے سے خالی نہیں تھا، انتظامیہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، پرنسپل سے لے کر چہرہ اسی تک سب مریم کی کلاس میں جمع ہو گئے، ایبویولنس منگوائی گئی، بچی کو فوراً ہسپتال پہنچایا گیا، بچی کے والدین بھی ہسپتال پہنچ گئے، مریم تھوڑی دیر بعد ہوش میں آ گئی لیکن ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ جاری رکھا، شام کو خون کی رپورٹس آئیں تو پتہ چلا ساڑھے چار سال کی مریم ہلڈ کینسر کی مریض ہے، مریم کی والدہ شش کھا کے گر گئی اور والد ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئے۔ مریم کے والد محمود صاحب قالیبنوں کے بہت بڑے تاجر ہیں، مریم محمود صاحب کی واحد اولاد تھی، محمود صاحب نے مریم کا علاج شروع کر دیا، وہ اسے امریکہ تک لے کر گئے لیکن مریم کی سانس مختصر تھیں، مریم پچھلی جنوری میں انتقال کر گئی، ایک کہانی یہاں ختم ہو گئی، دوسری کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے، محمود صاحب کو جون میں امریکہ سے ایک خط موصول ہوا، یہ خط اس ہسپتال کی انتظامیہ نے لکھا تھا، جس میں مریم زیر علاج رہی تھی، خط میں محمود صاحب اور بیگم صاحبہ کے خون کی رپورٹس تھیں اور ان رپورٹس کی روشنی میں ہسپتال انتظامیہ نے ان کو مشورہ دیا تھا، آپ دونوں کے

خون میں ایسے کیمیکل پائے جاتے ہیں جن کے ملاپ سے بلڈ کیسر پیدا ہوتا ہے، ہمیں خدشہ ہے آپ کے ہاں جو بھی بچہ پیدا ہوگا اسے بلڈ کیسر ہوگا چنانچہ آپ اس ضمن میں احتیاط کریں "محمود صاحب کیلئے یہ ایک "شاکنگ" خبر تھی انہوں نے پاکستان کی تین چار بڑی لیبارٹریوں سے ٹیسٹ کرائے سب لیبارٹریوں نے امریکی رپورٹ کی تصدیق کر دی محمود صاحب آج کل اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہیں ان کا کہنا ہے اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں زیادہ بچے دیے ہوتے تو آج تک ان کا سینہ بچوں کا قبرستان بن چکا ہوتا وہ بچوں کی اموات کا دکھ سب سے سبب سے نوت بول سکتے ہوتے۔

پاکستان میں اس وقت محمود صاحب جیسے لاکھوں والدین ہیں جو لاعلمی کی وجہ سے اپنے بچوں کو موت کا تھوڑے دے دیتے ہیں اور ان کے بچے آنکھ کھولتے ہی موت کی طرف سفر شروع کر دیتے ہیں میڈیکل سائنس کے مطابق دنیا کا ہر مرد ہر عورت اور ہر عورت ہر مرد کیلئے "سوت اپٹیل" نہیں ہوتی، بعض مردوں کے خون میں ایسے کیمیکل پائے جاتے ہیں جو مخصوص کیمیکل کی حامل خواتین کے جسم میں پہنچ کر خوفناک بیماری کی شکل اختیار کر جاتے ہیں یہ امراض بعد ازاں بچوں میں منتقل ہو جاتے ہیں شاید کسی وقت سے پاکستان کے پانچ فیصد بچے کیمیکل کا شکار ہوتے ہیں یا پھر ان میں شکار ہونے کے امکانات موجود ہوتے ہیں کیمیکل سیما کی وجوہات خالصتاً موردی ہوتی ہیں کیسر کی وجہ بھی والدین کے جینز ہوتے ہیں اگر ماں اور باپ دونوں میں کیسر کے جینز موجود ہیں تو بچے میں کیسر کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اسی طرح اس وقت دنیا میں ایڈز پھیلنا ٹائپس بی بی اور سٹیکس سمیت بے شمار ایسے امراض ہیں جو عورت سے مرد اور مرد سے عورت کو لگ جاتے ہیں اور اس کے بعد دونوں کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں یہ بیماریاں آگے چل کر دوسری اور تیسری نسل کو منتقل ہو جاتی ہیں اسی طرح جسمانی معذوری پاگل پن نفسیاتی بیماریوں اور ذہنی سماجی رویوں کا تعلق بھی عورت اور مرد کی "فارمیشن" سے ہوتا ہے اگر میاں بیوی میں کوئی جسمانی نفسیاتی یا ذہنی عیب موجود ہو تو وہ عیب کسی نہ کسی شکل میں اگلی نسل میں منتقل ہو جائے گا اسی لئے میڈیکل سائنس "کزن میرج" کے خلاف ہے امریکہ نے آج سے 70 برس پہلے قانون بنایا تھا امریکہ میں جو بھی شخص شادی کرے گا وہ پہلے اپنا میڈیکل ٹیسٹ کرائے گا یہ قانون اس وقت امریکہ کی 9 ریاستوں میں موجود ہے اور اسے "Premarital Certificate" کہا جاتا ہے اس قانون کے تحت امریکہ میں شادی کا خواہش مند ہر جوڑا اپنا خون ٹیسٹ کرتا ہے یہ ٹیسٹ بعد ازاں ناؤن کیٹی میں جمع کر دیا جاتا ہے یہ سرٹیفکیٹ صرف 65 دنوں تک کارآمد رہتا ہے اگر

اس دوران شادی نہ ہو تو جوڑے کو دوبارہ ٹیسٹ کرانا پڑتا ہے اس ٹیسٹ کی وجہ سے نہ صرف امریکہ کا ہیلتھ بجٹ کم ہو گیا بلکہ وہاں بے شمار سورتوں اور متحدری امراض بھی ختم ہو گئے امریکہ کے بعد اب یورپ مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ میں بھی شادی سے پہلے میڈیکل ٹیسٹ کا قانون لاگو ہو چکا ہے۔

پاکستان کا شمار اس وقت دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جن میں ایڈز پھیلنا ٹیسٹ بی اور سی ٹی بی اور ٹی بی سی ایڈز سے پھیل رہے ہیں ان امراض کی بے شمار وجوہات میں سے ایک وجہ شادی ہے اگر شادی سے پہلے نو جوانوں کا میڈیکل ٹیسٹ ہو جائے تو بے شمار لوگ ان امراض سے بچ سکتے ہیں اور یوں ہماری اگلی نسل زیادہ صحت مند اور شاندار ہو سکتی ہے مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے پچھلے دنوں پاکستان کی ایک بڑی پرائیویٹ یونیورسٹی کے ایم بی اے ڈیپارٹمنٹ کے طالب علموں کا طبی معائنہ ہوا کلاس میں 70 طالب علم تھے ان 70 طالب علموں میں سے 7 طالب علم چھانٹیس کے مریض نکلے ان طالب علموں کو اپنی بیماری کا علم تک نہیں تھا یہ ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے کی صرف ایک کلاس کی صورتحال تھی آپ باقی معاشرے کا اندازہ خود لگا سکتے ہیں میری حکومت سے درخواست ہے کہ پاکستان میں بھی ایسا قانون بن جائے جو محمود صاحب جیسے لاکھوں لوگ تباہ ہونے سے بچ سکتے ہیں پاکستان میں شادی بیاہ کی رسوں پر ہر سال اربوں روپے ضائع ہوتے ہیں ہم لوگ مایوں مہندی چراغاں اور آتش بازی پر بھی کروڑوں روپے لگا دیتے ہیں اگر ہم ان اخراجات میں میڈیکل ٹیسٹ کو بھی شامل کر لیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا لیکن اس کا ہماری قومی اور سماجی زندگی پر بڑا اچھا اثر پڑے گا آج کل اچھی لیبارٹریاں خون کی سکریننگ کیلئے تین سو روپے لیتی ہیں اور بیوگلوبن کے ٹیسٹ (اسے میڈیکل زبان میں ELECTRO PHRESIS کہتے ہیں) چار سو روپے میں ہو جاتے ہیں لہذا صرف 700 روپے میں ہماری اگلی نسل کا مستقبل محفوظ ہو سکتا ہے میری حکومت سے درخواست ہے وہ کالا باغ جیسے بڑے بڑے ایڈز کے ساتھ ساتھ ایسے چھوٹے چھوٹے ایڈز پر بھی توجہ دے ان ایڈز سے کروڑوں لوگوں کو فائدہ ہو سکتا ہے ڈیم بہت ضروری ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ لوگ بھی ضروری ہوتے ہیں کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو ملک میں ڈیم تو بن جائیں لیکن ان ڈیموں سے فائدہ اٹھانے والے لوگ نہ بنیں۔



بیڈ کوالٹی پرائس

پروفیسر صاحب بہت دکھی تھے انہیں دکھی ہونا بھی چاہیے تھا آپ خود سوچئے آپ کیا لگا بیڈی ہوں بیڈی نعمت کی میں بڑھاتے ہوں علم آپ کا اور صفا بچھوٹا ہو لوگ آپ کی باتیں سنئے آپ سے علم حاصل کرنے آتے ہوں لیکن ایک شام دو پولیس کاٹھنیل آپ کو سڑک کے کنارے کھڑا کریں اور آپ کی عزت نفس کو بیٹوں سے روند ڈالیں آپ احتجاج کریں تو وہ سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں آپ کو گالیاں دیں آپ کے کپڑے پھاڑ دیں اور آپ کے بازو مروڑیں تو آپ کا رد عمل کیا ہوگا آپ خود کو بے بس اور لاچار محسوس نہیں کریں گے؟ یقیناً آپ کے جذبات بھی وہی ہوں گے جو اس وقت پروفیسر صاحب کے تھے۔

میں نے ان سے عرض کیا "میں آپ کے دکھ میں برابر کا شریک ہوں لیکن میرا خیال ہے آپ اس سلوک کے مستحق تھے آپ کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو ہونا چاہیے تھا" انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا میں نے ان سے پوچھا "پروفیسر صاحب آپ نے گھر کیلئے پنکھا خریدا ہے یا نہیں آپ کس کپڑے کو نوٹیت دیں گے" پروفیسر صاحب نے کسمسا کہ جواب دیا "ظاہر ہے میں اچھی کپڑے کو نوٹیت دوں گا" میں ایسا پنکھا خریدوں گا جو کارکردگی میں اچھا اور دیر پا ہوگا" میں نے ہاں میں گردن ہلائی "اگر آپ اس کی جگہ ایک سب سٹینڈرڈ پنکھا خریدتے ہیں تو اس کا کیا نقصان ہوگا" انہوں نے مسکرا کر جواب دیا "میرے پورے گھر کی دائرگی جل جائے گی میرا فریج میرا

ٹی۔ دی اور میری دوسری اشیاء برباد ہو جائیں گی یا پھر میں اس بچھے کو اٹھا کر الیکٹریشنوں کی دکانوں کے چکر لگا جا رہوں گا" میں بھی مسکرایا اور میں نے ان سے پوچھا "اکنامکس کی زبان میں اس نقصان کو کیا کہتے ہیں" انہوں نے فوراً جواب دیا "بیزکوالٹی پرائس" میں نے تہمتہ لگایا "پروفیسر صاحب ہماری پولیس بیزکوالٹی پرائس ہے جس کی پرائس پورے معاشرے کو کسی نہ کسی شکل میں ادا کرنا پڑ رہی ہے" پروفیسر صاحب نے ذرا سا سوچا اور پھر غیر یقینی لہجے میں بولے "کیا تم اس کی مزید وضاحت کرو گے" میں نے مسکرا کر جواب دیا "کیوں نہیں! فرض کریں آپ کے گھر میں بچاس لاکھ روپے نقد ہیں اور میں چالیس لاکھ روپے کے زیورات پڑے ہیں اس گھر میں آپ اور آپ کے بچے بھی رہتے ہیں لیکن آپ ان سب کی حفاظت کیلئے ایک کمزور ڈیوٹی فون اور سٹیمپ کیڈر رکھ لیتے ہیں آپ اس کیڈر کو صرف 2 ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں اس شخص کو اس دو ہزار روپے میں اپنی رہائش کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے اپنے کھانے پینے اور آنے جانے کا بندوبست بھی کرنا پڑتا ہے اور اپنے لئے وردی اور جوتے بھی لینا پڑتے ہیں آپ بتائیے وہ شخص کیا کرے گا؟ کیا وہ شخص پورے غلوں سے آپ کے مال اور جان کی حفاظت کرے گا؟ پروفیسر صاحب نے انکار میں سر ہلا دیا میں نے عرض کیا "آپ کی حفاظت تو رہتی دوز ہو سکتا ہے وہ شخص ایک روز آپ ہی کو لوٹ لے اس کے برعکس اگر آپ ایک ماہر جہاز اور پڑھا لکھا گارڈ رکھتے ہیں اسے اس کی ضرورت کے مطابق تنخواہ دیتے ہیں اسے کھانا خوردی اور تنہا رہتے ہیں اور اسے رہائش کیلئے مناسب جگہ دیتے ہیں تو وہ بڑے غلوں کے ساتھ آپ اور آپ کے مال کی حفاظت کرے گا اور آپ زیادہ سکون اور آرام سے سو سکیں گے"

پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر دھیمے لہجے میں بولے "لیکن اس سارے فلسفے کا میرے مسئلے کے ساتھ کیا تعلق" میں نے عرض کیا "پروفیسر صاحب اس کا بڑا گہرا تعلق ہے پولیس حکومتی اداروں میں سب سے اہم اور بااثر محکمہ ہوتا ہے یہ وہ واحد ڈیپارٹمنٹ ہے جس کا بندہ کروڑوں لوگوں اور پندرہ بلین ڈالرز مالیت کی حکومت کے ساتھ روزانہ رابطہ رہتا ہے پولیس کسی بھی ملک کی مالیاتی، قانونی، سماجی، ثقافتی، سیاسی اور اخلاقی دولت کی محافظ ہوتی ہے لہذا اس کا انتخاب اس کی ٹریننگ، اس کی سولٹس اور اس کی مراعات کا تعین سائنسی بنیادوں پر ہونا چاہیے پولیس کی تنخواہیں ملک کے تمام دوسرے اداروں سے زیادہ ہونی چاہئیں ان کے پاس وزیراعظم اور صدر سے زیادہ جدید گاڑیاں اور انتہائی شاندار رہائش گاہیں ہونی چاہئیں ان کی تعلیم

اور تربیت تمام دوسرے اداروں سے بہتر اور معیاری ہونی چاہیے لیکن بد قسمتی سے ہم پاکستان میں تین بلین ڈالر سے گوارڈ پورٹ تو بنا دیتے ہیں لیکن اس کی حفاظت کی ذمہ داری ساڑھے چھ ہزار روپے ماہانہ کے ایس ایچ او کو سونپ دیتے ہیں ہم اس ملک میں تعلیم بھی عام کر رہے ہیں ہم اس ملک میں 50 ہزار بی ایچ ڈی بھی پیدا کر رہے ہیں ہم دنیا جہاں کے سرمایہ کاروں کو اس ملک میں سرمایہ کاری کی دعوت بھی دے رہے ہیں لیکن ہم ان سرمایہ کاروں ان بی ایچ ڈی ڈاکٹروں اور ان اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی حفاظت کا بندوبست نہیں کر رہے ہم ان لوگوں کی عزت نفس کی حفاظت کی پابندی نہیں کر رہے ہم اس ملک کو انڈسٹریل سٹیٹ بھی بنانا چاہتے ہیں ہم اس ملک کو بہشت گردی سے بھی پاک کرانا چاہتے ہیں ہم اسے اعتدال پسند اور روشن خیال بھی بنانا چاہتے ہیں لیکن ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا اس ساری روشن خیالی اس ساری آزادی اور اس ساری انڈسٹری کی حفاظت کون کرے گا؟ کیا ساڑھے تین ہزار روپے لینے والے اسے ایس آئی یا جوبن جولائی کی گرمی میں جلنے والے پولیس کانسٹیبل میں اتنی اہلیت ہے؟ ہم نے کبھی یہ سوچا؟

پروفیسر صاحب نے میری بات سے اتفاق کیا اور پوچھا: پھر اس کا حل کیا ہے؟ ہمیں نے تقبہ لگایا آپ نے پاکستان میں پھر کا ایک ایسا کھربنا میں جس میں کوئی روشن دان کوئی کھڑکی نہ ہو لیکن ساتھ ہی آپ اس کے اندر داخل ہونے سے پہلے یہ خواہش کریں اس کا ماحول سوئزر لینڈ جیسا ہو تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ اس وقت آپ کے پاس دو آپشن ہوں گے آپ چاہستان سے نکل کر سوئزر لینڈ چلے جائیں یا پھر پتھر کے اس مکان کے اندر ان سارے آلات ان ساری سہولتوں کا بندوبست کریں جو آپ کو سوئزر لینڈ کا ماحول فراہم کریں اگر آپ اس ملک میں عزت نفس ذوق اور سکون سے رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو پولیس کو وہ ساری سہولتیں دینا پڑیں گی جو امریکہ، یورپ اور مشرق بعید میں حاصل ہیں اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو پھر آپ اسی طرح بیڈ کووائی پرائس پے کرتے رہیں گے پروفیسر صاحب نے مسکرا کر میری اس بات سے بھی اتفاق کیا لیکن پھر پوچھا: اس کیلئے رقم کہاں سے آئے گی حکومت کے پاس تو پیسے ہی نہیں ہیں میں نے تقبہ لگایا اگر حکومت گوارڈ پورٹ بنا سکتی ہے اس کے پاس انٹرنیشنل سطح کے انٹرنیشنل بنانے کیلئے رقم ہے اگر وہ 80 ارب روپے کا سوئزر لینڈ بنا سکتی ہے تو وہ پولیس پر بھی پانچ دس ارب روپے لگا سکتی ہے اگر آپ چار پانچ کھرب سے کالاباغ ڈیم بنا سکتے ہیں تو آپ اس مشینری پر دو چار ارب روپے کیوں نہیں لگاتے جس نے آنے والے دنوں میں اس ڈیم کی حفاظت کرنی ہے اگر آپ اس

معاشرے کو روشن خیال اور اعتدال پسند بنانے کیلئے دس بیس ارب روپے خرچ کر سکتے ہیں تو آپ اس ادارے پر چار پانچ ارب روپے کیوں نہیں لگا سکتے جس نے کل کو اس روشن خیالی اور اس اعتدال پسندی کی حفاظت کرنی ہے پروفیسر صاحب ہم عجیب لوگ ہیں ہم پانچ کروڑ روپے کا گھر تو بنا لیتے ہیں لیکن ہم چوکیدار کو صرف از حوائی ہزار روپے دیتے ہیں" میں رکا اور پھر آہستہ آواز میں کہا "جب تک ہم گھر کی مالیت اور چوکیدار کی تنخواہ میں توازن قائم نہیں کرتے ہم لوگ اس وقت تک اسی طرح بیڈ کو الٹی پرائس پے کرتے رہیں گے ہم اسی طرح سڑکوں پر پولیس کے ہاتھوں مار کھاتے رہیں گے ہم اسی طرح کانٹینٹوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے رہیں گے"



Kashif Azad@OneUrdu.com

ماہ نور بنام مملکت خداداد

یہ 18 فروری کی شام تھی لیاقت علی قریشی اچھرہ سے اپنی ساس کے گھر سے نکلا اس کی دھڑکنے لگی پر چار لوگ سوار تھے اس کے پیچھے اس کی بیگم نور بیگم تھی اس کے آگے اس کی بیوی بیٹی تھی اور سب سے آگے تین سال کی ماہ نور بیگم تھی یہ لوگ فیروز پور روڈ پر پہنچے تو اچانک ماہ نور نے چچا ماری لیاقت علی قریشی گھبرا گیا اس نے آگے بھٹک کر دیکھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیر چھا گیا ماہ نور کی گردن کے ساتھ ڈور لٹی تھی اور اس کی شرک سے خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے لیاقت علی قریشی نے ڈور ہٹانے کی کوشش کی 'سورسائیکل غیر متوازن ہوئی اور وہ چاروں سڑک پر گر گئے لیاقت علی قریشی اس کی بیگم نور بیوی بیٹی اور ماہ نور کو شدید چوٹیں آئیں لیاقت قریشی نے فوراً ماہ نور کو جمہولی میں اٹھایا سڑک کے کنارے جیٹا اور روٹا شروع کر دیا بچی کا نصف گلا کٹ چکا تھا 'حلق سے خون کی آباریں بہ رہی تھیں لیاقت علی قریشی کے گریبان سے لے کر اس تک خون ہی خون تھا بچی کو سروسز ہسپتال لے جایا گیا ڈاکٹروں نے ماہ نور کی جان بچانے کی کوشش کی لیکن بچی کا کٹا ہوا گلا سیاہ جاسکا ماہ نور نے ہسپتال کے بیڈ پر جان دے دی۔

یہ بچی بسنت کا آغاز تھی میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا 'بھارت میں ایک ایسا فرقہ موجود ہے جو اپنے تہواروں کا آغاز معصوم بچوں کے خون سے کرتا تھا اس عمل کو وہ ملی چڑھانا کہتے تھے ماہ نور کا خون ہمارے ملک کے سب سے شاندار اور خوبصورت ترین تہوار کا آغاز ہے ہم

لوگ ہر سال اس تہوار کا آغاز بچوں کے خون سے کرتے ہیں اور مختلف عمروں کے دس پندرہ لوگوں کی قربانی دے کر اس تہوار کو نظر انجام تک پہنچاتے ہیں یہ بڑی خوشی کی بات ہے ہم نے اس سال بھی نہ صرف یہ روایت نبھائی بلکہ اس روایت کی جڑوں کو ماہ نور کا خون دے کر اسے اپنے لئے نیک شگون بنا لیا میری حکومت سے درخواست ہے وہ ماہ نور کی اس قربانی کو "آمین" کا حصہ بنا لے وہ اس ملک میں قانون پاس کر دے ہم ہر سال فروری میں ماہ نور جیسی ایک بچی کی قربانی دیا کریں گے اور اس کے بعد جب تک جشن بہار کا تہوار جاری رہے گا ہم روزِ صبح شام اس تہوار کو بچوں کا لہو پلاتے رہیں گے۔ ہم اسے روزِ دس میں بچوں کی قربانی پیش کریں گے لیکن ذرا رکھنے ماہ نور ہم سے اپنا جرم پھیر رہی ہے وہ ہمارا ہاتھ تھام کر ہم سے پوچھ رہی ہے اس کا تصور کیا تھا!

ماہ نور کے چار جرائم تھے ایک وہ ایسے ملک میں پیدا ہوئی تھی جس میں تفریح انسانی جان سے زیادہ قیمتی ہے جس میں قانون اور انصاف نام کی کوئی چیز نہیں۔ وہ وہ لیاقت علی قریشی کے گھر پیدا ہوئی تھی اس موثر سائیکل سوار لیاقت علی قریشی کے گھر جو اسے پچاس ساٹھ لاکھ کی گاڑی میں بٹھا کما س کی جان کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا، مہینے، جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اسے گلہ نشہ رک اور شرگ میں خون کی نالی دے دی تھی اور چار ماہہ پاکستان کے کسی فیصلہ ساز شخص کی بی بی نہیں تھی وہ ایک عام بے بس اور بے کس انسان کی بچی تھی اور یہ حقیقت ہے اس ملک کے عام بے کس اور بے بس لوگوں کے بچے قربانی کے جانور ہوتے ہیں اور یہ نظام یہ سسٹم اور یہ معاشرہ ان کی قربانی بچپن میں قبول کر لے یا پھر بالغ ہونے کے بعد انہیں بے روزگاری، لاقانونیت، دہشت گردی اور خبیثیات کے پھانسی گھاٹ پر لٹکا دے ماہ نور بھی ان بچوں میں سے ایک بچی تھی اور یہ اس معاشرے کا اس بچی پر خصوصی کرم تھا اس نے صرف تین سال کی عمر میں اس کی قربانی قبول کر لی۔ اسے دنیا کے دکھوں سے آزاد کر دیا۔

دنیا کی ہر روڑ کے پیچھے ایک ہاتھ ہوتا ہے یہ حقیقت ہے جب پتنگ ہوا میں لہراتی ہے تو ڈور والے ہاتھ اس کی منزل کا تین نہیں کر سکتے اور یہ بھی حقیقت ہے جب پتنگ کھتی ہے تو ہاتھوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا ان کی بے مہار ڈور اب کس کس کا گھاگانے گی اس ڈور کی دھار پر کون کون سی ماہ نور آئے اس دھار سے نپکتا ہوا لہو کس کس لیاقت علی قریشی کا دامن بھگوئے گا یہ کس کس کے خواب کس کس کے ارمان اور کس کس کی خواہشوں کی شرگ کانے گی یہ کتنے لوگوں کو زندگی کے دکھوں سے آزاد کر کے واپس لوٹنے کی اور یہ دوبارہ اڑنے کے بعد کس کس کی مانگ کس کس کی گود

اجازت دے گی دنیا ہو سکتا ہے ان ہاتھوں کو مورد الزام ٹھہرائے وہ ان نوجوانوں کو الزام دے جو چھتوں، مصلحتوں اور دیواروں پر چڑھ کر چنگیس اڑاتے ہیں لیکن میں ان نوجوانوں کو بے گناہ سمجھتا ہوں میرا خیال ہے ڈور کے سرے ہمارے نظام ہمارے قانون اور ہماری حکومتوں کے ہاتھوں تک جاتے ہیں ان کے ایک سرے پر ماہ نور جیسی بچیاں ہوتی ہیں اور دوسرے سرے پر ہماری حکومتیں ہماری عدالتیں ہمارا قانون اور ہمارا نظام ہوتا ہے اور یہ حقیقت ہے ہماری حکومتوں ہمارے نظام کے ہاتھوں پر دستانے چڑھے ہیں یہ بیٹائی سے محروم ہے اس کے کانوں تک آواز نہیں پہنچتی اور اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر نصب ہے۔ میں نے بڑے عرصے پہلے اپنے ایک بزرگ سے پوچھا تھا قدرت دو دو تین تین سال کے بچوں کو کنروں میں گرا دیتی ہے اور انہیں سڑکوں اور ریلوے ٹریکس پر مراد دیتی ہے قدرت کو اتنے چھوٹے بچوں سے کیا دشمنی ہوتی ہے وہ ان پر اتنا ظلم کیوں کرتی ہے میرے بزرگ نے مسکرا کر جواب دیا تھا انسان کا سب سے بڑا اثاثہ اس کے بچے ہوتے ہیں قدرت یہ اثاثہ چھین کر انسان کو یہ سبق دیتی ہے تمہارے مین ہولز کے ڈھکن غائب ہیں تمہاری سڑکیں اور تمہاری ریل گاڑیاں غیر محفوظ ہیں تمہارا قانون نامکمل ہے تمہارے انصاف کا نظام پوری طرح کام نہیں کرتا اور تمہاری حکومتیں ظالم ہیں اور وہ مہلک ہے اور تمہاری سطوں نے اس ملک اس معاشرے میں رہنا ہے تو تمہیں اپنی حکومتوں اپنی عدالتوں اپنے قانون اپنی سڑکوں اور اپنے مین ہولز کو ٹھیک کرنا ہوگا قدرت اس کو بتاتی ہے اگر تم نے ان چیزوں پر توجہ نہ دی تو تم اپنی سطیں کھودو گے تم بے اولاد مر جاؤ گے۔

ماہ نور کی تصویر میرے سامنے پڑی ہے اس کا گلہ روئی میں لپٹا ہوا ہے اس کی آنکھیں بند ہیں اس کے سر پر کفن کا کونہ لپٹا ہے اور اس کے چہرے پر بے شمار سوال ہیں یہ سوال اس مملکت خدا داد کے نام ایک عرضی ایک درخواست ایک استغاثہ ایک اپیل اور ایک رٹ ہیں ہم سب لوگ اس ملک میں رہنے والے ہم 16 کروڑ لوگ ماہ نور کے مجرم ہیں۔ صدر پرویز مشرف سے لے کر ہائیکورٹ کے ججوں اور ان کے مزدور عبدالکریم تک سب اس بچی کے مجرم ہیں یہ بچی اپنا استغاثہ کفن پر لکھ کر اس منصف کی عدالت میں حاضر ہو گئی ہے جو اس کائنات کا سب سے بڑا جج ہے جو اس کائنات کی ساری شہ رگوں کا خدا ہے اور جس نے انسان کے ہاتھ میں قلم اور کتاب پکڑنے سے پہلے اس کتاب اس قلم کی قسم کھائی تھی جو عادل ہونے پر فخر کرتا ہے اور جس کا کہنا ہے میں تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں اور یہ وہ شہ رگ ہے جو 18 فردری کو فیروز پور روڈ پر کٹ گئی

تھی۔

ماہ نور کا مقدمہ اللہ کی عدالت میں دائر ہو چکا ہے، مجھے یقین ہے اگر اس بیٹی کا کفن میلا ہونے سے پہلے انسانوں کی عدالت نے اس استغاثہ کا فیصلہ نہ کیا تو اللہ اس رٹ کا فیصلہ دے دے گا، اللہ اس بیٹی کے مجرموں کو کیفر کر دار تک پہنچا دے گا۔ حضرت عمر نے فرمایا تھا میں وجہ کے کنارے بڑے کتوں کی پیاس تک کا ذمہ دار ہوں، میرے اس ملک کے حکمران بتائیں یہ تین سال کی ماہ نور کس کی ذمہ داری تھی، اس کا خون کس کی گردن پر تحریر ہوتا ہے؟ خدا کیلئے خدا کے عذاب سے ڈرو، خدا کیلئے انسانوں کے خون سے نہ کھیلو، انسانوں کے رب سے نہ کھیلو۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

پروین بنام ابرار الحق

مجھے پروین نے چند روز پہلے لاہور سے پچاس روپے کا نوٹ بھجوایا، میں نے یہ نوٹ

اپنی بیوی رکھ دیا اور میں اس دن سے یہ نوٹ اٹھا کر رکھتا ہوں اس کے ساتھ چچا کا خط پڑھتا ہوں

اور میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں اس بچی کے ساتھ ہونے والے ظلم کا ذمہ دار

کون ہے اور وہ کون سا شخص، کون سا ادارہ ہے جو اس بچی کے دل پر مرہم رکھے گا، جو اس کے ساتھ

انصاف کرے گا، جو اس کی عزت بحال کرے گا، مجھے سمجھ نہیں آتی اس بچی کے ساتھ ہونے والے

ظلم کا ذمہ دار ابرار الحق ہے، ہماری حکومت کی روشن خیالی اور اعتدال پسندی ہے یا پھر بے حسی کی

گہری نیند میں سویا ہوا یہ پورا معاشرہ اور میں یہ بھی یقین نہیں کر پاتا اس بچی کے آنسو ابرار الحق

پونچھے گا، صدر معظم اس کیلئے وقت نکالیں گے، اس کی فریاد وزیراعظم سنیں گے، قائم مقام چیف

جسٹس جناب رانا بھگوان داس سوموٹو ایکشن لیں گے یا پھر پورا معاشرہ مل کر کوئی ایسا ضابطہ اخلاق

بنائے گا جس کے بعد پروین جیسی بچیاں اس ملک میں عزت اور آبرو کے ساتھ زندگی گزار سکیں گی

میں جب بھی سوچتا ہوں تو مجھے کوئی جواب نہیں ملتا میں سوچتا ہوں ابرار الحق ایک بین الاقوامی

شار ہیں چنانچہ ان کے پاس تھرڈ ایئر کی اس بچی کے لئے کوئی وقت نہیں، صدر معظم دہشت گردی

کے خلاف امریکی جنگ میں بری طرح معروف ہیں، انہوں نے ابھی چیف جسٹس اور یونیفارم

جیسے اہم مسائل بھی حل کرنے ہیں چنانچہ ان کے پاس بھی ایسے جموں نے جموں نے مسئلوں کیلئے وقت

نہیں ڈریرا عظیم اور ان کی حکومت ملک کو معاشی آزادی کا تھکا دینا چاہتی ہے چنانچہ ان کے پاس بھی پروین کیلئے وقت نہیں قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس بھاریہ کے بحران میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان کے پاس ایسے چھوٹے مسائل کیلئے وقت نہیں اور اگر ان کے پاس وقت ہو بھی تو عدل کا نظام اس وقت تک خاموش رہتا ہے جب تک کوئی سال اپنا سال ۱۹۱۱ء سے شروع کر زنجیر عدل نہیں بلاتا اور پیچھے رو جاتا ہے معاشرہ تو جس معاشرے نے قرآن مجید کا اثر نہیں لیا جس نے اللہ اور اللہ کے رسول کے احکامات سے آنکھ اور کان بند کر لئے وہ پروین جیسی بچپوں کی آواز کیسے سنے گا لیکن اس کے باوجود میں پروین کے خط اور اس کے بھجوائے پچاس روپے کے نوٹ کو اپنے اوپر قرض سمجھتا ہوں اور میں یہ قرض اس مملکت خدا داد کے کندھوں پر ڈال کر اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں میں پروین کا مقدمہ اس پورے معاشرے کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں اور اس معاشرے سے درخواست کرنا چاہتا ہوں اگر تم لوگوں نے پروین جیسی بچپوں کی آواز نہ سنی تو تم لوگ کوئی آواز سننے کے قابل نہیں رہو گے۔

پروین کے پچاس روپے کے نوٹ کے ساتھ خط تھا اور اس خط میں لکھا تھا ”میرا نام پروین ہے اور میں آج سے 4 دن پہلے تک لاہور کے ایک کامرس کالج میں فخر ڈاکٹر کی طالبہ تھی لیکن ابراہیم الحق کے ایک گانے کی وجہ سے نہ صرف مجھے اپنی تعلیم اور حوری چھوڑنی پڑی بلکہ اس گانے نے میری زندگی مشکل بنا دی میں اس خط کے ساتھ آپ کو 50 روپے بھیج رہی ہوں تاکہ جب بھی آپ میرا یہ 50 روپے کا نوٹ دیکھیں تو آپ کو میرا خط یاد آ جائے اور آپ بازار سے ابراہیم الحق کی کیسٹ ”لغرو سازا عشق ہے“ خریدیں اور اس کی اسے سائیڈ کا دوسرا گانا جس میں ابراہیم الحق نے پروین کا نام لے کر ایسی بے ہودہ باتیں کی ہیں کہ اگر آپ کی بیٹی یا بہن کا نام پروین ہوتا تو آج میری طرح آپ کی بیٹی یا بہن بھی آپ سے آنکھیں چرا رہی ہوتی ابراہیم الحق نے اس گانے میں پاکستان کی تمام پردیوں کے بارے میں جو الفاظ کہے ہیں مجھے وہ لکھتے ہوئے شرم آ رہی ہے ابراہیم الحق نے اس گانے میں کہا ہے ”نی پروین تو بڑی نکلیں اوپر سے تو مسکین اندر سے تو بڑی شوقین“ میرے کالج میں کو-ایجوکیشن تھی میں جب کالج کی کینٹین کے قریب سے گزرتی تھی تو لڑکوں کو اس کی شکل میں یہ گانا گانے لگتے تھے اور اس کے بعد قہقہے لگاتے تھے ایک دن میں نے ہمت کی اور ان لڑکوں سے اس شرارت کے بارے میں پوچھ لیا تو ان کا کہنا تھا ہم ابراہیم الحق کا گانا گارہے ہیں میں نے اس وقت تک یہ گانا نہیں سنا تھا اس شام جب میں نے یہ گانا اپنے کانوں سے سنا تو

میرے دل نے چاہا زمین پھٹ جائے اور میں اس کے اندر چلی جاؤں لیکن نہ زمین پھٹی اور نہ میں اس کے اندر جا سکی مگر میں نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی جاوید صاحب کا شہ آپ کی بیٹی یا بہن کا نام پروین ہوتا تب میں آپ سے پوچھتی ابرار الحق کا یہ گانا سن کر آپ کے دل پر کیا گزرتی ہے آپ یہ گانا سن کر کس طرح اپنی بیٹی یا بہن سے آنکھ چراتے ہیں جاوید صاحب میں پوچھتی ہوں اگر ابرار الحق کی بہن کا نام پروین ہوتا تو کیا وہ اپنی بہن کے متعلق بھی گانا گار دیتا تو یہ بتاتا "پروین تو بڑی عنکبوتی تو بڑی شوقین" میری دل سے دعا ہے اللہ تعالیٰ ابرار الحق کو ایک بیٹی دے اور اس کا نام پروین ہو پھر میں اس سے پوچھوں اب تو یہ گانا سنا اور اس کے بعد اپنی بیٹی کی طرف دیکھنے جاوید صاحب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے اس ملک کے کسی با اختیار شخص کی بیٹی یا بہن کا نام پروین نہیں اور نہ یہ گندی کیسٹ کب کی بہن ہو چکی ہوتی جاوید صاحب خدا کیلئے یہ کیسٹ یا میری یہ فریاد ایوان صدر پہنچا دیں تاکہ اس ملک کی تمام پروینوں کو گھر سے باہر نکلنے ہوئے شرم نہ آئے۔ دوسرا مجھے بتائیں میں اپنے والد اور بھائیوں کو کیا بتاؤں میں نے کالج کیوں چھوڑ دیا تھا؟ کیا میں یہ بتاؤں لڑکے ان کی بیٹی یا بہن کو عنکبوت اور شوقین کہتے تھے اور ان میں یہ الفاظ سننے کا حوصلہ نہیں تھا جاوید صاحب میری یہ فریاد اور میرا یہ خط آپ پر قلم ہے میں آپ کو یہ خط لکھ کر اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا محسوس کر رہی ہوں۔ کاش میرے والدین نے میرا نام پروین نہ رکھا ہوتا"

میں جانتا ہوں ابرار الحق اس معاملے میں تصور وار نہیں ہیں اور انہوں نے کسی پروین کو ذہن میں رکھ کر یہ گانا لکھا ہوگا اور نہ ہی گایا ہوگا لیکن بعض اوقات ہماری ذرا سی لاپرواہی بے شمار لوگوں کی زندگیوں میں تلخی کھول دیتی ہے ہماری ذرا سی بے احتیاطی پروین جیسی لڑکیوں کیلئے زندگی مشکل کر دیتی ہے ابرار الحق ایک اچھے انسان ہیں انہوں نے نارووال جیسے دور افتادہ شہر میں جدید ہسپتال بنا کر کمال کر دیا لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے وہ گلوکاری میں احتیاط نہیں کرتے ان کے گانے اکثر اوقات اخلاق کی ساری حدیں عبور کر جاتے ہیں وہ کبھی بلو کے نام سے ایسی بے ہودہ باتیں منسوب کر دیتے ہیں کہ سن کر شرم آتی ہے کبھی پورے پنجاب کی خواتین کو تاپنے کی دعوت دے دیتے ہیں اور کبھی پروین جیسی بچیوں کیلئے عزت اور آبرو کے ساتھ جینے کے راستے بند کر دیتے ہیں اگر ابرار الحق گانا بتاتے وقت لفظوں کا ذرا سا خیال رکھ لیں وہ ناموں سے پرہیز کریں تو میرا خیال ہے ان کی نیک نامی میں بھی اضافہ ہوگا اور ان کے ضمیر پر بھی بوجھ نہیں پڑے گا مجھے اچھی طرح یاد ہے انہوں نے "نچ پنجابن نچ" پر درعمل کے بعد پنجابن کو بجا نہیں بنا دیا تھا

اس تبدیلی سے ان کے گانے پر بھی کوئی اثر نہ پڑا اور پنجابیوں کی دل آزاری کا سلسلہ بھی بند ہو گیا تھا اسی طرح اگر وہ پروین کی جگہ پری کر دیں، شہزادی یا ملکہ لکھ دیں اور ناموں کے وزن کو سامنے رکھ کر کمپوزیشن میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دیں تو اس سے بھی پروین جیسی بے شمار بچیاں شرمندگی سے بچ جائیں گی اس میں کوئی شک نہیں فن عظیم ہوتا ہے لیکن انسانی جذبات اس سے بھی عظیم تر ہوتے ہیں چنانچہ فنکار کو اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسانی جذبات کی عظمت کو ضرور مد نظر رکھنا چاہیے انہیں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہیں ان کے فن سے کسی کی دل آزاری تو نہیں ہو رہی ان کے لفظ کسی کے دل پر بلینڈ کی طرح تو نہیں گر رہے یہ سوال تجلی علی عمل کے دوران دنیا کے ہر فنکار کے مد نظر ہونا چاہیے مجھے ایک بار نبی اکرم کی حیات پر بننے والی فلم "دی مسیج" کے پروڈیوسر کا انٹرویو دیکھنے کا موقع ملا تھا انٹرویو لینے والے نے ان سے پوچھا تھا "آپ نے فلم میں کسی جگہ نبی اکرم کا سایہ نہیں دکھایا کیوں؟" انہوں نے جواب دیا "میں یہ جسارت کر سکتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا میری اس حرکت سے عالم اسلام کی دل شکنی ہوگی لوگ میری جسارت کو قبول نہ کریں گے" اگر ہم فن کے مغربی نقطہ نظر سے دیکھیں تو پروڈیوسر کی بات غلط محسوس ہوگی لیکن اگر ہم انسانی جذبات، احساسات اور عقیدت کو سامنے رکھ کر تجزیہ کیا جائے تو پروڈیوسر سچا دکھائی دے گا اخلاق، تہذیب اور شانگی ہر دور میں فن سے عظیم رہی ہے اور رہے گی یہ حقیقت ہے دنیا کا کوئی گانا، کوئی نظم، کوئی غزل، کوئی افسانہ، کوئی ناول، کوئی قلم اور کوئی تصویر کسی انسانی جذبات کی جگہ نہیں لے سکے گی کیونکہ دنیا کا ہر گانا اور ہر گلوکار واقعی ہوتا ہے جبکہ انسانی جذبات اور انسانی اخلاقیات ابد تک قائم رہنے والی سچائیاں ہیں لہذا دنیا کا کوئی گانا اور کوئی گلوکار خواہ کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو جائے معاشرہ اسے ماں، بہن اور بیٹی کے رشتے پامال کرنے کی اجازت نہیں دے گا 'میرا دل چاہتا ہے میں ابرار الحق سے پوچھوں یہ کیسی گلوکاری ہے جسے سننے کے بعد بچپوں کو اپنے نام اور اپنے وجود سے گھن آنے لگتی ہے' بھائی اپنی بہن سے نظریں جراتا ہے اور بیٹیاں اپنے باپ سے شرمندہ ہو جاتی ہیں 'میرا دل چاہتا ہے میں بھی ابرار الحق سے پوچھوں کیا واقعی ان کی بہن یا بیٹی کا نام پروین ہوتا تو بھی وہ یہ گانا گاتے؟ اس وقت ان کا کیا رویہ ہوتا!

یہ پروین کا مقدمہ ہے اور اس مقدمے میں ملک کے مشہور گلوکار ابرار الحق مجرم ہیں کیا یہ معاشرہ اس معاشرے کے سولہ کروڑ لوگ اس معاشرے کی دو ہزار عداوتیں، تین ہزار جج اور ڈیڑھ لاکھ وکیل یہ مقدمہ لڑیں گے کیا ہم شاعروں، اُدبوں، موسیقاروں اور گلوکاروں کیلئے بھی کوئی

زیر پوائنٹ 3.....0.....197

ضابطہ اخلاق طے کریں گے اور کیا ہم پروین جیسی بچیوں کو تحفظ دیں گے؟ میں یہ سارے سوال آج کے دن پر چھوڑتا ہوں! میں یہ سوال اس ملک کے لوگوں پر چھوڑتا ہوں۔

نوٹ: (اس کالم کی اشاعت کے فوراً بعد قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس نے سومنوا ایکشن لے لیا تھا عدالت نے ابرار الحق کو طلب کیا اور ان کے اس گانے پر پابندی لگا دی بعد ازاں عدالت نے گانے میں موجود الفاظ ایٹ کرنے کا حکم دے دیا)



Kashif Azad@OneUrdu.com

رباب بنام پاکستان

رباب احمد کراچی کی ایک صحافی ہیں ان سے میری ملاقات پانچ برس پہلے ہوئی تھی دو ان دنوں کمی مچتی رہیں میں کام کرتی تھیں اس کے بعد ان سے رابطہ منقطع ہو گیا، نثر شروع ہو گئی تھی ان کا ایک خط موصول ہوا اس خط نے مجھے ہلا کر رکھ دیا یہ خط ایک عام شہری کا پاکستانی معاشرے اور حکومت پر سچا اور تلخ تبصرہ ہے۔ اس خط میں وہ سارے احساسات پائے جاتے ہیں جو اس ملک کی سڑکوں اور گلیوں میں پھرنے والے کروڑوں لوگوں کے دل سے گزرتے ہیں۔ اس خط میں وہ سارے دُخم اور وہ سارے گلے بھی موجود ہیں جو اس ملک کے عوام کی زبان پر ہیں، میں آپ کو رباب کے دکھ میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔

رباب احمد اس ملک کے لوگوں کو ایک سچی کہانی سنانا چاہتی ہیں ان کا ایک چھوٹا بھائی تھا عامر عامر بے انتہا شرارتی اور ذہین تھا اچھا لباس اور اچھی خوراک اس کی خاص کمزوری تھی، بچپن میں اسے کوئی لڑکی اچھی لگتی تھی تو وہ کہتا تھا میں اسی سے شادی کروں گا، 29 مئی 2006 کو اس کی شادی ہو گئی اس وقت عامر کی عمر 32 سال تھی عامر شادی کے بعد خود کو مکمل تصور کرنے لگا تھا۔ اسے بیٹی کی شدید خواہش تھی وہ کہتا تھا اگر اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹی عنایت کی تو وہ اس کا یہ نام رکھے گا۔ اسے سکول میں داخل کرائے گا اور اس کے ساتھ اس طرح کھیلے گا وغیرہ۔ رباب اور اس کا خاندان عامر کی ان باتوں پر ہنستا رہتا تھا ابھی عامر کی شادی کو فقط دو ماہ گزرے تھے کہ اس کے

خاندان میں ایک شادی آگئی۔ رباب عامر کی بیوی اور عامر گاڑی میں بیٹھ کر شادی گھر پہنچ گئے۔ عامر تھوڑی دیر ہال میں بیٹھا رہا اور اس کے بعد بور ہو کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یہ 18 اگست 2006ء کی رات تھی عامر کو ابھی گاڑی میں بیٹھنے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہاں ایک نو عمر لڑکا آ گیا لڑکے نے عامر کی گاڑی کا شیشہ بھجایا عامر نے شیشہ نیچے کیا تو لڑکے نے عامر کی کینٹی پر پستول رکھ دیا۔ لڑکے نے عامر سے اس کا سوا بل مانگنا شروع کر دیا عامر نے حیل و حجت سے کام لیا تو لڑکے نے گولی چلا دی۔ گولی عامر کی چھاتی سے ہوتی ہوئی ریزہ کی ہڈی تک پہنچی اور ہڈی کو چھلتی ہوئی نکل گئی۔ رباب اور اس کا خاندان شادی کے ہنگامے میں گم تھا اتنے میں باہر شور ہوا اور چند لوگ بھاگتے ہوئے رباب کے پاس پہنچے اور اسے حادثے کی اطلاع دی۔ یہ لوگ باہر کی طرف بھاگے گاڑی میں عامر خون میں لت پت پڑا تھا ان لوگوں نے عامر کو اٹھایا اور فوراً ہسپتال پہنچ گئے ہسپتال پہنچنے کے بعد ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہاں جا کر ان لوگوں کو پتہ چلا جب تک پولیس نہیں پہنچتی اس وقت تک مریض کا علاج ممکن نہیں۔ رباب کا بھائی خون میں لت پت تھا جب کہ ہسپتال میں پولیس کا دادا دودھ بیک کوئی کھانا نہیں تھا۔ عامر کبھی آنکھیں کھولتا تھا کبھی جھنجھار م تھا اور کبھی خاموش ہو جاتا تھا وہ بار بار رباب کا ہاتھ چڑا کر کہتا تھا "آپا میں مر جاؤں گا" رباب اس کی بات سن کر پاگلوں کی طرح رونا شروع کر دیتی تھی۔ کسی نے اس مظلوم خاندان کو مشورہ دیا تم لوگ فوری طور پر کسی سفارش کا بندوبست کرو کیونکہ پولیس کے آنے کے بعد بھی عامر کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ رباب نے جیسے تیسے ایک سفارش کا بندوبست کیا سفارشی ٹیلی فون موصول ہونے کے بعد ڈاکٹروں نے عامر کا علاج شروع کر دیا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا سب سے پہلے مریض کا سٹی سکین ہو گا۔ جب تک سٹی سکین کی رپورٹ نہیں آتی وہ مریض کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جاسکتا۔ عامر اس رات اپنے درد کے ساتھ دست و گریبان رہا۔ صبح عامر کی سٹی سکین کی رپورٹ آئی تو پتہ چلا عامر تہ صرف دونوں ٹانگوں سے معذور ہو چکا ہے بلکہ اس کا ایک پیچھوڑا بھی زخمی ہے گولی تلنے کی وجہ سے اس کی ایک پٹلی بھی زخمی ہے اس کی ریزہ کی ہڈی بھی متاثر ہے اور اس کے ایک بازو میں بھی زخم موجود ہے۔ رباب اور اس کا خاندان ہسپتال میں پاگلوں کی طرح گردش کرتا رہا انہیں یوں محسوس ہوا اس ہسپتال کی انتظامیہ کے پاس وقت بہت ہی ڈاکٹروں ہی دو۔ ان لوگوں نے فوراً عامر کو اس ہسپتال سے نکالا اور اسے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں منتقل کر دیا۔ اس کے بعد ہسپتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد

چوتھا ہسپتال آیا یہاں تک کہ چار ماہ میں بارہ ہسپتال تبدیل ہوئے لیکن عامر کی حالت ٹھیک نہ ہوئی۔ وہ ناگوں سے مکمل طور پر معذور ہو گیا۔ رباب کا کہنا تھا عامر کو جب بھی ہوش آتی تھی تو وہ اپنی ناگوں کے بارے میں پوچھتا تھا۔ رباب عامر کی بیوی اور دوسرے رشتہ دارا سے کھوکھلی تسلی دے دیتے تھے۔ رباب کا کہنا تھا ہم لوگ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اس نے عامر کو کم از کم زندگی تو دے دی۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی تھا ہمارا بھائی آنکھیں کھولتا ہے چند لفظ بولتا ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہاتھ ملا لیتا ہے۔ عامر کی صحت تیزی سے گرتی چلی گئی عامر کا خاندان ہسپتال تبدیل کرتا رہا لیکن اس خاندان کو ڈاکٹروں کے بھیجے میں پیشہ ور ٹھک تو ملے لیکن پورے شہر میں انہیں کوئی مسیحا نہ ملا کسی نے اس خاندان کا ہاتھ نہ تھاما کسی نے اس نوجوان کی زندگی کیلئے کوشش نہیں کی۔ پورا خاندان چھ ماہ تک امید اور ناامیدی کی صلیب پر لٹکا رہا ان چھ ماہ میں وہ روز اپنی ناگوں پر کھڑا ہونے کے خواب دیکھتا تھا وہ ایک خوبصورت اور مستحند زندگی کی دعائیں کرتا تھا لیکن 31 دسمبر 2006 کو عامر اور اس کی دعائیں دونوں انتقال کر گئیں عامر مر گیا اور جاتے جاتے پورے خاندان کو زندہ درگور کر گیا۔

Kashif Azeed@OneIndia.com

رباب کا کہنا تھا کہ وہ مسلمان ہونے کے ناطے یہ سمجھتی ہے اللہ تعالیٰ نے عامر کو صرف 32 سال کی عمر دی تھی لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی وہ اس ملک، اس ملک کے قانون اور موہاں چھیننے والوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کیا صرف چند ہزار روپے کے موہاں کے لئے عامر جیسے نوجوان کا قتل انصاف ہے؟ وہ سوچتی ہے اس کا مجرم کون ہے اور وہ عامر کے خون کا پرچہ کس کے خلاف کٹوائے وہ ناظم شہر کے خلاف ایف آئی آر کٹوائے یا وہ کراچی کے گورنر اور وزیر اعلیٰ کا گریبان پکڑے وہ وزیر اعظم اور صدر کے سامنے کھڑی ہو جائے یا وہ پورے شہر کو اپنا مجرم سمجھے۔ رباب کا کہنا ہے ہماری حکومت کو اس ملک میں القاعدہ کی چیونٹی تک نظر آجاتی ہے لیکن اسے شہر میں مرنے والے ہزاروں عامر دکھائی نہیں دیتے۔ اس کا کہنا تھا پاکستان کے کسی شہر میں جب بھی عامر جیسے ہنس میں لوگ مر جاتے ہیں تو حکومت "مجرموں کو قرا و اتقی سزا دی جائے گی" کا اعلان کر کے مظلوموں کی قبر پر پتھر اور لواحقین کے سینے پر صبر کی سل رکھ دیتی ہے۔ رباب کا کہنا تھا اگر عامر کسی دی آئی پی کا بیٹا ہوتا تو کیا وہ اسی طرح سڑک پر مارا جاتا اور اگر وہ مارا جاتا تو کیا حکومت اس کے مجرموں کو بھی اسی طرح چھوڑ دیتی؟ کیا اس ملک کے کسی دی آئی پی کا عامر بھی اسی طرح چھ ماہ تک خواہشوں اور دعاؤں کی صلیب پر لٹکے لٹکے ختم ہو جاتا اور کیا اس

کے خاتمے کے بعد حکومت اسی طرح خاموش رہتی؟ رباب کا کہنا تھا اس ملک میں جب کسی وزیر کا کوئی بیجا جرم کرتا ہے تو پوری حکومت اس کے سیاہ کرتوت پر سفید چادر ڈال دیتی ہے، وزیروں کے بیٹوں کے جرم میں بے گناہ پکڑے جاتے ہیں اور ان بے گناہوں کو بے گناہی کی پھاٹی پر چڑھا دیا جاتا ہے، اس ملک میں امریکہ کسی کا نام دے دے تو حکومت اس نام کے تمام لوگوں کو گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کر دیتی ہے۔ ہمارے سیاستدان ہمارے حکمران امریکہ کے اشارے پر زمین تک کھود ڈالتے ہیں، ہماری پولیس ہماری ایجنسیوں کی تمام تر مہارتیں اس ملک کے حکمران خاندانوں کی حفاظت میں صرف ہوتی ہیں، اگر امریکہ ایمل کانسی کی تصویر ہماری ایجنسیوں کے حوالے کر دیتا ہے تو ہماری ایجنسیاں ماچس کی ایک ڈبی کے ذریعے ایمل کانسی تک پہنچ جاتی ہیں لیکن بد قسمتی سے ان کے پاس عام جیسے شہریوں کے لئے کوئی وقت نہیں۔ رباب پوچھتی ہے یہ کون لوگ ہیں جو روز پستول لے کر گھر سے نکلے ہیں اور راستے میں آنے والے عام جیسے ہر نو جوان کے دل میں سوراخ کر جاتے ہیں اور کوئی انہیں پوچھتا تک نہیں، وہ کہتی ہے یہ کون لوگ ہیں جن کی نظر میں ایک موبائل فون انسانی جان سے زیادہ قیمتی ہے اور وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے عام جیسے نو جوانوں کی حفاظت کا حلف اٹھایا تھا، جنہیں ہم اس لئے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر دیتے ہیں کہ یہ لوگ کڑے وقت میں ہماری مدد کریں گے، ہماری حفاظت کریں گے۔ رباب کا کہنا تھا وہ کون لوگ ہیں جو پاکستان میں اسلحہ لارہے ہیں اور یہ اسلحہ گلی گلی تقسیم ہو رہا ہے، وہ کون لوگ ہیں جو اس اسلحہ کو عوام پر استعمال کر رہے ہیں۔ رباب کا کہنا تھا اسے پورا پاکستان جرم کی آماجگاہ محسوس ہو رہا ہے، وہ جب بھی اخبار میں کسی واردات کی خبر پڑھتی ہے یا اسے کس شخص کی تصویر نظر آتی ہے تو اس کے سینے میں عام زندہ ہو جاتا ہے۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے محسوس کرتی ہے اب اس ملک کے لوگوں کو پانی بجلی، گیس اور ٹیلی فون کے بلوں کے ساتھ ساتھ اپنی جانوں کا خراج بھی دینا پڑے گا، اب اس ملک کے لوگوں کو پر اپنی ٹیکس کی طرح حکومت کو جانیں بھی دینا پڑیں گی۔ اس کا کہنا تھا جب سے اس نے عام گورنر دیکھا ہے وہ اپنے بڑے بھائی کو پاکستان واپس نہ آنے کی درخواستیں کر رہی ہے کیونکہ اس کے اندر یہ خوف بیٹھ گیا ہے اگر اس کا دوسرا بھائی بھی پاکستان آ گیا تو وہ بھی کسی دن اسی طرح دہشت گردی کا شکار ہو جائے گا۔ اس کا کہنا تھا کیا اقتدار اعلیٰ کو کراچی کے یہ مسائل نظر نہیں آ رہے، کیا حکومت کو کراچی میں عام جیسے لوگوں کی نفسی نظر نہیں آ رہی، کیا حکومت کی نظر میں عام انسان اور عام انسان کی زندگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ رباب کا کہنا تھا عام کے بعد

بھی اٹھوں ہزاروں موبائل چھینے چاچکے ہیں ہر روز کتنی ہی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں ہر روز کراچی میں بے شمار وارداتیں ہوتی ہیں لیکن حکومت کی طرف سے قرار واقعی سزا کی ایک دھمکی کے سوا کچھ سامنے نہیں آتا۔ رباب کا کہنا تھا ہم کب تک اسی طرح قربانیاں دیتے رہیں گے ہم کب تک اس ملک میں زندگی اور موت کے درمیان لٹکتے رہیں گے۔ رباب کا کہنا تھا اس ملک میں ایک زندگی عام جیسے لوگ گزار رہے ہیں اور دوسری طرف بڑی بڑی گاڑیوں، شراہوں کی محفلوں، غیر ملکی دوروں، بڑے بڑے پائلوں اور اونچی اونچی - غار شوں والی زندگی ہے۔ اس کا سوال تھا عام جیسے لوگوں اور بڑے لوگوں کے درمیان یہ فرق کب تک قائم رہے گا۔ ہم لوگ عوام کا خون ٹھوڑ کر کب تک ااقانویت کا بازار گرم کرتے رہیں گے اور ہم یہ کیوں نہیں مان لیتے ہم ایک تباہ شدہ قوم ہیں ہم یہ اعتراف کیوں نہیں کر لیتے ہم دنیا میں امریکہ جیسے بڑے ممالک کے مفادات کی حفاظت کرنے کیلئے اترے ہیں۔ رباب کا کہنا تھا ہر روز جب عامر کی چوبیس سالہ بیوہ کو دیکھتی ہے اپنے والد کے افسردہ چہرے اور اپنے خاندان کی رندمی ہوئی آواز سنتی ہے اور وہ اپنے گھر کے خالی پن اور

کاشف آڈیو، ویڈیو، کتابوں اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر مواد کے لیے www.KashifAudiobooks.com سے رابطہ کریں۔

جیسے بڑے خاندان کو محسوس کرتا ہے تو اس کے دل پر آؤ گے جلتے ہیں اور اسے محسوس ہوتا ہے وہ کسی شہر میں نہیں بلکہ کسی قلعہ میں زندہ ہے۔ اس وقت اس کا دل چاہتا ہے کاش پاکستان کے حکمرانوں کی اولاد کے ساتھ بھی ایسا ہو کاش کبھی یہ لوگ بھی ہسپتالوں کے دھکے کھائیں کاش یہ لوگ بھی کبھی اپنے پیاروں کی اٹھیں اٹھا کر ایک ٹھیک سے دوسرے ٹھیک جائیں۔ کاش ان لوگوں کی اولاد بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی خواہش کرتے کرتے فوت ہو جائے اور کاش کبھی اس ملک کے حکمرانوں کو بھی عام انسانوں جیسی زندگی گزارنا پڑے۔ رباب کا کہنا ہے اب اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے وہ کس طرح حکمران طبقے کو ان حالات کا شکار ہوتے دیکھے جن کا وہ اور اس کا خاندان شکار ہے۔ اس کا کہنا تھا وہ اس ملک کے تمام حکمرانوں کو اپنا بھرم سمجھتی ہے اسے محسوس ہوتا ہے اس کے بھائی کی جان اس ملک کی حکومت نے لی۔ اس کا کہنا ہے یہ معاشرہ فرعونیت کا شکار ہو چکا ہے لہذا اسے سانس لینے کیلئے اب کسی موی کی ضرورت ہے۔ اس نے خط میں لکھا، مجھے کوئی ایسی عدالت بتائی جائے جس میں وہ اس معاشرے کے عام انسانوں کا مقدمہ دائر کر سکے اسے کوئی ایسا شخص بتایا جائے جس کا وہ گریبان پکڑ سکے۔ اس کا کہنا تھا جب سے اس کا بھائی قتل ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے دن رات قیامت کی دعائیں مانگ رہی ہے وہ اس دن سے روز محشر کا انتظار کر رہی ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو سکے اور وہ اس ملک کے حکمرانوں کا

گر بیان پکڑ سکے۔

یہ رباب کا مقدمہ تھا رباب نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی تھی میں اس کا مقدمہ کسی اعلیٰ عدالت میں پیش کر دوں۔ میں نے یہ خط پڑھنے کے بعد آگے پیچھے دیکھا لیکن مجھے اس ملک میں دور دور تک کوئی ایسا ایوان کوئی ایسی عدالت نظر نہیں آئی جس میں رباب کا مقدمہ دائر ہو سکے لہذا میں نے بے بس ہو کر رباب کا یہ مقدمہ عوام کی عدالت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا، مجھے یقین ہے عوام کی عدالت بھی یہ مقدمہ دوسرے کان سے خارج کر دے گی کیونکہ مقدمے اور بین انسان سنا کرتے ہیں اور بد قسمتی سے یہ ملک بے حس کا قبرستان بن چکا ہے اور بے حس کے قبرستانوں میں انسان نہیں بستے صرف اور صرف قبریں ہستی ہیں! ہم سب 16 کروڑ قبروں میں آباد ہیں۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

رٹ آف دی گورنمنٹ

ساریہ میڈیکل سنور اسلام آباد کے جی ایٹ مرکز میں دواؤں کی ایک چھوٹی سی دکان

نے 4 دسمبر 2006 کو تین نوجوان سنور میں داخل ہوئے انہوں نے مختلف چیزوں کی قیمت پوچھی
چند کا مہلکس انعامیں کاؤنٹر کی طرف آئے اور جیب سے پرنس کی بجائے پستول نکال لیا سنور
کے مالک احتشام الحق کاؤنٹر پر بیٹھے تھے نوجوانوں نے انہیں ساری نقدی حوالے کرنے کا حکم دیا
احتشام الحق صاحب جرأت مند قسم کے انسان تھے وہ ڈاکوؤں کے ساتھ الجھ پڑے ایک نوجوان
نے ان کی طرف پستول کیا اور گولی چلا دی احتشام الحق صاحب فرس پر گرے اور ترپنے لگے
نوجوانوں نے دراز کھولی اس میں موجود رقم نکالی اور اطمینان سے چلتے ہوئے سنور سے باہر نکل
گئے جبکہ احتشام الحق صاحب موقع پر جاں بحق ہو گئے۔ میں نے یہ واقعہ پانچ دسمبر 2006ء کے
اخبارات میں پڑھا تھا اور اس کے بعد اپنے ایک ساتھی سے پوچھا تھا "ڈاکوؤں کو اس چھوٹے سے
سنور سے کتنی رقم مل گئی ہوگی" میرے ساتھی نے تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا "ایک یا دو ہزار
روپے" میں نے اس سے پوچھا "تین نوجوان ایک دو ہزار روپے لوٹنے کیلئے آئے اور وہ ایک
شخص کو قتل بھی کر گئے یہ انتہائی خوفناک صورتحال نہیں؟" میرے ساتھی نے اٹسوں سے سر ملادیا اور
کہا "آج کل لوگ ایک گلوپنی کیلئے دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں"

میرے ساتھی کا کہنا تھا آج سے دس برس پہلے تک ڈاکے صرف بینکوں، سینھوں اور

بڑی بڑی کمپنیوں تک محدود تھے ڈاکو بڑے منظم انداز سے آتے تھے اور کم از کم پچاس ساٹھ لاکھ روپے لوٹ کر لے جاتے تھے لیکن اب ہمارے معاشرے میں ڈاکوؤں کی ایک ایسی گھنیا کلاس پیدا ہو چکی ہے جو ضروریات زندگی کیلئے ڈاکے ڈالتی ہے یہ لوگ روز ایک ریکٹ بناتے ہیں اور راتے میں آنے والے ہر شخص کو لوٹ لیتے ہیں سائیکل سوار سے لے کر کریمانہ مرچنٹ تک سب لوگ ان کا شکار ہوتے ہیں یہ لوگ راہ چلنے لوگوں کو روک کر ان کی جیب سے موبائل فون تک نکال لیتے ہیں ان کی گھڑی ٹیمپک اور پرس ٹھین لیتے ہیں اور سلام کر کے چلے جاتے ہیں مجھے اپنے ساتھی کی بات سن کر اہبت آباد کے ایک دوست کا واقعہ یاد آ گیا میرے دوست نے بتایا۔ ایک دن تین ڈاکو اس کے گھر گھس آئے گھر میں صرف ان کی والدہ تھی ڈاکوؤں نے اماں جی کے پاؤں چھوئے اور بڑے احترام سے بولے "اماں جی ہمیں صرف سات ہزار روپے چاہئیں مہربانی کر کے دے دیں" اماں جی نے سات ہزار روپے نکال کر دے دیئے ڈاکوؤں نے رقم لی اماں جی کے دو بارہ پاؤں چھوئے اور ہنس کر بولے "ہم نے دراصل بجلی کا بل جمع کرنا تھا ہمارے پاس پیسے نہیں تھے لہذا ہم نے سوچا ڈاکے مار لیتے ہیں گھر سے دوست نے بتایا وہ شام کو واپس آیا تو اس نے اپنی والدہ کو رقم کی بجائے ڈاکوؤں کیلئے منظر پایا میرے دوست کا کہنا تھا لوگ اب ضرورت کی وجہ سے بھی ڈاکے مارتے ہیں شاید میرے دوست کی بات درست ہو۔ آپ کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ کو اس میں ڈاکے اور ایکسٹنڈ کی خبر ضرور ملے گی ایک اندازے کے مطابق اس وقت پاکستان میں روزانہ بیس سے پچاس ہزار وارداتیں ہوتی ہیں جن میں آدمی سے زیادہ وارداتیں ڈاکے ہوتے ہیں میری پچھلے دنوں ایک سابق ڈاکو سے ان وارداتوں کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی، یہ شخص دس برس پہلے تک ایک نامور ڈاکو تھا لیکن پھر وہ ایک پیر صاحب کی مہربانی سے توبہ تائب ہو گیا میں نے اس سے ان وارداتوں کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنس کر بولا "پاکستان میں اب پارٹ ٹائم ڈاکو آچکے ہیں" میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا "پشاور ڈاکو کبھی قتل نہیں کرتا وہ کبھی کسی شخص کے سینے یا سر میں گولی نہیں مارتا وہ زیادہ سے زیادہ کسی شخص کے سر میں پستول کا بت مارے گا اسے بے ہوش کرے گا اور دوسرے لوگوں کو اس کی بے ہوشی سے ڈرا کر رقم نکلوالے گا ڈاکے کے دوران قتل ہمیشہ پارٹ ٹائم اور واقعاتی ڈاکو کرتے ہیں" میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا "پارٹ ٹائم ڈاکوؤں کو پستول پکڑنے اور پستول چلانے کی تکنیک نہیں آتی دوسرے لوگ واردات کے دوران اپنے اعصاب پر قابو نہیں رکھ پاتے لہذا یہ لوگ سیدھی گولی

چلا دیتے ہیں" اس نے بتایا "ماہرین صرف رقم کی مقدار اور واردات کے دوران زخمی ہونے والوں کی تعداد دیکھ کر ڈاکوؤں کے "کیلی بر" کا اندازہ لگا لیتے تھے کوئی بھی پروفیشنل ڈاکو لاکھوں سے کم کا ڈاکو نہیں ڈالتا وہ بدف پر باقاعدہ تحقیق کرتا ہے اور ہمیشہ اس دن واردات کرتا ہے جس دن بدف کے پاس ٹھیک خاک رقم جمع ہووے واردات کے دوران سیدھی گولی بھی نہیں چلاتا اور وہ کبھی پکڑا نہیں جاتا یہ گھنٹیا قسم کے پارٹ ٹائم ڈاکو ہوتے ہیں جو دس بیس ہزار روپے کیلئے واردات کرتے ہیں اور بندے بھی مار دیتے ہیں"

مجھے نہیں معلوم اس سابق ڈاکو کی بات کہاں تک درست تھی لیکن یہ بات حقیقت ہے پاکستان میں ڈاکوؤں کی ایک ایسی کلاس پیدا ہو چکی ہے جو دس بیس ہزار روپے کیلئے کسی بھی دقت اور کس بھی ڈاکو ال سکتی ہے اور اس واردات کے دوران اگر اسے ایک آدھ بندہ بھی مارنا پڑے تو وہ رو بلیغ نہیں کرتی سوال یہ ہے یہ ڈاکو کون ہیں میرا خیال ہے یہ ڈاکو اس ملک کے بے روزگار نوجوان بھی ہیں اور ضروریات زندگی اور مہنگائی کے ڈر سے ہوئے شریف شہری بھی یہ ڈاکو قلموں اور

ٹیلی ویژن چینلوں کے ٹرینڈ بھی ہیں اور متاثرہ بھی نہیں نے پچھلے دنوں ایک مظلومی رپورٹ پڑھی تھی اس سٹیڈی میں اگشتاف ہوا تھا شہری زندگی کا ایک بچہ بائیس ہوئے تک ٹیلی ویژن اور فلموں کے ذریعے اوسطاً 26 ہزار قتل دیکھ چکا ہوتا ہے یہ قتل یقیناً اس کی نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں شاید یہی وجہ ہے آپ کسی گھر کسی دکان پر جا کر دیکھ لیں آپ کو اس کے گیت پر ایک دو مسلح گارڈز ضرور ملیں گے یہ گارڈز کون ہیں اور یہ کیوں ہیں؟ یہ گارڈز اس معاشرے میں پر دان چڑھنے والا خوف ہیں یہ گارڈز ثابت کرتے ہیں ہمارا معاشرہ واردات کے خوف میں جھکا ہو چکا ہے لہذا اب ہمارے ملک میں صرف وہ شخص اطمینان سے سو سکتا ہے جس کے گیت پر دو گارڈ جاگ رہے ہیں میرا خیال ہے ہمارے معاشرے کو بے روزگاری مہنگائی میڈیا اور لاقانونیت تیزی سے اس موڑ کی طرف لے جا رہی ہے جس پر پہنچ کر انسان اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگتا ہے جس میں ہر دوسرا شخص قاتل اور ہر پہلا شخص ڈاکو بن جاتا ہے۔

یہ حالات کس نے ٹھیک کرنے ہیں؟ سیدھی ہی بات ہے اس صورتحال کو صرف حکومت سنبھال سکتی ہے لیکن آپ دلچسپ امر ملاحظہ کیجئے ہماری حکومت وانا اور بلوچستان میں تو اپنی "رٹ" قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہے اسے دزیرستان اور کوہلو میں تو اپنی رٹ پہنچتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اسے ڈاکوؤں کی وہ فوج دکھائی نہیں دیتی جو روز ملک کی ہر گلی ہر محلے ہر مکان اور ہر دکان

میں حکومت کی رٹ کو چیلنج کرتے ہیں، حکومت کے پاس اپنی کلیوں میں رٹ قائم کرنے کے لیے وقت ہے اور نہ ہی حکومت کا کوئی اہلکار ان ڈاکوؤں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے لہذا حکومت کی رٹ کا یہ عالم ہے آج ایس ایچ او تک سیکورٹی کی گاڑیوں اور مسلح سپاہیوں کے بغیر تھانے سے نہیں نکلتے، ہمارے آئی جی صاحبان کو بھی اپنی حفاظت کیلئے سو پچاس گاڑیوں کی ضرورت رہتی ہے اور حکومت کا کوئی وزیر سیکورٹی کور کے بغیر آفس نہیں جاتا، حالت یہ ہے لوگ روز ملتے ہیں لیکن کوئی شخص تھانے میں پرچہ درج نہیں کراتا کیونکہ لوگ انصاف اور قانون سے مایوس ہو چکے ہیں، وہ سمجھتے ہیں وہ رپٹ لکھوانے کے بعد مزید خوار ہو جائیں گے، یہ ہے ہماری ساری رٹ اور یہ ہے حکومت، ہم لوگ بھی عجیب ہیں، ہم امریکہ کو افغانستان اور عراق میں امن قائم کرنے کے مشورے تو دیتے ہیں لیکن ہمارا اپنا یہ عالم ہے ہمارا وزیر اعظم ایک عام شہری کی حیثیت سے شادی کی کسی تقریب میں نہیں جاسکتا، ہمارے ایس ایچ او صاحبان تک کی جیب کٹ جاتی ہے اور ہمارے بچوں تک کی گاڑیاں چوری ہو جاتی ہیں۔ ہم دنیا کے انتہائی دلچسپ لوگ ہیں، ہمیں وزیرستان اور کوہلو کے باغی تو نظر آتے ہیں لیکن ہم اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں امن قائم نہیں کر سکتے، ہم اپنے قریب و جوار کے ملکوں کو ڈاکوؤں اور چوروں سے نہیں بچا سکتے، یہ ہے ہماری رٹ اور یہ ہے ہماری حکومت۔



افسوس ہم نے ایک بار پھر ثابت کر دیا

مرزا طاہر حسین کی داستان میں بے شمار کہی اور ان کہی کہانیاں چھپی ہیں، طاہر حسین ایک سابق پاکستانی تھا، وہ اپنے خاندان کے ساتھ بڑا بڑا شہر لڈو میں رہتا تھا، وہ 17 دسمبر 1988ء کو راولپنڈی آیا، وہ چکوال میں اپنے رشتے داروں سے ملنے جا رہا تھا، راستے میں اس کی ٹیکسی ڈرائیور سے لڑائی ہو گئی، اس لڑائی میں ڈرائیور جشید خان ہلاک ہو گیا۔ طاہر حسین کا کہنا تھا جشید خان اور اس کے ساتھی نے اسے لوٹنے کی کوشش کی، اس نے مزاحمت کی جس کے نتیجے میں جشید خان اپنے ساتھی کے پستول سے مارا گیا، طاہر حسین نے ثبوت میں یہ جواز پیش کیا "میں نے جشید کی نعش اٹھائی، ٹیکسی میں رکھی اور نعش لے کر خود تھانے میں پیش ہو گیا، اگر میں گناہگار ہوتا تو میں جشید کی نعش جنگل میں پھینکتا اور وہاں سے فرار ہو جاتا" قصہ مختصر پولیس نے طاہر حسین کو گرفتار کر لیا، طاہر حسین کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور 1989ء میں سیشن کورٹ اسلام آباد نے اسے سزائے موت دے دی۔ طاہر حسین کے لواحقین نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی لیکن ملزم اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکا، مقدمہ شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ چلا گیا، دونوں عدالتوں نے اس کی سزا بحال رکھی، لواحقین نے 2005ء میں صدر سے رحم کی اپیل کی لیکن صدر نے بھی یہ درخواست مسترد کر دی جس کے بعد طاہر حسین کو مئی 2006ء کو پھانسی دینے کا فیصلہ ہو گیا، اس فیصلے تک پہنچتے پہنچتے طاہر حسین 18 برس قید کاٹ چکا تھا، طاہر حسین کے لواحقین نے صدر پرویز مشرف کو

مجرم کی سزا عمر قید میں بدلنے کی اپیل کی، طاہر حسین کے لواحقین نے برطانوی حکومت سے سفارش کی درخواست بھی کی، برطانوی حکومت نے یہ درخواست پاکستان میں اپنے ہائی کمیشن کو بھجوا دی، برطانیہ کے ہائی کمیشن نے درخواست لے کر صدر جنرل پرویز مشرف سے ملے، صدر نے طاہر حسین کی سزا پر عملدرآمد ایک ماہ کے لیے معطل کر دیا، اس دوران طاہر حسین کی داستان اخبارات تک پہنچی اور اخبارات نے طاہر حسین کے حق میں لکھنا شروع کر دیا، سزا کی معطلی کا دورانیہ ختم ہوا تو صدر نے اس میں ایک ماہ کی توسیع کر دی، اس دوران طاہر حسین کے بھائی مقبول جمشید کے لواحقین سے بھگوتے کی کوشش کرتے رہے، انہوں نے دو کروڑ روپے تک خون بہا دینے کی پیش کش کی لیکن مقبول کے لواحقین نے معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ صدر نے تیسری بار سزا معطل کر دی، طاہر حسین کے بعض جاننے والے مقبول کے گاؤں گئے اور خاندان کو مختلف ترغیبات دینے لگے لیکن وہ لوگ نہ مانے، صدر نے چوتھی بار پھانسی رکوا دی، اس دوران 29 اکتوبر 2006ء کو برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس اپنی اہلیہ کیلا پارکر کے ساتھ پاکستان آئے اور انہوں نے صدر پرویز مشرف سے مرزا طاہر حسین کی رہائی کی سفارش کی۔ اکتوبر 2006ء کے آخر میں برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیر نے مرزا طاہر حسین کیلئے صدر پرویز مشرف کو نئی فون کیا۔ برطانوی وزیراعظم نے 18 نومبر 2006ء کو تین روزہ دورے پر پاکستان آتا تھا اس دوران برطانوی میڈیا اور این جی اوز نے بھی پاکستان پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اب طاہر حسین کی پھانسی کے لیے نومبر کا مہینہ طے ہوا تھا، اکتوبر میں برطانوی وزیراعظم کے دورے کے سلسلے میں ہائی کمیشن کے عملے اور پاکستانی دفتر خارجہ میں ملاقاتیں شروع ہوئیں، ان ملاقاتوں کے دوران پاکستانی اہلکاروں کو محسوس ہوا توئی بلیر، اپنے دورے میں وزیراعظم شوکت عزیز اور صدر پرویز مشرف کے سامنے طاہر حسین کا مسئلہ اٹھائیں گے اور برطانوی وزیراعظم کی طرف سے دوسری بار سفارش سفارتی لحاظ سے ٹھیک نہیں ہوگی، صدر نے بھی صورتحال کی نزاکت کو محسوس کیا لہذا انہوں نے 15 نومبر 2006ء کو مرزا طاہر حسین کی پھانسی کو عمر قید میں بدل دیا۔ وزارت دفاع نے قید کے دنوں کا تخمینہ لگایا تو پتہ چلا طاہر حسین سزا کے دن پورے کر چکے ہیں چنانچہ 16 اور 17 نومبر کی درمیانی شب طاہر حسین کو برٹش ہائی کمیشن کے حوالے کر دیا گیا۔ برٹش ہائی کمیشن کا ایک اہلکار 17 نومبر کی صبح طاہر حسین کو لے کر برٹش ایئر لائن میں سوار ہو گیا یوں مرزا طاہر حسین 18 نومبر دوپہر ایک بج کر 15 منٹ پر ایٹمرو ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ ایٹمرو ایئر پورٹ پر ان کی تصویریں نہیں اور یہ تصویریں

دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوئیں، یہ تصویریں پاکستان کے اخبارات میں بھی چھپیں۔

مرزا طاہر حسین نہ صرف لیڈز میں اپنے خاندان کے پاس پہنچ چکے ہیں بلکہ وہ نئے سرے سے ایک خوبصورت اور محفوظ زندگی بھی شروع کر چکے ہیں۔ ان کی زندگی بچ گئی یہ فیصلہ اس لحاظ سے خوش آئند ہے لیکن جہاں تک طاہر حسین کے کیس کا معاملہ ہے تو یہ مقدمہ پاکستان کی دستوری، قانونی اور سفارتی زندگی پر بے شمار ایسے وجہ چھوڑ گیا ہے جن کو دھونے میں ہمیں مدتیں لگ جائیں گی اس کیس کا پہلا پہلو برطانوی حکومت کا رویہ تھا، برطانیہ نے ایک بار پھر دنیا پر اپنی اخلاقی برتری ثابت کر دی، برطانیہ نے ثابت کر دیا وہ اپنے شہریوں کے مسائل کو انتہائی سنجیدگی سے لیتے ہیں، وہ اپنے ایک مسلمان شہری کے لیے پرنس چارلس تک کو پاکستان بھجوا سکتے ہیں۔

دوسرا پہلو ہم نے دنیا پر ایک بار پھر اپنی قانونی، آئینی اور سفارتی کمزوری ثابت کر دی۔ ہم نے ثابت کر دیا ہم بیرونی دباؤ میں آخری حد تک جا سکتے ہیں، یقیناً ہماری حکومت کے پاس دوسرے اقدامات کی طرح اس فیصلے کے حق میں بھی بے شمار ٹھوس دلائل موجود ہوں گے لیکن سوال یہ ہے

اگر مرزا طاہر حسین پاکستان کے شہری ہوتے ان سے یہ جرم برطانیہ میں سرزد ہوتا اور وہ برطانوی

عدالتوں سے ہوتے ہوئے جمانی تک پہنچ جاتے تو کیا ہماری حکومت ان کے لیے بھی پرنس

چارلس اور نوٹی بلینز جتنی کوشش کرتی اور کیا ہماری ان کوششوں کے نتیجے میں برطانیہ انہیں رہا کر

دیتا؟ سوال یہ ہے اگر صدر پرویز مشرف یا وزیر اعظم شوکت عزیز برطانیہ کے دورے پر جاتے تو کیا

لندن میں ان کی لینڈنگ سے پہلے برطانوی حکومت مرزا طاہر حسین کو پاکستان بھجوادیتی؟ مجھے

یقین ہے ان تمام سوالوں کا جواب انکار ہے، ہم جانتے ہیں برطانیہ کبھی پاکستان کے لیے اپنا

قانون یا ضابطہ تبدیل نہ کرتا، ہم یہ بھی جانتے ہیں ہمارے اس مطالبے پر نوٹی بلینز بڑے آرام سے

کندھے اچکاتے اور سواری کہہ کر دوسری طرف منہ موڑ لیتے، اس وقت بھی برطانوی جیلوں میں سوا

دو سو امریکی جیلوں میں 190 پاکستانی موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کیا ہماری حکومت نے کبھی ان

قیدیوں کے لئے برطانوی حکومت سے بات کی؟ گوانتانامو بے میں اس وقت 29 پاکستانی مجبوس

ہیں، سوال یہ ہے کیا پاکستان نے کبھی ان پاکستانیوں کا مقدمہ لڑا؟ کیا پاکستان نے صدر بوش کے

دورے سے پہلے امریکہ سے یہ مطالبہ کیا تھا "جب تک آپ ہمارے ان قیدیوں کو رہا نہیں کرتے

اس وقت تک آپ پاکستان میں قدم نہیں رکھ سکتے" مجھے معلوم ہے ہم نے آج تک ایسا کیا اور نہ ہم

کبھی کریں گے کیونکہ ہم نے خود کو ایک غلام ریاست تسلیم کر لیا ہے لہذا ہم کبھی امریکہ کے احکامات

کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، کبھی سعودی عرب کو خوش کرنے کے لیے اپنی پالیسیاں تبدیل کرتے ہیں، کبھی برطانوی وزیر اعظم کو اپنے قانون اور ضابطوں کا تصدیق پیش کرتے ہیں اور کبھی چین کی خوشنودی کے لیے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم کبھی مشرق کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی مغرب کو لپٹائی نظروں سے نکلنے لگتے ہیں، ہم روز اپنے لیے نیا قبلہ تراشتے ہیں، ہم روز اپنے خدا بدلتے ہیں اور اس کے بعد شکوہ کرتے ہیں دنیا ہماری عزت نہیں کرتی، ہم ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں دنیا کبھی خادموں اور ملازموں کی عزت نہیں کیا کرتی، عزت کا آغاز ہمیشہ اپنی ذات سے ہوتا ہے، جو لوگ خود اپنی عزت نہیں کرتے دنیا کبھی ان کی عزت نہیں کیا کرتی، افسوس قدرت نے ہمیں خود کو بادقار اور عزت دار ثابت کرنے کا ایک موقع فراہم کیا تھا لیکن ہم نے یہ موقع بھی کھو دیا، ہم نے ایک بار پھر ثابت کر دیا، لالچ اور خوف ہماری قومی پالیسی ہے اور دنیا کا ہر دوسرا ملک ہماری اس پالیسی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

Kashif Azad@OneUrdu.com

اندھی آنکھوں کے خواب

یہ پانچ برس پہلے کا واقعہ ہے، اٹلی کے شہر میلان میں ایک ہسپتال کی عمارت گر گئی تھی۔ تحقیقات ہوئی، پتہ چلا عمارت کی تعمیر میں ٹائٹس سٹریل استعمال ہوا تھا، مزید تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا تعمیراتی کمپنی کی سمجھوتہ بھی اچھی نہیں تھی اس نے ماضی میں جتنی عمارتیں بنائی تھیں ان میں بھی تعمیراتی ٹائٹس پائے گئے تھے سوال پیدا ہوا پھر اس بدنام فرم کو ٹھیکہ کس نے دیا۔ انکشاف ہوا ٹاؤن میئر ٹھیکے میں ملوث تھا۔ کیس کارپوریشن مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ مجسٹریٹ نے میئر کو طلب کر لیا۔ سماعت ہوئی، جرم ثابت ہو گیا، مجسٹریٹ نے فیصلے کی تاریخ دے دی اس دوران میئر نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور فیصلے کے دن سے پہلے مجسٹریٹ کے چاؤلے کے احکامات آ گئے۔ مجسٹریٹ نے چارج چھوڑ دیا۔ عوام کو خبر ہوئی تو عوام سڑکوں پر آ گئے، ٹرانسپورٹ بند ہو گئی، شٹر ڈاؤن ہو گئے، تعلیمی اداروں میں پھنسی ہو گئی اور پورا میلان شہر جام ہو گیا، عوام کا ایک ہی مطالبہ تھا "ہمیں ہمارا مجسٹریٹ واپس چاہیے" میلان کے عوام کا خیال تھا جو مجسٹریٹ میئر کو عدالت میں بلا سکتا ہے وہ یقیناً ایک ٹڈی بے باک ایماندار اور شفاف جج ہے اور میلان شہر کو ایسا افسر نہیں کھونا چاہیے آنے والوں دنوں میں احتجاج اس قدر زور پکڑ گیا کہ حکومت کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا اس مجسٹریٹ نے دوبارہ اسی عدالت کا چارج سنبھالا، میئر کا کیس سنا اور عدالتی کارروائی کے بعد میئر کو باقاعدہ سزا سنائی۔

آپ یہ واقعہ سن کر ہرگز یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ اٹلی کوئی آئیڈیل ملک ہے وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں اور اس ملک میں تمام بکریاں اور شیر ایک ہی گھاٹ پر پیتے پلاتے ہیں اٹلی دراصل یورپ کا جنوبی ایشیا اور وسطی افریقہ ہے وہاں سیاسی کرپشن عروج پر ہے اور وہ جرائم میں تیسری دنیا کے جاہل ممالک کا مقابلہ کرتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ سیاسی جرائمیں اٹلی میں ہیں اور وہاں تیزی سے حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ اٹلی میں سیاسی رشوت ہارس ٹریڈنگ، اختیارات کا ناجائز استعمال، اقرباء پروری، لوٹ کھسوٹ اور کرپشن انتہا پر ہے پورا ملک مافیا کے کنٹرول میں ہے اور سرکاری ادارے اور حکومتیں پریشگر روپوں کے زیر اثر رہتی ہیں لیکن ان تمام قباحتوں کے باوجود اٹلی کے عوام بیدار مغز اور روشن ضمیر ہیں وہ اچھے اور برے کی تیز رکھتے ہیں وہ چاہتے ہیں اگر شہری اپنی 'ایمانداریت' کی حفاظت کر لیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کا مستقبل نہیں لوٹ سکتی لہذا اٹلی کا شمار دنیا کے ان ملکوں میں ہوتا ہے جن میں ہر ایماندار افسر کی نوکری اور عزت دونوں محفوظ ہیں اور اگر کوئی اتھارٹی، کوئی حکومت ان ایماندار افسروں پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کرے تو شہری فوراً سڑکوں پر آجاتے ہیں شاہد بیکار وہ ہے جس کے باعث اٹلی تمام تر کرپشن اور بد امنی کے باوجود معاشی اور سماجی لحاظ پر ترقی کر رہا ہے اور اس کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔ ہاتھ صرف اٹلی کی نہیں یہ ایک ناقابل تردید حجت ہے دنیا کے ہر ملک میں ایسے چند ہی لوگ ہوتے ہیں جن کی ان ٹیکریٹوں کا ایمان، جن کی مہارت اور جن کی ایمانداری شک و شبہ سے بالاتر ہوتی ہے۔ جنہیں دنیا کے سارے یکساں مل کر نہیں خرید سکتے اور جنہیں دنیا داری کا سارا بوجھ نہیں جھکا سکتا۔ اگر معاشرے، اگر ملک ان لوگوں کی حفاظت کر لیں، اگر ان کی عزت، ان کی حرمت، بچالیں تو وہ ملک، وہ معاشرے تباہ ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ اس وقت میرے دوست اور میرے عزیز تحریک عدم اعتماد کی ناکامی کا ماتم کر رہے ہیں میں ان کے اس دکھ، اس افسوس میں ان کے ساتھ ہوں لیکن میرا خیال ہے اس ملک، اس معاشرے میں تحریک عدم اعتماد کی ناکامی سے بڑے حادثے بھی ظہور پذیر ہو رہے ہیں یہاں بڑے بڑے سائے ہو رہے ہیں اور ہونے کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن ہمارے ضمیر پر جوں تک نہیں رہتی مثلاً آپ جنس طارق محمود کا کیس دیکھیں طارق محمود بلوچستان ہائی کورٹ کے جج تھے انہوں نے صدر پرویز مشرف کے ریفرنڈم سے اختلاف کیا، انکیشن کمیشن کی سینٹ چھوڑی، دباؤ بڑھا تو انہوں نے بلوچستان ہائی کورٹ سے بھی استعفیٰ دے دیا اس ملک، اس معاشرے میں جنس طارق محمود جیسے کتنے لوگ ہیں؟ کون ہے اس ملک میں

جس میں حکومت وقت سے اختلاف کی جرأت ہے؟ کون لوگ ہیں جو حکومتی اقدامات کی یوں مخالفت کی جرأت کرتے ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو اپنے موقف کی سچائی پر اپنی نوکری قربان کر دیتے ہیں؟ جسٹس طارق محمود کا اختلاف صحیح تھا یا غلط؟ آئینی تھا یا غیر آئینی اس سے کیا نظر انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا ایک سرکاری ملازم بھی حکومت سے اختلاف کا پورا پورا حق رکھتا ہے اور اسے بھی اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا حکومت ایسے قسمتی شخص کی قدر کرتی۔ ان سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کرتی لیکن حکومت نے ان کا استعفیٰ فوراً منظور کر لیا اس سے بھی کہیں افسوس ناک بات عوامی رویہ تھا۔ عوام کی طرف سے جسٹس طارق محمود کے حق میں کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ عوام جو ابرار الحق اور نصیبو مال کا گانا سننے کیلئے جمع ہو جاتے ہیں انہوں نے جسٹس طارق محمود پر استعفیٰ واپس لینے کیلئے دباؤ ڈالا اور نہ ہی حکومت کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور ملک میں کوئی تحریک چلی تھی اور نہ ہی احتجاج کا کوئی سلسلہ اگر اس وقت عوام جسٹس طارق محمود کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تو سوچنے ہمارے نظام میں موجود ان جیسے دوسرے لوگوں کی کتنی حوصلہ افزائی ہوتی۔ وہ لوگ جو اپنے ایمان کے چراغ کے گرد ہاتھوں کی دیوار بنائے بیٹھے ہیں ذرا سوچئے ان کے احساس ثباتی میں کمی کی آلی؟ کیا ان کے دلوں سے سفر رازبگاہ کا احساس ختم نہ ہو جاتا؟ ہماری تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں ہمارے سامنے کئی لوگوں نے اپنے ضمیر کے خلاف انتظامیہ کا ساتھ دینے سے انکار کیا لیکن لوگ کھڑے ہو کر ان کا تماشا دیکھتے رہے اور کسی شخص نے آگے بڑھ کر ان لوگوں کا ساتھ نہ دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اپریل 1999ء میں سرگودھا کی سول جج روبینہ سعید بگھی اور لاہور کے سول جج طاہر نعیم نے استعفیٰ دیئے تھے ان ججوں کا کہنا تھا ججوں کی تنخواہیں کم ہیں کرپشن بہت زیادہ ہے اور ہمارے رشتے دار بھی فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں لہذا ہمارے لئے انصاف کرنا ممکن نہیں میں اس دور میں ایسے لوگ تلاش کرتا رہا جو آگے بڑھ کر ان روشن ضمیر ججوں کا ساتھ دیتے جو ان کا حوصلہ بڑھاتے لیکن عوام کی طرف سے خاموشی رہی۔ اب یہ لوگ بھی کہیں برتن مانجھ رہے ہوں گے یا ٹیوشن پڑھا رہے ہوں گے۔

معاشرے تحریکوں اور ریلیوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں اگر ان میں زندگی موجود ہو تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں شکست نہیں دے سکتی مگر افسوس کا مقام ہے ہمارے معاشرے کی رگوں سے زندگی ہی خارج ہوتی جا رہی ہے لوگوں میں اچھائی کا ساتھ دینے کی جرأت ہی مرنی جا رہی

زیر و پوائنٹ 3 --- 0 --- 215

ہے اور یہ سچ ہے اگر معاشرے میں جائیں اگر لوگوں کی رگوں سے جرات ختم ہو جائے تو آپ تحفظ حقوق نسواں بل لے آئیں یا بل لوگ ایک ہی جواب دیں گے قبول ہے قبول ہے عوام مٹی کی طرح ہوتے ہیں مٹی اچھی اور صحت مند ہو تو فصلیں اور پودے بھی اچھے ہوتے ہیں لیکن ہم کتنے بے وقوف لوگ ہیں ہم عوام پر توجہ دینے کی بجائے اچھی اور مضبوط جمہوریت کے خواب بنتے ہیں ہم اندھی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہیں۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

بنیادی اصول

آرنلڈ شیواز گمر 30 جولائی 1947ء کو آسٹریا کے قصبے تھال میں پیدا ہوا وہ ایک مچھری پہلا ان تھا اس نے باڈی بلڈنگ شروع کی اور 20 سال کی عمر میں مسٹر یونیورسٹی بن گیا۔ وہ آسٹریا کی فوج میں بھرتی ہوا آسٹریا میں اس کا مستقبل بہت روشن تھا لیکن ایک دن اس نے امریکہ جانے کا فیصلہ کر لیا اس کے دوستوں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس کا کہنا تھا "مسٹر یونیورسٹی کو وہاں جانا چاہیے جہاں سے یونیورسٹی شروع ہوتی ہے" وہ امریکہ چلا گیا آرنلڈ شیواز گمر امریکہ پہنچا اور اس نے وہاں معمولی کاموں سے عملی زندگی کا آغاز کیا وہ ان کاموں سے ہوتا ہوا ہالی ووڈ پہنچ گیا 'ہالی ووڈ میں اسے "فرمنٹز" جیسی شہرہ آفاق فلم مل گئی فرمنٹز اپنے دور کی بین الاقوامی فلم ثابت ہوئی اس فلم سے آرنلڈ نے کروڑوں ڈالر کمائے اس فلم کے بعد اس کا شمار ہالی ووڈ کے سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے اداکاروں میں ہونے لگا اس کے گھر کے سامنے فلم سازوں کی لائنیں لگ گئیں 1986ء میں اس نے ماریا کے ساتھ شادی کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے دو بیٹیوں اور دو بیٹوں سے نوازا 2001ء تک وہ محض ایک اداکار اور سپر سٹار تھا لیکن اپریل 2001ء میں اس کی ملاقات کارل روڈ سے ہوئی کارل صدر بٹش کا سیاسی مشیر تھا کارل نے آرنلڈ کو مشورہ دیا "ہم لوگ کیلیفورنیا کے لئے نیا گورنر تیار کر رہے ہیں تم سیاست میں کیوں نہیں آ جاتے" آرنلڈ کیلئے یہ ایک حیران کن پیشکش تھی اس نے گھبرا کر جواب دیا "میں ایک باڈی بلڈر

اور ادا کار ہوں، کیا تم یہ سمجھتے ہو میں کیلیفورنیا جیسی بڑی ریاست چلا سکتا ہوں" کارل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولا "تجربہ کرنے میں کیا ہرج ہے" کارل نے تجربہ کیا، آرئلڈ کوری جیکسن پارٹی کے ٹکٹ پر کیلیفورنیا میں ایکشن لڑا اور وہ حیرت انگیز طریقے سے جیت گیا جس کے بعد 17 نومبر 2003ء کو اس کی زندگی نے ایک اور کوٹ لی، اس نے کیلیفورنیا کے گورنر کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور وہ اس ریاست کا "بادشاہ" بن گیا، جس میں اس نے مزدور کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا تھا۔

کیلیفورنیا نہ صرف امریکہ بلکہ دنیا کی امیر ترین ریاست ہے، کیلیفورنیا دنیا میں دولت کے لحاظ سے 5 ویں نمبر پر آتی ہے، پہلے نمبر پر امریکہ ہے، دوسرے نمبر پر جاپان، تیسرے نمبر پر جرمنی، چوتھے پر برطانیہ اور پانچویں نمبر پر کیلیفورنیا ہے، کیلیفورنیا کے بعد فرانس کا نمبر آتا ہے اور فرانس کے بعد باقی پوری دنیا، آپ نے اکثر ریاست کے اندر ریاست کا محاورہ سنا ہوگا، یہ محاورہ

کیلیفورنیا سے شروع ہوا تھا، کیلیفورنیا حقیقتاً ریاست کے اندر ایک منضبط ترین ریاست ہے، دنیا کی تین بڑی انڈسٹریاں قلم، لکیر اور جواہر کمانے کیلیفورنیا میں ہیں اور آرئلڈ شیوڈزنگر اس کیلیفورنیا

کا گورنر ہے، آرئلڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ دنیا کا واحد شخص ہے جو کانڈ کے ایک ٹکڑے پر دستخط کر کے ایک منٹ میں کسی بھی شخص کو ایک منٹ میں ارب پی بنا سکتا ہے، یہ پارلیمنٹ سے ایک قانون پاس کر کے سینکڑوں ارب پیوں کو فٹ پاتھ پر بھی لاسکتا ہے۔ آرئلڈ 21 ویں صدی کا قارون بھی کہلاتا ہے، اسے دنیا کے طاقتور ترین انسان کا خطاب بھی مل چکا ہے مگر دنیا کے اس طاقتور ترین انسان کے ساتھ جنوری 2006ء میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جنوری کے آخر میں اس نے اپنی "ہارلے ڈیوڈسن" موٹر سائیکل نکالی، موٹر سائیکل کے ساتھ چھوٹی نرالی گاٹی، اس نرالی میں اپنے 13 سالہ بیٹے پیٹرک کو بٹھایا اور سیر پر نکل گیا، سیر کے دوران اس کی موٹر سائیکل دیوار سے ٹکرائی، آرئلڈ اور اس کا بیٹا شدید زخمی ہو گئے، پولیس فوراً موقع پر پہنچ گئی، کیلیفورنیا کے قانون کے مطابق آرئلڈ سے ڈرائیونگ لائسنس طلب کیا گیا، گورنر نے پولیس کو لائسنس پیش کر دیا۔ لائسنس دیکھنے کے بعد سار جٹ نے گورنر کو سیلٹ کیا اور اس سے عرض کیا "سر یہ گاڑی کا لائسنس ہے آپ اس لائسنس پر موٹر سائیکل نہیں چلا سکتے" آرئلڈ گھبرا گیا اور اس نے گھبرا کر پوچھا "اب کیا ہوگا" سار جٹ نے جواب دیا "میں آپ کو گرفتار کروں گا، کوٹ میں پیش کروں گا اور کوٹ آپ کے بارے میں فیصلہ کرے گی" آرئلڈ نے فوراً سنے دیکل کو طلب کرنا، کیلا، نر...

کر صورت حال کا جائزہ لیا اور اس کے بعد پولیس کو سمجھا یا جب یہ حادثہ ہوا تھا اس وقت موٹر سائیکل کے ساتھ ٹرائی بندھی تھی اور قانون کے مطابق کیلیفورنیا میں گاڑی کا لائسنس رکھنے والا شہری تین اور تین سے زیادہ پہیوں والی گاڑی چلا سکتا ہے۔ ٹرائی کی وجہ سے موٹر سائیکل تین پہیوں والی گاڑی بن گئی تھی۔ وکیل کا موقف درست تھا لہذا پولیس نے آرٹنڈ کو وارننگ دے کر چھوڑ دیا۔ آرٹنڈ کا خیال تھا اگر اس دن اس کی موٹر سائیکل کے ساتھ ٹرائی نہ ہوتی تو وہ پہلے دن جیل میں ہوتا اور دوسرے دن اس کی گورنری ختم ہو جاتی، آرٹنڈ نے اگلے ہی دن موٹر سائیکل کے لائسنس کے لئے اپائی کر دیا، جنوری سے جولائی تک پولیس نے چھ ماہ اس کے جسامتی 'ڈینی اور تحریری ٹیسٹ لئے' اس کی 'ڈرائیونگ سکل' دیکھی اور 9 جولائی 2006ء کو اسے موٹر سائیکل چلانے کا لائسنس دے دیا۔

میں نے گزشتہ روز امریکہ کے ایک اخبار میں آرٹنڈ کی تصویر دیکھی، آرٹنڈ کے ہائیں ہاتھ میں ڈرائیونگ لائسنس تھا اور وہ کاغذی نامہ امتحان سے کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا، میں نے تصویر دیکھ کر مسکرائے، اٹھا میرے ساتھ میرے ایک دوست بیٹھے تھے انہوں نے مسکرائے کی وجہ پوچھی تو میں نے انہیں جواب دیا "یہ تصویر بتاتی ہے امریکہ آج سپر پادریوں ہے" وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے، میں نے عرض کیا "اول امریکہ کا طاقتور ترین انسان بھی ڈرائیونگ لائسنس کے بغیر موٹر سائیکل نہیں چلا سکتا، دوم کیلیفورنیا کے گورنر کو بھی تحریری 'زبانی اور عملی ٹیسٹ کے بغیر لائسنس نہیں ملتا اور سوم اگر اس ایجنسی کے ایک عام شہری کو چھ ماہ میں لائسنس ملتا ہے تو گورنر کو بھی لائسنس کیلئے چھ ماہ انتظار کرنا پڑتا ہے" میرے دوست خاموشی سے سنتے رہے، میں نے عرض کیا "آپ یہ تصویر دیکھیں اور اس کے بعد اپنے حکمرانوں کا پروفائل نکالیں، پاکستان کی کابینہ کے 40 ارکان کے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے لیکن یہ لوگ روزگاری چلاتے ہیں اور آج تک پولیس کے کسی اہلکار کو انہیں روکنے اور ان سے لائسنس طلب کرنے کی جرأت نہیں ہوتی" میں نے عرض کیا "اور اگر یہ لوگ لائسنس بنوانا چاہیں تو مجھے یقین ہے پولیس آدھ گھنٹے میں لائسنس لے کر ان کے گھر حاضر ہو جائے گی اور اگر یہ لوگ موٹر سائیکل کے لائسنس پر ہوائی جہاز چلانا چاہیں تو بھی انہیں کوئی شخص نہیں روکے گا" میں نے عرض کیا "قانون وہ بنیادی اصول ہوتا ہے جو جمونے جمونے میں تبدیل ہو کر رہتا ہے، جیسے شہروں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو کیلیفورنیا جیسی امیر ترین سٹیٹس میں تبدیل کر کے رکھنا، مستحق طور پر یہ قانون اور راز کا... ہونا اس قدر کا

زیر پبائٹ 3.....0.....219

وہ کنار اور زمین کا وہ کونا ہوتا ہے جہاں سے آنے والے کھل کے سورج طلوع ہوتے ہیں، جہاں سے تو میں اور ان کے آنے والے دن جنم لیتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ہمارے ملک میں ایسا کوئی کونا ایسا کوئی کنار اور ایسی کوئی چوٹی نہیں جہاں سے ہمارا کھل طلوع ہو سکے، ہماری بنیادوں میں اصول اور قانون کا کوئی ایسا پتھر، کوئی ایسی اینٹ بھی نہیں جس پر ہم ترقی اور خوشحالی کی عمارت تعمیر کر سکیں۔ میرا دوست خاموشی سے سنتا رہا، میں نے عرض کیا "کاش میں آرمینڈ کی یہ تصویر پاکستان کے ہر با اختیار شخص کی میز پر رکھ سکوں اور اس کے بعد اس سے عرض کر سکوں" حضور جس طرح اہتیلی پر گنا نہیں اگایا جاسکتا بلکہ اسی طرح قانون کے بغیر زمین کے کسی ٹکڑے کو ملک دس میں کر دے لوگوں کے ہجوم کو قوم اور 200 قوموں کو اچھی قوم نہیں بنایا جاسکتا، میں نے عرض کیا "کاش میں نہیں بتا سکوں، ہم کچھ سے کی کوکھ سے ہاتھی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"



Kashif Azad@OneUrdu.com

قانون

ایوب خان کے دور میں چند چینی ماہرین کا ایک وفد پاکستان کے دورے پر آیا۔ اسے لوگ دواہ کے آڈیو ٹیپس کی پیشکش کی تھی، کیونکہ اس وقت فریڈیا بنا تھا، دورے کے دوران انہوں نے ایک چھت پگتی پائی وفد کا ایک رکن یہ دیکھ کر جس پڑا میزبان معاملہ بھانپ گیا لہذا اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا "چھت نئی نئی ہے ہم فالت سٹاش کر رہے ہیں" مہمان نے تہنیت لگایا اور پورے اعتماد سے بولا "شروع شروع میں ہماری چھتیں بھی چھتی تھیں پھر ہم نے ایک ٹھیکیدار کو گولی ماری اس کے بعد چھت نئی ہو یا پرانی کبھی نہیں پگتی" یہ چینی مثال ہے۔ آپ سعودی عرب کو لیجئے پورے ملک میں جب اذان ہوتی ہے تو تمام دکاندار اپنی دکان میں اپنی درکشاپیں اور اپنے دفتر کھلے چھوڑ کر مسجد چلے جاتے ہیں، سرائوں کی دکانیں سونے اور جوہریوں کے شوکیس جو اہرات سے بھرے ہوتے ہیں لیکن مجال ہے کوئی ان کی طرف نظر ہی آکھ سے بھی دیکھ لے کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں اگر اس ملک میں کوئی شخص چوری کرتے ہوئے پکڑ جائے تو اگلے جمعہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ چوری کے معاملے میں ہمیں کے قوانین زیادہ سخت ہیں وہاں چور کو موت کی سزا دی جاتی ہے اور موت بھی بڑی بھیا تک۔ چور کے سر میں گولی ماری جاتی ہے اور جب لو اتھین فٹس لینے آتے ہیں تو انہیں پہلے اس گولی کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

چوری دنیا جرم و سزا کے معاملے میں اس بات پر متفق ہے سزا کا طویل یا خوفناک ہونا تاکہ

ضروری نہیں ہوتا جتنا ضروری اس کا قطعی ہونا ہے مثلاً آپ کسی معاشرے میں سرعام کھانے کی سزا موت رکھ دیں لیکن اس سزا پر عملدرآمد نہ ہو تو آپ اس کا نتیجہ خود ملاحظہ کر لیں گے سارا شہر کھانسا رہے گا جبکہ اس کے برعکس آپ اس "جرم" کی سزا چھ ماہ طے کر دیں لیکن مجرم کو مظلوم ہو جس دن اس سے یہ جرم سرزد ہو گا دنیا کی کوئی طاقت اسے سزا سے نہیں بچا سکے گی آپ دیکھ لیجئے گا چھ ماہ کی یہ سزا پھانسی سے زیادہ پراثر ثابت ہوگی۔ یہ بھی حقیقت ہے جن معاشروں میں سزاؤں پر عملدرآمد کمزور ہوتا ہے جن میں انصاف میں تاخیر اور تفتیشی نظام کرپٹ ہوتا ہے ان معاشروں میں آپ سزائیں جتنی چاہیں طویل اور قانون جتنا چاہیں مضبوط بنا دیں وہاں جرم نہیں رک سکتے کیونکہ ان معاشروں کا مجرم یہ جانتا ہے وہ رشوت اور سفارش کے ذریعے سزا سے بچ جائے گا وہ جانتا ہے اگر اسے سفارش نمل سکی تو بھی وہ عدالتی نظام کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا لے گا اسے وکیل بچالیں گے چنانچہ پاکستان جیسے تمام معاشروں تمام ممالک میں ہر سال نئی نئی جیلوں نئی عدالتوں اور نئے ججوں کی ضرورت پیش آ جاتی ہے معاشرے میں انصاف کی ضرورت بڑھ جاتی ہے لیکن انصاف نہیں ہوتا آپ اس معاشرے میں جہاں تک کر دیکھیں اس کا تفصیل سے جائزہ لیں یہاں ڈکیتی کی سزاؤں میں اضافہ ہوا آبدور بڑی اور دشمنگری کیلئے نئی سزائیں اور نئی عدالتیں نہیں لیکن ہر آنے والا دن ان جرائم میں اضافے کی خبر لے کر طلوع ہوا۔ کیوں؟ کبھی کسی نے سوچا بات بہت سادا اور عام فہم ہے ہم سزاؤں میں تو اضافہ کر دیتے ہیں نئی عدالتیں اور نئے قانون بھی بنا دیتے ہیں لیکن ہم سزاؤں پر عملدرآمد کا نظام نہیں بناتے قانون کو اٹل قطعی اور سب کیلئے یکساں بنانے کی کوشش نہیں کرتے لہذا ہمارا ہر مجرم یہ سمجھتا ہے قانون کوئی بھی ہو سزا خواہ کتنی بھی سخت ہو اس نے بلا خرچہ موٹ جانا ہے چنانچہ وہ جرم پر جرم کرتا چلا جاتا ہے۔

آپ ملاوٹ کو لہجے میر ظفر اللہ جمالی صاحب کی حکومت نے ادویات اور کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ کرنے والوں کیلئے 25 سال قید جائیداد کی قرتی اور لائسنس ضبط کرنے کی منگوری دی تھی اس معاشرے کیلئے یہ قانون اور یہ سزا بہت ضروری تھی کیونکہ جتنی ملاوٹ اس ملک میں ہوتی ہے شاید ہی دنیا کے کسی ملک کسی معاشرے میں ہوتی ہو۔ اس ملک میں اسپرین تک خالص نہیں ملتی۔ میں شوگر کا مریض ہوں میں ہر مہینے امریکہ سے دو انیس منگوا کر لاتا تھا کیونکہ میں

جب بھی پاکستانی برانڈ استعمال کرتا تھا تو میری شوگر آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتی تھی میں سوچتا تھا کیا یہ ظلم نہیں ایک ہی برانڈ ایک ہی کمپنی کی دوا امریکہ میں کچھ ہے اور پاکستان میں کچھ ہمارے ملک میں چائے کی پتی سے کیکر کا برادہ 'سرج' کے پاؤڈر سے رنگا ہوا بورا ڈال سے پلاسٹک کے باریک دانے اور ہلدی سے پیلا رنگ برآمد ہوتا ہے ہمارے ملک میں گوشت ناخالص ہوتا ہے آنے اور گھی میں ملاوٹ ہوتی ہے ہمارے ملک کے 'ٹیکے' گولیاں اور کپسول خالی ہوتے ہیں ہمارے ملک میں دودھ کا ایک گلاس تک صاف سٹرا نہیں ملتا 'پاکستان میں آپ کسی پرانی دوا خانے کی کوئی مشہور دوا نہیں کراہیجئے۔ آپ کو اس میں "شیرائزڈ" ملیں گے۔ اس ملک میں ہزاروں لاکھوں ایسے دوا خانے ہیں جو رجسٹر ہیں اور نہ ہی ان کی ادویات لیکن ان کے کارخانے بھی موجود ہیں 'سٹورڈ بھی ہیں اور ترسیل کا نظام بھی ہے۔ آپ پورے ملک کا دورہ کریں آپ کو ہر دو فٹ بعد کسی نہ کسی دوا یا کسی نہ کسی حاذق طبیب کا بورڈ ملے گا۔ یہ کون لوگ ہیں اور انہیں کس نے یہ دھندہ کرنے کی اجازت دی ہے اور ان کی ادویات میں کون کون سے اجزاء ہیں۔ آج تک کسی نے دیکھا اور بندھی کسی نے سوچا پاکستان کے سوا دنیا میں کون سا ملک ہے جس میں اس کا دوا بارکی گنجائش موجود ہے۔ یہ اعزاز صرف ہمارے ملک کو حاصل ہے ہمارے ملک میں گولوں کے برتنوں سے سینڈک برآمد ہوتے ہیں اور اس میں خراب بدبودار اور مضر صحت مند مہیں کر لوگوں کو کھلا دی جاتی ہے لہذا اس ملک کو ملاوٹ ایکٹ کی بڑی ضرورت تھی 'جمالی صاحب نے جب اس ایکٹ کا اعلان کیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے اس قانون کو خوش آمدید کہا تھا 'میں یہ سمجھتا تھا ملاوٹ کے مجرموں کے لئے 25 سال کی سزا بھی کم ہے لیکن بات پھر وہی نکلی اس قانون پر بھی عملدرآمد نہ ہوا لہذا آج اس قانون کو پاس ہونے تین برس گزر چکے ہیں لیکن تاحال 15 کروڑ لوگوں کے اس ملک میں ایک بھی "ملاوٹیا" گرفتار نہیں ہوا۔ قانون بن چکا ہے اعلان بھی ہو چکا ہے لیکن ملاوٹ کا کاروبار بھی اسی طرح جاری ہے مجھے یقین ہے اس ملک میں ملاوٹ کا کاروبار آئندہ بھی جاری رہے گا کیونکہ اس ملک کے ملاوٹینے جانتے ہیں سزا 25 سال ہو یا 225 سال اس ملک میں کوئی شخص ان پر ہاتھ نہیں ڈالے گا اور اگر کسی غلطی سے ان پر کوئی ہاتھ اٹھ بھی گیا تو وہ دس بیس پچاس ہزار روپے خرچ کریں گے اور اگلے ہی روز اپنے تھڑے اپنے چہرے پر بیٹھے ہوں گے۔ یہ ہے قانون اور اس کی اصل پوزیشن 'میں نے چند روز پہلے اخبارات میں چیف

www.paksociety.com

جسٹس آف پاکستان جناب انصار محمد چودھری کا ایک بیان پڑھا تھا انہوں نے زیر تربیت ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن ججوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا 'انصاف کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کیا جائے' میں نے بے اختیار سوچا اس ملک میں عدالتیں اور جج ہیں لیکن انصاف نہیں! قانون ہے لیکن قانون کا خوف نہیں! میں نے سوچا 'قانون اور سزاؤں کا خوف وہاں ہوتا ہے جہاں سزائیں دی جاتی ہیں جس ملک میں قانون بھولنے کیلئے بنائے جاتے ہوں اور سزائیں کتابوں میں رکھنے کیلئے وہاں سزائیں اور قانون کیا حیثیت رکھتے ہیں! وہاں انصاف کون کرے گا۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

کاش ملک کی ساری عدالتیں ایسی ہو جائیں

دنیا میں کیسپس کا تصور انگریزوں نے دیا تھا، وہ جب تعلیمی ادارے بناتے تھے تو ان میں دو باتوں کا خاص خیال رکھتے تھے وہ ایک ان کے تعلیمی ادارے شہر سے باہر ہوتے تھے انگریزوں کا خیال تھا شہر میں کمرشل اڈم ہونا ہے شہر میں ہنگامہ ریش اور پالوشن بھی ہونا ہے اور یہ تمام چیزیں طالب علموں کی کارکردگی کو متاثر کرتی ہیں، دو وہ تعلیمی اداروں کو سب سے زیادہ رقبہ دیتے تھے وہ سکول اور کالج میں بے شمار لان، گارڈن اور کھیل کے میدان بناتے تھے انگریز کے تعلیمی ادارے مختلف بلاکوں میں منقسم ہوتے تھے اور ان بلاکوں کے درمیان لان، گارڈن اور فوارے ہوتے تھے انگریزوں کا کہنا تھا کیسپس کی وسعت طالب علموں کا ذہنی اتق و وسیع کرتی ہے اور یہ ان کی صلاحیتوں میں بھی اضافہ کرتی ہے، دوسرا ان کا خیال تھا وقت گزرنے کے ساتھ تعلیمی اداروں کی ضروریات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ان میں طالب علموں کی تعداد بڑھ جاتی ہے، یہ "اپ گریڈ" ہوتے رہتے ہیں، سکول ہائر سکینڈری سکول اور کالج، یونیورسٹیاں بن جاتے ہیں لہذا جب یہ اپ گریڈ ہوتے ہیں تو انہیں زیادہ زمین اور زیادہ رقبے کی ضرورت پڑتی ہے، ان کا خیال تھا جب ان کے تعلیمی ادارے "اپ گریڈیشن" کے مرحلے پر پہنچیں تو ان کے پاس زمین کی کمی نہ ہو، انہیں نئی عمارتیں بنانے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے، چنانچہ آج آپ پاکستان میں انگریز کے بنائے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں دیکھ لیں آپ کو ان میں یہ دونوں خوبیاں ملیں گی۔

انگریز نے اس خطے کے ہر قبیلے، ہر شہر اور ہر ضلعی ہیڈ کوارٹر میں کوئی نہ کوئی تعلیمی ادارہ بنایا تھا۔ یہ تمام تعلیمی ادارے شہروں سے باہر بنائے گئے تھے لیکن آبادی میں اضافے کے باعث شہر پھیلنے لگے یہاں تک کہ ان 60 برسوں میں زیادہ تر تعلیمی ادارے شہروں کے درمیان آ گئے ان تعلیمی اداروں کے ارد گرد کمرشل ازم کا دریا بہا اور ان تعلیمی اداروں کی زمینیں "پرائم لینڈ" کا درجہ اختیار کر گئیں پاکستان میں جب پلاٹ کا مرض ابھر اور قبرستان تک پلاٹ بن کر بک گئے تو اس سوچ نے پاکستان میں ایک نیا طبقہ پیدا کیا اس طبقے کا نام لینڈ مافیا تھا اس مافیاء نے سرکاری زمینوں پر قبضہ شروع کر دیا تعلیمی ادارے ان لوگوں کا سب سے بڑا ہدف تھے اس کی وجہ سے تعلیمی اداروں کی "تیمی" تھی، پاکستان میں تعلیم اور تعلیمی اداروں دونوں کا کوئی والی وارث نہیں چنانچہ پاکستان کے زیادہ تر تعلیمی اداروں کی زمینوں پر لینڈ مافیا قابض ہو چکا ہے، ان اداروں میں چکوال کا کالج بھی شامل ہے۔ چکوال کے پوسٹ گریجویٹ کالج کی "فرنٹ سائیز" چکوال کی مین سڑک پر آتی تھی یہ سائیز کروڑوں روپے مالیت کی تھی چکوال کی سیاسی انتظامیہ اس زمین کی قدر و قیمت سے واقف تھی لہذا اس نے کالج کی 300 کنال جگہ پر قبضے کا فیصلہ کیا یہ لوگ اس جگہ 180 دکانیں اور ان دکانوں پر فلٹنس بنانا چاہتے تھے سیاسی انتظامیہ نے اس منصوبے کی اجازت کیلئے پنجاب گورنمنٹ کو لکھا پنجاب گورنمنٹ نے جنوری 2006ء کو انہیں اجازت دے دی حکومت نے محکمہ تعلیم کو بھی اس فیصلے سے مطلع کر دیا اس تحریری اجازت کے بعد چکوال کے تحصیل ناظم نے کالج کی "ہاء ٹیری وال" توڑ دی کالج کے لیکچراروں اور پروفیسروں نے اس واقعہ پر احتجاج شروع کر دیا انہوں نے ضلعی انتظامیہ کے خلاف ایک قرارداد مذمت پاس کی یہ قرارداد اور پروفیسروں کا احتجاج اخبارات میں شائع ہونے لگا انہما دونوں انگریزی کے ایک معاصر اخبار "ڈان" میں اس واقعے کے بارے میں ممتاز کالم نگار ایذا میر نے کالم بھی لکھا، یہ کالم چیف جسٹس آف پاکستان جناب افتخار محمد چودھری کی نظروں سے گزرا انہوں نے اسی وقت "سوسائٹی ایکشن" لے لیا سپریم کورٹ نے چکوال کے ناظم غلام عباس تحصیل ناظم اور ڈی سی اوسیت تمام متعلقہ حکام کو عدالت میں طلب کر لیا یہ حضرات 5 مئی کو سپریم کورٹ میں حاضر ہوئے چیف جسٹس نے انہیں 300 کنال جگہ کالج کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا ضلعی ناظم نے اسی وقت عدالت سے معذرت کی اور وہ دکانوں اور فلٹنس کے منصوبے سے دستبردار ہو گئے اس کے بعد چیف جسٹس نے بڑے جارحی ریمارکس دینے چیف جسٹس نے فرمایا "تعلیمی ادارے کمرشل

مقاصد کیلئے استعمال نہیں کیے جاسکتے، تعلیم کی فراہمی اور تعلیمی ادارے کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے آپ اپنی آنے والی نسلوں کو کیا دینا چاہتے ہیں اگر آپ تعلیمی اداروں کی جگہ کاروبار کیلئے استعمال کریں گے تو وہاں کاروبار ہوگا وہاں ہوش نہیں گے وہاں نشیات بھی فروخت ہوں گی جس کے بعد وہاں تعلیمی ماحول برقرار نہیں رہ سکے گا" یہ ریڈارکس 6 مئی 2006ء کو روزنامہ جنگ سمیت تمام اخبارات میں شائع ہوئے۔

سپریم کورٹ کے اس حکم کے بعد شاید پاکستان کے وہ تمام تعلیمی ادارے بچ جائیں جن کی زمینیں بدقسمتی سے شہر میں آگئی تھیں اور ان پر شہروں کے ناظم اور ان کے پروردہ مافیا نظریں جمائے بیٹھے تھے یہ لوگ کس قدر سنگدل اور خوفناک ہیں اس کا اندازہ آپ کو چھوٹے اضلاع اور چھوٹے شہروں میں جا کر ہوتا ہے یہ لوگ مسجدیں، درگاہیں اور قبرستان تک بچے ہیں ہر سال یہ لوگ قبروں پر ٹریکٹر چلاتے ہیں اور اس کے بعد ان پر دکانیں بنا کر کروڑوں روپے سمیت لیتے ہیں ان لوگوں کی دست برو سے سرکاری زمینیں تک محفوظ نہیں ہیں انہوں نے کوئی سکول چھوڑا، نہ ہسپتال اور نہ ہی کوئی کھیل کا میدان، سکول اور کالج ان لوگوں کا خصوصی ہدف ہوتے ہیں، مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے مگر اور وہ ہزاری شہر میں بھی کالجوں کی زمینوں کے ساتھ یہ سلوک ہو چکا ہے ہاں چکوال کی سیاسی انتظامیہ پوسٹ گریجویٹ کالج کے ساتھ کرنا چاہتی تھی میں اس ایکشن پر سپریم کورٹ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، جب سے جنس انفارمیشن چودھری سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بنے ہیں اور انہوں نے عام اور غریب لوگوں کے مسائل پر سوشل ایکشن لینے شروع کیے ہیں یقین کیجیے لوگوں کے دل میں عدالتوں کا احترام بھرا گزرا ہے لینے لگا ہے لوگوں کی عدالتوں کے ساتھ ایک بار پھر توقعات وابستہ ہونے لگی ہیں اور مجھ تک جا کہ کایس ہو شادی بیاہ کے کھانوں کا مسئلہ ہو ذوقی اور سوارہ کی رسم ہو یا پھر سپریم جوڈیشل کونسل کا معاملہ چیف جسٹس کے سوشل ایکشن نے عوام کے دل میں عدالت کی محبت اور احترام میں اضافہ کیا، چیف جسٹس صاحب ٹیلی ویژن اخبارات اور عوام کی عام درخواستوں تک پر سوشل ایکشن لیتے ہیں وہ اسی وقت غلطی کی ساری سرکاری مشینری کو عدالت میں طلب کر لیتے ہیں ان کے یہ اقدامات بیوروکریسی کے مزاج میں بہت بڑی تبدیلی لارہے ہیں، مجھے ایک ڈی آئی جی بتا رہے تھے آج جب اخبار میں کسی جرم یا زیادتی کے بارے میں کوئی خبر شائع ہوتی ہے تو ہم لوگ فوراً خوفزدہ ہو جاتے ہیں ہمیں معلوم ہوتا ہے ابھی ہمیں سپریم کورٹ سے ٹیلی فون آجائے گا جس کے بعد ہمارے لئے نوکری بچانا مشکل ہو جائے گا ڈی

آئی جی کا یہ اعتراف میرے لیے ایک کھلمکھٹ تھا، اس وقت میں نے دل سے دعا کی اللہ کرے ہماری عدلیہ کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے، سو سو نو ایکشن کی یہ روایت اعلیٰ عدالت سے لوئر کورٹس تک جائے اور اس ملک کے تمام بیج اسی سپرٹ اور اسی جذبے کے تحت کام کریں تاکہ پاکستان میں وہ وقت آجائے جب کوئی مجرم جرم کرنے سے پہلے ہزار بار یہ سوچے اس ملک کے بیج اور اس ملک کی عدالتیں جاگ رہی ہیں اور اگر میں نے یہ جرم کیا تو میں ان جاگتی عدالتوں اور ان بیدار ججوں سے بیخ نہیں پاؤں گا؟ مجرم جرم کرنے سے پہلے ہزار بار سوچے اگر اس نے جرم کیا تو اسے پورے ملک میں کوئی ایسی جگہ کوئی ایسا مقام نہیں ملے گا جہاں چھپ کر وہ عدالتوں اور ججوں سے اوجھل ہو سکے گا۔ میرے دل سے دعا نکلی کاش ہمارے ملک میں ایسا وقت آجائے جب اس ملک کے تمام مجرم یہ یقین کر لیں وہ جرم کے بعد قانون اور انصاف سے نہیں بچ سکیں گے، وہ حساب دیئے بغیر اس زمین پر نہیں رہ سکیں گے، کاش اس ملک میں ایسا وقت آجائے کاش ہماری ساری عدالتیں ایسی ہو جائیں۔

Kashif Azad@OneUrdu.com

بُرا قانون

میں نے کارڈ کھول کر دیکھا، کارڈ پر چلی حروف میں "حقیقہ" لکھا تھا، میں نے حیرت سے قریشی صاحب کی طرف دیکھا، وہ مسکرا کر بولے "آج کل ہونٹوں میں ویسے بڑا چندی ہے، پولیس چھاپے مارتی رہتی ہے چنانچہ میں نے بیٹے کی دعوت و لیسر اور نواسے کا حقیقہ اکٹھا کر دیا، ہم لوگ کارڈ حقیقہ کے تقسیم کر رہے ہیں لیکن دعوت ویسے کی دے رہے ہیں" میں نے عرض کیا "جناب آپ کو اس لمبی چوڑی منصوبہ بندی کی کیا ضرورت تھی آپ چپ چاپ قانون پر عملدرآمد کریں، لوگوں کو ایک کولڈ ڈرنک چائے یا سوپ پلائیں، خود بھی پریشانی سے بچیں اور دوسروں کو بھی کوفت سے بچائیں" قریشی صاحب مسکرائے "آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن میں ذات برادری والا آدمی ہوں، مجھے قانون کے ساتھ ساتھ دس دوسری چیزوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے، جنید میرا اکلوتا بیٹا ہے، میرے پاس اللہ تعالیٰ کا دیا بہت کچھ ہے لہذا میں ایک بھر پور و لیسر انورڈ کر سکتا ہوں" میں نے ان سے عرض کیا "آپ ویسے کی رقم کسی ضرورت مند کو دے دیں آپ کو ثواب بھی ہوگا اور آپ قانون توڑنے کی سخت سے بھی بچ جائیں گے" قریشی صاحب نے فوراً فرمایا "میں ہر سال کروڑوں روپے کی چیرٹی کرتا ہوں، میں نے تین ٹرسٹ بنا رکھے ہیں، بیٹے کی شادی سے پہلے میں نے بیس غریب لڑکیوں کی شادیاں کرائی تھیں، میں اس چیرٹی کے باوجود بیٹے کا و لیسر انورڈ کر سکتا ہوں لہذا تم خود بتاؤ، اب میں کیا کروں" میرے پاس ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اگر ہم شادی کی تقریبات کے بارے میں تحقیق کریں تو ہمیں محسوس ہوگا یہ تقریبات ہماری ثقافت ہماری روایات کا حصہ ہیں یہ روایات اس خطے میں پانچ چھ ہزار سال سے چلی آ رہی ہیں آپ برصغیر پاک و ہند کے ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی شادیوں کا جائزہ لیں آپ کو ان تمام مذاہب کی شادیوں میں بے شمار رسمیں "کامن" ملیں گی یہ نظیر اور روایات کی یکسانیت ہے اس خطے میں جب بھی کسی گھر میں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس کی ماں اس کا جینز بنانا شروع کر دیتی ہے اسی طرح جب بھی لڑکے کے ماں باپ بہو کی تلاش میں نکلتے ہیں تو وہ لڑکی والے کی حیثیت ضرور دیکھتے ہیں وہ عموماً جینز کی توقع بھی رکھتے ہیں یہ عادت والد پے سے لے کر جلال آباد تک لوگوں میں "کامن" ہے اور اس خطے میں پانچ چھ ہزار سال سے لوگ لڑکے کی پیدائش پر خوشیاں مناتے اور لڑکیوں کے جنم پر سنجیدہ ہو آ رہے ہیں یہ روایات اس خطے کی جڑوں میں اس خطے کی بنیادوں میں موجود ہیں اور پچھلے پانچ چھ ہزار سال میں دنیا کی کوئی طاقت انہیں مکمل طور پر ختم نہیں کر سکی ہاں البتہ پاکستان میں چند ایسی برادریاں ضرور موجود ہیں جنہوں نے اتفاق رائے سے ان روایات کو کسی حد تک قابل برداشت بنالیا یہ وہ برادریاں ہیں جو اپنے بچوں کی شادیاں ملوث خاندان میں کرتی ہیں اور جب ان لوگوں کو محسوس ہوا ان کے بعض بہن بھائی شادی بیاہ کی رسمیں انورڈ نہیں کر سکتے تو انہوں نے سب کی سہولت کیلئے ان روایات میں بعض چھوٹی موٹی تبدیلیاں کر دیں مثلاً بعض برادریوں میں سارے رشتے وارث کر لڑکی کا جینز بناتے ہیں پورا خاندان کنٹری بیوشن کر کے بارات کی خورد و نوش کا بندوبست کرتا ہے بعض خاندان مساجد میں نکاح کرتے ہیں اور ان خاندانوں میں بارات اور ویسے کی رسمیں ختم ہو چکی ہیں بعض خاندانوں میں لڑکی والوں کے اخراجات بھی لڑکے والے برداشت کرتے ہیں اور بعض خاندانوں میں شادی انتہائی سادگی سے ہوتی ہے لیکن اس کے بعد نیا جوڑا باری باری اپنے تمام رشتہ داروں کے گھر جاتا ہے اور وہ رشتے دار انہیں قیمتی تحفے تحائف دے کر واپس بھجواتے ہیں لیکن رسومات میں یہ تبدیلیاں صرف چند خاندانوں تک محدود ہیں یہ معاشرتی شکل اختیار نہیں کر سکیں ان کے اثرات پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکے۔ ہماری شادی بیاہ کی رسمیں مذہبی نہیں سماجی اور ثقافتی ہیں آپ ہار یا مالاکو لیجئے عرب دو لہے کے گلے میں ہار نہیں ڈالتے عرب دو لہے کو سلامی بھی نہیں دیتے لیکن برصغیر کے تمام مسلمان دو لہے کے گلے میں ہار بھی ڈالتے ہیں اور اسے سلامی بھی دیتے ہیں مالاکو لہے اور سلامی دینے کی رسم چھ ہزار سال پہلے ہندوستان میں رائج ہوئی

تھی اور یہ آج تک ہندوستان کے تمام مذاہب، فرقوں اور نسلوں کے لوگوں میں موجود ہے، یہی صورت حال ہندی کی ہے، برصغیر کے تمام مذاہب کے لوگ دہن کو مہندی لگاتے ہیں، اسی طرح چرائیاں، دہن کا شادی کا جوڑا، ڈھولکی، منجائی، ناچ گانا، دودھ پائی، شہ بالا اور مبارکبادیں بھی اس خطے کی روایات ہیں اور یہ روایات خطے کے تمام مذاہب، قوموں اور نسلوں میں یکساں موجود ہیں، ان روایات کو آج تک کوئی مذہب اور کوئی نظریہ تبدیل نہیں کر سکا، لیرہ بھی ان روایات میں سے ایک روایت ہے اور یہ بھی ہزاروں سال سے اس خطے میں چلی آ رہی ہے۔

آزادی سے پہلے انگریز مقامی روایات اور رسموں کے خلاف کوئی قانون نہیں بناتے تھے، وہ رسموں اور عقیدے کے خلاف قانون کو برا قانون (BAD LAW) کہتے تھے، ان کا خیال تھا قانون بنانا کمال نہیں ہوتا اصل کمال اس قانون پر عملدرآمد کرانا ہوتا ہے لہذا جس قانون پر عملدرآمد ممکن نہ ہو حکومت کو وہ قانون نہیں بنانا چاہیے، شاید یہی وجہ تھی انگریز نے کبھی کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جس پر وہ عملدرآمد نہیں کر سکتا تھا مثلاً انگریز چھوٹی عمر کی شادی کے خلاف تھا لیکن اس نے 1947ء تک اس کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا، وہ چاہتا تھا ہندوستان کے تمام مذاہب اور تمام علاقوں میں یہ روایت موجود ہے اور لوگ اس قانون کو تسلیم نہیں کریں گے، انگریز ذات برادری اور طبقاتی تفریق کو بھی ناپسند کرتا تھا لیکن اس نے کبھی برہمن کو شورور کے ساتھ بھانے کی کوشش نہیں کی، اس نے تمام ریلوے سٹیشنوں پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے پانی کے الگ الگ کولر لگوا دیئے، اس نے فوج تک میں ہندو اور مسلمانوں کے باورچی خانے علیحدہ علیحدہ رکھے، انگریز نے ڈیزھہ سو سال میں کبھی اندرون شہر کر فٹو لگانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جانتا تھا پرانے شہروں کی گلیاں تنگ ہوتی ہیں اور ان میں پولیس کے گھوڑے، تانکے، موٹر سائیکل اور جیپیں نہیں جا سکتیں لہذا حکومت وہاں کر فٹو پر عملدرآمد نہیں کرانے کی اور گائے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اختلاف کا باعث بنتی تھی چنانچہ انگریز نے ڈیزھہ سو سال میں گائے کے بارے میں کوئی قانون نہیں بنایا، انگریز کہتا تھا حکومت کو قانون بنانے سے پہلے معاشرے میں "سوشل چینج" لانی چاہیے، اسے مقامی لیڈروں اور امین جی اوز کی مدد سے پہلے معاشرے کا مزاج بدلنا چاہیے، جب معاشرے کا مزاج بدل جائے تو اس کے بعد قانون کی باری آتی ہے، اس سلسلے میں ہم "تسی" کی مثال بھی دے سکتے ہیں، انگریز نے تسی کی رسم کے خلاف قانون بنانے سے پہلے راجہ رام سوہن کے ذریعے ہندو معاشرے میں ایک سوشل چینج کی بنیاد رکھی، جب راجہ رام سوہن کی تعلیمات ایک

تحریک کی شکل اختیار کر گئیں تو اس کے بعد انگریزوں نے سنی کے خلاف قانون پاس کیا اور اس قانون پر پوری طرح عملدرآمد کرایا۔

میں دل سے شادی بیاہ پر اصراف کے خلاف ہوں، میں ویسے اور بارات کے اخراجات کو بھی پسند نہیں کرتا لیکن جہاں تک اس قانون کی بات ہے تو میرا خیال ہے یہ ایک ”بیلڈ“ ہے اور اس قانون نے معاشرے کی الجھنوں میں اضافہ کر دیا ہے اس نے ہماری معاشرتی منافقت بڑھا دی ہے۔ اس نے رشوت لوٹ کھسوٹ اور ہیرا پھیری کے نئے دروازے بھی کھول دیئے ہیں اس نے لوگوں کو ویسے کو عقیدے کا نام دینے پر مجبور کر دیا ہے اور اس قانون نے بااختیار اور بنا اختیار کی خلیج میں بھی اضافہ کر دیا ہے آج حالت یہ ہے بااختیار لوگ دھڑلے سے ویسے کرتے ہیں ان کی دعوت میں قانون بنانے اور نافذ کرنے والے دونوں شریک ہوتے ہیں اور پولیس باہر کھڑی ہو کر ان وی آئی پی کی حفاظت کرتی ہے لیکن جب کسی بے اختیار شخص سے ویسے کا جرم سرزد ہو جاتا ہے تو پولیس اس کی دیکھیں تک اٹھا کر لے جاتی ہے یہ تفریق عوام کے دلوں میں نفرت کے

سبب پوری ہے ہمارا خیال ہے حکومت کو اس ملک کے اصل مسائل پر توجہ دینی چاہیے حکومت کو دیکھنا چاہیے اس ملک کی نصف سے زائد دواؤں جعلی ہیں ان جعلی دواؤں سے ہزاروں لوگ ہلاک ہو چکے ہیں لیکن آج تک پولیس نے کسی ڈرگ سٹور پر چھاپہ نہیں مارا پاکستان کا شمار دنیا کے ان دس ملکوں میں ہوتا ہے جن میں خالص خوراک نہیں ملتی اور جس میں دودھ سے لے کر آٹے تک میں ملاوٹ ہوتی ہے لیکن آج تک کسی عدالت نے ملاوٹ کرنے والوں کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا پاکستان میں آج تک کسی ملاوٹ باز اور کسی جعل ساز کو پھانسی نہیں ہوئی ہمارے ملک میں دنیا میں سب سے زیادہ ٹریک حادثے ہوتے ہیں لیکن آج تک ان حادثوں کی روک تھام کیلئے کوئی قانون نہیں بنا اور تعلیم اور صحت ہر شہری کا بنیادی حق ہے لیکن آج تک پاکستان میں اس بنیادی حق کیلئے کوئی قانون نہیں بن سکا ہم پاکستانی جب ان معاملات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے ہماری حکومت کو جب بھی پانی کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ ماڈرن ایئر ریٹ کے نیچے دیا جلا کر بیٹھ جاتی ہے اور ہماری حکومت فرمی کی مرہم پٹی کے بجائے اسے بانسری سنانا شروع کر دیتی۔ ہم عجیب لوگ ہیں جس رسم کو چھ ہزار سال کی تاریخ نہیں بدل سکی ہم اس کے سامنے ڈنڈے لے کر کھڑے ہیں لیکن جو مسائل ہماری معمولی سی توجہ سے حل ہو سکتے ہیں ہم ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے ہم واقعی بہت دلچسپ لوگ ہیں ہر قانون بنانے میں پوری دنیا میں کوئی ہمارا مقابل نہیں کر سکتا۔

چیف جسٹس صاحب کے حضور

میں 2004ء میں آسٹریا گیا، فاروق چودھری دیا نا میں میرے میزبان تھے چودھری

صاحب اقرا احمد میں ملازمت کرتے ہیں اور پچھلے میں پچیس برسوں سے آسٹریا میں مقیم ہیں۔

مجھے آسٹریا یورپ کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں زیادہ صاف ستمرا پر سکون اور خوبصورت

ملک لگا۔ ویانا شہر کے مین درمیان سے دریائے ڈینیوب گزرتا ہے یہ دریا آگے چل کر آسٹریا کو

سمندر سے ملاتا ہے، میں فاروق صاحب کے ساتھ ویانا شہر میں گھوم رہا تھا تو مجھے شہر کے درمیان

سنہری رنگ کی ایک خوبصورت عمارت دکھائی دی، یہ شہر کی دیدہ زیب اور مصورانہ قسم کی عمارت تھی،

مجھے چودھری صاحب نے بتایا، یہ ویانا کا ٹریڈنٹ پلانٹ ہے، پورے ویانا شہر کا سیوریج یہاں آتا

ہے، یہ پلانٹ سیوریج کے پانی کو صاف کرتا ہے، اسے گندگی، بو، جراثیم اور کیمیائی عناصر سے پاک

کرتا ہے اور پھر یہ پانی دریائے ڈینیوب میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس پلانٹ کی وجہ سے ڈینیوب

یورپ کا صاف ترین دریا ہے، مجھے یہ بات عجیب لگی لہذا میں نے چودھری صاحب سے پوچھا

”اس سارے ترود کی کیا ضرورت تھی، یہ لوگ سیوریج کا پانی براہ راست دریا میں پھینک دیتے“

چودھری صاحب نے مسکرا کر جواب دیا ”آسٹریا کے لوگ اسے ظلم سمجھتے ہیں، ان کا خیال ہے پچھلی

نسلوں نے انہیں ایک صاف ستمرا دریا دیا تھا لہذا ہمیں بھی آنے والی نسلوں کو ایک شفاف رداں

اور سبے پور دینا چاہئے، یہ لوگ دریائوں، جنگلوں، پہاڑوں، جھیلوں اور پارکوں کو امانت سمجھتے ہیں

چنانچہ امانت کی طرح ان کی حفاظت کرتے ہیں" میں نے کہا "یہ ایک عجیب منطلق ہے" چودھری صاحب نے فرمایا "یہ عجیب منطلق نہیں! یہ عقل مندی ہے! آسٹریا کی حکومت نے پچاس برس پہلے تحقیق کرائی تو پتہ چلا اگر دریا آلود ہوگا تو آنے والے دنوں میں ویانا کا صحت کا بجٹ آٹھ گنا بڑھ جائے گا چنانچہ ان لوگوں نے ٹریسٹ پلانٹ لگانے کا فیصلہ کیا" آج ویانا کا صحت کا بجٹ یورپ کے دوسرے دارالحکومتوں سے کہیں کم ہے" میں نے حیران ہو کر پوچھا "ٹریسٹ پلانٹ کا صحت کے بجٹ سے کیا تعلق؟" چودھری صاحب مسکرائے "یہ دریا آسٹریا کی ہزاروں ایکڑ زمین کو سیراب کرتا ہے اس کا پانی جنگلوں، پارکوں اور جمیلوں تک پہنچتا ہے یہ بارش کا باعث بھی بنتا ہے اور یہ مضافات کی آبی ضروریات بھی پوری کرتا ہے" اگر یہ پانی آلود ہوگا تو اس سے پیدا ہونے والی مچھلیاں، سبزیاں، پھل، بارش اور ہوا بھی زہریلی ہوگی، ماحول کا یہ زہر شہریوں کو بیمار کرے گا اور اس بیماری سے صحت کے بجٹ میں اضافہ ہو جائے گا چنانچہ آسٹریا کی حکومت نے ماحول اور شہریوں کو صحت مند رکھنے کے لئے دریا کی صفائی کا فیصلہ کیا لہذا آج ویانا کے لوگ صحت مند بھی ہیں اور ان کی عمریں بھی بڑھی ہیں آپ کو ان اس دریا کی صفائی سے دو ٹوکاً میں پڑائیوں کی تصدیق کروں گا" میں نے کہا "میں ویانا کے اس ٹریسٹ پلانٹ اور دریائے ڈینیوب کو بھول گیا لیکن چند روز پہلے میری آنکروں سے چیف جسٹس آف پاکستان مسٹر جسٹس افتخار محمد چودھری کے چند ریمارکس گزرے اور مجھے ویانا کی دو تمام خوبصورت دو پہریں اور شاہ میں یاد آ گئیں جو میں نے دریائے ڈینیوب کے صاف ستھرے پانیوں کے قریب بیٹھ کر گزارا ہے" چیف جسٹس نے ایک مقدمے کے دوران ریمارکس دیئے "ٹیکسٹریوں کے فضلات پانی میں جھینکنے سے پیناٹنس کا مرض پھیل رہا ہے لہذا ٹیکسٹریوں کی گندگی دریاؤں اور نہروں میں نہ جھینکی جائے" اسی ڈی اے نالٹی میں گندگی جھینکنے کا نوٹس لے "چیف جسٹس نے یہ ریمارکس سپریم کورٹ کے پانچ رکنی لارجرنچ کی ایک سماعت کے دوران دیئے تھے یہ بیچ ماحولیاتی آلودگی کے بارے میں دائر ایک پیشین کیلئے تشکیل دیا گیا تھا۔ بیچ نے سماعت کے آخر میں ماحولیات کے ڈائریکٹر جنرل آصف شجاع کو اسلام آباد کے ٹیکسٹری ایریا آئی ٹائن کا دو ہفتوں میں سروے کرنے اور چاروں صوبوں میں ماحولیاتی ٹریسٹ بنانے کا حکم دیا۔

مجھے یہ احکامات اور چیف جسٹس کے ریمارکس پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی، چیف جسٹس کو اللہ تعالیٰ ایسے مزید احکامات جاری کرنے کی استطاعت عطا فرمائے، چودھری صاحب مدلیہ کی

تاریخ کے متبادل ترین چیف جسٹس ہیں۔ چیف جسٹس صاحب اخبارات میں چھپنے والی چھوٹی چھوٹی خبروں پر سوشل میڈیا ایکشن لے لیتے ہیں اور اس ایکشن کے نتیجے میں ان سینکڑوں ہزاروں مظلوموں کو انصاف اور ریلیف ملتا ہے جو شاید برسوں عدالت کے دروازے تک نہ پہنچ پائیں۔ میں واپس موضوع کی طرف آتا ہوں، ہماری بزرگ نسل بتاتی ہے ان کی جوانی میں پاکستان کے تمام ندی، نالے، بھیلیں اور دریا صاف ستھرے تھے۔ 1970ء تک راولپنڈی اور اسلام آباد کے شہری نالہ لئی کا پانی پیتے تھے۔ اس نالے کا پانی "سٹرل واٹر" ہوتا تھا کیونکہ مارگلہ کی وادی کے بے شمار چشمے اور جھرنے نالہ لئی میں شامل ہوتے تھے اور یہ آگے چل کر ہزاروں لوگوں کی ضرورت پوری کرتے تھے لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے لئی ایک گندے اور بدبودار نالے کی شکل اختیار کر گیا۔ دریائے سواں بھی کسی وقت اس علاقے کا آبجائی صاف ستھرا اور شفاف دریا تھا لیکن آج یہ دریا ہے اور نہ ہی اس کا صاف شفاف پانی، یہی صورتحال دریائے جہلم، چناب، ستلج اور راوی کی ہے۔

راوی کبھی ملکہ نور جہاں اور جہانگیر کا دریا ہوتا تھا لیکن آج کوے تک اس کا پانی نہیں پیتے، کیوں؟

تدیوں اور نالوں میں پھینک دیتے ہیں۔ ہماری آبادی میں جنوں جنوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ہماری ندیوں، نالوں اور بھیلیوں میں آلودگی بڑھ رہی ہے اور ہمیں اس آلودگی کا تادان بیماری اور موت کی شکل میں ادا کرنا پڑ رہا ہے یہ آلودگی آگے چل کر ہمارے کھیتوں اور باغوں تک پہنچتی ہے اور ہم لوگ اس آلودگی میں پروان چڑھنے والی سبزیاں اور پھل کھاتے ہیں۔ ہمارے دیہات کے لوگ ان دریاؤں، نہروں اور ندی نالوں کا پانی پیتے ہیں۔ یہ ندی نالے زمین میں رس کر ہمارے آبی وسائل کو بھی آلودہ کر رہے ہیں اور یہ آلودگی نلکوں اور ٹونٹیوں سے ہو کر ہمارے معدوں تک پہنچ رہی ہے چنانچہ آج ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی طبی مسئلے کا شکار ہے۔ ہم میں سے ہر شخص بیمار ہے، چھانٹاؤں اور کینسر دنیا کے مہلک ترین امراض ہیں اور اس آبی آلودگی کے باعث یہ دونوں امراض پاکستان میں بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں لہذا میری چیف جسٹس صاحب سے درخواست ہے وہ پاکستان کی تمام سرکاری اور غیر سرکاری ہاؤسنگ سکیموں کو قانونی طور پر پابند کر دیں وہ اپنی سیوریج لائن کے آخر میں ویانا جیسے ٹریٹمنٹ پلانٹ لگائیں، عدالت تمام ٹاؤن کیشنوں، میونسپل کارپوریشنوں اور میٹرو پولیٹن انتظامیہ کو بھی پابند کر دے کہ وہ اپنی اولین فرصت میں سیوریج کے ساتھ ٹریٹمنٹ پلانٹ لگائیں اور پاکستان میں اس وقت تک کسی ہاؤسنگ سکیم کو اجازت نہ دی

وزیر و پوائنٹ 3 0 235

جائے جب تک وہ سکیم سیوریج کا ٹریٹمنٹ پلانٹ نہ خرید لے اور یہ پلانٹ سیوریج لائن کے ساتھ لگانے کا تحریری معاہدہ نہ کر لے۔ میں ہاؤسنگ کے وفاقی وزیر سے بھی درخواست کر چکا ہوں انہوں نے بھی اس پر ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا تھا لیکن میرا خیال ہے اس کے لیے بڑی سطح پر قانون سازی اور غور و فکر کی ضرورت ہے لہذا میری چیف جسٹس صاحب سے درخواست ہے وہ ٹریٹمنٹ پلانٹس کو بھی اپنے ایجنڈے کا حصہ بنائیں وہ اس ملک کی اگلی نسل پر احسان کر جائیں ہم آج کیا کھا رہے ہیں کیا پل رہے ہیں اس کو سامنے رکھ کر سوچنے ہماری آنے والی نسل کل کیا کھائے گی اور کیا پئے گی میری چیف جسٹس کے حضور درخواست ہے وہ کل عدالت میں بیٹھے ہوئے 2010ء کا کیلنڈر دیکھ لیں اور اس کے بعد اپنے دریاؤں اور ندی نالوں پر نظر ڈالیں اور سوچیں ہمارے بزرگوں نے ہمیں کتنا صاف ماحول دیا تھا لیکن ہم اپنے بچوں کیلئے کیسا ماحول چھوڑ کر جا رہے ہیں ہم انہیں کیا دے کر جا رہے ہیں۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com

انصاف

لندن میں دن کے گیارہ بجے تھے اور یہ 9 مارچ کا دن تھا، میں چودھری عنصر محمود کا انتظار کر رہا تھا، عنصر بیٹے کے لحاظ سے وکیل ہیں اور وہ لندن میں ایگریگیشن کا کام کرتے ہیں، عنصر نے مجھے واٹر لوکیشن پر چھوڑنا تھا، میں اس شام لندن سے ہیرس جا رہا تھا، دن گیارہ بجے مجھے اچانک برمنگھم سے فون آیا اور کسی صاحب نے ہانپتے ہوئے بتایا، "صدر نے چیف جسٹس آف پاکستان کو معطل کر دیا ہے" اس خبر نے لندن کی خشکی کو تپش میں تبدیل کر دیا، میں نے بارہویں منزل کے اس فلیٹ کی کھڑکی کھولی اور ایک لمبا سانس لیا، مجھے دو دن پہلے میاں شہباز شریف کا زیاد آ گیا، میاں صاحب نے مجھے کھانے کی دعوت دی تھی، ہم دونوں ایجویر روڈ کے ایک لبنانی ریسٹوران میں بیٹھ گئے اور تین گھنٹے تک پاکستان کے حالات پر گفتگو کرتے رہے تھے، میاں شہباز شریف کا کہنا تھا "میں دیکھ رہا ہوں پاکستان کے عوام سڑکوں پر کھڑے ہیں اور حکمران جان بچاتے ہوئے بھاگ رہے ہیں" میں نے سوچا کیا اس شروعات کی شروع ہو چکی ہے، مجھے میاں نواز شریف سے اپنی ملاقات بھی یاد آگئی، میاں صاحب کا کہنا تھا "نوجی حکمران ایک غلطی کے قاصدے پر کھڑے ہیں" میں نے سوچا "کیا یہ وہی غلطی ہے جو پھیل کر حکمرانوں کی نائٹس جلا دے گی" مجھے الطاف حسین سے ملاقات بھی یاد آگئی، 8 مارچ کو ایم کے ایم کے انٹرنیشنل ہیڈ کوارٹر میں الطاف حسین سے میری گفتگو ہوئی تھی، اس گفتگو میں الطاف حسین نے دعویٰ کیا تھا "وہ دن دور

نہیں جب عوام کو اختیار ملے گا" میں نے سوچا "کیا عوام کو اختیار ملنے کا دن آچکا ہے" میسر ج سکوائر کے اس فلیٹ کے نیچے زندگی رواں دواں تھی پورے لندن پر سورج چمک رہا تھا اور میں کھڑکی کھول کر اپنے ملک کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن میرے ہاتھ کوئی سر نہیں آ رہا تھا۔

میرا سفر دوماچ کو شروع ہوا میں نے سات دن لندن رک کر جیس جانا تھا میں نے خود کو چند دن چھٹی دے دی تھی پورے ملک میں ہم دھماکے ہو رہے تھے پورے تیس دن تک روز کوئی نہ کوئی بری خبر ملتی تھی اور یہ خبر کانوں سے لے کر روح تک ہر چیز کو جمیل ذاتی تھی لہذا میں نے حالات سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا لیکن برادر ام عابد عبداللہ کا خیال تھا "اخبار نویسوں کو چھٹی نہیں ملا کرتی" لوگ کالموں کا انتظار کرتے ہیں" میں نے درمیان کاراستہ نکالا میں نے ایڈوائس کالم لکھ دیئے یہ سدا بہار قسم کے کالم تھے میرا خیال تھا لوگوں کو میری غیر موجودگی کا اندازہ نہیں ہوگا لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا نومارچ آیا اور پاکستان میں ہر چیز تبدیل ہو گئی لندن میں میرے پانچ ہدف تھے میاں نواز شریف، میاں شہباز شریف، میرے دوست پرویز رشید بے نظیر بھٹو اور ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین میں نے سوچا میں ان لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار کر

پاکستان کے آنے والے سیاسی دنوں کا اندازہ لگاؤں گا لیکن بے نظیر بھٹو میرے لندن پہنچنے سے پہلے دعویٰ چلی گئیں لہذا میرے پاس صرف چار ہدف رہ گئے۔ میں میاں شہباز شریف کا "فین" ہوں میں نے سوچا میں ان سے ان دنوں کی ناگفتہ تعلیمات سنوں گا جب انہوں نے پنجاب میں سماجی انقلاب کی بنیاد رکھی تھی میاں شہباز شریف کو اقتدار سے فارغ ہونے ساڑھے سات سال گزار چکے تھے لیکن مجھے ان ساڑھے سات برسوں میں کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس نے شہباز شریف کی انتظامی صلاحیتوں کی تعریف نہ کی ہو شہباز شریف نے حقیقتاً پنجاب میں حکمرانی کا ایک نیا معیار طے کر دیا تھا لہذا ان کے بعد پنجاب کا تاج جس شخص کے سر پر بھی رکھا گیا وہ دانشکی یا غیر دانشکی میں شہباز شریف کا مقابلہ کرنا دکھائی دیا "آپ گورنر خالد مقبول کو دیکھ لیجئے یا وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الہی کا مطالعہ کر لیجئے آپ کو پنجاب کے یہ دونوں حکمران میاں شہباز شریف کے چیلنج کا مقابلہ کرتے دکھائی دیں گے لندن کے بعد میں نے جیس اور سویڈن جانا تھا ان دونوں ملکوں میں میرے دوست میسر شیخ اور محمد عباس رہتے ہیں یہ دونوں غیر سیاسی اور غیر صحافتی قسم کے دوست ہیں لہذا میں ہمیشہ ان کی کہنی کو "انجوائے" کرتا ہوں لیکن درمیان میں نومارچ آ گیا چیف جسٹس آف پاکستان معطل ہوئے اور میری چھٹی کینسل ہو گئی اور میں چند روز دوماچ کو واپس آ گیا۔

چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کے ساتھ کیا ہوا؟ کیا وہ اس سلوک کے مستحق تھے اور کیا صدر جنرل پرویز مشرف کو ایسا قدم اٹھانا چاہئے تھا؟ ان سوالوں کا جواب وقت دے گا اور یہ وقت زیادہ دور نہیں لیکن جہاں تک چیف جسٹس آف پاکستان کی ذات کا تعلق ہے تو میں اس سلسلے میں چند معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں، میری چیف جسٹس آف پاکستان کے ساتھ چند ملاقاتیں رہی ہیں، سپریم کورٹ کے دوسرے سینئر ترین جج جسٹس رانا بھگوان داس میرے مہربان اور دوست ہیں، رانا صاحب کے ساتھ میری اکثر ملاقاتیں رہتی ہیں، رانا صاحب کی محفل میں بعض اوقات دوسرے جج حضرات بھی موجود ہوتے ہیں لہذا مجھے رانا صاحب کی رہائش گاہ پر چیف جسٹس کی شخصیت کو سمجھنے کا بھرپور موقع ملا، کسی صاحب اختیار کے کوئیگ اور عام لوگ اس کی غیر موجودگی میں اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ کسی شخصیت کو سمجھنے کے لئے یہ انتہائی ضروری ہوتا ہے، دنیا کا ہر شخص اپنے سینئر افسروں کو دیکھ کر دے سکتا ہے لیکن دنیا کا کوئی شخص اپنے آپ کو اپنے جونیئر افسروں سے چھپا سکتا ہے اور نہ ہی دھوکہ دے سکتا ہے، لوگ ہمارے بارے میں کیا کہتے ہیں، وہ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں، یہ بات غدارہ خدا ہوتی ہے، عوامی پٹی برائی، پبلک ایج اوہ عزت اور وہ ذلت ہوتی ہے جس کا اللہ تعالیٰ دعویٰ فرماتے ہیں لہذا ہم لوگ کسی بھی شخص کا پبلک ایج دیکھ کر اس کے مستقبل کے بارے میں بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں، چیف جسٹس آف پاکستان ان دونوں معاملات میں بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں، میں نے ان کے کولیس کے منہ سے ہمیشہ ان کی تعریف سنی، ان کے ساتھی بچوں کا کہنا تھا وہ انتہائی ان تھک شخص ہیں، وہ رات گئے تک دفتر میں کام کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے چارج سنبھالتے ہی زیر التوا مقدمے نمٹانا شروع کر دیئے تھے۔ انہوں نے کیس ملتوی کرنے پر پابندی لگا دی تھی وہ وکیلوں کو کیس لگانے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور وہ عدلیہ کے ایج کے بارے میں بڑے حساس واقع ہوئے تھے وغیرہ۔

چیف جسٹس کا پبلک ایج اس سے بھی کہیں آگے تھا۔ چودھری صاحب نے اپنے سوموٹو اختیار کو عوام کے لیے وقف کر دیا تھا انہوں نے سپریم کورٹ میں انسانی حقوق کیل قائم کیا۔ یہ سب عام شہریوں کی سادہ کاغذ پر تحریر درخواستوں پر متحرک ہو جاتا تھا چنانچہ منوبھیل کا کیس ہو یا رسول بخش کی پولیس قبضے میں ہلاکت، ٹھل کی پانچ بچیوں کی زبردستی شادی کا مسئلہ ہو یا حیدرآباد میں تین نابالغ بچوں کی گرفتاری اور نڈو آدم خان میں پانچ سالہ بچی کا رشتہ کرنے کا معاملہ ہو یا کوٹ غلام محمد میں بجلی کے کرنٹ سے تین بچوں کی ہلاکت چیف جسٹس نے ان تمام معاملات پر سوموٹو ایکشن لیا

اور خود کو عام شہری کا چیف جسٹس ثابت کیا۔ وہ روز اخبارات پر نہ کہ سوسائٹی ایکشن لیتے تھے اور آئی جی سے لے کر وزیر اور جاگیرداروں تک کو کورٹ میں طلب کر لیتے تھے لہذا ان کے دور میں عام شہریوں کو انصاف بھی ملا اور ریلیف بھی، پچھلے دو اڑھائی برسوں میں چیف جسٹس اور ان کا سوسائٹی ضرب الش کی حیثیت اختیار کر گیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا اگر ان کا مسئلہ چیف جسٹس تک پہنچ گیا تو انہیں ضرور ریلیف ملے گا، چودھری صاحب کے سوسائٹی فیصلوں نے انہیں ریکارڈ مقبولیت عنایت کی یہاں تک کہ وہ عام لوگوں کی آخری امید بن گئے۔ چودھری صاحب نے عدلیہ کے دقار میں بھی اضافہ کیا، انہوں نے عوام میں انصاف کے خراب ہوتے ایج کو بھی سہارا دیا لہذا آج یہ ان کی مقبولیت کا نتیجہ ہے پاکستان کے عوام ان کے لیے سڑکوں پر کھڑے ہیں اور پاکستان کا بچہ بچہ حکومتی اقدامات کی مذمت کر رہا ہے۔

میں نے کل اپنے ایک دوست سے پوچھا "اب کیا ہوگا" اس نے ہنس کر جواب دیا نیولے کے منہ میں سانپ آ گیا ہے، اگر نیولے نے سانپ نگل لیا تو وہ مارا جائے گا اور اگر اس نے سانپ اگل دیا تو سانپ کو اڑھائی درجے کی "میرے دوست کا کہنا تھا۔ یہ وہی صورتحال ہے جو منزنل شیاء الحق کو ذوالفقار علی بھٹو کے مسئلے میں درپیش تھی اس دور کے تجزیہ نگار کہتے تھے "قبریں دو ہیں اور مردہ ایک" میرے دوست کا کہنا تھا سپریم کورٹ کے ایٹو نے ایک بار پھر ثابت کر دیا حکمرانوں کو وسیع القلب اور شمل حراج ہونا چاہیے، اگر صدر محترم 9 مارچ کو ذرا سا شمل کا مظاہرہ کرتے، اگر وہ وسعت قلبی سے کام لیتے تو آج پاکستان کے کونے کونے میں آگ نہ لگتی اور آج حکومت کو عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے ٹیلی ویژن چینلوں پر حملے نہ کرانا پڑتے، میرے دوست کا کہنا تھا "حکومت کے بعض اہم خواہ صدر اور چیف جسٹس کی صلح کی کوشش کر رہے ہیں، یہ بی بی خواہ چیف جسٹس سے جان کی امان طلب کر رہے ہیں، اگر چیف نے حکومت کو جان کی امان دے دی تو حکومت کیس واپس لے لے گی بصورت دیگر چیف جسٹس کا کیس عدالت سے گلیوں میں چلا جائے گا اور اس کا فیصلہ لوگ کریں گے" میں نے اپنے دوست سے اتفاق کیا کیونکہ میں بھی سمجھتا ہوں جب عدالتوں اور حکومتی ایوانوں میں انصاف نہیں ہوتا تو پھر لوگ گلیوں اور سڑکوں پر انصاف کرتے ہیں اور اہم لوگ بد قسمتی سے بڑی تیزی سے ایوانوں سے سڑکوں کی طرف آ رہے ہیں، ہم اپنا انصاف لوگوں کے حوالے کر رہے ہیں۔



کاشف آزاد

358 برس بعد

وہ نارنوک کے علاقے مائل ہام میں پیدا ہوا اس کے والد نے اس کا نام کوک رکھا لیکن وہ سر ایڈورڈ کوک کے نام سے مشہور ہوا۔
 ایڈورڈ کوک 1556ء میں نارویج گرامر سکول میں داخل ہوا اور وہاں سے ہوتا ہوا
 ٹرینیٹی کالج کیمرج تک پہنچ گیا، ٹرینیٹی کالج کا شمار دنیا کے نامور کالجوں میں ہوتا ہے اس کالج نے
 دنیا کو سینکڑوں ہزاروں معروف لوگ دیئے دنیا ٹرینیٹی کالج پر تاز کرتی ہے لیکن ٹرینیٹی کالج سر ایڈورڈ
 کوک پر فخر کرتا ہے۔ آج سر ایڈورڈ کوک کو ٹرینیٹی کالج سے فارغ ہونے والے 32 برس ہو چکے ہیں
 لیکن کالج کی دیواروں 'کالج کی لائبریری' کالج کے کینے میرا اور کالج کے لانوں میں آج بھی
 ایڈورڈ کوک کے نقش باقی ہیں! آپ آج بھی ٹرینیٹی کالج میں داخل ہوں تو آپ کو محسوس ہوتا ہے
 آپ ایڈورڈ کوک کی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں اور یہ دنیا بیچ بیچ کر کہہ رہی ہے قانون بنانے اور
 قانون کی حرمت بچانے والے کبھی فوت نہیں ہوتے دنیا کا کوئی بادشاہ کوئی حکمران اور کوئی آمر
 قانون سازوں کو نہیں مٹا سکتا سر ایڈورڈ کوک 1578ء میں لندن بار کا ممبر بنا، وہ 1589ء میں
 برطانوی پارلیمنٹ کا ممبر بن گیا، 1592ء میں وہ سوئیٹزر جزل اور ریکارڈر آف لندن بنا،
 1593ء میں اسے دارالعوام کا جج بنا دیا گیا اور وہ 1594ء میں وہ سر فرانسس بیکن کو شکست
 دے کر انارنی جزل بن گیا، برطانیہ میں 1603ء بہت اہمیت کا حامل ہے اس سال سنوارٹ

خاندان کا ایک شہزادہ جیمز اول آگے بڑھا اور اس نے نیوڈر خاندان سے برطانیہ کا تخت چھین لیا۔ جیمز اول ایک طالع آزماء اور آمرانہ فطرت کا بادشاہ تھا، وہ ملک کے تمام اختیارات اور اقتدار اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا، بادشاہ کی خواہش تھی اس کے منہ سے نکلے ہر لفظ کو حکم الہی سمجھا جائے لیکن اس وقت تک برطانیہ کے عام شہری بیدار ہو چکے تھے لہذا ان پر عسکرانی جتنا آسان نہیں رہا تھا، جیمز اول ایک مکار شخص تھا، اس نے حالات کو بھانپ لیا چنانچہ اس نے عدالت کو ساتھ ملانے کا فیصلہ کیا، اس دور میں سرائیڈورڈ کوک کا طوطی بولتا تھا، جیمز اول نے 1606ء میں ایڈورڈ کوک کو چیف جسٹس بنا دیا، جیمز اول کا خیال تھا ایڈورڈ کوک چیف جسٹس بننے کے بعد اس کے غیر قانونی احکامات کی حمایت کرے گا اور یوں بادشاہ قانون کے لبادے میں رہ کر اپنے آمرانہ اختیارات سے لطف اندوز ہوتا رہے گا لیکن بادشاہ کے ارادوں پر بہت جلد اس پڑ گئی کیونکہ ایڈورڈ کوک نے چیف جسٹس کا حلف اٹھایا تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے سر پر سفید بالوں کی دگ اور جسم پر چیف جسٹس کا گاؤن دکھا اور اپنے آپ سے پوچھا، کیا تاریخ مجھے بادشاہ کا نظام

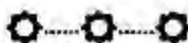
جسٹس کہے گی؟ اس نے ایک ایسی سانس لی اور اس کی کاپی پلٹ گئی۔

سرائیڈورڈ کوک نے بادشاہ کی بجائے عام شہری کا بیج بننے کا فیصلہ کیا، اس نے برطانیہ کے مظلوم شہریوں کا ہاتھ پکڑ لیا، اس کا کہنا تھا، "جب تک قانون بادشاہ سے زیادہ مضبوط نہیں ہوتا اس وقت تک ہم برطانوی معاشرے کو مہذب قرار نہیں دے سکتے" اس کا کہنا تھا، "معاشرہ کو قانون عزت دیتا ہے بادشاہ نہیں اور بدقسمتی سے برطانیہ قانون کی بجائے بادشاہوں کا ملک ہے" آنے والے دنوں میں سرائیڈورڈ کوک کے خیالات نے شاہی خاندان کو ہلا کر رکھ دیا، بادشاہ پریشان ہو گیا لیکن اس کے پاس اس پریشانی کا کوئی مددوا نہیں تھا، سرائیڈورڈ کوک اس وقت تک اپنے فیصلوں کے ذریعے عام شہریوں کے دل میں گھر کر چکا تھا اور لوگ اس کی کارکردگی اور ایمانداری سے مطمئن تھے، 1610ء میں ایڈورڈ کوک نے برطانیہ کے شاہی خاندان کے تابوت میں آخری کیل ٹھوک دی، اس نے فیصلہ دیا، "بادشاہ قانون میں کوئی ایسی ترمیم نہیں کر سکتا جس سے عام شہریوں کے حقوق متاثر ہو سکتے ہیں" یہ فیصلہ بادشاہ کی اتھارٹی کو براہ راست چیلنج تھا، اس وقت تک بادشاہ کاغذ پر دو سطریں لکھ کر نہ صرف قانون کی کسی بھی شق کو معطل کر سکتا تھا بلکہ وہ کسی بھی وقت تمام شہری حقوق بھی ساقط کر سکتا تھا لیکن ایڈورڈ کوک کے اس فیصلے نے بادشاہ کے اختیارات کے سامنے قانون کی دیوار کھڑی کر دی۔ بادشاہ نے ایڈورڈ کوک کو دبانے کیلئے اسے

شاهی بیچ کا اضافی چارج دے دیا، اس دور میں سپریم کورٹ کے دو بیچ ہوتے تھے ایک بیچ کا سن لاء کہلاتا تھا جبکہ دوسرا کننگز بیچ تھا، کا سن لاء کا چیف جسٹس عام شہریوں کے قانونی حقوق کی حفاظت کرتا تھا جبکہ کننگز بیچ کا چیف جسٹس شاهی خاندان کے اختیارات اور حقوق کا محافظ ہوتا تھا، کننگز بیچ براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتا تھا اور اس کا چیف جسٹس تخت کے سامنے جوابدہ تھا، بادشاہ کا خیال تھا ایڈورڈ کوک کننگز بیچ کا چارج لینے کے بعد قانونی لحاظ سے بے بس ہو جائے گا لیکن ایڈورڈ کوک کننگز بیچ کا چارج لینے کے باوجود خاموش نہ ہوا، وہ نہ صرف عام شہریوں کے حقوق کے لئے لڑتا رہا بلکہ وہ بادشاہ کے بے لگام اختیارات کو بھی چیلنج کرتا رہا، نومبر 1616ء کو اس وقت کے ”جسی ٹلفز“ فرانسس میکن نے بادشاہ کی شہ پر ایڈورڈ کوک کے خلاف ریفرنس دائر کر دیا اور بادشاہ نے اس ریفرنس کی بنیاد پر 14 نومبر 1616ء کو ایڈورڈ کوک کو معطل کر دیا۔ سرائیڈورڈ کوک کی معطلی کی خبر جوں ہی عام ہوئی برطانیہ کے شہریوں نے ہنگامہ کر دیا لوگ سڑکوں پر آئے اور انہوں نے برطانیہ کا نظام ورہم برہم کر دیا، یہ احتجاج ایک سال تک جاری رہا یہاں تک کہ حکومت نے 1617ء میں اسے دہرا کرتے پر مجبور ہوئی۔ 1620ء میں برطانیہ میں الیکشن ہوئے تو لوگوں نے سرائیڈورڈ کوک کو بادشاہ کے حلقے سے الیکشن لڑایا، اسے الیکشن میں بھاری دڈوں سے کامیاب کرایا اور اسے کندھوں پر اٹھا کر دارالعوام پہنچا دیا۔ پارلیمانی سرائیڈورڈ کوک آنے والے دنوں میں چیف جسٹس ایڈورڈ کوک سے زیادہ خطرناک نکلا۔ اس نے دارالعوام میں بادشاہ کے اختیارات کو چیلنج کر دیا۔ وہ جس دن دارالعوام میں تقریر کرتا تھا اس دن لندن کی گلیاں لوگوں سے بھر جاتی تھیں۔ لوگ پارلیمنٹ ہاؤس کی گیلری سے تقریر سنتے تھے اور باہر آ کر لوگوں کے سامنے یہ تقریر دہرا دیتے تھے۔ یہ تقریر منہ سے منہ اور شخص سے شخص تک ہوتی ہوئی پورے برطانیہ میں پھیل جاتی تھی، ایڈورڈ کوک نے اپنی تقریروں سے شاهی خاندان کو نفرت کا استعارہ بنا دیا۔ اس نے پارلیمنٹ میں فرانسس میکن کو رشوت خورد بھی ثابت کر دیا۔ 1621ء میں حکومت نے اسے جیل میں پھینک دیا لیکن حکومت نوامہ کی کوشش کے باوجود اس پر الزام ثابت نہ کر سکی۔ 1625ء میں جیمز اول کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ چارلس اول بادشاہ بن گیا۔ چارلس اول پرانے بادشاہ کے مقابلے میں کئی مہلتا آمر اور ظالم تھا۔ اس نے ایڈورڈ کوک پر حملے شروع کر دیے۔ ایڈورڈ کوک 1628ء کو پارلیمنٹ سے ریٹائر ہوا اور 1634ء کو انتقال کر گیا لیکن اس وقت تک وہ بادشاہ کے اختیارات میں درانداز ڈال چکا تھا چنانچہ ایڈورڈ کوک کے انتقال کے بعد پارلیمنٹ اور تخت کے درمیان لڑائی

شروع ہو گئی یہ جنگ پارلیمنٹ ہاؤس سے گلیوں میں پہنچی اور برطانیہ میں سول وار شروع ہو گئی۔ لوگوں نے بادشاہ چارلس اول کو پکڑا اور اسے 1649ء میں پھانسی دے دی، چارلس کی پھانسی کے بعد برطانیہ میں شاہی خاندان ختم ہو گیا اور اقتدار "کونسل آف سٹیٹ" کو منتقل ہو گیا۔ سرائیڈورڈ کوک کا مشن مکمل ہو گیا۔ 1660ء میں برطانیہ میں بادشاہت بحال ہوئی لیکن اس بادشاہت کے مندرجہ ذیل امریت کے دانت نہیں تھے۔

آج اس واقعے کو 358 برس گزر چکے ہیں لیکن لوگ آج بھی سرائیڈورڈ کوک کو یاد کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کا یہ قول دہراتے ہیں "معاشرے اس وقت تک مہذب نہیں ہو سکتے جب تک ان میں قانون کی بجائے بادشاہ حکمران رہتے ہیں" میں نے 16 مارچ 2007ء کو سرائیڈورڈ کوک کا یہ قول پڑھا اور سوچا برطانوی بادشاہ جیمز اول چارلس اول اور ہمارے بادشاہ صدر جنرل پرویز مشرف میں کتنا فکری اشتراک پایا جاتا ہے برطانوی بادشاہوں نے 351 برس پہلے سرائیڈورڈ کوک کو معطل کر دیا تھا اور ہمارے بادشاہ صدر جنرل پرویز مشرف نے 9 مارچ 2007ء کو ہمارے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو محب آفس میں بلا کر "غیر فعال" کر دیا، میں نے سوچا کیا ہم مہذب معاشرے کی تعریف پر پورے اترتے ہیں؟ کیا ہم 358 برس بعد بھی ضمیر اور ایمان کے اس درجے پر پہنچ پائے ہیں جس پر 1649ء میں برطانیہ کے عوام تھے، میں نے اپنے آپ سے پوچھا کیا ہم میں 358 برس بعد بھی اتنی جرأت نہیں کہ ہم اس ملک میں قانون، قانون کی حکمرانی اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کیلئے لڑیں؟ کیا ہم آج بھی برطانیہ کے 358 برس پرانے معاشرے سے ہزاروں قدم پیچھے نہیں ہیں؟ میں نے اپنے آپ سے سوال پوچھے اور ایسی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔



بڑی عدالت

یہ اپریل کی گیارہ تاریخ 2007ء کا سن تھا، صبح کے پونے دس بجے تھے اور کراچی ہائیکورٹ کا باروم تھا، سینیٹر وسیم سجاد پی ایس او کی گنج کاری کے کیس کی جیڑوی کیلئے کراچی آئے تھے، وسیم سجاد سماعت کے بعد کورٹ روم سے نکلے اور ٹیلے ٹیلے باروم میں چلے گئے، باروم میں اس وقت زیادہ دکھا نہیں تھے، وسیم سجاد ایک میز پر بیٹھ گئے، انہوں نے چائے منگوائی اور آہستہ آہستہ چائے کی چسکیاں لینے لگے، دس بجے کے قریب دکھاہ کا ایک دستہ باروم میں داخل ہوا، انہوں نے وسیم سجاد کو دیکھا تو وہ ٹھٹک گئے اور انہوں نے وسیم سجاد کے خلاف چارجیٹیاں شروع کر دیں، ان دکھاہ میں صلاح الدین گنڈاپور بھی شامل تھے، وہ آگے بڑھے، وسیم سجاد کے پاس پہنچے اور ذرا سے تیز لہجے میں ان سے مخاطب ہوئے، "وسیم صاحب آپ باروم سے باہر چلے جائیں" وسیم سجاد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور ناراض لہجے میں پوچھا، "کیوں؟" گنڈاپور نے اسی لہجے میں جواب دیا، "آپ چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف ریفرنس میں سکوٹی وکیل ہیں، آپ قانون کے پیشے کی توہین کر رہے ہیں، ہم لوگ آپ کو پسند نہیں کرتے، چنانچہ آپ فوراً باروم سے چلے جائیں" وسیم سجاد نے چائے ختم کرنے کی مہلت مانگی لیکن گنڈاپور نے ساسی دکھاہ کی طرف اشارہ کیا اور وسیم سجاد کو بتایا، "یہ لوگ مشتعل کھڑے ہیں، یہ کہیں آپ پر حملہ نہ کر دیں" وسیم سجاد نے جو سنیئر دکھاہ کی طرف دیکھا، وہ انہیں شعلہ بار نظروں سے گھور رہے تھے، وسیم سجاد معاملے کی سبھی بھانپ گئے، لہذا انہوں نے چائے چھوڑی اور باروم سے نکل گئے، یعنی

شاہدین کا کہنا ہے وہ بعد ازاں ہائی کورٹ کے کیلئے ٹیریا میں گئے اور انہوں نے وہاں سے چائے پی۔

چیف جسٹس آف پاکستان کے معاملے میں اب تک تین قسم کی صورت حال سامنے آئی۔ پہلی صورت حال دکناء کا اتحاد ان کا رد عمل اور عدلیہ کے ساتھ ان کا اظہار ہے، دکناء نے چیف جسٹس کے حق میں سڑکوں پر نکل کر پوری دنیا کو حیران کر دیا، یہ وہ کام تھا جو پاکستان کی تاریخ میں بڑی سے بڑی سیاسی جماعت نہیں کر سکی، اگر دیکھا جائے تو صدر پرویز مشرف کو پچھلے ساڑھے سات برسوں میں پہلی بار کسی منظم رد عمل کا سامنا کرنا پڑا، اس معاملے میں کراچی سے طورخم اور سکرو سے چمن تک سارے دکناء ہم خیال ہیں اور حکومت پوری کوشش کے باوجود ان میں ”ذنت“ نہیں ڈال سکی، حکومت پوری کوشش کے باوجود دکناء اور بار کونسلوں کو تقسیم بھی نہیں کر سکی، حکومت کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دکناء کی تحریک مضبوط اور تیز ہوتی جا رہی ہے اور معاشرے کے دوسرے طبقے بھی اس میں شامل ہو رہے ہیں، دوسری صورت حال غیر فعال چیف جسٹس کی مقبولیت میں اضافہ ہے، حکومت کا خیال تھا چیف جسٹس دکناء برادری، پیورو کرٹس، سیاستدانوں اور بزنس میمنوں میں غیر مقبول ہیں اور یہ سارے طبقے ریٹرنس کے بعد حکومت کا ماتحت رہیں گے لیکن دکناء، سیاستدانوں، میڈیا اور عام شہریوں نے غیر فعالیت کے بعد چیف جسٹس کو تاریخی اہمیت دی اور چودھری صاحب دیکھتے ہی دیکھتے ہیرو بننے چلے گئے، یہاں تک کہ لوگ ان کے قلم ان کے جوشے اور ان کے پھنے ہوئے کوٹ کی لاکھوں روپے بولی لگانے لگے، لوگ آج ان کے ہاتھ چومتے ہیں اور ان کے حق میں وہ سارے نعرے لگاتے ہیں جن کیلئے پاکستان کے بڑے بڑے سیاستدان ترس رہے ہیں، 14 اپریل کو چیف جسٹس بار کونسل سے خطاب کے لئے سکھر گئے تھے، وہ جب سکھر ایئر پورٹ پر اترے تو آدھا شہر وہاں جمع تھا، چیف جسٹس کو جلوس کی شکل میں بار کونسل ہال تک لایا گیا، چیف جسٹس کا یہ استقبال دیکھ کر محسوس ہوتا تھا اگر چیف جسٹس پاکستان کی دس بڑی بار کونسلوں میں خطاب کر لیں تو حکومت کے خلاف وہ تحریک شروع ہو جائے گی جو پچھلے سات برسوں میں مسلم لیگ، پیپلز پارٹی اور ایم ایم اے شروع نہیں کر سکی اور تیسری ویم پیاد جیسی صورت حال ہے، حکومت کو سپریم جوڈیشل کونسل میں اپنا موقف ثابت کرنے کے لئے وکیل نہیں مل رہے، چیف جسٹس کے خلاف ریٹرنس کی شروعات نسیم بخاری نے کی تھی، نسیم بخاری نے فروری میں چیف جسٹس کے خلاف ایک خط لکھا تھا جس میں انہوں نے انتخار محمد چودھری کی ذات کو بدفہم تخریب بنایا تھا، یہ خط پاکستان اور بیرون پاکستان بڑی سطح پر پڑھا گیا تھا لیکن حکومت نے

جوں ہی چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس دائر کیا نسیم بخاری کیلئے عدالتوں میں جانا مشکل ہو گیا وہ پچھلے دنوں سندھ کی ایک عدالت میں پیش ہوئے تو وکلاء نے ان پر حملہ کر دیا، پنجاب کی ایک تحصیل میں ان کا ایک ہم شکل پت گیا اور ایک ریستوران میں دبیروں نے انہیں کھانا دینے سے انکار کر دیا، حکومت نے ریفرنس کیلئے جناب شریف الدین پیرزادہ سے رابطہ کیا لیکن انہوں نے بھی انکار کر دیا، یہ شریف الدین پیرزادہ کی طرف سے کسی حکومت کو پہلا انکار تھا، حکومت نے بڑی مشکل سے انہیں منایا اور وہ مئی کے مہینے میں عدالت میں پیش ہونے لگے، حکومت نے فخر الدین جی ابراہیم، ایس ایم ظفر اور حفیظ پیرزادہ سے بھی رابطہ کیا لیکن انہوں نے بھی "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" جیسا جواب دے دیا، حکومت نے سرکاری اکیلوں اور ایڈووکیٹ جنرلوں کو حکم دیا لیکن انہوں نے بھی استغفوں کی دھمکیاں دے دیں اس نازک وقت میں صرف خالد راغما اور وسیم جاد جیسے جرأت مند اکیلوں نے سرحد کی بازی لگانے کا فیصلہ کیا لیکن وہ بھی اس وقت شدید دباؤ کا شکار ہیں، خالد راغما کو ٹرس میں داخل نہیں ہو پائے وہ اب سڑک پر بھی نہیں نکل پاتے، مختلف پارٹنریس ان کی رکنیت منسوخ کر رہی ہیں جبکہ وسیم جاد کے ساتھ ہونے والا سلوک آپ ملاحظہ فرمائیے، جس سے یوں محسوس ہوتا ہے اگر یہ مقدر سلبا چلا تو حکومت کے سامنے کوئی جگہ نہیں ہے اور حکومت کیلئے اپنا دینی ثابت کن شکل ہو جائے گا۔

مجھے اس سارے منظر میں وسیم جاد کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ انتہائی دلچسپ اور سبق آموز محسوس ہوتا ہے، یہ بنیادی طور پر معاشرے کا احتساب تھا، یہ واقعہ ثابت کرتا ہے جب معاشرہ کسی شخص کا احتساب کرتا ہے یا جب عام شخص کی عدالت کسی کے خلاف فیصلہ دیتی ہے تو "ملزم" کے پاس اس فیصلے کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، بالغ معاشرے عدالتوں سے باہر بھی فیصلے کیا کرتے ہیں اور یہ فیصلے معاشروں کا اصل حسن ہوتے ہیں، ذرا تصور کیجئے وسیم جاد کے ساتھ جو کچھ کراچی ہائیکورٹ کے باروم میں ہوا یا ان کے ساتھ جس لہجے میں صلاح الدین گنڈاپور نے گفتگو کی اگر یہ لہجہ اور یہ صورتحال وسیم جاد اور خالد راغما کے ساتھ پورے ملک میں پیش آنے لگے اور لوگ جہاز میں ان کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیں، انہیں ریستورانوں میں کھانا سرون کیا جائے، یہ لوگ سنوروں سے سودا سلف نہ خرید سکیں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلباء ان کے بچوں کو روک کر سوال پوچھنا شروع کر دیں، لوگ ان کی تقریبات کا بائیکاٹ کر دیں، میڈیا انہیں بلانا چھوڑ دے اور لوگ ان کے ساتھ کھڑا ہونے سے پرہیز کرنے لگیں تو ان کا کیا بنے گا؟ میرا خیال ہے یہ لوگ بھی جلد دوسرے وکلاء کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ بھی

حکومت کا ساتھ دینے سے پہلے دس دس مرتبہ سوچیں گے، ہم اگر اس صورتحال کو ذرا سا پھیلا کر دیکھیں، اگر ہم اس میں مارشل لا لگانے والوں کو بھی شامل کر لیں، اگر ہم حکومتی پارٹیوں میں شامل ہونے والے سیاستدانوں اور وزراء کو بھی اس کینگری میں ڈال دیں اور اگر لوگ و سیم جہاد کی طرح ان کا احتساب بھی شروع کر دیں تو شاید پورے ملک کا قبلہ درست ہو جائے اور کوئی طالع آزماس کے بعد ملک کے مقدر سے کھیلنے کی جرأت نہ کرنے عام شخص کی نظر اور عوام کی نفرت دنیا کی سب سے بڑی عدالت ہوتی ہے اور جب تک معاشرے اس عدالتی نظام میں داخل نہیں ہوتے اس وقت تک ان میں قی اور پٹریاں قسم کی سوچ جنم لیتی رہتی ہے اس وقت تک وہ ترقی نہیں کرتے چنانچہ میرا خیال ہے جناب و سیم جہاد کے ساتھ ہونے والے سلوک کا کیڑا ذرا سا وسیع ہونا چاہیے یہ فارمولا دوسرے سیاستدانوں اور فوجی حکمرانوں پر بھی آزما دیا جانا چاہیے، میں نے ایک بار برطانیہ کے ایکسٹرنل جرنل سے پوچھا تھا "کیا فوج برطانیہ میں مارشل لا نہیں لگا سکتی" اس نے فوراً جواب دیا تھا "بالکل لگا سکتی ہے، دنیا کی ہر فوج اپنے ملک میں مارشل لا لگا سکتی ہے" میں نے اس کے بعد پوچھا "مگر تم لوگ کیوں نہیں لگاتے" اس نے بڑا خوبصورت جواب دیا تھا "اس کا کہنا تھا ہم مارشل لا لگا تو لیں گے لیکن ہمارے عوام اسے تسلیم نہیں کریں گے" اس کو رائے جرنیل سے مجھے معلوم ہوا تھا وہ امریکی رائے دنیا کی سب سے بڑی عدالت ہوتی ہے اور جب تک یہ رائے نہیں جاتی اس وقت تک قوموں کا مقدر سویا رہتا ہے، آج پانچ دیکھوں کی رائے نے حکومتی وکیل کو چائے کی پیالی ختم نہیں کرنے دی، ذرا سوچئے جب سولہ کروڑ لوگوں کی رائے جاگ اٹھے گی تو اس وقت ہمارے ان حکمرانوں کا کیا بنے گا جو آئین، قانون، دستور اور اخلاقیات پر دستر خوان بچھا کر کاک نیل پارٹیاں کر رہے ہیں، جو اس ملک کو "سافٹ ٹارگٹ" سمجھ رہے ہیں، میرا خیال ہے ہم بڑی تیزی سے اس بڑی عدالت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔



لیگل پروفیشنلز

وسیم سجاد صاحب ملک کے نامور سیاستدان اور قانون دان ہیں وہ چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف دائر ریفرنس میں حکومت کے وکیل بھی ہیں۔ میں نے چند دن قبل ایک کالم میں وسیم سجاد کا ذکر کیا تھا یہ کالم کراچی بار روم میں وسیم سجاد کے ساتھ پیش والے ایک واقعے کے بارے میں تھا۔ وسیم سجاد کراچی بار میں چائے پینے گئے تھے لیکن وہاں موجود ایک وکیل گنڈاپور نے انہیں بار روم سے چلے جانے کا "مشورہ" دیا اور وسیم سجاد اس مشورے کے احرام میں بار روم سے باہر چلے گئے اس کالم کے رد عمل میں وسیم سجاد نے گزشتہ روز مجھے خط لکھا جس میں انہوں نے فرمایا "مجھے چائے پر کراچی بار کے چند دکھاہ نے مدعو کیا تھا چائے بھی وہاں پیئے وکیل ساتھیوں نے منگوائی تھی آپ نے درست لکھا بار روم میں اس وقت دکھاہ کی تعداد کم تھی یہ بھی درست ہے ایک وکیل جن کا نام بعد میں گنڈاپور صاحب معلوم ہوا وہ میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے مجھے کہا تھا آپ یہاں سے چلے جائیں کیونکہ آپ وفاقی حکومت کے ریفرنس میں وکیل ہیں یہ درست ہے میں اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے فوراً چلا گیا تھا لیکن میں نے ان سے کوئی بحث کی تھی اور نہ ہی مجھے وہاں کسی نے گھورا تھا میں نے وہاں ناراض لہجہ بھی اختیار نہیں کیا تھا مجھے اس کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی تھی میں لیگل پروفیشن سے تعلق رکھتا ہوں اور ایک وکیل کی حیثیت سے وفاقی حکومت کی نمائندگی کر رہا ہوں میں یہ کام صرف عدالت میں کروں گا یہ ایک وکیل کا حق ہے لوگ عدلیہ کی

آزادی کو بجا طور پر اہمیت دیتے ہیں لیکن اتنا ہی اہم تصور وکالت کی آزادی بھی ہے۔ یہ جمہوری روایات کا حصہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک وکیل جس جانب سے چاہے پیش ہو اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنے موکل کا دفاع کرے اگر دفاع کی Case کی Popularity کی بنا پر کیا جائے تو پھر وکلاء اپنا فرض ادا نہیں کر سکیں گے۔ وکلاء نے ہمیشہ Rule of Law کیلئے جدوجہد کی ہے لیکن وکالت کی آزادی کے تحفظ کے بغیر ملک میں Rule of Law کا نفاذ امور ہوگا۔

میں نے وہیم سجاد کے قانونی اور "وکیلانہ" حق کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا رد عمل آپ کے سامنے پیش کر دیا لیکن جہاں تک ان کے موقف کا تعلق ہے تو مجھے اس سے اتفاق نہیں! میں اپنے اعتراضات کی وضاحت آگے چل کر کروں گا! ہم سرے دست وہیم سجاد کے خط کی ابتدائی سطروں کی طرف آتے ہیں وہیم صاحب نے تسلیم کیا کہ ان صاحب نے ان سے کراچی بار روم سے جانے کا "کہا" تھا اور وہ اس "کہا" کے "احرام" میں اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے چلے گئے تھے وہیم سجاد نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ان صاحب نے انہیں چیف جسٹس کیس میں حکومت کی

وکالت پر بار روم سے نکل جانے کی درخواست کی تھی چنانچہ وہیم سجاد کے ان دونوں اعتراضات کے بعد صرف "بے عزتی" کے سائز اور وزن کا تخمینہ پیچھے رہ جاتا ہے میں یہ سمجھتا تھا کہ کراچی بار روم میں وہیم سجاد کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بے عزتی تھی لیکن وہیم سجاد سے بے عزتی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں ان کا خیال ہے کسی بار روم میں کوئی جونیئر وکیل کسی سینئر وکیل کسی سابق چیئر مین ایٹ اور کسی سابق صدر کو چائے پینے سے روک دے یا حکومت کی وکالت کے جرم میں اسے بار روم سے چلے جانے کا حکم دے دے اور بار روم میں موجود وکلاء اس جونیئر وکیل کی "بد تمیزی" پر خاموش رہیں اور سینئر وکیل بار روم سے چپ چاپ نکل جائے اور اس بد تمیزی پر بار روم کی انتظامیہ جونیئر وکیل کے خلاف کسی قسم کی تادیبی کارروائی نہ کرے اور پاکستان بھر کے وکلاء اس جونیئر وکیل کو اس "بد تمیزی" پر سہارا دیا پیش کریں تو یہ بے عزتی نہیں ہوتی! میں نے جب سے وہیم سجاد کا یہ جواز پڑھا ہے مجھے انشورنس ایجنٹوں کا ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے آج انشورنس ایک باعزت اور قابل تعہد پیشہ ہے لیکن لوگ ابتدائی دنوں میں انشورنس کے تصور "انشورنس کمپنیوں اور انشورنس ایجنٹوں کو پسند نہیں کرتے تھے یہ لطیفہ اس دور سے متعلق ہے انشورنس کے ابتدائی دنوں میں کسی جونیئر انشورنس ایجنٹ نے اپنے سینئر سے شکایت کی "سر ہمارا پیشہ بہت اچھا ہے ہمیں اس پیشے میں ایوارڈ اور ریوارڈ بھی ملتا ہے اور ہم لوگوں کو معاشی منانیت بھی فراہم کرتے ہیں لیکن سراسر اس کے

ہاں جو ہمارے ساتھ لوگوں کا رویہ اچھا نہیں ہوتا، لوگ ہماری بے عزتی کرتے رہتے ہیں۔ سینئر نے جو نیوز ایجنٹ کی شہادت کی طرف دیکھ کر یوں کہا اور جو نیوز کی طرف دیکھ کر یوں کہا "نوجوان تم لوگوں نے ایک آئیڈیل دور میں پروفیشن جوائن کیا، جب ہم لوگ اس پیشے میں داخل ہوئے تھے تو لوگ ہم پر کچھ نہ کی تو کڑیاں الٹ دیتے تھے وہ ہم پر کتے چھوڑ دیتے تھے اور پورا معاملہ لڑ کر ہمیں گالیاں دیتا تھا لیکن ہماری بے عزتی کبھی نہیں ہوئی" سینئر کا اور دوبارہ گویا ہوا "نوجوان بے عزتی صرف محسوس کرنے والی چیز ہوتی ہے اگر تم محسوس نہ کرو تو دنیا کا کوئی شخص تمہاری بے عزتی نہیں کر سکتا لہذا جب بھی کوئی شخص تمہاری بے عزتی کرنے لگے تو تم فوراً ہمارے بارے میں سوچو اور محسوس کرنا بند کرو۔ تمہاری بے عزتی نہیں ہوگی" اگر اس سینئر انشورنس ایجنٹ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو واقعی اس سارے کھیل میں وہیم سجاد کی بے عزتی نہیں ہوئی تھی وہ چائے پینے کیلئے باروم گئے تھے، گنڈاپور صاحب نے انہیں اٹھا دیا، وہ چپ چاپ اٹھ کر باہر چلے گئے اور دوسری جگہ بیٹھ کر چائے پی لی لہذا اس میں بے عزتی والی کیا بات تھی!۔

وہیم سجاد نے غلط نہیں اپنے لیگل پروفیشن پر بھی فخر کا اظہار کیا، میں ان کے اس اعزاز کو تسلیم کرتا ہوں، یہ حقیقت ہے کہ قانون دنیا کا باعزت ترین پروفیشن اور دکھ اور محاسروں کے معزز ترین لوگ ہوتے ہیں، یہ لوگ مظلوموں کو انصاف لے کر دیتے ہیں اور اللہ اور معاشرے کی نظر میں انصاف دینے اور انصاف میں مدد دینے والے لوگ دونوں انتہائی معزز سمجھے جاتے ہیں، میں یہاں تک وہیم سجاد کے اعزاز سے اتفاق کرتا ہوں لیکن جوں ہی وہ فرماتے ہیں "میں وکیل کی حیثیت سے وفاقی حکومت کی نمائندگی کر رہا ہوں" تو ان سے میرے اختلافات شروع ہو جاتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں لیگل پروفیشن ایک نوبل پروفیشن ہوتا ہے لیکن اس پروفیشن کو نوبل رکھنا وکیل کی ذمہ داری ہوتی ہے، دنیا کا بہترین وکیل جب عدالت میں کھڑا ہو کر شیطان کی وکالت کرے گا یا وہ وقت کے فرعون، نمرود یا بیزید کا وکالت ناسرے لے کر عدالت میں چلا جائے گا تو اس کا پروفیشن صرف پروفیشن بن کر رہ جائے گا اس سے "نوبلٹی" ختم ہو جائے گی، لوگ اس وکیل پر تہمت کریں گے اس میں کوئی شک نہیں وہیم سجاد وکیل تک ایک "نوبل لیگل پروفیشنل" تھے لیکن آج انہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ صرف "پروفیشنل" بن چکے ہیں اور ان کے ایک وکالت نامے کی وجہ سے ان کے ساتھی ان سے نفرت کر رہے ہیں، ایمان اور ایمانداری کے بغیر پروفیشن پروفیشن نہیں رہتے وہ ریڈی کا کوٹھا بن جاتے ہیں اور میرے محترم وہیم سجاد کوٹھوں کے دور میں داخل ہو گئے ہیں لیکن ان کا اصرار ہے

ان کی اس ایمان فروشی کے باوجود ان کی عزت کی جائے انہیں نگریم دی جائے انہیں یہ عزت اب صرف بازار سے مل سکتی ہے معاشرے سے نہیں وہیم سجاد نے اپنے رد عمل میں "وکالت کی آزادی" کا ذکر بھی کیا، میں ان کی اس آزادی کا احترام بھی کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ پوچھنے کی جسارت بھی کرتا ہوں، کیا معاشروں کیلئے وکالت کی آزادی ضروری ہوتی ہے یا انصاف کی وہیم سجاد نے وکالت کی آزادی کو جمہوری روایات کا حصہ بھی قرار دیا، میں ان کی یہ بات بھی تسلیم کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ پوچھنے کی جسارت بھی کرتا ہوں، وہ کس جمہوریت اور کون سی روایات کی بات کر رہے ہیں، جس ملک میں وہیم سجاد جیسے قانون دان یونیفارم کے سامنے میں پناہ لے لیں اور جس میں وہیم سجاد جیسے "ریگل پروفیشنل" سینٹ کے ٹکٹ کیلئے اپنی وفاداریاں اور اپنی سیاسی وابستگیاں بدل لیں اس ملک میں روایت اور جمہوریت کہاں باقی رہتی ہے۔

وہیم سجاد نے فرمایا "وکلاء نے ہمیشہ رول آف لاء کیلئے جدوجہد کی اور وکالت کی آزادی کے تحفظ کے بغیر رول آف لاء کا نفاذ احمور ہوگا" میں ان کے اس نکتے سے بھی اتفاق کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی ان سے یہ پوچھنے کی جسارت بھی کرتا ہوں، اگر وہیم سجاد اور خالد رانجھا رول آف لاء کے لئے لڑ رہے ہیں تو ملک کے باقی ڈیز ہڈ لاکھ وکیل کس کیلئے لڑ رہے ہیں یہ لوگ کالے کوٹ پہن کر بریسر سے دن سڑک پر کیوں آجاتے ہیں اور یہ لوگ سپریم کورٹ کے سامنے احتجاج کیوں کر رہے ہیں وہیم سجاد نے اپنے خط میں جمہوری روایات کا حوالہ دیا تھا، میں ان سے عرض کرتا چاہتا ہوں، جمہوریت کا پہلا اصول اکثریت ہوتی ہے، جمہوریت میں اکثریت ہمیشہ سچی اور اقلیت جھوٹی ہوتی ہے، لیکن چیف جسٹس کے معاملے میں حکومت اور وہیم سجاد دونوں یہ اصول مانتے کیلئے تیار نہیں ہیں، اس معاملے میں وہیم سجاد اور خالد رانجھا جیسے دو "ریگل پروفیشنل" خود کو سچا کہتے ہیں جبکہ فخر الدین جی ابراہیم سے ایس ایم ظفر تک باقی ڈیز ہڈ لاکھ وکیلوں کو غلط اور غیر جمہوری سمجھتے ہیں، کیا یہ سچ ہے؟ میں آخر میں مزید وہیم سجاد سے پوچھتا چاہتا ہوں، معاشروں کو رول آف لاء چاہیے یا رول آف جسٹس، اگر معاشروں کو رول آف جسٹس چاہیے تو پھر ہمیں ماننا پڑے گا اس نکلزم آف جسٹس کا چیف اس وقت خود انصاف مانگ رہا ہے اور وہیم سجاد اور خالد رانجھا جیسے "ریگل پروفیشنل" اس انصاف کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں۔

(نوٹ:- اگر جناب وہیم سجاد اور خالد رانجھا چیف جسٹس آف پاکستان کا کیس سپریم

کورٹ کے بجائے اخباری صفحات اور کالموں میں لڑنا چاہیں تو میں حاضر ہوں)

وہ کون ہے؟

کراچی کی ایک شاہراہ پر تین نعشیں پڑی تھیں، نعشوں کے قریب ایک گاڑی جل رہی تھی اور پورے شہر سے احوال اٹھ رہا تھا اس نے اخبار میرے سامنے دکھا اور ان نعشوں پر اٹھی روک کر پوچھا "یہ کون لوگ ہیں" میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس نے ذرا دیر بعد دوسرا سوال کیا "انہیں کس نے مارا" میں اس سوال پر بھی خاموش رہا اس نے ذرا توقف کے بعد تیسرا سوال کیا "یہ سب کون کر رہا ہے" لیکن میرے پاس اس سوال کا جواب موجود تھا میں نے فوراً جواب دیا "خوف"۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا میں نے اس سے عرض کیا "بزرگ کہتے ہیں ہاتھی جب خوفزدہ ہوتا ہے تو وہ جنگل میں اندھا دھند بھاگتا ہے اور وہ راستے میں آنے والی ہر چیز کو پکٹتا چلا جاتا ہے طاقتور لوگ بھی ہاتھی کی طرح ہوتے ہیں یہ لوگ جب خوفزدہ ہوتے ہیں تو یہ بھی راستے کی ہر رکاوٹ گراتے پلے جاتے ہیں" میں رکا اور دوبارہ عرض کیا "یہ طاقتور لوگ خوف کے عالم میں ہمیشہ نعشوں کے پیچھے پناہ لیتے ہیں" وہ بڑی دیر تک میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اس نے آخر میں ایک لمبی آہ بھری اخبار اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

یہ بارہ مئی کی آہ تھی 9 مارچ اور 12 مئی کے درمیان واقعات کا ایک سمندر خائل ہے دیکھنے والے واقعات کی رفتار اور ترتیب پر حیران ہیں 9 مارچ 2007ء سے پہلے صدر پرویز مشرف حکومت کے پاس بے شمار راستے تھے حکومت چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری اور سپریم

کورٹ آف پاکستان کے اختیارات کو تسلیم کر لیتی، عدالت کے تمام احکامات پر چپ چاپ عملدرآمد کرتی اور اپنی نیک نامی میں اضافہ کرتی رہتی، صدر صاحب دہرے کے مطابق یونیفارم اتارنے اور مقبول ترین سوئیلین لیڈر کی حیثیت سے دوبارہ سندھ صدارت پر فائز ہو جاتے اور حکومت بے نظیر بھٹو کے ساتھ ڈیل کر لیتی، اکتوبر میں الیکشن کرائی اور اگلے پانچ برس کیلئے اقتدار میں آ جاتی لیکن پھر چاہا کہ نو مارچ آیا اور حکومت کیلئے "آپشن" محدود ہوتے چلے گئے، میں نے چند دن پہلے ایک سابق سیکرٹری سے پوچھا تھا، صدر صاحب بڑے سکون سے حکومت کر رہے تھے، انہیں 9 مارچ کا "کنا" کھولنے کی کیا ضرورت تھی، سیکرٹری صاحب نے مسکرا کر جواب دیا "یہ بحران صدر صاحب نے پیدا نہیں کیا تھا، یہ آمریت اور اتھارٹی کا پیدا کردہ کرائس تھا، آمریت کبھی سکون سے نہیں بیٹھ سکتی، وہ ہمیشہ بحران پیدا کرتی ہے، میں نے ان کی بات سنی اور خاموش ہو گیا، نو مارچ کے بعد بھی حکومت کے پاس تین آپشن تھے، حکومت چیف جسٹس کے خلاف وائر ریفرنس واپس لے لیتی جس کے نتیجے میں سارا ایشو "لٹوز" ہو جاتا، حکومت سپریم جج ڈی ایچ کوٹل پر "ورک" کرتی اور اپنی مرضی کے مطابق حاصل کر لیتی اور تین حکومت میرٹ پر فیصلے کا انتظار کرتی، اگر سپریم کورٹ چیف جسٹس کو بحال کر دیتی تو حکومت یہ فیصلہ چپ چاپ قبول کر لیتی لیکن ان تینوں آپشنز سے پہلے ایک نئی صورت حال نے جنم لے لیا، چیف جسٹس نے ملک بھر کے دورے شروع کر دیے اور ان کے اعزاز میں تاریخی جلوس نکھنے گئے، لوگ دیوانہ وار سڑکوں پر آ گئے، اس صورت حال کے بعد بھی حکومت کے پاس ایک راستہ موجود تھا، حکومت چیف جسٹس کو جلنے، جلوس اور ریفرنس کی کھلی اجازت دے دیتی، ملک میں گرمی کی شدید لہر آ چکی تھی، لوگوں کیلئے دو بیخے بعد باہر نکھنا مشکل ہو جانا تھا، مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے چودھری شجاعت حسین نے حکومت کو یہ مشورہ دیا تھا، صدر صاحب اس پر رضامند بھی تھے لیکن اس میں ایک خطرہ تھا، اپوزیشن پارٹیاں تیزی سے چیف جسٹس کے سامنے میں پناہ لے رہی تھیں اور حکومت کے بعض اہم خواہوں کا خیال تھا، یہ چھوٹے چھوٹے ندی نالے لڑ لڑ کر سیلاب کی شکل اختیار کر لیں گے اور یہ سیلاب آنے والے دنوں میں ساری حکومت کو بہا لے جائے گا، چنانچہ حکومت نے سیلاب کے سامنے بند باندھنے کا فیصلہ کر لیا، ایک طرف یہ سارے آپشن چل رہے تھے اور دوسری طرف حکومت، نچوں پر بھی "ورک" کر رہی تھی، ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی نے دو بیخے قبل سپریم کورٹ کے سب سے تیز ترین جج اور قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان واس سے ملاقات کی، کوشش کی لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا، حکومت

نے اسلام آباد میں عوام کے ٹھانہیں مارتے سمندر سے خطاب کیا اور کراچی کے واقعات کو "عوامی طاقت" قرار دیا، ابھی کراچی کے قتل عام کے دو چھ نہیں دھلے تھے کہ 14 مئی کو سپریم کورٹ کے ایڈیشنل رجسٹرار سید حماد رضا کو قتل کر دیا گیا، سید حماد رضا ڈی ایم جی افسر تھے اور انہیں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری ڈپٹی سیشن پر سپریم کورٹ لائے تھے، وہ چیف جسٹس کے سٹاف افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے اور ان کے بہت قریب سمجھے جاتے تھے، سید حماد رضا کے قتل نے ایک بار پھر سارے نظام کو ہلا کر رکھ دیا، 14 مئی کی سہ پہر جب سپریم کورٹ کے سیکرٹریج تعزیت کیلئے سید حماد رضا کے گھر پہنچے تو مرحوم کی بیوہ شبانہ حماد نے اسے "نارگٹ کلنگ" قرار دیا، ان کا کہنا تھا خفیہ اداروں کے اہلکار ان کے خاوند کو پھیلے کئی دنوں سے "ڈمی بریفنگ" کیلئے بلارہے تھے، ڈمی بریفنگ کے ان سیشن کے دوران حماد رضا سے چیف جسٹس اور ان کی فیملی کے بارے میں پوچھا جاتا تھا، حماد رضا کو وعدہ معاف گواہ بننے کی پیش کش بھی کی گئی تھی، لیکن حماد رضا نے انکار کر دیا، جس پر اسے قتل کر دیا گیا، حماد رضا کی بیوہ کا کہنا تھا یہ قتل بنیادی طور پر ججوں کیلئے وارننگ ہے، اگر ہم 9 مارچ کے بعد میڈیا کی صورت حال دیکھیں تو یہ بھی سید حماد رضا سے ملتی جلتی ہے، ان دو ماہ میں وہ مقبول ملکی ویرن جینٹلو پر حملے ہو چکے ہیں، 12 مئی کو "آج" ٹیلی ویرن پر ہونے والا حملہ انتہائی انسوسناک تھا، اس حملے کے دوران "آج" کے کارکن جس کرب سے گزرے اور انہوں نے جس صورت حال میں اپنی پروفیشنل ذمہ داریاں پوری کیں اس نے بھی عالمی سطح پر حکومت کا ایجنٹ ٹھیک ٹھاک خراب کیا۔

ہم اگر موجودہ صورت حال کا تجزیہ کریں تو یوں محسوس ہوتا ہے کوئی طاقت میڈیا، ججوں اور عوام تینوں کو ڈرانے کی کوشش کر رہی ہے، کوئی ہے جو خوف کے عالم میں پورے معاشرے کو خوفزدہ کر رہا ہے، وہ کون ہے! میرا خیال ہے اس کا نام صدر پرویز مشرف ہے!



ہم لوگوں نے تو

وہ شخص تپتی دھبہ میں سڑک پر دوپانہ دار بنا جا رہا تھا، کبیرہ بھی اس کے چہرے پر آتا تھا، کبیرہ بھی اس کے حرکت کرتے ہاتھوں کو سوزوم، مگر تا تھا اور کبیرہ بھی اس کے ننگے پاؤں کو "ٹوکس" کر لیتا تھا، آسمان سے آگ برس رہی تھی اور سڑک دوزخ کی طرح تپ رہی تھی لیکن وہ شخص سرستی کے عالم میں ناچتا چلا جا رہا تھا، غیر فعال چیف جنس افتخار محمد چوہدری کا قافلہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا، ذمہ والے ذمہ لے رہے تھے اور اڈوڈ جیکر سے ٹرے بلند ہو رہے تھے، کبیرہ میں ایک لمحے کیلئے ہجوم کی طرف گھوما تو تاحہ نظر گاڑیاں ہی گاڑیاں اور لوگ ہی لوگ تھے، افتخار محمد چوہدری کبیرہ بھی ہاتھ گاڑی سے باہر نکال کر لہراتے تھے اور لوگ ان کا ہاتھ دیکھ کر دیوانہ وار نعرے لگاتے تھے۔

میرے دوست نے ٹیلی ویژن کی آواز بند کی اور میری طرف مڑ کر بولا "کیا واقعی چیف جنس استے پاپولر ہیں" میں نے فوراً ٹیلی میں سر ہلا دیا، اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور ٹیلی ویژن سکرین پر نظر ڈال کر بولا "پھر یہ کیا ہے؟" میں نے جواب دیا "یہ حکومت کی غیر مقبولیت ہے" وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا، میں نے عرض کیا "9 مارچ تک افتخار محمد چوہدری ایک غیر مقبول چیف جنس تھے، وہ دکھا، بیورو کریسی اور سماجی جتوں میں زیادہ پسند نہیں کئے جاتے تھے، وہ بھری عدالت میں سینئر دکھا، کوڈ انٹ دیتے تھے، وہ دکھا، مکی درخواست پر کیس بھی

ملتی نہیں کرتے تھے وہ بیورو کریسی کے ساتھ بھی بہت صحیح تھے وہ ایس ایچ اے سے آئی جی اور ڈی سی او سے چیف سیکرٹری تک سب کو "ٹف ٹائم" دیتے تھے وہ ساتھی جموں میں پاپولر نہیں تھے انہوں نے چیف جسٹس بننے کے بعد برسوں سے زیر التوا مقدمے ختم کر دینے تھے وہ خود بھی رات گئے تک دفتر بیٹھے تھے اور ساتھی جموں کو بھی بھنائے رکھتے تھے ان کے ساتھیوں کو پانچ پانچ بجے تک چائے نصیب نہیں ہوتی تھی کام کی کثرت کے باعث چارج دل کے سرٹیس بن گئے جبکہ زیادہ تر ہائی بلڈ پریشر اور ٹینشن کا شکار ہو گئے چودھری صاحب کی ذات سے اگر کسی کو فائدہ پہنچا تو وہ صرف عام لوگ تھے چیف جسٹس اخبار پڑھ کر سو موٹو ایکشن لے لیتے تھے جس کے نتیجے میں ان مظلوموں کو ریلیف مل جاتا تھا جن کی وکیل اور عدالت تک رسائی نہیں ہوتی تھی لہذا اگر جج بولا جائے تو وہ دکھاؤ بیورو کریسی اور ساتھی جموں میں غیر مقبول اور چند ہزار عام شہریوں میں مقبول تھے میرے دوست نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ٹیلی ویژن سکرین کی طرف دیکھ کر بولا "لیکن پھر یہ بیجوم" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا "یہ بیجوم حکومت کے خلاف ریفرنڈم ہے عوام قیادی طور پر حکومت سے ٹھک تھے آخر ہونے کا جانا اور وہ لوگوں کو چاہی کی کوڑا لے بھی کھانا تو بھی عوام اسے زیادہ دیر برداشت نہیں کرتے" میرے دوست نے بڑی بے مبری سے پوچھا "لیکن کیوں" میں نے عرض کیا "اس کی دو بڑی وجوہات ہوتی ہیں اول آمر کو اقتدار میں رہنے کیلئے بے شمار سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں اور ان میں سے ہر سمجھوتہ عوام کی رگوں سے نکلتا ہے اور دوم آمر ہمیشہ طاقت کا بیہودا استعمال کرتا ہے اور عوام یہ دونوں چیزیں برداشت نہیں کرتے چنانچہ ان کے دلوں میں آمر کے خلاف نفرت جنم لینے لگتی ہے ہماری حکومت اور ہمارے جرنل صاحب کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا جرنل پرویز مشرف کو اقتدار میں رہنے کیلئے امریکی ایجنڈے سے سمجھوتہ کرنا پڑا تھا انہیں افغانستان میں امریکی آپریشن کی حمایت کرنا پڑی وہ طالبان اور مجاہدین کی گرفتاریوں پر بھی مجبور ہوئے انہوں نے جنوبی وزیرستان اور قبائلی علاقوں میں بھی فوجی آپریشن کئے انہیں بلوچستان میں فوج کشی بھی کرنا پڑی اور وہ مشرقی روایات میں گوندھے معاشرے کو روشن اور اعتدال پسند بنانے پر بھی مجبور ہو گئے یہ سارے سمجھوتے عوام کو پسند نہ آئے ہمارے صدر سات برسوں میں عوام کیلئے بھی کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہیں دے سکے تھے ان سات برسوں میں پٹرول کی قیمتوں میں تین گنا اضافہ ہوا آٹا دالیں تھی چینی اور چاولوں کے نرخ دو گنا ہو گئے ٹرانسپورٹ کے کرایوں میں سگنا اضافہ ہوا بجلی گیس اور پانی کے بل گھیس سے کہیں پہنچ گئے تعلیم

صحت اور روزگار عام شہری کی زندگی سے دور ہو گیا اور بے روزگاری اپنی انتہائی سطح کو چھونے لگی۔ اس کے علاوہ ملک میں امن و امان اور سیکورٹی کے مسائل بھی پیدا ہو گئے۔ لوگ دن دیناڑے لٹنے لگے پولیس چوروں اور ڈاکوؤں کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہو گئی ڈاکوؤں اور چوروں کی وجہ سے ہر دوکاندار اور ہر صاحبِ محبت شخص گھر پر سیکورٹی گارڈ رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ سونوے تک پرگازیاں لٹنے لگیں اور موٹا بٹل چھیننے کی وارداتیں معمول بن گئیں۔ عام شہری اس سے بھی بری طرح متاثر ہوا۔ جنرل صاحبِ احتساب کا نعرہ لگا کر اقتدار میں آئے تھے، نیب نے شروع میں غیر جانبداری دکھائی، ماضی کے تمام کرپٹ سیاستدان گرفتار کر لئے گئے لیکن پھر ان تمام کرپٹ سیاستدانوں کو جمع کر کے حکومتی پارٹی بنائی گئی اور اس پارٹی نے بعد ازاں جنرل صاحب کو یو نیفارم اور صدارت کا تختہ دیا۔ اس سارے کھیل کے دوران احتساب کا عمل غیر جانبداری کھو بیٹھا اور لوگ قومی احتساب بیورو کو سرعام انکیشن کیشن کہنے لگے۔ اس کے بعد ہی سبھی کسر گھروں سے غائب ہونے والے لوگوں نے پوری کر دی۔ یہ لوگ اپنے خاندانوں، عزیزوں، رشتے داروں، محلوں اور شہروں میں ایسا ہوا اور ایک کیسے جانتے تھے یہ لوگ گھروں سے غائب ہوئے اور اس کا الزام خلیہ اداروں اور حکومت پر لگا تو عوام کا خون کھول اٹھا۔ ان حالات میں لوگوں کو حکومت کے خلاف کھڑا ہونے کیلئے کوئی بہانہ چاہیے تھا۔ یہ لوگ کسی بڑے واقعے کے منتظر تھے اور 9 مارچ 2007ء کو انہیں وہ بہانہ بھی مل گیا اور افتخار محمد چودھری کی شکل میں لیڈر بھی لہذا آج لوگ 50 سینٹی گریڈ کی گرمی میں سڑکوں پر کھڑے ہیں، میں خاسوس ہو گیا۔

میرے دوست نے پوچھا "کیا تم افتخار محمد چودھری کو لیڈر سمجھتے ہو؟" میں نے ایک بار پھر انکار میں سر ہلا دیا، میرا دوست غور سے میری طرف دیکھنے لگا، میں نے عرض کیا "پاکستان میں اس وقت تین بڑے لیڈر ہیں، محترمہ بے نظیر بھٹو، نواز شریف اور الطاف حسین، لیکن بدقسمتی سے یہ تینوں لیڈر ملک سے باہر ہیں، ان میں سے الطاف حسین حکومت کے اتحادی ہیں، بے نظیر بھٹو ایک کچی پکی ذیل میں بندھی ہوئی ہیں جبکہ میاں نواز شریف کسی ایسے وقت کے انتظار میں لندن میں بیٹھے ہیں، میرا دعویٰ ہے اگر یہ لوگ 2005ء کے بعد ملک میں ہوتے تو اس وقت حالات ان کے ہاتھ میں ہوتے لیکن یہ لوگ ملک میں آنے کی جرأت نہ کر سکے اور جرأت لیڈروں کا پہلا دھفہ ہوتی ہے، عوام بھاگنے یا پشت دکھانے والے لوگوں کو پسند نہیں کیا کرتے، ان حالات میں افتخار محمد چودھری سامنے آئے اور لوگ ان کے گرد جمع ہوتے چلے گئے، تم بتاؤ لوگوں کو چودھری صاحب کی

کس خوبی نے متاثر کیا" وہ خاموش رہا میں نے عرض کیا "وہ مارچ کو حکومت کے سامنے پسا نہیں ہوئے تھے وہ حکومت کے سامنے ڈٹ گئے تھے چنانچہ لوگوں نے انہیں کندھے پر اٹھالیا میں اس فقید المثال استقبال کے باوجود یہ سمجھتا ہوں وہ لیڈر ہیں اور نہ ہی وہ زیادہ دیر تک اس صورتحال کو سنبھال سکیں گے یہ صورتحال اپنے نئے گارڈ فادر پیدا کرے گی اور یہ گارڈ فادر آگے چل کر فائدے اٹھائیں گے" میں خاموش ہو گیا میرے دوست نے آخری سوال پوچھا "کیا حکومت سمجھوتے پر مجبور ہو جائے گی" میں نے ایک بار پھر انکار میں سر ہلادیا میں نے عرض کیا "چیف جسٹس سپریم کورٹ سے بحال ہو جائیں گے لیکن حکومت اس فیصلے کو قبول نہیں کرے گی حکومت کے ماہرین دن رات آئین سے ایسی دفعات تلاش کر رہے ہیں جن کے ذریعے سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد چیف جسٹس کو دوبارہ غیر فعال کیا جاسکے حکومت صدر صاحب کو پارلیمنٹ سے بھی نئے اختیارات لے کر دینے کی پلاننگ کر رہی ہے چنانچہ جب تک حکومت قائم ہے چیف جسٹس واپس سپریم کورٹ نہیں جاسکیں گے" میں خاموش ہو گیا میرا دوست اٹھا اور ذرا دیر سوچ کر بولا "اگر حکومت ریفرنس واپس لے لے تو یہ حاراجمان پنڈتہ منٹ میں ختم ہو سکتا ہے" میں نے ایشیاٹ میں سر ہلایا اور مسکرا کر جواب دیا "ہاں لیکن حکومت ریفرنس واپس نہیں لے گی" میرے دوست نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا میں نے عرض کیا "آمریت پوری دنیا کے سامنے جھک سکتی ہے لیکن وہ اپنے لوگوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کرتی تم نیولین بونا پارٹ سے میسولینی تک دنیا کے تمام آدمروں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو یہ لوگ دشمنوں کے قدموں میں جھک گئے تھے لیکن انہوں نے اپنے لوگوں کے خلاف دائر ریفرنس واپس نہیں لئے" صدر پرویز مشرف بھی اس صورتحال سے نکلنے کیلئے امریکہ سے سمجھوتہ کر لیں گے لیکن وہ افتخار محمد چودھری کے ساتھ ہاتھ نہیں ملائیں گے ہم تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے تو آدھا ملک بھارت کو دے دیا تھا لیکن بنگالیوں کو اقتدار نہیں دیا تھا ہم تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے B کروڑ بنگالیوں کی بات نہیں مانی تھی ہم ایک چیف جسٹس کی بات کیسے مانیں گے"



بجوں کی ذمہ داری باقی ہے

مجھے ایک بار پیر ایم کوورٹ کے موجودہ جسٹس ظلیل الرحمن مدظلہ کے ساتھ سفر کرنے کا اتفاق ہوا تھا یہ 1999ء کا سال تھا عطا الحق قاسمی صاحب اس وقت تاروے میں پاکستان کے سفیر تھے اور جسٹس ظلیل الرحمن مدظلہ کے مہمان تھے 'بزرگ کہتے ہیں اگر کسی شخص کو بکھنا ہو تو اس کے ساتھ سفر کریں اس کے ساتھ کھانا کھائیں اور اس کے ساتھ معاملہ کریں' میں نے اس سال مدظلہ صاحب کے ساتھ سفر بھی کیا 'قیام بھی کیا اور کھانا بھی کھایا بس میں معاملہ نہیں کر سکا جس کا مجھے ابھی تک انوس ہے 'جسٹس صاحب اس وقت لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے اور میری ان کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی اس ملاقات میں جسٹس صاحب کی شخصیت کے بے شمار رنگ میرے سامنے آئے ان رنگوں میں ان کی کیوٹیکیشن پاور جس مزاج اور دانشوری بھی شامل تھی 'میں نے ان ملاقاتوں میں جج کے پردے میں ایک شاندار شخص دریافت کیا' اس ملاقات کی بے شمار یادیں آج تک میرے ذہن میں تازہ ہیں 'مجھے آج بھی یاد ہے جسٹس مدظلہ نے اسلو میں عطا الحق قاسمی کے ڈرائیونگ روم میں بیٹھ کر فرمایا تھا 'انصاف صرف بجوں کی ذمہ داری نہیں 'معاشرے کا ہر شخص جج یا منصف ہوتا ہے اس پر بھی انصاف کی اتنی ہی ذمہ داری ہوتی ہے جتنی بجوں پر 'اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح الفاظ میں تحریر کیا 'تم لوگ انصاف قائم کرو اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا صرف جج انصاف قائم کریں چنانچہ انصاف پورے معاشرے کی ذمہ داری ہوتا

ہے

جسٹس رمدے نے احساس ذمہ داری پر بھی بڑی خوبصورت مثال دی تھی انہوں نے فرمایا تھا "اگر انسان کے پاس سائیکل ہو تو وہ زیادہ سے زیادہ اس کی ہوا چیک کرتا ہے، اگر اس کے پاس موٹر سائیکل ہو تو وہ اس کا پٹرول، انجن، آئل اور بیٹری کا پانی چیک کرے گا، اگر وہ گاڑی کا مالک ہے تو وہ گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے ریفری ایئر کا پانی اور چاروں پہیوں کی ہوا دیکھ لے گا، وہ سینے میں ایک بار گاڑی کا چیک اپ بھی کرالے گا لیکن جب ہوائی جہاز کسی ایئر پورٹ پر اترتا ہے تو اس کا ایک ایک قبضہ، ایک ایک نٹ، ایک ایک بولٹ اور ایک ایک پرزہ چیک کیا جاتا ہے اور جب تک ایئر پورٹ کا انجینئر ٹیم ڈیپارٹمنٹ مطمئن نہیں ہو جاتا اس وقت تک جہاز کو اڑنے کی اجازت نہیں دی جاتی" جسٹس ظلیل رمدے کا فرمانا تھا "سائیکل اور جہاز کے بارے میں رویے کا یہ فرق ذمہ داری کی وجہ سے ہے، ہم جانتے ہیں اگر سائیکل یا موٹر سائیکل خراب ہوگا تو اس سے صرف ایک شخص کو کوئی ہونگی، اس طرح اگر گاڑی ایکسیڈنٹ کا شکار ہو جائے تو اس سے چند لوگوں کی جان جائے گی لیکن جہاز میں سینکڑوں لوگ سوار ہوتے ہیں چنانچہ جب جہاز حادثے کا شکار ہوتا ہے تو نہ صرف اس میں سوار لوگ جان سے جاتے ہیں بلکہ وہ زمین پر سوچو دھار توں اور لوگوں کیلئے بھی خطرہ بن جاتا ہے لہذا جہاز کی سائیکل، موٹر سائیکل، گاڑی اور بس سے زیادہ پڑتال کی جاتی ہے" جسٹس صاحب کا فرمانا تھا "انسان سماجی لحاظ سے جوں جوں ترقی کرتا ہے اس کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ بلند مرتبہ لوگوں کو جہاز کی طرح اپنے کیل قبضوں اور نٹ اینڈ بولٹس کا خیال رکھنا چاہیے" اس دور میں بل کنٹین امریکہ کے صدر تھے، جسٹس رمدے نے بل کنٹین کی مثال دیتے ہوئے فرمایا تھا "فرض کریں اگر آپ اور میں پاگل ہو جائیں تو ہمارے پاگل پن کا نقصان صرف چند لوگوں کو پہنچے گا لیکن اگر بل کنٹین پاگل ہو جائے تو وہ آدمی دنیا کو تباہ کر دے گا چنانچہ بل کنٹین کو ہر فیصلے سے پہلے پچاس مرتبہ سوچنا چاہیے، اسے اپنی محبت یا نفرت کے اظہار سے پہلے ہاتھ اٹھانے، ہلانے اور گرانے سے پہلے دس دس مرتبہ سوچنا چاہیے کیونکہ اس کی ایک جنبش ایک حرکت کے ساتھ لاکھوں کر دڑوں لوگوں کی زندگیاں وابستہ ہیں" جسٹس صاحب نے امریکہ کے صدر روز ویلٹ کی مثال بھی دی تھی ان کا فرمانا تھا "روز ویلٹ نے 1945ء میں جاپان پر ایٹم بم گرانے کا حکم دے دیا تھا، ذرا سوچئے ان کے ایک حکم سے کتنے لاکھوں لوگوں کی زندگیاں چلی گئیں، آپ تصور کیجئے اس شخص کے پاس اتنا خوفناک اختیار تھا اور اس کے اس اختیار

کے ایک غلط استعمال کا کیا نتیجہ نکلا؟

جسٹس ظلیل الرحمن رمدے کے ساتھ وہ سفر وہ ملاقاتیں اور یہ ساری باتیں ماضی کا قصہ بن گئیں لیکن آج 24 مئی 2007ء کو جب میں نے اخبارات اٹھائے اور اخبارات میں جسٹس ظلیل الرحمن رمدے کے بیانات پڑھے تو مجھے 1999ء کی وہ گرمیاں، اوسلو کی وہ شامیں اور جسٹس صاحب کے ساتھ ہونے والی وہ ساری گفتگو یاد آگئی، جسٹس ظلیل الرحمن رمدے اس وقت چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے خلاف صدر پرویز مشرف کے دائرہ کردہ ریفرنس کی سماعت فرما رہے ہیں اس سماعت کیلئے قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس نے 13 بجوں کا بیج بنایا تھا اور جسٹس ظلیل الرحمن رمدے اس بیج کے سربراہ ہیں، 23 مئی کو بیج کے سامنے ریفرنس کی سماعت تھی اس سماعت کے دوران جسٹس ظلیل الرحمن رمدے نے بڑے دلچسپ ریماڈرکس دیئے تھے انہوں نے فرمایا تھا ”اگر ججوں کو اس طریقے سے نکالا جاتا رہا اور اس کا کوئی مدعا ثابت ہوا تو پھر والدین اپنے بچوں کو بیج نہ بننے کی نصیحت کریں گے“ جسٹس صاحب کے ریماڈرکس 24 مئی کے اخبارات میں شمر شیوں کے ساتھ شائع ہوئے اور مجھے اوسلو کی وہ ساری شامیں یاد کرا گئے اور میں نے فوری طور پر اپنے دلچسپ سے سوال کیا اس وقت پاکستان میں سب سے زیادہ ذمہ دار عہدیدار کون ہے؟ میرے ذہن میں بے شمار لوگ آئے لیکن پھر میری نظر 13 بجوں کے اس بیج پر آ کر رک گئی اور مجھے محسوس ہوا اس وقت پاکستان، پاکستان کی عدلیہ اور پاکستان کے مستقبل کی ذمہ داری ان 13 بجوں پر استوار ہوتی ہے آنے والے کل میں لوگ اپنے بچوں کو بیج بنانا چاہیں گے یا نہیں اس کا فیصلہ بھی اس وقت ان 13 بجوں کے ہاتھ میں ہے اکل پاکستان کے لوگ عدلیہ کے بارے میں کیا سوچیں گے؟ پاکستان میں جمہوریت کی کیا حالت ہوگی؟ پاکستان کے عوام کے پاس کیا حقوق ہوں گے اور دنیا آنے والے دنوں میں پاکستان کے بارے میں کیا سوچے گی اس کا فیصلہ بھی اب 13 بجوں نے کرنا ہے مجھے محسوس ہوتا ہے جسٹس ظلیل الرحمن رمدے اور ان کی ٹیم اس وقت ذمہ داری کی باریک بار پر چل رہی ہے ان لوگوں کی ذمہ داری ہے احتیاطی اس ملک کی رہی کسی ساکھ بھی ختم کر دے گی اور ان لوگوں کا ایک فیصلہ اس ملک کے ان تمام لوگوں کو زبان دے دے گا جن کے منہ پر 60 برس سے خوف کے تالے لگے ہیں۔

مجھے یقین ہے 13 بجوں کا یہ پیش درست فیصلہ کرے گا لیکن اس کے باوجود میں جسٹس رمدے کو اوسلو کی وہ شامیں یاد کرا نا چاہتا ہوں اور ان سے اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں 21 مئی

کو چھپو ملٹی کے دو دو کیلوں نے اپنے تام سے پرویز ہنا کر افتخار لگا دیا تھا " آپ کے فیصلے کے بعد کمپنیاں ایسا نہ ہو یہ لوگ ایک بار پھر اپنا نام تبدیل کر دیں، کمپنیاں ایسا نہ ہو لوگ سپریم کورٹ کی طرف انگلی اٹھا کر کہیں " یہ وہ کورٹ ہے جو اپنے چیف کو انصاف نہ دے سکی " کمپنیاں ایسا نہ ہو لوگوں کا انصاف سے اعتماد اٹھ جائے اور وہ عدالت کی بجائے گلیوں، مخلوں اور بازاروں میں اپنا فیصلہ کرنے لگیں، میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں آج سے تیس برس پہلے کولمبیا میں باغیوں نے سپریم کورٹ پر قبضہ کر لیا تھا ان لوگوں نے جج اور 100 وکیل قتل کر دیئے تھے لیکن ججوں نے ہمت نہ ہاری، 1990ء میں کولمبیا کی سپریم کورٹ نے مافیا کے خلاف مقدمہ سنا شروع کیا تھا تو مافیا بریڈوشی پر عدالت میں بم دھماکہ کرتا تھا اور اس دھماکے میں جج مارا جاتا تھا اس کیس کی سماعت کے دوران 99 جج مارے گئے لیکن اس کے باوجود سماعت جاری رہی اور عدالت نے مافیا لارڈ پابلو اسکوبار کو مجرم قرار دیا، یہ فیصلہ عدل کی تاریخ میں کولمبیا کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سرخرو کر گیا، پاکستان کولمبیا نہیں اور نہ ہی پاکستان میں کولمبیا جیسے حالات ہیں لیکن اس کے باوجود عوام عدالت اور ججوں سے اسی استقامت کی توقع رکھتے ہیں۔ قوم، وکیل اور معاشرہ افتخار محمد چوہدری کیلئے باہر آ کر اپنی ذمہ داری پوری کر چکا ہے اب ججوں کی ذمہ داری باقی ہے بہتر لوگوں کو استقامت اور انصاف کا مظاہرہ کرنا چاہیے، خواہ ہماری عدالت کولمبیا کی عدالت ہی کیوں نہ بن جائے۔



جس طرح

میں دوہنی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اتر تو مجھے محسوس ہوا میں جدید دنیا میں آ گیا ہوں ابھر پورے سے گریڈ حیات ہونے لگا۔ دوہنی میں روشنی اور خوشبو سورتی تھی خوشبو سورتی اور اس میں امن تھا گاڑیوں کی طویل قطاریں اور عمارتوں پر چلتی بھتی روشنیاں خوشحالی اور ترقی کی نوید سنارہی تھیں ہماری گاڑی دوہنی کی مرکزی شاہراہ جبل علی سے گزر رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کیا آج اس شاہراہ پر کھڑے ہو کر کوئی سوچ سکتا ہے 1980 تک اس جگہ ریت کے ٹیلے اونٹوں کے ریوڑ اور نکل بھانڈیاں ہوتی تھیں یہاں خاک اڑتی تھی اور غربت اور بے بسی کاشت ہوتی تھی لیکن پھر اس ملک اس شہر کو ایک وڈرنری شخص ملا اور اس وڈرنری شخص نے ریت کے ان ٹیلوں کا مقدر بدل دیا اس نے ویرانے کو دنیا کے جدید ترین شہر میں تبدیل کر دیا اس وڈرنری شخص کا نام شیخ محمد بن راشد الختوم تھا۔

شیخ محمد 1949ء میں پیدا ہوئے تھے وہ دوہنی کے سلطان شیخ راشد الختوم کے تیسرے صاحبزادے تھے ان کی ابتدائی زندگی عربی شیخوں کی روایتی ثقافت کے مطابق گزری وہ بچپن میں اپنے بھائیوں اور کزنوں کے ساتھ کھیلنے کودتے رہتے تھے اونٹوں پر بیٹھ کر ریس لگاتے تھے یا پھر صحرا میں برن کے پیچھے بھاگتے تھے 4 سال کی عمر میں انہوں نے گھر پر عربی اور اسلام کی تعلیم شروع کی 1955ء میں ان کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی انہیں دوہنی کے احمدیہ سکول میں

داخل کر دیا گیا انہوں نے اس سکول میں عربی انگریزی ریاضی جغرافیہ اور تاریخ کی ابتدائی تعلیم حاصل کی دس سال کی عمر میں وہ اہلباب سکول میں داخل ہو گئے وہ دو سال تک اس سکول میں پڑھتے رہے اس کے بعد انہیں دوہنی کے سینڈری سکول میں داخل کر دیا گیا شیخ محمد کے والد شیخ راشد انھیں فوجی بنانا چاہتے تھے ان کی خواہش تھی شیخ محمد عسکری تعلیم حاصل کریں جس کے بعد انہیں لندن یا امریکہ کی کسی ملٹری اکیڈمی میں داخل کر دیا جائے اور وہاں سے واپس آ کر وہ دوہنی کی فوج کی کمان سنبھال لیں شیخ کی اس خواہش کا پس منظر بہت دلچسپ تھا شیخ کا خاندان کئی نسلوں سے تجارت سے وابستہ تھا تجارت وراثت کی شکل میں ان کے خاندان میں منتقل ہوتی جا رہی تھی ان کے تین بیٹے تجارت سے منسلک تھے لہذا ان کی خواہش تھی ان کا ایک بیٹا سپہ سالار بنے لیکن شیخ محمد کا رجحان ذرا مختلف تھا وہ آرٹ زبان اور فنون لطیفہ میں دلچسپی لیتے تھے جب شیخ نے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ بھیجنے کا فیصلہ کیا تو شیخ محمد نے انگریزی زبان میں داخلہ لینے کا اعلان کر دیا شیخ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہٹ کے کہے تھے لہذا مجبوراً شیخ راشد کو ان کی ہمت ماننا پڑی۔ یوں شیخ محمد اپنے کزن شیخ محمد بن علی نے انھیں ان کے ساتھ برطانیہ چلے گئے وہاں انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی کے مل کالج میں انگریزی زبان میں داخلہ لے لیا جس دن انہوں نے کیمبرج میں قدم رکھا تھا اس دن ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا یہ واقعہ آگے چل کر دوہنی جیسے جدید اور خوبصورت شہر کی بنیاد بنا۔ یہ شیخ محمد کا کلاس میں پہلا دن تھا سب طالب علم ایک دوسرے کو اپنا تعارف کر رہے تھے جب شیخ محمد نے اپنا تعارف کر لیا تو جنوبی امریکہ کے کسی طالب علم نے ان سے پوچھا "آپ انگریزی سیکھ کر کیا کریں گے" وہاں کلاس میں چین کا ایک طالب علم بھی تھا اس نے شیخ پر پھینکی کسی "یہ اونٹوں کو انگریزی سکھائیں گے" کلاس روم میں ایک قہقہہ گونجا اس قہقہے اور چینی طالب علم کی پھینکی نے شیخ کو سوچنے پر مجبور کر دیا شیخ نے سوچا دنیا عربوں کو بدو سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی اس وقت اس کلاس روم میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے فیصلہ کیا وہ دوہنی کو ایک ایسی ریاست بنائیں گے جس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ہوگی لوگ اس کا حوالہ دیا کریں گے شیخ محمد کا یہ عزم آگے چل کر آج کے دوہنی کی بنیاد بنا۔

شیخ محمد جتنا عرصہ یورپ رہے وہ وہاں کے نظام کا محاسبہ کرتے رہے وہ چھٹی کے دن یورپ کے دوسرے ممالک اور شہروں میں نکل جاتے اور وہاں جا کر ان کے طرز تعمیر ان کے حکومتی اور سرکاری نظام ان کی تجارت ان کے بینکوں ان کے ویلفیئر سسٹم اور ان کی طرز گفتگو کا مطالعہ

کرتے وہ یورپ کی ٹیکسیوں، بسوں اور ریلوں میں بیٹھ کر ان کا نظام دیکھتے وہ ان کے انٹرپرائس اور گودیوں کا سسٹم دیکھتے وہ ان کے سیورج، بجلی اور پانی کے نظام کا مطالعہ کرتے اور وہ ان کے سکولوں، ہسپتالوں اور ڈاک خانوں کا جائزہ لیتے جب وہ یورپ کا سارا نظام سمجھ گئے تو انہوں نے نتیجہ نکالا جب تک کسی ملک کا جنس سسٹم بہتر نہیں ہوتا وہ ملک ترقی نہیں کرتا جب تک اس ملک میں سرمایہ کاری نہیں ہوتی وہ ملک آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک اس ملک میں اعتدال پسندی اور روشن خیالی نہیں آتی جب تک اس ملک میں مسجد اور تفریح گاہیں دونوں نہیں بنتیں اور جب تک لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق رقم اور بنیادی سہولتیں نہیں ملتیں اس وقت تک ملک ترقی نہیں کر سکتا وہ واپس دوہی آئے اور انہوں نے نئے دوہی کی بنیاد رکھنا شروع کر دی۔ اس وقت تک متحدہ عرب امارات میں تیل نکل چکا تھا اور شیخ زاہد بن سلطان الزہیان ایک انقلابی جذبے کے ساتھ امارات کی ترقی اور استحکام کا کام شروع کر چکے تھے شیخ محمد نے آگے بڑھ کر زیادہ تر کام اپنے ہاتھ میں لے لیا انہوں نے اسلامی معاشرے کو اعتدال کی راہ پر ڈالا انہوں نے شراہوں کے لئے بہترین شہر اب خانہ، جموں اور یوں کے لئے انتہائی جدید جموں، جواہ خانے اور ملازموں کے لئے دنیا کی بہترین مسجدیں بنا گئیں انہوں نے دنیا جہاں کے سرمایہ کاروں کو دعوت دی اور ان کیلئے روٹیاں کی سر زمین کھول دی انہوں نے دیکھا مشرق اور مغرب کے درمیان کوئی جدید شہر موجود نہیں چنانچہ مشرقی ممالک کے امراء کو علاج، تعلیم، تفریح، شاپنگ، کاروبار اور عیاشی کے لئے لندن، پیرس اور نیویارک جانا پڑتا ہے جس کے نتیجے میں ہر سال مشرق سے اربوں ڈالر مغرب چلے جاتے ہیں انہوں نے سوچا اگر مشرقی ممالک کے امراء کے لئے چند گھنٹوں کی ڈرائیو اور مختصر سی فلانٹ پر ایک ایسا شہر موجود ہو جو کسی بھی طرح یورپ اور امریکہ سے کم نہ ہو تو ان اربوں ڈالر کا رخ مشرق کی طرف پھیرا جاسکتا ہے لہذا آج حالت یہ ہے دنیا میں سب سے اچھی اور سستی تعلیم دوہی میں ملتی ہے دنیا میں سب سے زیادہ شاپنگ، سب سے زیادہ علاج اور سب سے زیادہ تفریح دوہی میں ملتی ہے دوہی دنیا کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر ہے دوہی میں دنیا کا سب سے مہنگا ہوٹل موجود ہے دوہی میں سب سے زیادہ مساجد پارلر ہیں دوہی دنیا کا سب سے بڑا انٹرنیٹ اور دنیا کی سب سے بڑی تفریح گاہ ہے یہ سب ایک شخص کے وژن اور محنت کا نتیجہ ہے اور اس شخص کا نام شیخ محمد بن راشد المنتم ہے۔

میں شیخ محمد بن راشد المنتم کے شہر میں تین دنوں کیلئے آیا ہوں دوہی پہنچ کر میں نے

زیر پبلسٹن 3.....0.....267

محبوس کیا اگر انسان کے پاس وژن، محنت اور حوصلہ ہو تو وہ ریت کے ٹیلوں کو سونا بنا سکتا ہے۔ میری گاڑی میں دو عی کے بارے میں ایک کتابچہ پڑا تھا، میں نے اس کی ورق گردانی شروع کر دی، اس کتابچے میں شیخ محمد بن راشد الختموم کا ایک قول درج تھا، شیخ نے فرمایا تھا "ترقی کیلئے انصاف اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا جانداروں کیلئے آکسیجن" میں نے شیشے سے باہر دیکھا، باہر حد نظر تک ترقی ہی ترقی، خوشحالی ہی خوشحالی تھی، میں نے پردہ کھینچ دیا، آنکھیں بند کیں اور دل میں سوچا، کاش یہ بات کوئی شخص ہمارے ان حکمرانوں کو سمجھا دے جو انصاف کے بغیر ملک کو ترقی دینا چاہتے ہیں جو دیگر کے جنگل میں کپاس بونا چاہتے ہیں جو جھیلوں کی کالی پر جمناسٹک کھیلنا چاہتے ہیں، کاش کوئی ہمارے حکمرانوں کو یہ سمجھا دے انصاف اور قانون کے بغیر معاشرے اس طرح ہوتے ہیں جس طرح پانی کے بغیر دریا، جس طرح چاندنی کے بغیر چاند۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

اکیسویں صدی کے شیخ چلی

شیخ محمد بن راشد الختوم نے 1976ء میں یمن کوئی کی تھی "دہنی 2000 تک دنیا کی چھٹے اور مشرق وسطیٰ میں تیسری ریاست ہوگی اور پوری دنیا سے لوگ یہاں آکر آباد ہوں گے" ان کا یہ بیان اس وقت برطانیہ کے اخبارات میں شائع ہوا تھا اور جس شخص نے بھی یہ بیان پڑھا تھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی یہ مسکراہٹ بجا تھی اس وقت دہنی دنیا کی پسماندہ ترین ریاست تھی پورے شہر کا رقبہ 20 مربع کلومیٹر تھا شہر میں صرف ایک قہری سٹار ہوٹل اور ایک بڑی سڑک تھی لوگ اونٹوں اور گدھا گاڑیوں پر سفر کرتے تھے اور شہر میں پینے کا پانی تک دستیاب نہیں تھا لہذا اس وقت ایک ایسے شہر کے بارے میں یہ دعویٰ اپنا مذاق اڑانے کے مترادف تھا برطانیہ کے ایک اخبار کے رپورٹر نے شیخ سے اس خدشے کا اظہار بھی کیا لیکن اس کے جواب میں شیخ محمد نے جو واقعہ سنایا اس نے پوری دنیا کو حیران کر دیا شیخ نے فرمایا "ہم نے دہنی میں نئی پولیس تشکیل دی ہے کل میں اپنی گاڑی چلاتا ہوں اپنی ہمشیرہ کے گھر گیا میں نے نقلی سے نو پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر دی میں جب واپس آیا تو میری گاڑی کے نائز پر پولیس کا "کلب" پڑھا تھا میں نے آگے پیچھے دیکھا دور سائے میں ایک پولیس کا نشیمل کھڑا تھا میں نے اشارے سے اسے بلایا وہ آیا اور اس نے مجھے سلوٹ کیا میں نے اس سے پوچھا میری گاڑی پر کلب تم نے لگایا ہے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا میں نے اس سے کہا تم مجھے نہیں جانتے اس نے ہاں میں سر ہلا کر جواب دیا آپ

ہمارے شیخ ہیں میں نے کہا 'تم میری گاڑی نہیں پہچانتے تھے' اس نے ہاں میں گردن ہلائی اور احترام سے بولا 'میں پہچانتا ہوں میں نے پوچھا پھر تم نے میری گاڑی پر کلپ کیوں لگایا' اس نے سینٹان کر جواب دیا 'آپ کی گاڑی غلط جگہ پر پارک تھی اور وہی میں شیخ ہو یا کوئی دیگر قانون سب کے لئے برابر ہے مجھے اس کی بات بہت اچھی لگی لہذا میں آج اس پولیس کانسٹیبل کی بنیاد پر یہ دعویٰ کرتا ہوں ہمارے ملک کا کل بہت روشن ہے اور اگر ہمارے ملک میں اس طرح قانون کی حکمرانی رہی تو اگلے 25 برسوں میں وہی دنیا کی جدید ترین ریاست ہو گا' شیخ کا جواب سن کر وہ صحافی خاموش ہو گیا 'شیخ محمد کی جوشن کوئی سچ ثابت ہوئی اور ٹھیک 25 برس بعد وہی یورپین سائل کا پہلا ایشین شہر بن گیا' آج آپ وہی جائیں تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نئی پارک 'لندن یا نوکیوں میں گھوم رہے ہیں اور جیسے آپ جدید دنیا کے کسی جدید ترین شہر میں آگئے ہیں آج جب بھی کوئی شخص شیخ محمد بن راشد انصاف کے سامنے دہی کی تعریف کرتا ہے تو وہ 1976ء کے اس پولیس کانسٹیبل کا نام لیتے ہیں اور اس کے بعد فخر سے کہتے ہیں 'دہی کو وہی اس کانسٹیبل نے بنایا تھا۔'

انسان کی دل ہزار سالہ تاریخ اس نقطے پر ممتحن ہے جب تک کسی شہر کسی معاشرے اور کسی ملک میں قانون اور اس کے بعد انصاف قائم نہیں ہوتا اس وقت تک وہ ملک ترقی نہیں کرتا' آپ دنیا کے کسی جدید اور ترقی یافتہ ملک کو دیکھ لیں آپ کو اس ملک کی ترقی کے پیچھے پولیس کا مضبوط نظام اور فوری اور غیر جانبدار عدالتی سسٹم ملے گا اسی طرح آپ تمام تباہ شدہ برہاد اور انحطاط پذیر معاشروں کا تجزیہ کر لیں آپ کو ان تمام معاشروں میں ایک بات مشترک نظر آئے گی اور وہ بات قانون اور انصاف کا کمزور اور بے بس نظام ہو گا' آپ کو معلوم ہو گا ان تمام ملکوں کی عدالتیں بے بس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے کرپٹ ہیں ان ملکوں کے بااختیار لوگ قانون کو کھیل اور عدالتوں کو کھلونا سمجھتے ہیں اور وہاں کی پولیس اور عدالتیں حکمران کلاس کی اتا اور مفادات کی حفاظت کر رہی ہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے روٹلڈرینگن کے دور میں امریکہ میں ایک بڑی سٹی کا سروے ہوا تھا اس سروے میں لوگوں سے پوچھا گیا تھا 'ہم سپر پاور کیوں ہیں' اس وقت نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی فوج 'سب سے زیادہ ایٹمی ہتھیار' سب سے بڑی سٹاک ایکسچینج' سب سے بڑا میڈیا' سب سے زیادہ مالیاتی ذخائر' سب سے بڑی انڈسٹری' سب سے زیادہ ٹیکنالوجی سب سے زیادہ ڈاکٹر' سب سے زیادہ سائنس دان اور سب سے زیادہ یونیورسٹیاں امریکہ میں تھیں بلکہ اس وقت امریکہ نے سوویت یونین کو تازہ تازہ شکست بھی دی تھی لیکن جب سروے کے

نتیجہ آئے تو امریکہ کے 81 فیصد لوگوں کی متفقہ رائے تھی ”امریکہ کو اس کے قانون اور انصاف نے سپر پارہ بنایا“ اس سروے کے بعد رونلڈ ریگن نے بڑا مشہور بیان دیا تھا ”میں نے کہا تھا ”اور جب تک امریکہ میں قانون اور انصاف کا احترام باقی رہے گا اس وقت تک امریکہ دنیا کی سپر پارہ رہے گا“ ریگن کا یہ بیان پاکستانی اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا، میں اس وقت میٹرک کا طالب علم تھا، میرے لئے ریگن کی بات حیران کن اور ناقابل یقین تھی لیکن جب آنے والے دنوں میں مجھے دنیا میں گھومتے پھرنے کا موقع ملا اور میں نے قوموں کے عروج و زوال کا تجزیہ کیا تو مجھے معلوم ہوا جب کسی قوم میں قانون محترم ہوتا ہے، جب کسی ملک میں لوگوں کو فوری اور غیر جانبدار انصاف ملتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس ملک کو ترقی کرنے سے نہیں روک سکتی اور جب کسی ملک میں قانون اور انصاف کا مذاق شروع ہو جاتا ہے، جب کسی معاشرے میں قانون سیاستدانوں، حکمرانوں اور مافیا لارڈز کے دروازے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور جب انصاف حکمرانوں کے گھبر کی بوٹی بن جاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس معاشرے کو برباد ہونے سے گھنڈر بننے سے نہیں بچا سکتی، مجھے معلوم ہوا قانون اور انصاف وہ بنیادی پتھر ہوتے ہیں جن پر معاشروں کی دیواریں، چتھیں، گنبد اور مینار تعمیر ہوتے ہیں، یہ بنیاد کے وہ پتھر ہوتے ہیں جن پر عروج اور ترقی کے قبلے تعمیر ہوتے ہیں، یہ وہ بنیادی اصول ہوتے ہیں جو قوموں کے آنے والے سورج تراشتے ہیں اور یہ وہ کھیت ہوتے ہیں جن میں معاشروں کے مستقبل کا شت ہوتے ہیں۔

آپ بنیاد کے ان پتھروں اور تنزی اور ترقی کے ان اصولوں کو سامنے رکھ کر پاکستان کے مستقبل کا اندازہ لگا سکتے ہیں، ذرا سوچئے جس ملک میں کانسٹیبل سے لے کر آئی جی تک کی زندگی کا مقصد حکمران طبقے کی حفاظت ہو اور جس کی کسی عدالت میں انصاف نہ ملتا ہو، اس ملک کا کیا مستقبل ہوگا، ذرا سوچئے جس ملک میں قانون بنانے والے ارکان اسمبلی قانون نافذ کرنے والوں کو سزوں پر لٹا کر ٹھنڈے مار رہے ہوں اور عدالتیں اس واقعہ پر خاموش بیٹھی ہوں، اس ملک کا کیا مستقبل ہوگا، اس ملک کا کیا کل ہوگا؟ میں جب بھی ایسے واقعات دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے ہم لوگ گارے کی دیوار پر چڑھ کر چاند کو چھونے کی کوشش کر رہے ہیں، ہم لوگ جو ہڑ کے کنارے بیٹھ کر ہنسوں کا انتہار کر رہے ہیں، ہم روزیوں میں عمل تلاش کر رہے ہیں اور ہم لوگ ایک لاقانون اور بے انصاف معاشرے میں رہ کر اللہ کی نصرت اور اللہ کے کرم کی دعائیں مانگ رہے ہیں، مجھے محسوس ہوتا ہے ہم ایک ۲۰۰۰ء کی سرخو جا رہے ہیں۔

ڈیڈ لائن

1775ء میں امریکہ میں سول وار شروع ہوئی۔ یہ امریکی ریاستوں کی برطانوی سامراج کے خلاف جنگ تھی اس خانہ جنگی کے دوران امریکہ کی فوج نے "ایڈیشن ویل" میں جنگی قیدیوں کی ایک کھلی جیل بنائی یہ جیل میدان کی شکل میں تھی امریکہ کے فوجی برطانوی قیدیوں کو وہاں لاتے اور انہیں اس میدان میں چھوڑ دیتے امریکہ کی فوج نے اس میدان کے گرد ایک سفید لائن کھینچ دی تھی یہ سفید لائن موت کی لکیر تھی جب کوئی قیدی اس لکیر کو عبور کرنے کی کوشش کرتا تھا تو امریکی فوج اسے گولی مار دیتی تھی یہ لکیر ایک غیر مرئی دیوار تھی اور اس کھلی جیل میں بند ہر قیدی جانتا تھا اگر اس کا قدم اس لکیر پر آ گیا تو وہ زندگی کی حد پار کر جائے گا امریکی اس لکیر کو "ڈیڈ لائن" کہتے تھے۔ 1800ء میں جب دنیا میں کرسٹل بزنلزم کا دور شروع ہوا تو "ڈیڈ لائن" کا لفظ ایڈیشن ویل سے نکل کر صحافت میں داخل ہو گیا صحافت میں "ڈیڈ لائن" کا مطلب کسی خبر کسی رپورٹ کسی شعوری یا کسی کالم کو اخبار ریز یا نیٹلی وین کے دفتر پہنچانے کا آخری وقت ہوتا ہے پاکستان کے زیادہ تر اخبارات کی آخری کاپی رات دو بجے پر لیس جاتی ہے لہذا رات ایک یا ڈیڑھ بجے کے بعد آنے والی خبر اخبار میں شائع نہیں ہوتی چنانچہ اخبارات کی ڈیڈ لائن ایک یا ڈیڑھ بجے رات ہے جبکہ نیٹلی وین اور ریز یا خبر نامے کا وقت دیکھ کر اپنی ڈیڈ لائن طے کرتے ہیں۔ پچھلے دو سو سال میں صحافت میں یہ لفظ سب سے زیادہ استعمال ہوا اس کثرت استعمال سے یہ لفظ میڈیا سے نکل کر عام

زندگی میں شامل ہو گیا اور عملی زندگی کے تقریباً تمام شعبے بھی ڈیڈ لائن کے شکنجے میں آ گئے پچھلے دس پندرہ برسوں میں ڈیڈ لائن ہماری سیاست کا بھی باقاعدہ حصہ بن گیا۔ 1992ء سے صحافت سے وابستہ ہوں اور اس حوالے سے میرا سیاست کے ساتھ بھی رابطہ رہتا ہے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی وجہ سے میں قریباً روزانہ یہ لفظ سنتا ہوں اور بڑی حد تک اسے سمجھتا بھی ہوں۔ ان 14 برسوں میں مجھے محسوس ہوا سیاست کی ڈیڈ لائن صحافت کی ڈیڈ لائن کے مقابلے میں کہیں خطرناک اور مشکل ہے صحافت کی ڈیڈ لائن کے ڈسے تو شاید بیچ جاتے ہیں لیکن سیاست کی ڈیڈ لائن کی لپیٹ میں آنے والے اقدار کی قربانی دینے بغیر اس سے باہر نہیں نکلتے۔

جون کے وسط میں میرے ایک دوست نے میرے کان میں سرگوشی کی "حکومت مشکل کا شکار ہو گئی ہے" میں نے اسے کہا "مجھے بظاہر ایسا دکھائی نہیں دیتا" قومی اور بین الاقوامی امور صدر صاحب کی کھل گرفت میں ہیں وزیراعظم صاحب معیشت کو ترقی کی ہنزی پر لے آئے ہیں اور رہتی سہی کسر ہمارے "شیریں دہن" وزیر اطلاعات محمد علی درانی پوری کر رہے ہیں اس نئے انکار میں سر بلایا اور پورے یقین سے بولا "نہیں جو لائی ڈیڈ لائن ہے تم دیکھنا جو لائی سے حالات زبردست طریقے سے چلنا کھائیں گے اور حکومت کیلئے حالات کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا" میں نے اس کی بات مذاق میں اڑادی لیکن آنے والے چند دنوں میں حکومت حقیقتاً ڈیڈ لائن کا شکار دکھائی دینے لگی حکومت کی ایم ایم اے کے ساتھ ذیل کمزور پڑی ہے نظیر کے ساتھ خفیہ مذاکرات کی واپسی شروع ہوئی بھارت کے ساتھ تعلقات سرد مہری کا شکار ہوئے شاک ایکس پیجنگ اور مشیل طر کے ایٹوز کی چونچیں ریت سے باہر آنے لگیں اور اپوزیشن کی صفوں میں اتحاد کے آثار دکھائی دینے لگے چنانچہ مجھے اپنے دوست کی بات میں وزن محسوس ہونے لگا ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ جو لائی کے آخر میں اچانک ایم کیو ایم کا "سنا" کھل گیا اور حکومت کیلئے اسے باندھنا مشکل ہو گیا ایم کیو ایم سندھ حکومت کا مرکزی ستون ہے "سندھ میں" متحدہ حکومت" ہے جس میں مسلم لیگ ق" نیشنل الائنس اور ایم کیو ایم شامل ہیں وفاقی حکومت نے 2002ء میں ایم کیو ایم کو حمایت کے بدلے گورنر شپ 7 صوبائی وزراتیں 4 مشاورتیں اور سپیشل اسٹیکس کی چار نشستیں دی تھیں۔ 9 جون 2004ء میں جب ڈاکٹر ارباب غلام رحیم نے حکومت بنائی تو ایم کیو ایم نے وفاقی حکومت کے سامنے چند "مطالبات" رکھے ان مطالبات میں ایم کیو ایم کے کارکنوں کیلئے نوکریاں ایم کیو ایم کے حلقوں کیلئے ترقا، افزاء اور حذوہ زرا، رتار، رشاد، متحدہ آواز، حکمران، ز

یک جنبش قلم یہ سارے مطالبات مان لئے لیکن جب یہ مطالبات پورے کرنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا یہ مطالبے اتنے بھی سادہ نہیں ہیں اس کے بعد وفاقی حکومت اور ایم کیو ایم کے درمیان کھینچا تانی شروع ہو گئی یہ کھینچا تانی مئی 2006ء میں اپنی آخری حدوں کو چھونے لگی یہاں تک کہ بجٹ سے پہلے ایم کیو ایم نے سندھ اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا اس بائیکاٹ سے سندھ حکومت اور وفاقی حکومت دونوں کو شدید جھنجکاٹ کا صدر کی ہدایت پر وزیر اعظم شوکت عزیز اور طارق عزیز نے ایم کیو ایم کے ساتھ مذاکرات کئے ان مذاکرات میں 31 جولائی کی "ڈیڈ لائن" طے ہوئی دونوں عزیزوں نے ایم کیو ایم سے وعدہ کیا سندھ حکومت 31 جولائی تک ان کے سارے "مطالبات" پورے کرے گی ایم کیو ایم کے بعض حلقوں کے مطابق ان "مطالبات" میں وزیر اعلیٰ سندھ کے ساتھ ساتھ ڈائریکٹر جنرل پوسٹ آفس آغا مسعود بی ڈیو ڈی کے ڈی جی بریگیڈیئر چیمبر اور نیشنل ہائی وے اتھارٹی کے چیئرمین میجر جنرل فرخ جاوید کی تبدیلی بھی شامل تھی ان دو ماہ میں آغا مسعود اور بریگیڈیئر چیمبر کے سلسلے میں ایم کیو ایم کی خواہش پوری ہو گئی لیکن چیف منسٹر سندھ اور جنرل فرخ جاوید کا مسئلہ نکالنا اس دوران چیف منسٹر آفس میں ایم کیو ایم کے وزراء کی ازخانی سرفرازی جمع ہو گئیں ایم کیو ایم کے وزراء جب یہ فائلیں نکالنے کا مطالبہ کرتے تھے تو ارباب غلام رحیم وفاقی حکومت پر ذمہ داری عائد کر دیتے وہ کہتے تھے جب تک مجھے اسلام آباد سے حکم نہیں آئے گا میں آپ لوگوں کی مدد نہیں کر سکتا ایم کیو ایم کی ان فائلوں میں 50 ہزار نوکریاں بھی شامل تھیں 31 جولائی کی ڈیڈ لائن آہستہ آہستہ قریب آنے لگی جولائی کے آخری ہفتے میں صدر کراچی شریف لے گئے ایم کیو ایم کا خیال تھا صدر کراچی میں چیف منسٹر کی تبدیلی کا فیصلہ کریں گے لیکن صدر صاحب نے ایم کیو ایم کی توقعات کے برعکس جلسہ عام میں ارباب غلام رحیم پر اعتماد کا اظہار کر دیا جس سے ایم کیو ایم کے جذبات کو شدید وچکا پہنچا لہذا اس کے وزراء نے اگلے دن سندھ اور وفاقی میں استغنے دے دیئے۔ اس رات صدر نے ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین سے ٹیلی فون پر 55 منٹ گفتگو کی جس میں بڑی حد تک معاملات طے پا گئے اس گفتگو کے دوران ایم کیو ایم اور حکومتی نمائندوں میں یکم اگست کو میٹنگ طے ہوئی خیال تھا یکم اگست کو ایم کیو ایم استغنے واپس لے لے گی لیکن عین وقت پر ایم کیو ایم نے چیف منسٹر کے ایک بیان کو اینٹو بنایا اور مذاکرات میں شامل ہونے سے انکار کر دیا جس کے بعد حکومت "ڈیڈ لاک" کا شکار ہو گئی رات میری عمران خان سے بات ہو رہی تھی خان صاحب نے پوچھا "اس سارے ڈرامے کا کیا نتیجہ نکلے گا" میں

نے عرض کیا "ایم کیو ایم کے سارے مطالبے مان لئے جائیں گے" عمران خان نے قبضہ لگا کر میری بات کی تائید کی میں نے ان سے عرض کیا "وزیر اعلیٰ سندھ سے جو بیان منسوب کیا جا رہا ہے اس میں انہوں نے کہا تھا وہ گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی پسند کریں گے لہذا میرا خیال ہے انہیں شیر کی ایک دن کی زندگی دے دی جائے گی" عمران خان نے پوچھا "اور اگر یہ نہ ہوا تو؟" میں نے عرض کیا "سندھ کا گورنر تبدیل ہو گا جس کے بعد وہاں گورنر راج نافذ ہو گا اور ایم کیو ایم اپوزیشن کے ساتھ شامل ہو جائے گی" عمران خان نے دوسری بار قبضہ لگایا۔

سندھ حکومت کا بحران کس کسٹ میں بیٹھتا ہے اس کے بارے میں سر دست کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اتنا طے ہے ہماری حکومت اس وقت بے شمار "ڈیڈ لائنوں" میں گھر چکی ہے اے آر ڈی اور ایم کیو ایم کی ڈیڈ لائن ختم ہو چکی ہے بے نظیر بھٹو کی ڈیڈ لائن ختم ہونے والی ہے مولانا فضل الرحمان ڈیڈ لائن دے کر ملک سے باہر چائے ہیں قاضی حسین احمد اپنے ہاتھ سے اینڈرسن ویل کے گرو سفید لیکر کھینچ رہے ہیں اور امریکہ اور بھارت کی ڈیڈ لائنیں سر پر کھڑی ہیں یہ تمام ڈیڈ لائنیں کسی بھی وقت پھٹ سکتی ہیں اور اس کے بعد کیا ہو گا؟ یہ آپ کو صرف مشاہدہ حسین بتا سکتے ہیں!

Kashmir Azad@OneOrdu.com



چند ماہ کی بات ہے

شاہ ایران محمد رضا پہلوی 1941ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ خادم مغرب کہلاتا تھا وہ

امریکی صدر کو اپنا پاس کہتا تھا اور وہ مسکن کو ایران کا دار الحکومت بنا۔ اس کی امریکہ نوازی کی انتہا

دیکھئے شاہ ایران نے بیک جنبش قلم ایران میں موجود تمام امریکیوں کو سفارتی حیثیت دے دی اس

وقت ایران دنیا کا واحد ملک تھا جس میں جو امریکی شہری قدم رکھتا تھا اسے ایئر پورٹ پر سفارتکار کا

ستیس مل جاتا تھا۔ دنیا میں امریکہ سے باہر کیلینفورنیا یونیورسٹی کی صرف ایک شاخ تھی اور وہ شاخ

ایران میں تھی شاہ ایران کا خیال تھا امریکہ اس کا دوست ہے لہذا اس کی باری کبھی نہیں آئے گی

لیکن جب 1979ء میں انقلاب آیا تو امریکہ دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے شاہ ایران کو پناہ دینے

سے انکار کیا شاہ ایران پوری دنیا میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن امریکہ نے اسے علاج تک کے لئے نئے

بارک نہ اترنے دیا یہاں تک کہ جب اس کا انتقال ہوا تو لوہا چھین اس کی نعش اٹھا اٹھا کر بھرتے

رہے مگر امریکہ کے خوف سے کوئی ملک شاہ کی میت کو چھ پائی روٹ جگہ دینے کے لئے تیار نہیں

تھا۔ آخر مرحوم بادشاہ کو قاہرہ میں قبر نصیب ہوئی۔ "اناس تاسیو سو ہزار" نکاراگوا میں امریکہ کا

دوست تھا وہ اور اس کا والد برسوں امریکہ کے سپاہی بن کر کیونز کے خلاف لڑتے رہے۔ اناس

تاسیو کا بھی یہی خیال تھا اس کی باری کبھی نہیں آئے گی لیکن جب اسے نکاراگوا سے بھاگنا پڑا تو

امریکہ نے اسے پناہ دینے سے انکار کر دیا یہ اناس تاسیو سو ہزار پیراگوئے کے شہر "اسٹین" میں

انتہائی کمپیوٹی کی حالت میں مراٹھیا پن کا فرڈی ٹیڈ مارکوس بھی امریکہ کا دوست تھا، وہ ٹیپائن میں 20 سال تک امریکی دوستی کا حق ادا کرتا رہا۔ اس نے امریکہ کے ایما پر ہزاروں کمپنٹ ڈیجھ کر دیئے لیکن وہ 1986 میں ہونولولو میں امریکہ کی بے وفائیوں کے شکوے کرتے کرتے مراٹھیا پن کے ہائی لیڈر جونا س بیوسی نے 1992 میں امریکہ کی ایما پر کمپنٹوں سے امن معاہدہ کیا تھا، وہ بھی اس خدمت کے بعد یہ سمجھتا تھا اس کی باری کبھی نہیں آئے گی لیکن ہی آئی اسے نے جونا س کی امداد روک لی جس کے بعد کمپنٹوں کی تنظیم ایم پی ایل اس نے اس پر حملہ کر دیا اور وہ امریکہ کی مدد کا انتظار کرتا ہوا ہلاک ہو گیا، پانامہ کے جنرل نوریکا نے 25 سال امریکہ کی خدمت کی لیکن امریکہ نے پانامہ پر فوج کشی فرمادی۔ نوریکا کو گرفتار کیا، اس پر فضیلت کا کیس بنایا اور اسے عدالت سے سزا دلوا کر جیل میں ڈال دیا۔ امریکہ نے 1979 میں رہویشیا کے بپ اہل منور پوا کو موغابے اور گومو کے خلاف ہلاشری دی بعد ازاں ہی بپ امریکی دوستی کے ٹیکل مہرت کا نشان بن گیا۔ چلی کے ارسٹو پوٹے نے ملک کو خانہ جنگی اور کمونزم سے بچایا، 17 سال امریکہ کی خدمت کی، وہ امریکہ کا اس قدر وفادار تھا کہ اس نے 1990 میں امریکہ کے حکم پر حکومت چھوڑ دی اور لندن میں پناہ لے لی امریکہ کے اشارے پر لندن میں اسے نظر بند کر دیا گیا، وہ امریکہ کو مدد کے لئے دہائی دیتا رہا لیکن پوٹے کی باری آچکی تھی۔

آپ امریکہ کے دوست ملکوں کی مثال بھی لیجئے، دوسری جنگ عظیم کے بعد 29 ممالک کا خیال تھا "ہماری باری کبھی نہیں آئے گی" لیکن امریکہ نے ان ممالک پر 97 فوجی حملے کئے، آپ تاریخ نکال کر دیکھ لیجئے جین ہو، کوریا ہو یا پھر گوسے، مالا، انڈونیشیا، کیوبا، کنگو، پیرو، لاؤس، ویت نام، کیوبا، گرینڈا، لبنان، لیبیا، ایل سلواڈور، نکاراگوا، پانامہ، سوڈان، پورٹوریکو، یوگوسلاویہ، یوراگوئے، البانیہ، زامبیا، بوسنیا، صومالیہ، لائبیریا، بولیویا، افغانستان یا پھر عراق، ہر وہ ملک جو امریکہ کا دوست تھا، جس نے خود کو امریکہ سے محفوظ سمجھا اور جو یہ کہتا تھا "ہماری باری کبھی نہیں آئے گی" اس ملک پر امریکی فوج ضرور اتری۔ اس ملک میں امریکی بارود ضرور پھٹا اور اس ملک پر امریکی طیاروں نے ضرور بم برسائے۔ یہ امریکہ کی 1890ء سے اپریل 2003ء تک کی فوجی تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں افغانستان اور عراق جیسے درجنوں ملک آتے ہیں۔ امریکہ کے سابق وزیر خارجہ ہنری سٹینر نے ایک بار کہا تھا "آپ امریکہ کی مخالفت کریں تو امریکہ آپ کو منہ ماگی قیمت دے کر خرید لے گا لیکن اگر آپ اس کے دوست بن جائیں تو وہ آپ کو سستے داموں بیچ

دے گا۔ ہم بھی امریکہ کے دوست ہیں لہذا بھارت ہمیں گرم تعاقب کی دھمکی دیتا ہے لیکن ہم امریکہ کو اپنا دوست سمجھ کر مطمئن بیٹھ جاتے ہیں، رچ ڈھاڑ چڑھاڑتے ہیں پاکستان کے خلاف بیان دیتا ہے لیکن ہم امریکہ کی دوستی پر اعتماد کر کے چپ چاپ بیٹھے جاتے ہیں، وہ ہم سے ڈاکٹر قذافی، جنوبی وزیرستان اور گوادرنکٹا ہے لیکن ہم اسے ایک دوست کا "لاڈ" سمجھ کر سکرادیتے ہیں اور امریکہ کے تحنک نینک ہمیں دہشت گرد قرار دیتے ہیں لیکن ہم سوچتے ہیں "ہماری باری کبھی نہیں آئے گی" ہم خود کو عراق، پانامہ اور فلپائن کے مقابلے میں امریکہ کا کہیں زیادہ دوست سمجھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں۔ ہم پٹھے، پٹھے، پٹھے، نوریکا، مارکوس، جوئاس، سیوسی، تاسیو اور رضا پہلوی کے مقابلے میں امریکہ کے کہیں زیادہ وفادار ہیں لہذا ہماری باری کبھی نہیں آئے گی لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں ہاتھی کتنا ہی مہذب کیوں نہ ہو جائے وہ سوئڈ ہلائے بغیر نہیں رہ سکتا اور بچھو خواہ مسجد میں جنم لے وہ ڈے بغیر نہیں رہ سکتا اور ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں جس امریکہ نے فیرنیو کیائی ملک عراق کو نہیں بخشا تھا وہ جو بری اسلامی طاقتوں کو کیوں معاف کرے گا! ہم یہ بھول جاتے ہیں ہم امریکہ کے دوست ہیں لہذا ہمیں کبھی نہ کبھی اس دوستی کا تادان ضرور ادا کرنا پڑے گا! ہم کبھی نہ کبھی ہاتھی کی سونڈ کی لپیٹ میں ضرور آئیں گے لیکن ہم ایک خوش فہم قوم ہیں، ہم اور ہمارے مقلدان اچھا تک یہ سمجھ رہے ہیں ان کی باری کبھی نہیں آئے گی، ہم لوگ بلوچستان میں گئی آگ کا نظارہ کر رہے ہیں، ہم اپنی سرحدوں پر ہونے والی تبدیلیاں بھی دیکھ رہے ہیں اور ہم بھارت اور افغانستان کی آنکھوں کی سرنفی بھی دیکھ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم یہ سمجھ رہے ہیں، ہماری باری نہیں آئے گی، ہم کتنے خوش فہم ہیں! ہم یہ سمجھ رہے ہیں دودھ میں گرنے کے بعد چھپکلی کا زہر ختم ہو جائے گا اور پاکستان تک پہنچ کر بچھو اپنی فطرت بدل لے گا! ہم حقیقتاً بہت بے وقوف ہیں ہمیں یہ نظر نہیں آ رہا ہماری باری آ چکی ہے اب بس چند ماہ کی بات ہے!



نائین الیون

یہ پانچ برس پہلے کی بات ہے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ نوجرمنی سے نکلا، راستے

میں ہم لوگ گاڑی کا آئل اور فلٹر تبدیل کرانے گئے اور میرے دوست نے گاڑی کی ورکشاپ پر رکت

گئے۔ ورکشاپ پر اس وقت چھ کارکن تھے، ہم نے جو بھی گاڑی کھڑی کی، وہ لوگ آگے بڑھے۔

انہوں نے گاڑی "ڈیک" پر لگائی۔ ہائیڈراک سٹونوں کے ذریعے گاڑی اوپر اٹھائی اور تقریباً

مختصر لگا کر انہوں نے گندا آئل نکالا، پراپلٹر اگ کیا، نیا فلٹر اور تازہ آئل بھرا اور پھر اس کے بعد

ایک برقی گاڑی شارٹ کر کے انجن کے فنکشنز کا جائزہ لینے لگے، اس جائزے کا دورانہ بھی تقریباً

ایک گھنٹے پر محیط تھا، اس جائزے کے دوران انہوں نے دیکھا آئل تو ایک نہیں کر رہا فلٹر تو نہیں

دس رہا، نیا آئل انجن کو پریشان تو نہیں کر رہا اور آئل اور فلٹر تبدیل ہونے سے گاڑی کی رفتار اور

کارکردگی پر برے اثرات مرتب تو نہیں ہوئے۔ اس سارے عمل کے دوران ان لوگوں نے نئے

آنے والے گاڑیوں کو "وی آر بی" کانفرہ لگا کر بھگا دیا، جب ہم لوگ فارغ ہوئے تو یہ لوگ

ورکشاپ کی صفائی پر جت گئے اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ورکشاپ یوں ہو گئی جیسے برسوں سے

وہاں کوئی گاڑی نہیں آئی۔ میں یہ صورتحال دیکھ کر پریشان ہو گیا کیونکہ ہمارے ملک میں عام فٹ

پاتھوں پر بیٹھے "چھوٹے" یہ کام کسی آلے اور ورکشاپ کے بغیر چند منٹوں میں کر دیتے ہیں۔

موتروں سے پرہیز کر میں نے اپنے دوست سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا تو وہ ہنس کر بولے "اسے

امریکن وے آف ڈونگ تھنگو کہتے ہیں۔“

اس واقعے کے بعد میں نے ایک نئے زاویے کے ساتھ امریکی معاشرے کا جائزہ لیا تو مجھے پوری امریکی "سوسائٹی امریکن وے آف ڈونگ تھنگو پر کاربند نظر آئی۔ امریکہ میں جب کوئی شخص کام شروع کرتا ہے تو وہ چار چیزوں کا خیال رکھتا ہے ایک ایک سوئی، دو مہارت، تین بعد از خدمت مشاہدہ اور چار ماحول یا جگہ کی صفائی۔ اس سارے سلسلے کو آپ یوں دیکھ سکتے ہیں فرض کریں آپ امریکہ میں ہاتھ روٹھک کرانے کیلئے پلیمبر ہوتے ہیں۔ اول وہ پلیمبر اس قدر یک سوئی سے کام کرے گا کہ اس دوران دنیا سے اس کا رابطہ تک منقطع ہو جائے گا۔ وہ کسی دوسری چیز، کسی دوسرے کام کے بارے میں سوچے گا اور نہ ہی اس کی طرف دیکھے گا، دوم وہ کام مکمل کرنے کیلئے اپنی پوری مہارت صرف کر دے گا، سوم کام مکمل ہونے کے بعد وہ ایک کونے میں بیٹھ کر اس کا جائزہ لیتا رہے گا کہ کیا کام واقعی اس معیار، اس لیول کو "بچ" کر رہا ہے جس کی ضرورت تھی اور آخر میں پلیمبر وہ جگہ صاف کرے گا جہاں اس نے کام کیا تھا یوں وہ پلیمبر وہاں سے واپس جائے گا اور کوئی شخص ہاتھ روٹھک رہا تو اسے بھولنے کے بعد یاد نہ لائیں لگا سیکے گا کہ یہاں کام ہوا تھا یا جہاں سے ابھی ابھی کوئی پلیمبر گیا ہے۔ اس "امریکن وے آف ڈونگ تھنگو" کی دو بڑی وجوہات ہیں اول امریکہ میں زیادہ تر کام گارنٹی یافتہ ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی سے کام کرتا ہے تو یہ طے ہوتا ہے اگر سروس کے بعد خرابی دور نہ ہوئی یا چند دنوں بعد وہی مسئلہ دوبارہ پیدا ہو گیا تو وہ سٹری یا کارکن واپس آکر اسی ادا شدہ رقم میں وہ کام دوبارہ کرے گا۔ دوم اگر اس مرمت کے دوران کوئی نقصان ہو جائے تو وہ کارکن یا کمپنی اس کی تلافی کرے گی لہذا یہ وہ خوف ہیں جن کے باعث امریکہ میں کوئی شخص رسک لینے کیلئے تیار نہیں ہونا چاہتا۔ وے آف ڈونگ تھنگو کا یہ فلسفہ ان لوگوں کی سائیکسی، ان لوگوں کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔

اب دیکھئے ایک طرف تو یہ حالت ہے امریکہ کا ایک عام مکینک، ایک عام پلیمبر گاڑی کا آئل بدلنے یا ایک معمولی سی نوٹی ٹھیک کرنے میں پورا پورا دان لگا دیتا ہے جبکہ دوسری طرف امریکی سیاست ہے اور امریکی حکومت کا وے آف ڈونگ تھنگو ہے امریکہ نے دس سال تک افغانستان میں روس کے خلاف جنگ لڑی، ان دس سالوں میں امریکہ نے افغانوں کو بے تحاشا اسلحہ یا انہیں حملہ کرنے، چھاپے مارنے، بہوں کے بغیر وٹمن کے ٹھکانے تباہ کرنے، جان لینے اور جان دینے کی ٹریٹنگ دی۔ انہیں بیر وٹن بنانے اور یورپ اور امریکہ پہنچانے کا طریقہ سکھایا۔

انہیں میزائل دینے، انہیں توپیں اور ٹینک دینے اور انہیں بم بنانے اور چلانے کے طریقے سکھائے لیکن جب افغانوں کی تین سلیبس مرنے اور مارنے میں طاق ہو گئیں تو امریکہ یہ سارا گند چھوڑ کر واپس چلا گیا اور اس نے یہ تک نہ سوچا یہ مہلک ترین اسلحہ، یہ ٹرینڈ لوگ اور یہ مرنے مارنے کی نفا کس کس کو نقصان پہنچائے گی۔ اس کے ظن سے کون کون سی تحریکیں جنم لیں گی اور اس کے اندوں سے کیا کیا خوف، کیا کیا ڈر پیدا ہوں گے۔ افغانستان ایک ایسا آپریشن تھا جس کے اختتام پر امریکہ نے اپنا وے آف ڈونگ تھکنکو کا فلسفہ فراموش کر دیا تھا۔ اس نے آپریشن کے بعد جگہ کی صفائی کا اصول بھلا دیا تھا اور وہ افغانستان کو افغانوں پر چھوڑ کر چلا گیا تھا، اس بے وفائی، اس کٹھور پن کا پھل افغانستان پاکستان نے اٹھایا، پاکستان شدید ترین دہشت گردی کا شکار ہو گیا، افغانستان سے کھائیں گئیں آئیں اور پاکستان کی گلی گلی محلے محلے میں ریڑھیوں اور خیلوں پر پکٹے لگیں۔ بم، راکٹ لائچر اور ٹرینڈ آئے، کراچی پہنچے اور پاکستان کے سب سے بڑے شہر کو آگ لگ گئی۔ یورپ اور امریکہ نے بیرونی جہتیں اور انہوں کے راستے بند کئے تو پاکستان ان مہلک خشکی کی منڈی بن گیا۔ پاکستان میں فرقہ پرستی شروع ہوئی اور افغانستان سے دور آمد شدہ اسلحہ مسجدوں، امام بارگاہوں اور قبرستانوں میں استعمال ہونے لگا۔ یہ سلسلہ چل رہا، یہاں تک کہ بارود کی یہ بوبخیرہ عرب سے نکل کر میڈی ٹیرن سی اور الملائک اوشین تک جا پہنچی افغانستان کے بارود کی تپش امریکہ کے پاؤں تک آ گئی اور دنیا ایک خوفناک جنگ کے رہانے پر آ گئی ہوئی جس کے بارے میں آئین سائن نے کہا تھا تیسری جنگ کے بعد دنیا میں جو لوگ بچ جائیں گے وہ پتھروں اور ڈنڈوں سے لڑا کریں گے۔ اس سارے کھیل میں کون تصور دار ہے؟ یہ کس کی خامی، کس کی غلطی تھی؟ اگر وولڈ ٹریڈ سنٹرز کی تباہی کا کمرہ واقعی افغانستان جاتا ہے تو بھی مجرم افغان یا اسامہ بن لادن نہیں بلکہ خود امریکہ ہے امریکہ 1990ء میں افغانستان کی آگ بجھائے بغیر واپس چلا گیا تھا اور وہ یہ بھول گیا تھا امریکی قانون کے مطابق اگر کسی جگہ مرمت کے بعد کوئی خرابی رہ جائے یا کوئی چیز ٹوٹ جائے تو اس کا تاوان ملکیت، مستری کارکن یا کپنی کو ادا کرنا پڑتا ہے اور وہ یہ بھول گیا تھا چنگاری چنگاری رہے تو اسے بجھانا آسان ہوتا ہے لیکن اگر وہ بجھانے میں ناکام رہے تو اس پر قابو پانا ممکن نہیں رہتا وہ بھول گیا تھا لاوا چٹانوں میں رہے تو وہ پانی ہوتا ہے لیکن وہ باہر آ جائے تو اس کی پھیلائی تباہی کا سلسلہ سمندروں تک جاتا ہے۔ وہ یہ بھول گیا تھا سلتی ہوئی آگ اور ٹونا ہوا بند قیامت ہوتا ہے۔

زیر پبائٹ 3.....0.....281

کل ٹائمیں الیون تھا، امریکہ نے کل تاریخ کے سب سے بڑے سامنے کی پانچویں برسی منائی، میں بھی کل امریکہ کے عوام کے ساتھ اداں تھا لیکن میں ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا امریکہ نے جو فصل 1990ء میں افغانستان میں بوئی تھی اسے دو فصل 2001ء میں کاٹا پڑی تھی لیکن اس نے جو کاٹنے 2003ء میں بوئے ہیں اس فصل کے کتنے کا وقت کب آئے گا۔ یہ آگ امریکہ کے پاؤں تک کب پہنچے گی۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

محبت اور امن

امبر یا اٹلی کا خوبصورت ریجن ہے اور اسامی (Assisi) اس کا ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے۔ اپنے قدیم چرچ کے حوالے سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ چرچ 1228ء میں بنا تھا اور آج تک اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ قائم ہے۔ پوری دنیا سے ہر سال لاکھوں سیاح اسامی آتے ہیں یہ چرچ دیکھتے ہیں اور اس کی شان کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ 80ء کی دہائی تک اسامی محض عیسائیوں کے لئے ایک مقدس اور سیاحوں کے لئے ایک سیاحتی مرکز تھا لیکن 1986ء میں پوپ جان پال نے اسے ایک نئی حیثیت دے دی۔ 1986ء میں سرد جنگ اپنے عروج پر تھی افغانستان میں سوویت یونین کی فوجوں اور افغانوں، پوری دنیا کے مسلمان مجاہدین امریکہ اور اس کے عیسائی اتحادیوں کے مابین جنگ جاری تھی بیت المقدس میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان لڑائی، یورپی تھی لداش کے مسئلے پر چین کے سوشلسٹ اور بھارتی ہندو ایک دوسرے کے خلاف بدسر پہ پکارتے تھے، تبت کی وجہ سے چینی حکومت اور بودھوں کے درمیان کشمکش پائی جاتی تھی، یوگوسلیا، سریہ اور کروشیا میں نفرتوں نے آہستہ آہستہ سر اٹھانا شروع کر دیا تھا، ہنگامی ریاستوں میں یونان کے عیسائی اور ترک مسلمان لڑ رہے تھے، براعظم امریکہ میں کیوبا اور امریکہ کے درمیان میزائلوں کی دوڑ جاری تھی، شامی کوریا جنوبی کوریا کے ساتھ دست و گریبان تھا اور برلن کے عیسائی دو حصوں میں تقسیم تھے اس وقت محسوس ہوتا تھا پوری دنیا بارود کے ڈبیر پر بیٹھی ہے اور

بس ایک دیاسلاوی دکھانے کی دیر ہے اور پوری دنیا بھگ سے اڑ جائے گی اس وقت پوپ جان پال سامنے آئے اور انہوں نے ستمبر 1986ء میں اساسی میں مذاہب عالم کی پہلی امن کانفرنس منعقد کرائی۔ یہ ایک دعائیہ کانفرنس تھی جس میں تمام مذاہب کے بڑے رہنما اکٹھے ہوئے انہوں نے آپس میں ڈائیلاگ کی ضرورت پر زور دیا اور آخر میں سب نے مل کر اللہ تعالیٰ سے امن کی دعا کی۔

یہ کانفرنس 1986ء کے بعد ایک روایت بن گئی اور پچھلے برس سے ہر سال ستمبر میں دنیا بھر کے مذہبی رہنما اور فوڈ اساسی میں جمع ہوتے ہیں اور امن کیلئے اجتماعی دعا کرتے ہیں۔ اس سال بھی اساسی میں امن کانفرنس ہوئی، کانفرنس کا میزبان وینی کن شٹی تھا اور اس کا افتتاح اٹلی کے صدر نے کیا تھا جبکہ اس میں اٹلی کے 5 بڑے وزراء کے علاوہ بریکو فاسو کے صدر آرتھوڈکس چرچ کے سربراہ، یوڈیوں کے رہنما، وینی کن شٹی کے کارڈینل، نیپلز کے کارڈینل اور یوڈیوں کے روحانی پیشوا نے شرکت کی، اسلامی دنیا سے اس کانفرنس میں جامعہ الازہر کے ریکٹر احمد الطیب،

قاہرہ یونیورسٹی سے حسن خنی، الجزائر سے محمد السلمان اور ایران سے محمد علی کسرائی نے شریک ہوئے،

اٹلی میں موجود پاکستانیوں کا ایک وفد بھی اس کانفرنس میں شریک ہوا اس وفد کی قیادت پاکستان کے سرمایہ کاری قونصل اور یورپ کے نامور پاکستانی بزنس من طارق بھٹی نے کی تھی۔ طارق بھٹی کے ساتھ پاکستانی صحافی اور یورپ میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو اخبار "جذیبہ" کے چیف ایڈیٹر اعجاز احمد پیارا بھی شامل تھے، وفد میں ایک پاکستانی سسٹی کالر پروفیسر سبین شاہد بھی شامل تھے، پروفیسر سبین شاہد کا تعلق جہلم سے ہے، وہ وینی کن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور وہ پاکستان کے ان چند سیکھوں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنے ٹیلنٹ اور محنت کے زور پر وینی کن یونیورسٹی کی قیادت میں شامل ہوئے ہیں، برادر طارق بھٹی کا تعلق گوجر خان سے ہے وہ آج سے پچیس برس پہلے روزگار کے سلسلے میں فرانس گئے تھے، یورپ جا کر انہوں نے حیرت انگیز ترقی کی، وہ ٹیلی کیوٹیکیشن کے بزنس سے وابستہ ہیں، ان کی کمپنی کا نیٹ ورک اس وقت پورے یورپ میں پھیلا ہوا ہے۔ اٹلی کی حکومت انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور وہ اس وقت اطالوی اور

پاکستانی حکومتوں کے درمیان بل کا کام دے رہے ہیں، پاکستان میں وہ صدر صاحب کے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں، اٹلی میں موجود پاکستانیوں نے اس سال اپنے طور پر امن کانفرنس میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا، انہوں نے وفد تشکیل دیا اور طارق بھٹی کو اس وفد کا سربراہ بنا دیا، یہ اساسی امن کانفرنس میں پاکستانیوں کی پہلی نمائندگی تھی، یہ لوگ جب کانفرنس میں پہنچے تو دوسرے تمام وفدوں نے

بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا، اعلیٰ کے صدر اور وزیر داخلہ آگے بڑھ کر پاکستانی وفد سے ملے اور پاکستان اور صدر پر دیر مشرف کا بڑے اچھے الفاظ میں ذکر کیا۔

اس کانفرنس میں جامعہ الازہر کے ریکٹر جناب احمد الطیب نے بڑی خوبصورت بات کہی، انہوں نے کہا ”دنیا مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہے، اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو امن اور سلامتی پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے، ہمارے مذہب میں دو مسلمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو دونوں السلام علیکم کہہ کر ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں لہذا جو مذہب امن اور سلامتی پر اتنا یقین رکھتا ہو اس سے دنیا کے امن کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے“ پروفیسر بین شاہد نے کانفرنس میں پاکستان کا مقدمہ پیش کیا انہوں نے بتایا ”میں ایک عیسائی پاکستانی ہوں، میں دینی کن شہی میں پڑھا ہوں لہذا آپ مجھے ایک ذمہ دار عیسائی کہہ سکتے ہیں، میں آج دعویٰ سے کہتا ہوں پاکستان میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، ہم سب پاکستان میں امن اور اطمینان سے رہ رہے ہیں“ پروفیسر بین شاہد اور جامعہ الازہر کے ریکٹر جناب احمد الطیب کی گفتگو کو تمام شہر کا مہنے سزا ہوا طارق بھٹی نے کہا ”جب تک دنیا کی تمام قوموں میں ڈائلاگ نہیں ہوتا اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا، ہم نے اس کانفرنس میں شریک ہو کر ڈائلاگ کا آغاز کر دیا اب آپ لوگ آگے بڑھیں تاکہ دنیا جنگوں اور نفرتوں سے باہر آسکے۔“ اس کانفرنس کے آخر میں تمام مذاہب کے لوگوں نے اپنے اپنے طریقے سے عبادت کی، اساسی شہر میں امن مارچ کیا، امن کیلئے شمعیں جلائیں، ایک دوسرے کو بھول جوش کئے اور امن کیلئے اجتماعی دعا کی۔

اساسی کی امن کانفرنس ایک اچھی روایت ہے لیکن اس کے پلیٹ فارم اور دائرہ کار کو مزید وسعت ملنی چاہیے، دینی کن شہی کو اسے صدارتی سطح تک لے جانا چاہیے اور اس میں پوپ اور امام کعبہ کو بھی شریک ہونا چاہئے، پاکستان امن کے معاملے میں فرنٹ لائن سٹیٹ ہے لہذا پاکستان کو اس کانفرنس میں سرکاری طور پر شریک ہونا چاہیے تھا، میں سمجھتا ہوں اعلیٰ گیا تو ہاں پاکستان کے چند مقامی لیڈروں نے بتایا وہ کوشش کر رہے ہیں اگلے سال دینی کن شہی سید شاہد حسین کو سرکاری طور پر دعوت دے، ان کا کہنا تھا دینی کن شہی میں سید شاہد حسین کے بارے میں بڑی اچھی رائے پائی جاتی ہے، دینی کن شہی کی قیادت انہیں سکائز اور معتدل پاکستانی لیڈر سمجھتی ہے پوپ تک ان کے نام سے واقف ہیں لہذا پاکستانیوں کی خواہش ہے اگلے سال سید شاہد حسین پاکستان

کا وفد لے کر اساسی آئیں، مجھے ان لوگوں نے مشاہد حسین کو یہ پیغام دینے کی ذمہ داری سونپی، میں نے واپس آ کر شاہ صاحب سے رابطے کی کوشش کی لیکن شاہ جی آج کل سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف ہیں لہذا ان سے ملاقات نہ ہو سکی تاہم مجھے یقین ہے شاہ جی اگلے سال تک فارغ ہو چکے ہوں گے اور ان کے پاس امن اور اساسی دونوں کیلئے بڑا وقت ہوگا۔ میں واپس اساسی کانفرنس کی طرف آتا ہوں۔ یہ حقیقتاً ایک بڑا پلیٹ فارم ہے لہذا پاکستان کو اس پر توجہ دینی چاہئے، طارق بھٹی و بیٹی کنٹی اور اعلیٰ حکومت کے قریب ہیں چنانچہ ہماری حکومت ان کی مدد سے پوپ کے حلقے تک پہنچ سکتی ہے جس کے نتیجے میں پاکستان کا بین الاقوامی امیج بہتر ہوگا۔

دنیا کے تمام مذاہب میں دو چیزیں مشترک ہیں، ایک محبت اور دوسری امن، ہم سب لوگ اگر ان دو چیزوں کو عالمی اصول بنالیں تو مجھے یقین ہے دنیا کی تمام توپوں کے دھانوں میں پھول اگ آئیں اور ساری چھاؤنیاں زمریوں کی شکل اختیار کر جائیں اور دنیا حقیقت میں رہنے کے قابل ہو جائے گی لیکن انہیں اس زمین کے لوگوں کے پاس محبت کے لئے وقت ہے اور نہ ہی

Kashif Azad@OneUrdu.com



ملک بھی پھستو ہوتے ہیں

پھستو اندرون پنجاب کے بڑے دلچسپ کردار ہوتے ہیں یہ لوگ مہموا کی خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی زندگی کا اہم حصہ چودھریوں کے جراثیم کی سزا بھگتنا ہوتا ہے پنجاب کے وڈیرے سردار اور چودھری اپنے کیوں میں سے مضبوط قدم کاٹھ کے نوجوان الگ کر لیتے ہیں اور انہیں پھستو کا عہدہ دے کر اپنا قرب عنایت کر دیتے ہیں جس کے بعد یہ لوگ خصوصی سلوک کے مستحق ہو جاتے ہیں پنجاب کے چودھری سردار اور وڈیرے مہموا ظالم ہوتے ہیں یہ لوگ کمزوروں کے ساتھ زیادتی کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں آج سے سو پچاس برس پہلے تک ان کی زیادتیاں بے لگام ہوتی تھیں اور یہ لوگ اگر دس بیس ہندے قتل بھی کر دیتے تھے تو کوئی ان کے سامنے آہ نہیں کرتا تھا لیکن جب انسانی حقوق کا دور شروع ہوا اور قانون نے پھیل کر چھوٹے فرعونوں کو اپنے دائرے میں لے لیا تو یہ لوگ پھستو کا باقاعدہ "ٹھک" بنانے پر مجبور ہو گئے اب یہ لوگ ظلم کرتے ہیں عورتوں کو اغوا کرتے ہیں ان کی آبروریزی کرتے ہیں دشمنوں پر تشدد کرتے ہیں اور گاؤں کے گاؤں قتل کر دیتے ہیں لیکن جب پولیس آتی ہے تو ان کا کوئی نہ کوئی پھستو آگے بڑھ کر چودھری صاحب کا جرم اپنے سر لے لیتا ہے جس کے بعد پھستو پولیس کچھریوں اور جیلوں میں چودھری صاحب کے حصے کی سزا بھگتا ہے چودھری صاحبان اس کی غیر موجودگی میں اس کے خاندان کا خیال رکھتے ہیں اور جب پھستو "سزا" کاٹ کر واپس آتے ہیں تو چودھری اس کے اعزاز میں بہت

بڑی تقریب کا اہتمام کرتے ہیں جس میں ان کی قربانیوں اور وفاداریوں کا خصوصی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

میں نے خود ایک بار اپنی آنکھوں سے ایک شخص کو دیکھا جس نے دیکھا میں ڈی جی خان کے ایک سردار صاحب کے ساتھ سفر کر رہا تھا سردار صاحب میرے ساتھ گفتگو بھی فرما رہے تھے اور ڈرائیونگ بھی کر رہے تھے یہ رات کا وقت تھا دوران سفر ہماری لینڈ کروزر ایک چھوٹی ایف ایکس کے ساتھ ٹکرائی حادثہ شد یہ تھا ہم لوگ بڑی گاڑی میں ہونے کی وجہ سے صاف بچ گئے لیکن ایف ایکس کے مسافر شدید زخمی ہو گئے سردار صاحب نیچے اترے انہوں نے ایف ایکس کا جائزہ لیا اپنے گاڑی میں سے ایک لمبے ترنگے لہجے کے جوان کو قریب پایا لینڈ کروزر کی چابی اس کے حوالے کی اور مجھے دوسری گاڑی میں بٹھا کر آگے روانہ ہو گئے میرے لئے یہ انتہائی خوفناک صورتحال تھی میں حادثے میں کا شکار ہونے والوں کیلئے سوگوار تھا جبکہ سردار صاحب ڈرائیونگ اور میوزک سے لطف اندوز ہو رہے تھے سردار صاحب نے میری طرف دیکھا مجھے تسلی دی اور دوبارہ گفتگو میں مصروف ہو گئے میرے اوسان ذرا سے بھال ہوئے تو میں نے ان سے پوچھا "حادثے کا شکار ہونے والوں کا کیا ہے گا" انہوں نے فرمایا "میرا بندہ ٹیک کیکر ٹرک لے گا" میں نے پوچھا "اگر پولیس کیس بن گیا تو؟" انہوں نے مسکرا کر جواب دیا "میرا بندہ یہ جرم اپنے سر لے لے گا اور میری جگہ گرفتار ہو جائے گا" میں نے حیران ہو کر پوچھا "اس کے بعد کیا ہوگا" وہ بولے "اس کے بعد میں اپنے بندے کو چھڑانے کی کوشش کروں گا سفارش اور رشوت کا سہارا لوں گا" اگر کامیابی نہ ہوئی تو میں اچھے سے اچھے وکیل کا بندوبست کروں گا" میں نے پوچھا "اور اگر اس کے بعد بھی وہ رہا نہ ہوا تو؟" انہوں نے قہقہہ لگایا "تو پھر کوئی بات نہیں وہ میری جگہ پولیس کی بار کھائے گا اور جیل میں رہے گا یہ میرا ہمسوا ہے اور یہ اس کی جاب ہے" میں نے زندگی میں پہلی بار اس نوعیت کی جاب سنی تھی۔

یہ ہوتے ہیں ہمسوا آپ نے اکثر اخبارات میں خبریں پڑھی ہوں گی فلاں وڈیرے نے اتنے بار یوں کے ساتھ مل کر فلاں خاتون کی آبروریزی کی تھی جب شروع شروع اس قسم کی خبریں پڑھتا تھا تو سوچتا تھا وڈیرے اس "ٹیک" کام میں اپنے ہار یوں کو کیوں شامل کر لیتے ہیں؟ میں نے سردار صاحب جیسے لوگوں سے اس بارے میں پوچھا تو پتہ چلا یہ باری ہمسوا ہوتے ہیں اور وڈیرے خود کو قانون سے بچانے کیلئے انہیں استعمال کرتے ہیں پتہ چلا جب وڈیرے کسی خاتون

کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں تو وہ بعد ازاں خاتون کو اپنے ہتھیاروں کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ اگر "خدا نخواستہ" پولیس کیس بن جائے اور طبی معائنہ ہو تو سردار صاحب بچ جائیں اور سزا کا پھندا اس ہتھیار کے گلے میں آ پڑے جس نے آخری مرتبہ خاتون کے ساتھ زیادتی کی تھی اسی طرح وڈیرے عیاشی سے پہلے اپنی ہدف عورتوں کو ہتھیاروں کے نکاح میں دے دیتے ہیں یہ نکاح کاغذی ہوتے ہیں یہ خواتین وڈیروں کے حرم سراؤں میں رہتی ہیں لیکن ان کے زوجہ کے خانے میں کسی ہتھیار کا نام ہوتا ہے اگر اس دوران خاتون ماں بن جائے تو وڈیرے خاتون کو ہتھیار کے حوالے کرتے ہیں اور اس کا وظیفہ لگا دیتے ہیں یہ بندوبست بھی قانون کی مداخلت سے نہ چنے کیلئے کیا جاتا ہے ہتھیار اپنے اس کردار سے بخوبی واقف ہوتے ہیں لہذا وہ چپ چاپ چودھریوں سرداروں اور وڈیروں کے جرموں کی جھنجھکیاں پہن لیتے ہیں کیونکہ یہ جانتے ہیں اگر انہوں نے اس نظام میں زندہ رہنا ہے تو انہیں سرداروں کے نفسیاتی امراض کا ایندھن بننا پڑے گا انہیں اپنے ناکردہ جرائم کی سزا بھگتنا پڑے گی چنانچہ جب بھی کوئی چودھری کسی ہتھیار کی طرف اشارہ کرتا ہے تو وہ چپ چاپ آگے بڑھتا ہے اپنا گانہ چودھری کے منہ کے قریب لاتا ہے اور اس کے بعد چودھری جو حکم دیتا ہے ہتھیار سے اذیر کر کے پولیس کے سامنے پیش ہو جاتا ہے ہمارے دیہات کے وڈیرے اپنے ہتھیاروں کی تعداد پر فخر بھی کرتے ہیں اور انہیں اپنے دوست وڈیروں کو "ادھار" بھی دیتے رہتے ہیں۔

میں 30 اکتوبر 2006 تک یہ سمجھتا تھا یہ روایت صرف ہمارے دیہات تک محدود ہے لیکن جب بھری کی صبح باجوڑ ایجنسی کے علاقے ڈم ڈولام میں امریکی طیاروں نے ایک دیہی مدرسے پر میزائل داغے اور اس حملے میں 83 طالب علم اور اساتذہ شہید ہو گئے اور ہماری حکومت نے اس مظلوم حملے کا جرم اپنے سر لے لیا تو مجھے محسوس ہوا ہتھیاروں کے دیہات تک محدود نہیں ہیں بلکہ یہ قومیں اور ملک بھی ہو سکتے ہیں اور بد قسمتی سے ہم نہ صرف امریکہ کے ہتھیار کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں بلکہ چودھری ہتھیاروں کے تمام جرائم اپنے سر لینا ہماری قومی اور ملی ذمہ داری ہے آج اس حملے کو چاروں نژاد چکے ہیں ان چاروں میں ثابت ہو چکا ہے مولانا لیاقت کے اس مدرسے میں صرف غریب طالب علم پڑھتے تھے اور مدرسے میں کوئی شریک نہیں تھا امریکہ کے ذرائع ابلاغ اعتراف کر رہے ہیں اس مدرسے پر امریکی طیاروں نے ٹھنڈی ٹھنڈی بمباری کیا تھا اور اس حملے میں 83 بے گناہ اور معصوم بچے شہید ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود ہم لوگ

رضا کاراندہ مہسٹو بن چکے ہیں، ہم یہ جرم اپنے سر لے رہے ہیں، کون؟ میرا خیال ہے، ہم لوگ اقوام عالم میں اپنے لئے مہسٹو کا کردار پسند فرما چکے ہیں اور ہم غلامی کی اس سطح تک پہنچ چکے ہیں جہاں غلام اپنی غلامی پر فخر کرنے لگتے ہیں، میں جب بھی اس صورتحال پر غور کرتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے میں امریکہ کا شکر یہ ادا کروں کیونکہ مجھے محسوس ہوتا ہے یہ امریکہ کی خاص مہربانی ہے اس نے ابھی تک پاکستان کی تمام مسجدوں اور مدرسوں پر حملوں کا فیصلہ نہیں کیا، اس نے ابھی تک ہمیں کلمہ پڑھنے، واڑھی رکھنے اور ٹوپی پہننے کی اجازت دے رکھی ہے ورنہ ہماری حکومت نہ صرف اس امر کی اقدام کی بھی حمایت کر دیتی بلکہ وہ مہسٹو بن کر یہ "کار خیر" بھی اپنے ذمے لے لیتی، میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں واقعہ کہ بلا ہمارے دور میں پیش نہیں آیا ورنہ ہم خدا نخواستہ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کو بھی اپنا کارنامہ قرار دے دیتے اور ہم اس معاملے میں بھی مہسٹو بن جاتے۔

Kashif Azad@OneUrdu.com

کاش اسرائیل اسلامی ملک ہوتا

موشے کاتساؤ اسرائیل کے صدر ہیں 'کاتساؤ کا پس منظر بہت دلچسپ تھا وہ 1945ء میں مادین کے شہر یازد میں پیدا ہوئے ان کے والدین گمراہ یہودی تھے 1948ء میں ان کے والدین تہران منتقل ہوئے اور 1951ء میں یہ لوگ اسرائیل چلے گئے 'کاتساؤ نے 24 سال کی عمر میں سیاست شروع کی اور وہ لی خود پارٹی کے گلٹ پر اسرائیل کے چھوٹے سے قصبے قیریاٹا کے میئر منتخب ہو گئے وہ اسرائیل کے کم عمر ترین میئر تھے وہ 1969ء میں ہیکلی ہار پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے 1981ء میں وہ ہاؤسنگ کے نائب وزیر بنے اور اس کے بعد وہ مختلف ادوار میں وزیر بننے چلے گئے جولائی 2000ء میں انہوں نے مشہور سیاستدان اور سابق وزیر اعظم شمعون پیرز کے مقابلے میں صدارتی الیکشن لڑا اور اسرائیل کے صدر منتخب ہو گئے وہ اسرائیل کی تاریخ کے پہلے صدر ہیں جو 7 سال کیلئے منتخب ہوئے ہیں 'موشے کاتساؤ میں پانچ خوبیاں ہیں وہ دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں وہ کسی اسلامی ملک میں پیدا ہونے والے پہلے اسرائیلی صدر ہیں ان کی مادری زبان فارسی ہے وہ اسرائیل کے سابق وزیر اعظم کوٹکت دے کے صدر بنے ہیں اور وہ نڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے پہلے اسرائیلی صدر ہیں۔

موشے کاتساؤ کی زندگی اور سیاست اس وقت شدید بحران کا شکار ہے۔ جولائی 2006ء میں ایک یہودی خاتون نے موشے کاتساؤ کے خلاف زیادتی کا پہلا کیس درج کرایا

پولیس کو ابتدائی تفتیش میں خاتون کی بات سچ محسوس ہوئی لہذا 22 اگست 2006ء کو پولیس نے ایوان صدر پر ریڈ کیا، صدر کے تمام کاغذات اور کمپیوٹر قبضے میں لئے اور صدر کے خلاف تفتیش شروع کر دی پولیس ریڈ کی خبریں شائع ہوئیں تو بے شمار خواتین نے صدر کے خلاف جنسی زیادتیوں کے مقدمے درج کرانا شروع کر دیئے پولیس کو معلوم ہوا موٹے کاٹاؤ، ہانسی میں خواتین کو ملازمت دیتے تھے اور اس ملازمت کی آزادی میں ان کے ساتھ زیادتی کرتے تھے پولیس نے وہ خواتین کے مقدمے درج کئے اور اعلیٰ سطح پر ان مقدموں کی تفتیش شروع کر دی 23 اگست کو صدر کے خلاف پہلی تفتیش شروع ہوئی اور 7 ستمبر کو چوتھے مقدمے پر کام شروع ہو گیا 13 ستمبر 2006ء کو صدر نے ایوان صدر میں نئی انکیشن کمشنر مس نبیش سے حلف لینا تھا اسرائیل کے آئین کے مطابق یہ حلف صرف صدر لے سکتا ہے لیکن اس دن صدر کی تفتیش تھی، اسرائیلی قانون کے مطابق کوئی زیر تفتیش ملزم پولیس کی اجازت کے بغیر تفتیش سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا، موٹے کاٹاؤ نے اس تقریب میں شرکت کیلئے پولیس چیف کو درخواست دی لیکن پولیس چیف نے تفتیش موخر کرنے سے انکار کر دیا، صدر نے پارلیمنٹ سے معذرت کر لی جس کے بعد اسرائیل کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ تقریب ایوان صدر کی بجائے پارلیمنٹ میں منعقد ہوئی اور انکیشن کمشنر کا حلف اسرائیل کی پارلیمنٹ میں ایت نے لیا، اس دن پولیس نے صدر موٹے کاٹاؤ سے نو گھنٹے تفتیش کی، یہ تفتیش صبح دس بجے شروع ہوئی اور شام سات بجے تک چلتی رہی پولیس کے مطابق جب تک یہ تفتیش جاری رہے گی اس وقت تک صدر موٹے کاٹاؤ کی سرکاری مصروفیات معطل رہیں گی اور وہ پولیس کی اجازت کے بغیر کسی جگہ جا سکیں گے اور نہ ہی کسی تقریب میں شرکت کریں گے۔

یہ عالم اسلام کے سب سے بڑے دشمن کے نظام عدل کی تازہ ترین مثال ہے، میں جب اسرائیلی صدر موٹے کاٹاؤ کا کیس پڑھا رہا تھا تو میں نے سوچا، کیا اسلامی دنیا کے 62 ممالک میں بھی ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا پاکستان سے لے کر ایچوقیا تک کسی اسلامی ملک کی پولیس برسر اقتدار صدر کے خلاف مقدمہ درج کر سکتی ہے؟ کیا کسی اسلامی ملک کی پولیس ایوان صدر میں داخل ہو سکتی ہے؟ وہ صدر کے کاغذات اور کمپیوٹر قبضے میں لے سکتی ہے؟ کیا وہ صدر سے نو گھنٹے تفتیش کر سکتی ہے اور کیا کسی اسلامی ملک کا کوئی صدر سرکاری تقریب میں شرکت کیلئے پولیس سے اجازت لے گا اور کیا کسی اسلامی ملک کا پولیس چیف صدر کی درخواست پر نامنظور لکھنے کی جرأت کرے گا؟ میرا جواب انکار تھا، میرا خیال ہے اگر یہ سوال آپ سے بھی پوچھا جائے تو آپ بھی

انکار میں سر ہلا دیں گے آپ کا یہ انکار بنیادی طور پر ترقی، عروج اور عزت کا لفظ آغاز ہے یہ "ہمیں" آگے چل کر قوموں کا عروج و زوال ملے کرتا ہے میرے بے شمار قارئین کیلئے یہ بات نئی ہو گی کہ اسرائیل نے انصاف اور عدل کا یہ نظام اسلام سے لیا تھا آج سے چودہ سو سال پہلے یہودیوں اور مسلمانوں کے نظام عدل میں بڑا فرق تھا یہودی دنیا کی پہلی قوم تھی جس میں بالائی اور زبیری طبقہ پایا جاتا تھا ان کا بالائی طبقہ قانون کی گرفت سے آزاد سمجھا جاتا تھا جبکہ زبیری طبقوں پر پورا پورا قانون نافذ کر دیا جاتا تھا آپ نے سیرت کی کتابوں میں بنو مخزوم کی ایک خاتون فاطمہ کا واقعہ پڑھا ہوگا اس خاتون کو نبی اکرمؐ نے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی تھی اور بعض صحابہ کرام نے اس کی سفارش کی تھی جس پر نبی اکرمؐ نے بڑے تاریخی الفاظ فرمائے تھے "آپ نے فرمایا تھا تم سے پہلی قومیں اس لئے برباد ہو گئیں کہ جب ان کا کوئی معزز شخص جرم کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیا جاتا تھا لیکن جب کسی عام شخص سے جرم سرزد ہو جاتا تھا تو اس کو سزا دے دی جاتی تھی آپ نے فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ فاطمہ بنت محمدؐ ہوتی تو مجھ میں اسے بھی سزا دیتا" اس واقعے میں نبی اکرمؐ کا اشارہ یہودیوں کی طرف تھا کہ تم اس زمانے کے یہودی بالائی طبقے کے مجرموں کو چھوڑ دیا کرتے تھے جبکہ اس کے مقابلے میں اسلام دنیا کا پہلا مذہب تھا جس نے عدل اجتماعی کی بنیاد رکھی جس میں قاضی کی عدالت میں پہنچ کر ظیفہ اور مسائل ایک ہو جاتے تھے بڑا مشہور واقعہ ہے حضرت عمرؓ کے دسترخوان پر حضرت علیؓ گھانا تناول فرما رہے تھے اور ایک یہودی نے آکر عرض کیا "حضرت علیؓ میرے ملزم ہیں" حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کو اپنے دسترخوان سے اٹھا کر مسائل کے ساتھ کھڑا کر دیا اور حضرت عمرؓ کا وہ واقعہ جس میں انہوں نے اپنے بیٹے کو زنا کے جرم میں اپنے ہاتھوں سے کوڑے مارے تھے یہ واقعہ اس وقت دنیا کی قانون کی تمام کتابوں میں درج ہے خلفائے راشدین کے دور میں تمام خلفاء کئی بار تاضیوں کے سامنے پیش ہوئے اور اسلامی عدل کے نظام سے گزرے لہذا یہ اسلام تھا جس نے اقتساب اور انصاف کا ایک ایسا نظام تشکیل دیا جس میں ایک عام بد کھڑا ہو کر ظیفہ سے دوسری چادر کا حساب مانگ لیتا تھا اور جس میں گورا اور کالا عربی اور گھنی چھوٹا اور بڑا سب برابر تھے آنے والے ادوار میں دنیا کی ہر اس قوم نے اسلام کے اس نظام کو اپنے لئے مشعل راہ بنالیا جو ترقی کرنا چاہتی تھی جو اقوام عالم میں آگے بڑھنا چاہتی تھی آپ دلچسپ بات ملاحظہ کیجئے دنیا کی جس قوم نے اسلام کے اس نظام عدل سے استفادہ کیا وہ چند برسوں میں سر پر باد بن گئی اس نے دنیا پر حکمرانی کی یہاں تک کہ یہودی تک اسرائیل میں عدل

کا اسلامی نظام نافذ کرنے پر مجبور ہو گئے لہذا آج ان کے سربراہ بھی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے عدل کے اس عمل سے گزرتے ہیں جس سے اسلام کے ابتدائی دنوں میں ہمارے اکابرین کو گزرنا پڑا تھا آج ہمارے دشمنوں کے ملک میں بھی وہ نظام نافذ ہے جس پر کبھی ہم فخر کیا کرتے تھے۔

میں نے جب کاتساؤ کا کیس پڑھا تو میرے دل سے آہنگی اور میں نے اپنے آپ سے کہا کاش یہ واقعہ کسی اسلامی ملک میں پیش آیا ہوتا کاش موٹے کاتساؤ کی جگہ کسی اسلامی ملک کا صدر ہوتا تو آج ہم بھی دنیا کی ترقی یافتہ قوم ہوتے آج ہم بھی عزت اور وقار کے ساتھ زندگی گزار رہے ہوتے اور آج ہمیں آرمیج جیسے لوگوں سے بچنے کیلئے باجوڑ میں اپنے بچے قتل نہ کرنا پڑتے، میں نے سوچا کاش موٹے کاتساؤ مسلمان صدر ہوتا کاش اسرائیل اسلامی ملک ہوتا۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

بس اب رسوائی اور سزائے عظیم باقی ہے

برطانوی وزیر عظیم ٹونی بلیر نے 20 نومبر 2006ء کو فیصل مسجد کا دورہ کرنا تھا۔ تمنا ہے کہ قریب سیکورٹی اہلکار فیصل مسجد میں داخل ہوئے اور انہوں نے اللہ کے گھر کا تمام انتظام و انصرام سنبھال لیا۔ مسجد کا لاؤڈ سپیکر قبضے میں لے لیا گیا۔ مسجد میں موجود تمام زائرین سیاحوں اور نمازیوں کو باہر نکال دیا گیا اور مسجد کے چپے چپے کی کلاشی شروع ہو گئی اس کلاشی کے دوران نماز عصر کا وقت ہو گیا۔ مسجد کے منتظمین نے سیکورٹی ایجنسیوں کے اہلکاروں کو وقت کی نشاندہی کی اہلکاروں نے حکم دیا "نماز عصر موخر کرو" سننے والوں میں سے ایک شخص نے تڑپ کر جواب دیا "نماز موخر نہیں ہو سکتی" اہلکاروں نے اسے گھور کر دیکھا لیکن پھر صورتحال کی نزاکت بھانپ کر خاموش ہو گئے۔ مؤذن نے اذان دینے کی اجازت طلب کی انتظامیہ نے منظوری تو دے دی لیکن لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت نہ دی۔ مؤذن نے لاؤڈ سپیکر کے بغیر اذان دے دی۔ امام صاحب مقررہ وقت پر اپنے حجرے سے نکلے لیکن انتظامیہ نے انہیں مسجد کے احاطے میں داخل نہ ہونے دیا۔ وہ تھوڑی بہت ٹکرا کر بعد واپس لوٹ گئے اس وقت مسجد کے احاطے میں کوئی نمازی کوئی سیاح اور کوئی زائر نہیں تھا۔ مسجد میں نماز پڑھنے اور پڑھانے والے بھی نہیں تھے۔ لہذا وہاں موجود تین چار لوگوں نے "جماعت" بنائی اور چپ چاپ نماز ادا کر کے باہر نکل گئے۔ یہ فیصل مسجد کی پہلی نماز تھی جس کیلئے ہاتھ دھو صف بندی ہوئی اور نہ ہی نمازیوں کو اللہ کے گھر میں داخل ہونے دیا گیا۔

21 نومبر کی صبح اسلام آباد کے ایک صحافی نے اس واقعے کے بارے میں خبر دے دی اس خبر کی تصدیق برطانیہ کے ایک صحافی نے بھی کی یہ صحافی فیصل مسجد میں ہونے والی ساری کارروائی مانیٹر کر رہا تھا دارالحکومت کی انتظامیہ اسے وزیراعظم ٹونی بلیر کا سیکورٹی ایجنٹ سمجھتی رہی لہذا اس صحافی نے اپنی آنکھوں سے حکومت کی روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا مظاہرہ دیکھا اور شام کو مجھے اس کی ساری روداد سنائی یہ منظر بیان کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا "جب اسلامی ممالک کے حکمران یورپ کے چرچز کا دورہ کرتے ہیں تو ہم وہاں انہیں سیکورٹی فراہم نہیں کرتے ہم ان کیلئے چرچوں میں موجود زائرین کو باہر نہیں نکالتے لیکن یہ آپ لوگوں کا کمال تھا آپ نے ہمارے وزیراعظم کے اعزاز میں نہ صرف مسجد خالی کرائی بلکہ نماز تک نہ ہونے دی اس کا کہنا تھا "ٹائن الیون کے بعد یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے ہمارے بعض کنوشری مسجدوں کو نشانہ بنانے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں" پچھلے پانچ برسوں میں ہمارے بے شمار لوگوں نے مسجدوں میں اذانیں بند کرانے کیلئے حکومت کو درخواستیں دیں لیکن ہماری حکومتوں نے کسی مسجد پر پابندی لگائی کسی مسجد میں نماز رکوائی اور نہ ہی اذان کے خلاف کوئی حکم جاری کیا آج بھی یورپ اور امریکہ کی تمام مسجدوں میں اذانیں ہوتی ہیں اور مسلمان نمازیں بھی پڑھتے ہیں اس نے کہا "برطانیہ کے جس وزیراعظم کے استقبال کیلئے اذان اور نماز رکوائی مسمی اس وزیراعظم کے ملک میں تمام مسجدیں آزاد ہیں وہاں دن میں پانچ بار لاؤڈ سپیکر پر اذان ہوتی ہے" میں نے اس سے عرض کیا "تمہارے اور ہمارے ملک کے حالات میں بڑا فرق ہے تمہارے ملک کی سیکورٹی ایجنسیاں اور امن وامان کے ادارے تشکیل ہیں تم لوگ مسندوں کی دیواروں کے پیچھے محفوظ ہو جبکہ ہم لوگ فرنٹ لائن میں ہیں ہمارے ملک میں حملے کرنے والے لوگ موجود ہیں لہذا ہمیں اس قسم کے بندوبست کرنے پڑتے ہیں" اس نے قہقہہ لگایا اور خاموشی سے اپنے لیب ٹاپ کے ساتھ کھینچنے لگا۔

میں نے اسے مجھوتی ہچی وکیل دے کر خاموش تو کر دیا لیکن میں اندر سے مطمئن نہ ہوا لہذا میں نے اپنے ایک ساتھی سے درخواست کی وہ مجھے قرآن مجید سے ایسی آیات نکال کر دے جس میں اللہ تعالیٰ نے مسجدوں اور نمازوں پر پابندی لگانے والوں کے بارے میں وعید سنائی ہو میرے ساتھی ایک عالم دین اور قرآن فہم شخص ہیں ان کی زندگی کا ایک لمبا عرصہ مدارس میں تعلیم پاتے اور بعد ازاں تعلیم دیتے گزارا وہ آج کل دین کے بارے میں میری تربیت کر رہے ہیں انہوں نے میرے سامنے سورۃ البقرہ کی ایک آیت رکھ دی یہ سورۃ البقرہ کی 114 نمبر آیت تھی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا "اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں ان کا ذکر (اور عبادت) کئے جانے سے بندش کرے اور ان کے ویران (ومظلل) ہونے (کے بارے) میں کوشش کرنے ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت ہو کر ان میں قدم بھی نہیں رکھنا چاہیے تھا (بلکہ جب جاتے ہیبت اور ادب سے جاتے) ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نعیب) ہوگی اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی" یہ حکم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ تھا میں نے جب یہ آیت پڑھی تو میں روح کی گہرائی تک دہل گیا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ہم جیسے لوگوں کے لئے اتاری تھی اللہ تعالیٰ جانتے تھے پاکستان کے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ آئے گا جو غیر ملکی سربراہان کو خوش کرنے کیلئے مسجدوں کو نمازیوں سے خالی کرالے گا جو مؤذن کو اذان اور امام کو امامت سے روک دے گا جس کی نظر میں دین کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی اور جو شعار اسلام کا کھلم کھلا مذاق اڑاے گا جس کے دور میں اذان نماز داڑھی اور ایمان منکوک ہو جائیں گے جس کے عہد میں اہل ایمان کو باغیوں اور وہشت گردوں کا نام دیا جائے گا جس دور میں برلاڈین کے خون اور مغرب پرست شخص معتدل اور روشن خیال سمجھا جائے گا اور جس دور میں لادین خواتین و حضرات مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ مسلمان دکھائی دیں گے میں نے جوں جوں اس آیت پر غور کیا مجھے محسوس ہوا خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جن ظالموں کا ذکر کیا تھا وہ لوگ ہمارے ارد گرد موجود ہیں اور ہم نہ صرف ان کے ہاتھوں پر ہیبت کر چکے ہیں بلکہ ان کا ہر ظلم اور ہر زیادتی چپ چاپ سہہ رہے ہیں میں نے محسوس کیا یہ لوگ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے اتنے نافرمان ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ظالم کا خطاب دینے پر مجبور ہیں میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا اللہ تعالیٰ کی نظر میں ظالم لوگ کون ہوتے ہیں میرے ساتھی نے جواب دیا اللہ تعالیٰ فرعونوں، فروروں، شدادوں اور ابو جہلوں کو ظالم سمجھتا ہے میں نے یہ آیت دوسری مرتبہ پڑھی میں جب آیت کے آخر تک پہنچا تو میں ظالم لوگوں کے انجام سے خوف زدہ ہو گیا اللہ تعالیٰ نے اپنی آیت مبارکہ کے آخر میں فرمایا "ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نعیب) ہوگی اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی" میں آیت کے اس حصے کو علامہ کرام پرچھوڑتا ہوں وہ فیصلہ کریں اللہ تعالیٰ کی نظر میں رسوائی اور سزائے عظیم کیا ہوتی ہے میں تو بس اتنا جانتا ہوں سورۃ البقرہ کی آیت 114 کا پہلا حصہ مکمل ہو چکا ہے بس آخری حصہ پورا ہونے کی دیر ہے بس اب رسوائی اور سزائے عظیم پاتی ہے۔

پاسپ لائن کی بجائے

موسیٰ حسین شیراز کا رہنے والا تھا، وہ امریکہ سے مشینری درآمد کرتا تھا، اسے کاروباری

حیرت سے ہر مہینے امریکہ جانا پڑتا تھا، وہ تہران سے ڈوئی جاتا تھا اور دوئی سے نیو یارک۔ 2005ء

کے آخر میں وہ نیو یارک گیا۔ وہ پولٹری فیڈ بنانے والی جدید مشینیں خریدنا چاہتا تھا، وہ سہ ماہی

بجے جان ایف کینڈی ایئر پورٹ پر اتر، اس نے لمبا اور بھاری کوٹ پہن رکھا تھا، امریکی سیکورٹی

ایجنسیوں نے اسے روکا اور سٹاٹی کیلئے اس کے کپڑے اتارتا شروع کر دیے۔ یہ ایک کھلی جگہ تھی

جہاں سے بیسیوں مسافر گزر رہے تھے، موسیٰ کو سبکی کا شدید احساس ہوا لیکن اس کے پاس کوئی دوسرا

راستہ نہیں تھا، وہ خاموش کھڑا رہا، ایجنسیاں سٹاٹی کے اس عمل سے مطمئن نہ ہوئیں چنانچہ اسے

تفتیشی کمرے میں لے جایا گیا، وہاں رات دو بجے تک اس کی تفتیش ہوتی رہی، موسیٰ حسین بلڈ

پریشر اور شوگر کا مریض تھا، اس کا بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی ناک سے خون رسنے لگا۔ اہلکار گھبرا

گئے چنانچہ وہ اسے ہسپتال لے گئے۔ موسیٰ چار دن ہسپتال میں رہا، ان چار دنوں میں اس کے

خاندان کو شدید پریشانی لاحق رہی، اس کے کاروبار کا بھی حرج ہوا اور اسے ہسپتال کو بھی 18 ہزار

ڈالر ادا کرنے پڑے۔ اسی دوران امریکی ایجنسیوں نے موسیٰ حسین کو "رنگی" بھی قرار دے

دیا جس کے بعد موسیٰ حسین کی خصوصی سٹاٹی اور گمرانی شروع کر دی گئی۔ موسیٰ حسین واپس تہران

پہنچا تو اس نے مقامی اخبارات میں اپنی ساری روداد شائع کرا دی۔ موسیٰ حسین کا کہنا تھا اگر

امریکی ادارے امریکہ میں ایرانی شہریوں کی تلاش لے سکتے ہیں، اگر امریکہ نے ایرانیوں کیلئے فنکر پرنس اوزم قرار دے دیئے ہیں تو ایران ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟ یہ مسئلہ اخبارات سے ہوتا ہوا ایران کی پارلیمنٹ میں گیا۔ 2006ء کے وسط میں اس پر بحث شروع ہوئی اور یہ بحث 19 نومبر کو قانون کی شکل اختیار کر گئی۔ ایران کی پارلیمنٹ نے 26 کے مقابلے میں 135 ووٹوں سے یہ قانون بنا دیا۔ "2007ء سے ایران کی حدود میں داخل ہونے والے تمام امریکی شہریوں کے فنکر پرنس لیے جائیں گے۔" یہ قانون منظور ہو گیا لیکن ایرانی صدر محمود احمدی نژاد اس سے مطمئن نہیں تھے لہذا انہوں نے اس کے خلاف گارڈین کونسل میں اپیل کر دی۔ ایران میں گارڈین کونسل پارلیمنٹ کے کسی بھی قانون کو ویتو کر سکتی ہے۔ یہ کونسل بہرہ ور ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے چھ سیاسی و مذہبی لیڈر ہوتے ہیں جبکہ 6 ارکان کا تعلق عدالتوں سے ہوتا ہے۔ ایرانی صدر نے اپنی اپیل میں خیال ظاہر کیا "ایران کے اختلافات امریکی حکومت سے ہیں امریکی عوام سے نہیں اور اس قانون سے مسافروں اور سیاحوں کو تکلیف ہوگی جس سے ایران اور امریکہ کے سفارتی تعلقات خراب ہو جائیں گے" ایرانی صدر کا موقف تھا "فنکر پرنس کے عمل سے امریکی مہمانوں کے میزبانوں کو بھی شرمندگی ہوگی چنانچہ ہمیں اس قانون سے پرہیز کرنا چاہیے" گارڈین کونسل نے اس قانون اور ایرانی صدر کی اپیل کا از سر نو جائزہ لیا اور آخر میں صدر کی درخواست مسترد کر دی۔ گارڈین کونسل کے ترجمان عباس علی کا کہنا تھا "امریکہ میں ایرانیوں سمیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو روز شرمندگی ہوتی ہے اگر امریکی اس شرمندگی کا تھوڑا سا حصہ واپس لے لیں گے تو قیامت نہیں آجائے گی۔ ایرانی پارلیمنٹ قانون پاس کر چکی ہے لہذا کوئی امریکی شہری اب اس سے مستثنیٰ نہیں ہوگا۔"

ایران دنیا کا دوسرا ملک ہے جس نے امریکیوں کے خلاف اتنا سنگین قانون بنایا۔ امریکہ نے نائن الیون کے بعد جب فنکر پرنس اور تلاشی کا کام شروع کیا تھا تو برازیل دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے اپنے ایئر پورٹس پر صرف امریکیوں کی تلاشی اور فنکر پرنس شروع کرا دیئے تھے لہذا دسمبر 2003ء سے آج تک برازیل کے تمام ایئر پورٹوں پر صرف امریکیوں کی تلاشی اور فنکر پرنس لیے جاتے ہیں۔ صدر بش سمیت ساری امریکی انتظامیہ اس امتیازی سلوک پر برازیل سے بار بار احتجاج کر چکی ہے لیکن برازیل حکومت کا کہنا ہے یہ ان کی عدالت کا حکم ہے لہذا حکومت اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ برازیل کے بعد ایران دوسرا ملک ہے جس نے امریکیوں کے خلاف

اتحادیہ ایکشن لیا۔ اگر ہم امریکہ اور ایران کے موجودہ سفارتی تعلقات کو سامنے رکھ کر اس قانون کا جائزہ لیں تو یہ قانون سیدھی سادی خودکشی محسوس ہوتا ہے۔ ایران امریکہ کی ہٹ لسٹ میں شامل ہے۔ امریکہ پچھلے پانچ برس سے ایران پر حملے کیلئے بہانہ تلاش کر رہا ہے۔ امریکی فوج ترکمانستان، آذربائیجان، ترکی، عراق، قطر، افغانستان اور پاکستان کی طرف سے ایران کا گھیرا بھگ کر رہی ہے۔ ایران پر ہواؤ ڈالنے کیلئے بلوچستان میں نئے ہوائی اڈے اور چھاؤنیاں بنائی جا رہی ہیں۔ اتحادی فوجیں ایران کی سرحد تک پہنچنے کیلئے قندھار اور ہرات میں طالبان کے خلاف برسر پیکار ہیں۔ امریکی فوجیں ترکمانستان، آذربائیجان اور ترکی میں اتر رہی ہیں اور قطر کے امریکی ایئر بیس پر امریکی سرگرمیوں میں اضافہ ہو چکا ہے، امریکہ کے اپنے تجزیہ نگاروں کو خدشہ ہے صدر بش اپنی صدارتی مدت ختم ہونے سے پہلے ایران اور شام پر حملہ کرے گا۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے ری پبلکن پارٹی اور بش خاندان پوری دنیا پر عیسائی غلبہ چاہتا ہے، کیونکہ دونوں جانتے ہیں 2008ء کے بعد انہیں یہ موقع نہیں ملے گا چنانچہ وہ اقتدار کے آخری دو برسوں کو ہر صورت میں یادگار بنانا چاہتے ہیں۔ ایران اس صورتحال سے پوری طرح واقف ہے اس لئے اس نے اپنے ہٹلے سلسلے بھی تیز کر دیا ہے اور وہ میزائل سازی میں بھی بہت آگے جا رہا ہے۔ ایران امریکی قوت سے بھی پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ جانتا ہے اگر امریکہ نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر ایران پر حملہ کر دیا تو وہ زیادہ دنوں تک امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکے گا چنانچہ ایران سمجھتا ہے وہ جتنی دیر تک اس حملے کو ٹال لے گا یہی اس کی کامیابی ہوگی۔ ایران کی کوشش ہے وہ کسی نہ کسی طرح امریکہ کو 2008ء کے ایکشن تک ٹالے رکھے۔ جس کے بعد ڈیموکریٹس اقتدار میں آجائیں گے اور یہ لوگ ری پبلکن کے مقابلے میں جنگ کے مخالف ہیں چنانچہ ایران بچ جائے گا۔ اس صورتحال میں ایسا خطرناک قانون پاس کرنا تیل کو سرخ کیڑا دکھانے کے مترادف ہے لیکن اس کے باوجود ایرانی پارلیمنٹ نے نہ صرف یہ قانون پاس کیا بلکہ اس پر فوری طور پر عملدرآمد بھی شروع کر دیا۔ یہ حقیقتاً سفارتی جرأت اور قومی بہادری ہے۔

پانچ فروری 2007ء کو ہمارے صدر جنرل پرویز مشرف ایران اور ترکی کے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ وہ ایک دن تہران میں زکے۔ ایران میں انہوں نے صدر محمود احمدی نژاد سے دن نو دن اور 75 منٹ کی طویل میٹنگ کی۔ اس میٹنگ میں ایران پاک میس پانپ لائن پر عملدرآمد کا فیصلہ ہوا۔ صدر مشرف نے مشرق وسطیٰ میں امن قائم کرنے کا منصوبہ بھی پیش کیا اور

ایران نے اس منصوبے کی بھرپور مدد کا یقین بھی دلایا۔ پاکستان نے ایران کو امریکی حملے کے خدشات کے بارے میں بھی بتایا جس پر ایران نے پاکستان کے نیک جذبات پر اطمینان کا اظہار کیا جس کے بعد ہمارے صدر مظہر حسین ہو کر ترکی روانہ ہو گئے۔ یوں یہ دورہ بھی پچھلے دوروں کی طرح کامیاب قرار پا گیا۔ مجھے یقین ہے ہمارے صدر واپس لوٹنے کے تو گیس پائپ لائن پر کام شروع ہو جائے گا، مجھے یہ بھی یقین ہے گیس پائپ لائن پاکستان، ایران اور بھارت کی معیشت میں انقلاب برپا کر دے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا ملکوں کو صرف معیشت، گیس اور پائپ لائنیں درکار ہوتی ہیں اور کیا ملکوں کیلئے صرف ڈالر زور خوشحالی کافی ہوتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں انسانوں کی زندگی میں روٹی، کپڑا اور مکان بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ قوموں کو شیشیں، ٹیکسٹائل اور سڑکیں ترقی یافتہ بناتی ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ڈالر قوموں کے مقدر کا فیصلہ کیا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے فرد ہو یا قومیں ان کی زندگی کیلئے انا، ضمیر اور عزت نفس آکسیجن کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ ڈالر جو دوسرے انسان کے پاؤں چھو کر ملے اور روٹی جس کے لئے انسان کو اپنی عزت نفس ضائع کرنا پڑے اور وہ زندگی جھپٹا کی گردن میں بے غیرتی کا طوق ہو دینا میں اس سے بڑا کوئی عذاب نہیں ہوتا، دنیا میں اس سے بڑا خسارہ کوئی نہیں ہوتا دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں جو سمجھتے ہیں وہ زندگی جو انسان کو انسانیت کے شرف سے نیچے گرا دے اس زندگی سے موت اچھی ہے اور جو روٹی انسان کو انسان کے سامنے جھکا دے اس سے بھوک لاکھ دے اچھی ہے اور جو ڈالر انسان کو اپنی غیرت کے عوض ملے اس ڈالر سے غربت کر ڈر دے بہتر ہوتی ہے لیکن بد قسمتی سے ہمارا شمار دنیا کی ان قوموں میں ہوتا ہے جو عزت نفس پر سمجھوتہ کرتی چلی آ رہی ہیں اور جن کا ملک دوسری قوموں کی چراگاہ بن چکا ہے میں نے جب اخبارات میں صدر کے دورے کی خبریں پڑھیں تو میں نے سوچا کاش ہم ایران سے پائپ لائن کی بجائے عزت نفس لے آتے، ہم ان سے یہ سیکھ لیتے کہ عزت کے ساتھ کیسے جیا جاتا ہے، کاش ہم ایرانی صدر سے وہ حوصلہ اور وہ جرأت مانگ لیتے جو قوموں کو قومیں، ملکوں کو ملک اور انسان کو انسان بناتی ہے، کاش ہم پائپ لائن کی بجائے ایران سے ضمیر اور استقلال لے لیتے۔



جو لوگ اپنا بیگ نہیں اٹھا سکتے

میرے سامنے امریکہ کے نائب صدر ڈک چینی کی ایک تصویر پڑی ہے۔ یہ تصویر 27 فروری 2007ء کو افغانستان کے مگرام ایئر بیس پر اتاری گئی اور 28 فروری کو پاکستان سمیت دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوئی اس تصویر میں ڈک چینی جہاز کی طرف جا رہے ہیں ان کے ایک ہاتھ میں ہزار ڈیڑھ ہزار صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جبکہ انہوں نے دوسرے ہاتھ میں اپنا بیگ اور ایک بھاری بھرم فائل اٹھا رکھی ہے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں تنوں چیزیں بڑی مشکل سے سنبھال رکھی ہیں یہ بظاہر ایک سادھی تصویر ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس میں امریکہ کے عروج، امریکہ کی ترقی اور امریکہ کے سپر پاور ہونے کی اصل وجوہات چھپی ہیں یہ تصویر امریکہ اور تیسری دنیا کے درمیان ایک ایسی لیکر کھینچتی ہے جس کے ایک طرف استحکام، عروج، طاقت اور ترقی ہے جبکہ دوسری طرف، پسماندگی، کمزوری، زوال اور عدم استحکام ہے یہ تصویر محض ایک تصویر نہیں بلکہ یہ روایت، تاریخ، نظریہ اور زاویہ نظر بھی ہے دنیا کی تاریخ کبھی مورخ لکھا کرتے تھے اور یہ کتابوں میں محفوظ ہوتی تھی لیکن جب سے کیمرا ایجاد ہوا ہے یہ تاریخ اب فوٹو گرافر لکھتے اور کیمرا میں بیان کرتے ہیں لہذا اب دنیا کا کوئی شخص تصویروں کے مطالعے کے بغیر کسی قوم کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تاریخ تک پہنچ سکتا ہے۔ ڈک چینی کی یہ تصویر بھی ایک تاریخی دستاویز ہے اور جب تک ہم اس تصویر کا تجربہ نہیں کرتے ہم امریکہ کی اصل طاقت تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

امریکہ اس وقت دنیا کی واحد سپر پاور ہے اور ڈک چینی اس واحد سپر پاور کے نائب صدر امریکی آئین کے مطابق نائب صدر کو بعض ایسے اختیارات بھی حاصل ہیں جو صدر کے پاس نہیں ہیں، امریکہ کا نائب صدر عملاً دنیا کا نائب صدر ہوتا ہے لیکن یہ شخص نہ صرف اپنا سامان خود اٹھا کر جہاز میں سوار ہوتا ہے بلکہ وہ اپنا بیگ اپنی فائل اور اپنی کتاب خود اٹھا کر جہاز سے اترتا ہے، حکومت نے اسے سامان اٹھانے کے لئے کوئی اسے ڈی سی، سیکرٹری یا ملازم نہیں دیا، وہ اپنا ذاتی سامان اٹھانے کے لئے اپنے سٹاف کے کسی شخص کی مدد بھی نہیں لے سکتا، شاید یہ بات بے شمار لوگوں کے لئے نئی ہو امریکی حکومت صرف صدر کو سرکاری مصروفیات کے دوران بیگ اٹھانے کے لئے معاون فراہم کرتی ہے، یہ سہولت پر وہ لوگوں کی مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے دی گئی تھی کیونکہ دنیا بھر میں جب کوئی سربراہ مملکت کسی دوسرے سربراہ سے ملتا ہے تو اس کے دونوں ہاتھ خالی ہونے چاہئیں چنانچہ امریکی قانون نے اس مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے صدر کو پروٹوکول کے دوران معاون کی سہولت فراہم کر دی لیکن جو کسی سرکاری مصروفیت ختم ہوتی ہے صدر بھی اپنے سامان کا خود ڈسٹو دار ہو جاتا ہے آپ نے اکثر امریکی صدر کو تعطیلات کے دوران اپنا بیگ اٹھانے یا گالف کھیلتے ہوئے اپنی ٹرائی خود کھیلنے دیکھا ہو گا، آپ آئندہ غور کیجئے گا اس وقت صدر کے ساتھ سیکورٹی کے علاوہ کوئی معاون نہیں ہوتا، امریکی صدر کے علاوہ کسی دوسرے عہدیدار کو سرکاری مصروفیات کے دوران بھی یہ سہولت حاصل نہیں ہوتی لہذا نائب صدر ہو یا امریکہ کا کوئی وفاقی وزیر وہ اپنی فائلیں اور اپنا بیگ خود اٹھا کر آتے ہیں اور خود اٹھا کر لے جاتے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں آپ پاکستان کے سرکاری کالج پر نظر ڈالیں تو آپ کو سیکشن افسر سے صدر تک نہ صرف سب کے ہاتھ خالی ملیں گے بلکہ ان کے پیچھے سرکاری ملازموں کی فوج چل رہی ہوگی اور سب ملازموں نے صاحب کی کوئی نہ کوئی چیز اٹھا رکھی ہوگی آپ صبح کے وقت کسی سرکاری دفتر میں چلے جائیں، آپ دیکھیں گے 16 سے 22 گریڈ تک کے ہزاروں ایک، اس کی فائلیں، اس کا فون، اس کا بلب ٹاپ، اس کی بچھتری، اس کا پاپ اور بعض اوقات اس کے جوتے تک اس کے ڈرائیور اس کے چہرے یا اس کے کسی جوئیئر افسر نے اٹھا رکھے ہوں گے، آپ پورے پاکستان میں کسی وزیر کو بیگ اٹھانے نہیں دیکھیں گے جبکہ وزیر اعظم اور صدر کے معاملے میں تو یہ خواہش مکمل بے وقوفی ہے۔

میں پچھلے 17 برس سے صحافت میں ہوں، میں نے ان 17 برسوں میں ایک ہزار کے قریب وزیر اعظم اور حاکم صدر کو کبھی نہ آج تک کسی کے ہاتھ میں کوئی فائل، کوئی

کتاب یا کوئی بیگ نہیں دیکھا، ان سب لوگوں کا سامان ان کے سٹاف نے اٹھا رکھا تھا، مجھے ایک صدر صاحب کو وضو کرتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا تھا، صدر صاحب کو چار ملازم مل کر وضو کرا رہے تھے، وضو کے بعد ملازموں نے کرسی پر بیٹھا کر ان کے ہاتھ پاؤں اور منہ خشک کیا تھا، نماز کے بعد چاندی کی ایک پشتری الائی گئی تھی، پشتری کے اوپر سے ڈسکن اتارا گیا تو میں نے دیکھا پشتری کے اندر تسبیح بڑی تھی، تسبیح کے بعد ترے میں صدر صاحب کی جرابیں آئی تھیں اور ایک ہاروری ملازم نے صدر صاحب کے پاؤں گود میں رکھ کر انہیں جرابیں پہنائی تھیں، یہ ایک پرانے صدر کا قصہ تھا، آپ جدید دور کے وزیر اعظم کے معمولات ملاحظہ کیجئے، ہمارے وزیر اعظم سرکاری یا ذاتی دورے پر جاتے ہیں تو ان کے ساتھ بارہ ملازم ہوتے ہیں، یہ ملازم ان کے ذاتی کاموں کے لئے ساتھ جاتے ہیں، وزیر اعظم کی تقریر اور چشمہ ان کے اسے ڈی سی سنبھالتے ہیں جبکہ پرس کی حفاظت سٹاف افسر کرتا ہے، کپڑوں کی استری اور جوتوں کی پالش کے لئے دو ملازم ہوتے ہیں جبکہ خانہ سالن وزیر اعظم کی خصوصی خود لاک کے لئے ساتھ جاتا ہے جبکہ وزیر اعظم کا سامان اٹھانے کے لئے دو پورٹرز ہوتے ہیں، ہمارے موجودہ صدر ان سے کہیں زیادہ ترنگ و احتشام کے ساتھ گھر سے نکلتے ہیں، ایک ہاروری ملازم نے ان کی پانی کی بوتل اٹھا رکھی ہوتی ہے، ان کا بیگ اور بریف کیس دو ملازم اٹھاتے ہیں جبکہ موہل فون تین مختلف افسروں کے پاس ہوتے ہیں، مجھے ان سارے لوگوں میں صرف گورنر پنجاب قدرے بہتر حکمران لگے ہیں ان کے ساتھ صرف ڈرائیور، اسے ڈی سی اور سامان اٹھانے کے لئے ایک ملازم ہوتا ہے، صدر وزیر اعظم اور گورنروں کے بعد وزراء اعلیٰ وزراء اور سیکرٹریوں کی باری آتی ہے، وزراء اعلیٰ پورے اڈے لشکر کے ساتھ گھر سے نکلتے ہیں، ان کا سامان بھی اسی طرح مختلف لوگوں میں تقسیم ہوتا ہے، کسی نے ان کی پانی کی بوتل اٹھا رکھی ہوتی ہے، کسی کی جیب میں صاحب کا نوٹھ پیسٹ ہوتا ہے اور کسی نے ان کے لئے صندوق کی "نوٹھ پکس" اٹھا رکھی ہوتی ہیں۔ کوئی ان کے چشمے کی حفاظت کر رہا ہوتا ہے، کسی نے ان کی جرابوں کا جوڑا پکڑ رکھا ہے اور کوئی جیب میں رقم ڈال کر ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہے اور جہاں صاحب اشارہ کرتے ہیں وہ جیب سے نوٹ نکال کر سامنے پھیلی جھولی میں ڈال دیتا ہے، اسی طرح وزراء کے ساتھ بھی سٹاف افسروں، ڈپٹی سیکرٹریوں اور ذاتی ملازموں کی فوج چلتی ہے، یہ لوگ بھی ان کا سامان اٹھا کر پیچھے پیچھے چلتے ہیں جبکہ صاحب خالی ہاتھ گاڑی میں سوار ہوتے ہیں اور خالی ہاتھ اترتے ہیں، میں نے ایک بار کراچی انٹریورٹ پر بڑا دلچسپ منظر دیکھا تھا، ایک وزیر صاحب

جہاز میں سوار ہونے کے لئے آئے تو ان کا بورڈنگ کارڈ ان کے سٹاف افسر نے اٹھا رکھا تھا، یہ افسر وزیر کے آگے آگے چل رہا تھا جبکہ صاحب چٹون کی جیبوں میں ہاتھ دے کر اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے وزیر صاحب نے تلاش تک کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

آپ پاکستانی عمامہ میں کی یہ حرکات ملاحظہ کریں اور اس کے بعد یارپ مشرق بعید اور امریکہ کے حکمرانوں کا لائف سٹائل دیکھیں تو یقین کیجئے شرم سے سر جھک جاتا ہے مجھے ایک دوست نے امریکہ کے نائب وزیر رچرڈ آر میچ کے ساتھ ایک پاکستانی سیکرٹری کی ملاقات کا احوال سنایا تھا، یہ سیکرٹری صاحب سرکاری ملاقات کے لئے امریکہ گئے تھے ان کے ساتھ چار لوگوں کا سٹاف تھا، رچرڈ آر میچ ملاقات کے بعد سیکرٹری صاحب کو لپچ پر لے گئے، آر میچ انہیں پیدل ریستوران تک لے کر گیا تھا، اس نے اپنی ٹرے خود اٹھائی تھی، کھانا لیا تھا اور میز پر بیٹھ کر کھانے لگا، سیکرٹری صاحب اس کے سامنے بیٹھ گئے جبکہ ان کا سٹاف ریستوران کے باہر ٹھہرا، کھانے کے بعد سیکرٹری صاحب نے اپنے ڈپٹی سیکرٹری کو اشارہ کیا، اس نے ہاتھ میں پکڑا پیکٹ سیکرٹری صاحب کو دے دیا، سیکرٹری صاحب نے آر میچ سے عرض کیا، "جناب یہ ہماری طرف سے آپ کے لئے ایک حقیر سا تحفہ ہے، آر میچ نے شکر یہ ادا کر کے پیکٹ لے لیا، دونوں نے ہاتھ ملایا اور آر میچ یہ پیکٹ خود اٹھا کر واپس دفتر چلا گیا جبکہ سیکرٹری صاحب نے اپنی ٹینک ڈپٹی سیکرٹری کو پکڑا دی اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چار لوگوں کے جلوں میں ہونٹ کی طرف روانہ ہو گئے، میں نے جب سے ڈک چینی کی یہ تصویر دیکھی ہے مجھے محسوس ہوتا ہے یہ تصویر بار بار پوچھ رہی ہے، جس ملک کے حکمران اپنا بیک نہیں اٹھا سکتے، وہ قوم کی ذمہ داری کیسے اٹھائیں گے، میں بار بار یہ سوال سنتا ہوں اور شرم سے سر جھکا لیتا ہوں، میرا خیال ہے پوری قوم کو اجتماعی طور پر اپنا سر جھکا لینا چاہیے، ہمیں مان لینا چاہیے ہمارے دشمن اخلاقی، سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے ہم سے بہت آگے ہیں، ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے، حضرت عمر فاروق ہمارے خلیفہ تھے لیکن ان کی سنت پر عمل امر کی اور یورپی حکمرانوں نے کیا، ہمیں مان لینا چاہیے اسلام ہمارا مذہب ہے لیکن اس مذہب کی اصل روح غیر مسلموں نے اپنائی اور ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے مذہب ہمارے ہاتھ میں رہ گیا لیکن اس کی روح ہمارے دشمنوں کے پاس چلی گئی، ہم کلمہ پڑھتے رہ گئے جبکہ ہمارے دشمن اسلام کی برکتوں سے لطف اٹھاتے رہے۔



صغیرہ اسلام کے خلاف

عداری کا پرچہ درج کریں

Kashif Azad@OneUrdu.com

میں نے گزشتہ روز اخبارات میں ایک دلچسپ تصویر دیکھی یہ پنجاب اسمبلی کی عمارت تھی اس عمارت کے سامنے ایک رکش کھڑا تھا اور رکشے سے ایک خاتون اتر رہی تھی، تصویر کے نیچے کپشن میں لکھا تھا "پنجاب اسمبلی کی خاتون رکن صغیرہ اسلام اجلاس میں شرکت کیلئے رکشے پر اسمبلی آ رہی ہیں" میں نے تین چار مرتبہ یہ تصویر دیکھی اور اتنی ہی مرتبہ کپشن پڑھا لیکن مجھے اپنے پڑھے اور دیکھے پر یقین نہ آیا لہذا میں نے فوراً پنجاب اسمبلی کی ویب سائٹ سے صغیرہ اسلام کا پروفائل نکالا مجھے ویب سائٹ سے معلوم ہوا صغیرہ اسلام شیخوپورہ سے تعلق رکھتی ہیں، وہ اکتوبر 1945ء کو بھارت میں پیدا ہوئیں، انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا، وہ 1977ء اور 1988ء میں دو مرتبہ پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں، ان کے خاندان چودھری اسلام صاحب انتقال فرما چکے ہیں، وہ 2002ء کے الیکشن میں خواتین کی مخصوص نشست پر تیسری مرتبہ رکن منتخب ہوئی ہیں اور وہ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹریں کی رکن ہیں، ان کے پروفائل کے آخر میں ان کا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر بھی درج تھا، میں نے انہیں ٹیلی فون کیا لیکن وہ اس وقت گھر پر سو جو نہیں تھیں چنانچہ میں اس تصویر کے بارے میں تصدیق نہ کر سکا لہذا ہم سر دست اس تصویر کی حقیقت کو

حکیم کر لینے ہیں اور یہ سمجھ لینے ہیں یہ تصویر صفیر و اسلام ہی کی تھی اور دو واقعہ 11 جون کی ایٹمی اور کھولتی دو پہر کو کسے پر پنجاب اسمبلی کی تھیں۔

میں نے تیسری کلاس سے اخبار پڑھنے شروع کیے تھے اور آج مجھے اخبارات پڑھتے ہوئے پورے تیس برس ہو چکے ہیں چنانچہ میں بڑے دعوے سے کہتا ہوں میں نے ان تیس برسوں میں ایک بھی ایسی تصویر نہیں دیکھی، ہاں البتہ میرے بچپن میں جنرل ضیاء الحق کی ایک تصویر ضرور چھپی تھی جس میں وہ فورسٹار جنرل کی وردی میں پورے صدارتی اقتدار کے ساتھ سائیکل چلا رہے تھے میں اس وقت ان کی سائیکل سواری اور عاجزی اگساری سے بہت متاثر ہوا تھا لیکن جب میں باشعور ہوا تو معلوم ہوا جنرل صاحب کی یہ سائیکل سواری ان کے اسلام سے مختلف نہیں تھی چنانچہ جنرل ضیاء الحق کی اس تصویر کے علاوہ مجھے کوئی ایسی تصویر یا مثال دیکھنے کا موقع نہیں ملا مجھے اب تک دنیا کی تین بڑی پارلیمنٹس میں جانے کا اتفاق ہو چکا ہے مجھے اس سال مارچ 2007ء میں لندن میں چوتھی بار ہاؤس آف کامنز کا اجلاس دیکھنے کا موقع ملا۔ برطانیہ کے

پاکستانی برٹش رکن اسمبلی چودھری سرور نے میرے لئے پورے پارلیمنٹ ہاؤس کی سرکائیڈ ویسٹ گلیاں گھمائی مجھے ان کے پورے کل ٹیکر لائی نے ساری عمارت، سارے ہالز اور سارے کورڈرز دکھائے مجھے امریکی کانگریس میں بھی جانے کا اتفاق ہوا اور میں فرانس کی پارلیمنٹ کا وزٹ بھی کر چکا ہوں ان کے علاوہ میں ٹیلی ویژن چینلز پر بھارتی لوک سبھا، جاپان کی پارلیمنٹ ڈائنٹ اور چین کے قومی اسمبلی کے اجلاس بھی دیکھ چکا ہوں مجھے ان تمام پارلیمنٹس میں ایک چیز مشترک نظر آئی تھی، جب بھی ان اسمبلیوں کے اجلاس شروع ہوتے ہیں تو درجنوں بلکہ سینکڑوں ارکان اسمبلی ٹیکسیوں، بسوں اور ٹرینوں کے ذریعے اسمبلی ہاؤس آتے اور جاتے ہیں میں نے اپنی آنکھوں سے برطانوی ارکان اسمبلی کو ٹیکسیوں سے اترتے اور اپنے بیک خود اٹھا کر ہاؤس آف کامنز میں آتے جاتے دیکھا امریکی کانگریس کی عمارت کے نیچے ڈیزین ٹرین چلتی ہے، میں نے امریکہ کے بے شمار بین الاقوامی شہرت یافتہ سینٹرز اور کانگریس مین کو اس ٹرین میں سوار ہوتے اور اترتے ہوئے دیکھا اور فرینچ پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے بس سٹاپ ہے اور میں نے متعدد فرینچ ارکان اسمبلی کو اس سٹاپ پر بس کا انتظار کرتے دیکھا اسی طرح میں اکثر ٹیلی ویژن چینلز پر بھارتی ارکان اسمبلی کو رکشوں سے اترتے اور سوار ہوتے دیکھتا ہوں، چین کی پارلیمنٹ میں بعض ارکان اسمبلی سائیکلوں پر بھی اجلاس میں آتے ہیں اور جاپان کی پارلیمنٹ میں 140 ایسے ارکان ہیں جن کے

پاس ذاتی ڈرامیڈ نہیں جبکہ 35 چاہانی ارکان کے پاس ذاتی سواری نہیں اور یہ 35 ارکان ہمیشہ بس ٹرین اور ٹیکسی پر سفر کرتے ہیں اس کے مقابلے میں آپ پاکستانی اسمبلیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی ہماری اسمبلیوں کے سو فیصد ارکان نہ صرف ذاتی گاڑیوں کے مالک ہیں بلکہ یہ سب لوگ بڑی بڑی گاڑیوں پر اجلاس میں شرکت کرتے ہیں پاکستان میں اب ہجیرہ لینڈ کروزر، پراڈا اور لیکسز گاڑیاں سیاستدانوں اور ارکان اسمبلی سے منسوب ہو چکی ہیں اب حالت یہ ہے جب بھی شہر میں کوئی نئی لینڈ کروزر دکھائی دیتی ہے تو پولیس کانسٹیبل اسے فوراً سیلوٹ مار دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں اس میں لازمی کوئی نہ کوئی رکن اسمبلی یا وزیر صاحب کے لواحقین سوار ہوں گے ان گاڑیوں کو ملنے والے اس پر نوٹوں کی وجہ سے ملک میں دو نمبر دھندے کرنے والے تمام لوگوں نے بھی لینڈ کروزر خرید رکھی ہیں آپ جعلی ہاؤسنگ سیکسوں کے تمام مالکان کو دیکھ لیجئے آپ جعلی ادویات بنانے والوں، ٹیکسی چوری، جوئے اور شراب فروشی کے دھندوں میں ملوث لوگوں کو دیکھ لیجئے آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی یہ تمام لوگ ایک ایک دو دو براڈ نیو لینڈ کروزر کے مالک ہوں گے، لوگ آپ کو مرشدین، لی اسم ڈبلیو یا رولڈر انجین میں بھی سفر کرتے دکھائی دیں گے تو ان کے آگے آگے ایک لینڈ کروزر ضرور چلتی ہوگی یہ لینڈ کروزر انہیں سیاستدان کی "لک" دیتی ہے اور اس کی وجہ سے راستے کی ساری رکاوٹیں انہیں سیلوٹ کر کے ایک طرف ہٹ جاتی ہیں آپ لینڈ کروزر کلچر کا اندازہ میرے دوست کی کہانی سے لگا لیجئے میرے دوست 2002ء میں انجینئر لڑنے کیلئے امریکہ سے پاکستان آئے تھے اس وقت تک پاکستان میں ان کا ووٹ تک نہیں بنا تھا لیکن انہوں نے پاکستان میں ووٹ بنانے سے پہلے لینڈ کروزر خریدی تھی میں نے جب پوچھی تو انہوں نے جواب دیا تھا "پاکستان میں ووٹ کے بغیر سیاست ممکن ہے لیکن لینڈ کروزر کے بغیر نہیں"

میں اسلام آباد کا پاسی ہوں اور میں روزانہ پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے سے گزرتا ہوں ہمارا پارلیمنٹ ہاؤس شاہراہ دستور پر واقع ہے اور اس شاہراہ کا شمار دنیا کی دس مہنگی ترین سڑکوں میں ہوتا ہے اس سڑک پر ایک کینال زمین کی مالیت دس سے بیس کروڑ روپے ہے لیکن پارلیمنٹ ہاؤس کا پارکنگ ایریا بارہ ایکڑ پر محیط ہے اور یہ پارلیمنٹ ہاؤس کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ کے علاوہ ہے پارلیمنٹ ہاؤس کی پوری عمارت کے نیچے تہ خانہ ہے اور یہ تہ خانہ بھی پارکنگ کیلئے استعمال ہوتا ہے آپ اجلاس کے دوران پارلیمنٹ کا دورہ کر کے دیکھ لیں آپ کو تہ خانے سے لے کر

اوپن پارٹنگ تک گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آئیں گی آپ وہاں موجود گاڑیوں کے ماڈل اور میک
 وکیج لیس وہاں موجود 90 فیصد گاڑیاں تازہ ترین ماڈل اور انتہائی مہلے برانڈ کی حامل ہوں گی ہماری
 پارلیمنٹ میں ایسے ارکان بھی موجود ہیں جو تیرہ تیرہ گاڑیوں کے کارواں کے ساتھ سفر کرتے ہیں
 آپ یہ گاڑیاں دیکھیں اور اس کے بعد ان ارکان اسمبلی کا کردار دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا
 ہمارے ارکان اسمبلی امریکہ، برطانیہ، فرانس، چین، جاپان اور بھارت کے ارکان سے کہیں صاحب
 ثروت ہیں اور پاکستان دنیا کے ان چھ بڑے ممالک کے مقابلے میں کہیں امیر اور خوشحال ملک ہے
 آپ یہ گاڑیاں دیکھیں اپنے ارکان اسمبلی اور وزراء کا "لیڈنگ سینڈرز" دیکھیں اور اس کے بعد
 پاکستان میں غربت کی شرح بے روزگاری اور مہنگائی کا گراف ملاحظہ کریں تو آپ کا سر شرم سے
 جھک جائے گا۔ پاکستان کے اس سیاسی اور پارلیمانی ماحول میں محترمہ صفیرہ اسلام پنجاب اسمبلی کی
 عمارت کے سامنے رکشے سے اترتی ہیں اور ان کی یہ تصویر اخبارات میں شائع ہوتی ہے تو یقین
 نہیں آتا اور میرے جیسا شخص بھی تصدیق کیلئے بے اختیار صفیرہ اسلام کے گھر فون کرنے پر مجبور

ہو جاتا ہے۔

Kashif Azad@OneUrdu.com

محترمہ صفیرہ اسلام کی یہ "حکومت" ہر لحاظ سے خلاف قانون اور خلاف آئین ہے خود
 سوچئے جس ملک کا فریب دوزیر اعظم اپنے لئے 8 ارب روپے کا نیا جہاز خریدتا ہو اور جس کا چیف
 منسٹر اپنی مدت کے آخر میں نیا جہاز خرید رہا ہو اور جس کے تمام وزراء کے پاس سیکورٹی کور ہو اور
 جس کے تمام گورنرز وزراء اعلیٰ دوزیر اعظم اور صدر پندرہ پندرہ کروڑ روپے کی کم پروف گاڑیوں
 میں سفر کرتے ہوں اور ان کے آگے پیچھے سیکورٹی کی 21 گاڑیاں ہوں وہاں اگر کوئی رکن رکشے پر
 اسمبلی آئے گی تو کیا یہ حرکت آئین قانون اور اسمبلی کے تقدس کی توہین نہیں ہوگی میرا خیال ہے
 صفیرہ اسلام کا دامنی توازن ٹھیک نہیں چنانچہ حکومت کو فوری طور پر ان کے اس غیر پارلیمانی فعل پر
 سخت ایکشن لینا چاہیے حکومت کو ان کی رکنیت فوراً معطل کر دینی چاہیے اور اگر ممکن ہو تو ان کے
 خلاف غداری کا پرحمی درج کرا دینا چاہیے کیونکہ صفیرہ اسلام اس ملک اور پارلیمنٹ دونوں کی
 نندار ہیں۔



صغیرہ اسلام جیسے رول ماڈل

میں نے پچھلے دنوں پاکستان پیپلز پارٹی کی ایک رکن پنجاب اسمبلی صغیرہ اسلام کے بارے میں کالم تحریر کیا تھا یہ کالم لاہور کے اخبارات میں شائع ہوئے والی ایک تصویر سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا جس میں صغیرہ اسلام پنجاب اسمبلی کے سامنے رکشے سے اتر رہی تھیں میرے لئے یہ ایک حیران کن واقعہ تھا اور میں نے اپنے کالم میں اسی حیرت کا اظہار کیا تھا محترمہ صغیرہ اسلام نے میری حیرت کے جواب میں مجھے اپنی ساری کہانی بھجوائی یہ کہانی میری پہلی حیرت کے مقابلے میں کہیں زیادہ حیران کن ہے میری خواہش ہے میں اپنی حیرت کے اظہار سے پہلے آپ کو صغیرہ اسلام کی کہانی سناؤں صغیرہ اسلام اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹری کے گلٹ پر خواتین کی خصوصی نشست پر پنجاب اسمبلی کی رکن ہیں صغیرہ اسلام کا کہنا ہے "میں نے شادی کے وقت صرف میٹرک کیا ہوا تھا شادی کے بعد میں نے اپنے مرحوم شوہر کے اسپانڈیشن پرائف اے کیا اس کے بعد بی اے اور پی اے کے بعد ایم اے ابھی میرا ایم اے کا نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ میری ساری خوشیاں مجھ سے روٹھ گئیں یہ آٹھ مارچ 1976ء کا دن تھا میرے شوہر اس دن مجھے چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے اور میں جوانی میں بیوہ ہو گئی اس وقت میری گود میں دو برس کی بیٹی تھی یہ بیٹی میرے جینے کا سہارا بھی تھی اور میرے مرحوم خاوند کی نشانی بھی میں نے اس بچی کی تعلیم اور تربیت کو اپنا مقصد بنا لیا میں نے زندگی کے اس مرحلے میں اپنا بوجھ خود اٹھانے کا فیصلہ کیا میں نے

اپنے ساتھ وعدہ کیا میں کسی سے کسی قسم کی مدد نہیں لوں گی اللہ کا کرم ہے میں آج تک اپنے اس وعدے پر قائم ہوں میں نے اپنی عملی زندگی میں چار چار ٹیوشن پڑھائیں اور ان سے حاصل ہونے والی آمدنی سے اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پالا میں نے 1982ء میں اپنا ایک چھوٹا سکول بنالیا میں اس سکول میں یتیم بچوں سے فیس نہیں لیتی تھی اس سکول میں غریب بچوں کی تعلیم بھی مفت تھی میں خود بھی اس سکول میں پڑھاتی رہی افسوس پچھلے سال یہ سکول بند ہو گیا۔

صغیرہ اسلام نے اس کے بعد اپنی سیاسی زندگی کے بارے میں بتایا ان کا کہنا تھا "میرے والد اور شوہر دونوں کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا میرے شوہر ڈاکٹر علی بھٹو کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے میں نے ان کے کہنے پر سیاست شروع کی میں عملی طور پر 1975ء میں سیاست میں آئی میں ضلع شیخوپورہ پیپلز پارٹی کی خواتین ونگ کی صدر منتخب ہوئی اپنے شوہر کے انتقال کے بعد مجھے 1977ء میں پہلی بار خواتین کیلئے مخصوص نشست پر ایم پی اے منتخب کیا گیا میں اس دور میں پنجاب میں پیپلز پارٹی کی جنرل سیکرٹری اور ضلع لاہور کی صدر بھی رہی میں نے نظر بھٹو کے دور میں دوسری مرتبہ ایم پی اے منتخب ہوئی اور 2002ء میں مجھے محترمہ نے نظر بھٹو نے تیسری بار پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب کرایا یہ میری قائدینے نظر بھٹو کا میری جیسی غریب کارکن پر اعتماد تھا ایم پی اے بننے سے پہلے میں ضلع شیخوپورہ کی واحد خاتون تھی جو ذکوۃ اور عسکری چیئر پرسن منتخب ہوئی تھی میں نے پوری ایما ندراری اور محنت سے یہ اہم ذمہ داری نبھائی تھی میں نے پوری کوشش کی تھی میں حق داروں اور سچے لوگوں تک ذکوۃ پہنچاؤں اور اللہ کا کرم ہے میں اس ذمہ داری سے پوری طرح سرخرو ہوئی۔"

محترمہ صغیرہ اسلام نے اس کے بعد اپنے لائف سٹائل پر روشنی ڈالی ان کا فرمانا تھا "میں حقیقی طور پر ایک غریب خاتون ہوں میرے گھر میں کوئی ملازم نہیں میں سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں میں نے پوری زندگی مارکیٹ سے خود سودا خریدا لہذا میں پاکستان کی تمام اسمبلیوں کی واحد رکن ہوں جو مہنگائی سے حقیقی معنوں میں واقف ہے مجھے معلوم ہے جب چیزوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے تو گھریلو خواتین کیلئے تھوڑے پیسوں میں گزارہ کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے لہذا میں ان اسمبلیوں کی واحد رکن ہوں جو غریب عوام کی اصل پریشانیوں کو جانتی ہے جو یہ جانتی ہے اس ملک میں تین چار ہزار روپے ماہانہ کمانے والے لوگ کس طرح گزارہ کرتے ہیں میرا دعویٰ ہے وہ سکران کبھی عام آدمی کی مشکلات کو نہیں سمجھ سکتے جو ایئر کنڈیشنڈ میں بیٹھے ہیں اور

جنہوں نے زندگی میں کبھی نوکری پکڑ کر ہزاروں سے آلوچیا نہیں خریدے آپ نے مجھ سے پوچھا تھا میں رکشے پر اسبلی کیوں جاتی ہوں جاوید بھائی رکشہ تو بہت بڑی سواری ہے میں تو اکثر اوقات بسوں اور دیکھوں میں سفر کرتی ہوں لہذا میں لاہور شہر کی دیکھوں اور بسوں کے احوال سے بھی پوری طرح واقف ہوں میں یہ جانتی ہوں دیکھوں اور بسوں کے مالکان مسافروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس دیتے ہیں اور عام شہریوں کیلئے اس گرمی میں دیکھوں اور بسوں میں سفر کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے میں یہ بھی جانتی ہوں بسوں اور دیکھوں کے اکثر مالکان کراچی میں اضافہ کر دیتے ہیں اور اس اضافے کے نتیجے میں لوگوں کی زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جا رہی ہے میں روزانہ اس تجربے سے گزرتی ہوں لہذا میں پنجاب اسبلی کی واحد رکن ہوں جو اسبلی کے فلوور پر کمزری ہو کر وزیر ٹرانسپورٹ سے درخواست کرتی ہے وہ شہر میں دیکھوں اور بسوں کے کرائے کم کرانیں اور وہ شہر میں زیادہ سے زیادہ بسیں اور دیکھیں چلوائیں میری بیٹی اکثر مجھے کہتی رہتی ہے اماں آپ کیا چیز ہیں آپ تین بار اسبلی کی رکن منتخب ہوئیں لیکن آپ آج بھی دھوپ میں پیدل چلتی ہیں یا پھر بسوں دیکھوں اور رکشوں میں جھکے کھاتی ہیں میں اسے تو یہ گھرانے کا کہتی ہوں اور بے ایمان خواتین کے بارے میں بتاتی ہوں جو اس گرمی میں سڑک کے کنارے بیٹھ کر چمڑ توڑتی ہیں یا چالیس چالیس کلو وزن اٹھا کر پچاس پچاس بیڑھیاں چڑھتی ہیں میں اس کو بتاتی ہوں میں عوام کی حقیقی نمائندہ ہوں اگر میرے عوام کے پاس پانی بجلی اور گاڑی نہیں تو میں بھی بڑی حد تک ان نعمتوں سے محروم ہوں اگر اس ملک کے 90 فیصد لوگ بسوں دیکھوں اور رکشوں میں سفر کرتے ہیں تو میں بھی ان کے ساتھ سفر کرتی ہوں میری بیٹی کو میری باتیں پسند نہیں آتیں لہذا وہ مجھے کہتی ہے اماں آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے لیکن جاوید صاحب مجھے اپنی اس "حرکت" پر فخر ہے میں آپ کو یہاں اپنی ذاتی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی بتاتی چلوں جون 2006ء میں واچا کا ایک ایٹکارٹس لے کر میرے گھر آ گیا اس کا کہنا تھا اس پورے محلے میں آپ لوگوں کا بل سب سے کم آ رہا ہے ہمارا خیال ہے کسی ایم پی اے کا بل اتنا کم نہیں ہو سکتا چنانچہ ہمیں شک ہے آپ بجلی چوری کر رہی ہیں میں نے اسے کہا تم ہمارے گھر کی تلاش لے لو اس نے تلاش لی تو وہ حیران رہ گیا تمہارے گھر میں صرف ایک اسے ہی تھا اور اس پر بھی ٹائف چڑھا ہوا تھا وہ اسے ہی استعمال ہی نہیں ہوتا تھا جبکہ گھر میں بلب بھی نہ ہونے کے برابر تھے اس نے واپس جا کر اپنے ایس ڈی او کو رپورٹ دی یہ کسی بھی طرح کسی ایم پی اے کا گھر محسوس نہیں ہوتا "مسیحیہ اسلام کافر مانا تھا" میں اپنے ساتھیوں

کو اکثر کھتی ہوں اگر ہم لوگ عوامی نمائندے ہیں تو پھر ہمیں عوام جیسا لگنا چاہیے یہ کیا بات ہوئی عوام سڑکوں پر دھکے کھا رہے ہیں وہ مزگانی میں پس رہے ہیں بسوں اور دیکھوں میں بھیڑ کمریوں کی طرح سڑکرتے ہیں جبکہ عوامی نمائندے پچاس پچاس لاکھ کی گاڑیوں میں آسلیوں میں آتے ہیں اور اپنے کتوں تک کو سر بے کھلاتے ہیں اور ان کے گھروں کے بجلی کے بل لاکھ لاکھ روپے ماہانہ آتے ہیں یہ اس ملک کی کتنی بڑی بد قسمتی ہے کہ اس ملک کے نمائندے کسی بھی طرح عام لوگ دکھائی نہیں دیتے میرا بس چلے تو آسلیوں کے تمام نمائندوں کو بسوں اور دیکھوں میں سڑکراؤں میں قانون پاس کرادوں آسلی کا کوئی رکن ہوئی جہاز میں سڑک کرے گا اور نہ ہی گاڑی استعمال کرے گا وہ بس و ٹرین یا ٹرین پر عوام کی طرح سڑک کرے اور جس عوامی نمائندے کے گھر دوسرا "اے سی" چلے گا اس کی رکنیت منسوخ ہو جائے گی اور میں قانون بنا دوں تمام عوامی نمائندے بازار سے اپنا سودا سلف خود خریدیں گے میں قانون بنا دوں جب تک کوئی عوامی نمائندہ روزانہ دو سو عام لوگوں سے ذاتی طور پر نہیں مل لیتا وہ گھر نہیں جاسکتا مجھے یقین ہے اگر یہ قانون بن جائیں اور ہمارے نمائندوں اور عام شہری کے لائف سٹائل میں فاصلہ کم ہو جائے تو یہ ملک جنت بن جائے گا"

میں نے صغیرہ اسلام کے خیالات پڑھے تو مجھے پہلی بار کسی عوامی نمائندے سے میں نمائندگی اور عوام دونوں نظر آئے اور میرے دل سے دعا نکلی کاش پاکستان کے تمام ارکان آسلی صغیرہ اسلام کی طرح ہو جائیں آپ یقین کیجئے صغیرہ اسلام جیسے لوگ ہی دراصل معاشروں کے رول ماڈل ہوتے ہیں اور معاشروں کو اس قسم کے رول ماڈل اور ایسے لوگوں کو پرموٹ کرنا چاہیے کاش ہماری حکومت صغیرہ اسلام کی طرح سوچے کاش ہم لوگ صرف اور صرف صغیرہ اسلام جیسے لوگوں کو منتخب کریں اور کاش ہم صغیرہ اسلام جیسے لوگوں کو سامنے لائیں اور انہیں رول ماڈل بنا کر اپنے بچوں کو بتائیں جیسا عوامی نمائندے اس قسم کے ہوتے ہیں اور اگر تم بڑے ہو کر سیاست میں آئے تو تمہیں بھی صغیرہ اسلام جیسا بننا چاہیے تمہیں بھی شکل ملے کراد اور لائف سٹائل سے عوامی نظر آنا چاہیے۔



ہم نے چین سے کیا پایا

www.paksociety.com

لوگ ٹرین کے ذریعے بیجنگ سے شنگھائی جا رہے تھے۔ دوران سفر ایک دانشور نے مترجم کی مدد سے ایک مسافر بچی کے ساتھ گپ شپ شروع کر دی۔ گفتگو کے دوران بچی نے اچانک پاکستانی دانشور سے پوچھا "آپ کیا کرتے ہیں" دانشور نے مسکرا کر جواب دیا "میں کام کرتا ہوں" بچی مصحوبیت سے بولی "آپ مجھے اپنے ہاتھ دکھائیں" دانشور نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے، بچی نے اس کے نرم اور ملائم ہاتھوں پر ہاتھ پھیرا اور مصحوبیت سے کہا "اگر آپ کام کرتے ہیں تو پھر آپ کے ہاتھوں پر بھول کیوں نہیں ہیں" دانشور کے لیے یہ بات عجیب تھی، اس نے بچی سے وضاحت چاہی، بچی نے اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے، اس کے ہاتھوں کی جلد سخت اور کھردری تھی اور اس پر جگہ جگہ زخم بنے ہوئے تھے۔ بچی نے ان "زخموں" پر انگلی پھیر کر بتایا "جو شخص کام کرتا ہے اس کے ہاتھوں پر ایسے بھول ہوتے ہیں" دانشور جیسے عجیب نہیں ہونے لگا تو مترجم نے مداخلت کی اور مدد سے خواہتا لیے میں بولا "در اصل ہمارے چین میں کام کا مطلب جسمانی محنت ہوتی ہے، ہمارے ہاں نرم ہاتھوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا" دانشور نے حیران ہو کر پوچھا "لکھتا، پڑھتا اور میز کر می پر بیٹھ کر حساب کتاب کرتا بھی تو کام ہوتا ہے" مترجم نے مسکرا کر جواب دیا "آپ کی بات درست ہے لیکن چین میں میز کر می پر بیٹھنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں بھی زخم

ہوتے ہیں، ہم میں سے ہر شخص اپنی روٹین جاب کے ساتھ جسمانی مشقت کرتا ہے، ہمارے
وانشور اور کھاری کھینے کے بعد سڑکوں پر روزنی کونٹے ہیں، کھیتوں میں گھوڑی کرتے ہیں اور گھیلوں
میں اٹھیں لگاتے ہیں اور یہ لوگ ان کاموں کا معاوضہ بھی نہیں لیتے، مثلاً آپ مجھے دیکھئے، میں دفتر
خارجہ میں اسٹنٹ ہوں لیکن میں بھی اس بچی کی طرح کام کرتا ہوں مترجم نے اتنا کہنے کے بعد
اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے، اس کے ہاتھوں پر بھی مشقت کے ”پھول“ بنے ہوئے تھے۔

اہل چین دنیا کے پہلے لوگ تھے جنہوں نے محنت کو فلسفے کی شکل دی۔ جنہوں نے
خرگوش کی بجائے کچھوے کی رفتار کا انتخاب کیا اور صرف اور صرف اپنی محنت اور ورژن کے بل
بوتے پر دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت بن گئے۔ آج چین کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ کسی
ملک میں اس وقت تک تجارت، کاروبار اور صنعت کا عمل مکمل نہیں ہوتا جب تک وہاں چینی ماہرین
قدم نہیں رکھتے۔ آج دنیا میں کوئی ایسی پراڈکٹ نہیں جس کا مارکیٹ میں چینی ورژن موجود نہ ہو اور
آج دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جس میں چینی باشندے نہ پہنچے ہوں اور انہوں نے وہاں کی معیشت
کے لئے نیا خرماں ڈھول نہ کیا ہو، اس وقت دنیا کی تمام چھوٹی بڑی کمپنیاں چینی منڈلی ہو چکی ہیں اور

چین ایک ایسی معاشی و صلوان بن چکا ہے جس نے دنیا کے تمام معاشی دریاؤں کا رخ اپنی طرف
موڑ لیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟ یہ شخص چینیوں کے ہاتھوں کے پھولوں کا
کمال ہے، چین دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے کام کو عادت کا درجہ دیا، ماؤزے تنگ اور چوان لائی
نے کھر پے، کسی کینٹی اور جھاز کو ہر چینی کی ذات کا حصہ بنا دیا، چین میں 70 لاکھ چینی باشندے
روز اپنی سائیکلوں پر کینٹی، جھاز، کسی اور کھر پے باندھ کر گھر سے نکلتے تھے اور راستے میں آنے
والے قریب ترین کھیت میں کام شروع کر دیتے تھے، یہ لوگ گھر سے نکل کر کسی گلی اور کسی سڑک
کے کسی حصے کی مرمت شروع کر دیتے تھے، یہ کسی دہلیز، کسی دکان اور کسی کارخانے میں جھاز و جانا
شروع کر دیتے تھے اور یہ لوگ کام کرتے ہوئے کسی سے نہیں پوچھتے تھے یہ کارخانہ، دکان یا یہ کھیت
کس کی ملکیت ہے، چین کے لوگ چین کی سرحدوں میں موجود ہر چیز، ہر جگہ کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے
اور ملکیت کے جذبے سے ہر شاعر ہو کر اسے سنوارنے لگتے تھے، چین کے لوگ چالیس برس تک
مسلحہ اسی سپرٹ سے کام کرتے رہے، ان چالیس برسوں میں چین میں کسی نے چھٹی نہیں کی،
چین میں ہفتہ وار چھٹی کا تصور تک نہیں تھا، یہ لوگ کام کی تنخواہ بھی نہیں لیتے تھے، ان لوگوں کو بس
حکومت کی طرف سے مفت کھانا مل جاتا تھا، یہ لوگ صبح سات بجے گھر سے نکلتے تھے، ٹیک بارو بجے

کھانے کا وقفہ کرتے تھے کسی قریب ترین بیکری پر جاتے تھے اور بیکری کے مالکان انہیں حکومت کے کھانے سے لُج دے دیتے تھے اور یہ لوگ تھوڑا سا قیلو کر کے ایک بیجے دو بارہ کام میں جت جاتے تھے یہ لوگ شام چھ بجے واپس گھر جاتے تھے، رات سے سرکاری بیکری سے رات کا کھانا لیتے تھے اور آٹھ نو بجے کے درمیان سو جاتے تھے، آج بھی پورے چین میں بارہ بجے دن لُج کا وقفہ ہوتا ہے اور چین کے لوگ چھ سے سات بجے کے درمیان ڈنر کر لیتے ہیں میں مارچ 2006ء میں مشاہد حسین سید کے ساتھ چین گیا اور ہمیں بعض جگہوں پر چین کے پرانے "کاسٹریڈ" دکھائی دیئے یہ لوگ آج بھی اسی طرح سائیکل پر بھار ڈاکھتے، کسی اور کھر پہ بانڈھ کر نکلتے ہیں اور چپ چاپ کام شروع کر دیتے ہیں چین میں کہا جاتا ہے اگر آپ کے پاس دو ہاتھ ہیں تو آپ دوزخ کو جنت بنا سکتے ہیں چین میں یہ بھی کہا جاتا ہے۔ انسان اور جانور میں صرف ہاتھوں کا فرق ہوتا ہے اور جو انسان اپنے ہاتھوں سے کام نہیں لیتا وہ انسان نہیں جانور ہے دنیا میں بے شمار قوموں نے ترقی کی ان میں سے بعض قوموں نے علم کا سہارا لیا، بعض نے عقل استعمال کی، بعض تجارت کے ذریعے ترقی کی چلی پر مینجمنٹ اور بعض نے ہتھیاروں اور فوجوں کی مدد سے ترقی کو لُج کیا لیکن چین دنیا کے پہلے لوگ تھے جنہوں نے سنگ تراشوں کی طرح اپنے ہاتھ سے ترقی کا بت تراشا جنہوں نے اپنی انگلیوں اور ہتھیلیوں سے ترقی کا پہاڑ طے کیا شاید یہی وجہ ہے، آج سے تیس ہفتیس برس پہلے امریکی صدر جان ایف کینڈی نے کہا تھا "اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر انسان کو ہاتھ دیئے ہیں لیکن اس نے ان ہاتھوں کا استعمال صرف چینوں کو سکھایا" یہ چینوں کے ہاتھوں اور ان ہاتھوں کے پھولوں کا کمال تھا۔ آج چین دنیا کی سب سے بڑی معاشی قوت ہے۔ آج اس کے زر مبادلہ کے ذخائر 998 بلین ڈالر ہو چکے ہیں اور یہ دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار دینے والا ملک بن چکا ہے چین نے پچھلے دنوں دنیا کی سب سے سستی نگڑری گاڑی تک بنائی ہے۔ اس وقت دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں جس میں "میڈ ان چائنا" نہ ہو، دنیا کے 142 بڑے چھوٹے ممالک میں "چائنا" ناؤن "آباد ہو چکے ہیں اور چین دنیا کا واحد ملک ہے جو سوئی سے لے کر جہاز تک بنا رہا ہے، جس نے اپنی سٹی اپنی ریت تک کی مارکیٹنگ شروع کر دی ہے اور جس کا دعویٰ ہے اگر دنیا ہم سے کچھ سیکھنا چاہتی ہے تو اسے ہم سے کام کرنا سیکھنا چاہئے۔

دنیا کی اس حیرت انگیز قوم کے صدر جو چین ناؤ پچھلے دنوں پاکستان کے دورے پر آئے

وو دون اسلام آباد رہے اور ہفتے کا دن انہوں نے پاکستان کے ثقافتی شہر لاہور میں گزارا، صدر

ہو جن تاؤ نے جس دن لاہور کا دورہ کرنا تھا اس دن لاہور کے تمام سکولوں، کالجوں اور دفتروں میں چھٹی کرا دی گئی تھی اس دن سارا لاہور گھروں میں محصور رہا، ہم نے اس ملک کے صدر کو یہ استقبال پیش کیا جس کے لوگوں نے چالیس سال تک ہفتہ وار چھٹی نہیں منائی تھی، جس کے بابائے قوم ماؤزے تنگ نے موت سے پہلے چین کے لوگوں سے کہا تھا "تم اگر میرا سوگ منانا چاہو تو تم دو دو گھنٹے مزید کام کرنا، میری روح کو آرام اور سکون مل جائے گا" جن کے دوسرے بڑے لیڈر چو امین لائی کی ہر برسی پر چین کے لوگ "ادور نام" کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ وصول نہیں کرتے اور جس کے ہر شہری کے ہاتھ پر آج بھی پھول ہیں، ہم نے اس ملک کے صدر کی آمد پر لاہور میں چھٹی کرا دی تھی، کیا ہم نے چین سے یہ سیکھا تھا! میرا خیال ہے ہم لوگ اپنے رویوں میں بھکاری بن چکے ہیں، ہم قوموں، ملکوں اور لیڈروں سے سیکھنے کی بجائے ان سے ادا چاہتے ہیں، ہم دوستوں کو انگریزوں سے ادا اور سفارتکاری کے پیمانوں پر تپتے ہیں اور ہم یہ دیکھتے ہیں ہم نے کس ملک کی دوستی سے کتنے ڈالر کمائے، افسوس ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا، ہم نے کس ملک سے کیا سیکھا، ہم نے کس دوستی سے کیا کیا فائدہ حاصل کیا، صدر ہو، جن ماؤزے آئے، ہم نے ان کے استقبال کے لئے چراغاں کیا، ڈھول بجائے، تصویریں کھینچیں، چھٹی کی اور دو چندا انگریزوں پر دستخط کر کے چلے گئے، افسوس ہم نے صدر ہو، جن تاؤ کے ہاتھوں کے پھول نہیں دیکھے، ہم نے ان سے یہ نہیں پوچھا "جناب صدر کیا آپ بھی ہاتھ سے کام کرتے رہے ہیں" جتنی صدر آئے اور چلے گئے لیکن ہم نے ان سے چین کا وہ محاورہ تک نہیں پوچھا جس میں چین کے کسی دانشور نے کہا تھا "آلو، مانگو، آلو کا ج مانگو"



دیوار چین

کیمونسٹ پارٹی آف چائنا (سی پی سی) چین کی واحد سیاسی جماعت ہے، یہ پارٹی 1949ء میں چین میں کمر اقتدار ہے۔ صدر سے لے کر عام شہری تک ہر چینی کسی نہ کسی لحاظ سے اس پارٹی کا حصہ ہے۔ سی پی سی نے فروری کے مہینے میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کو اپنا وفد چین بھجوانے کی دعوت دی، یہ وفد 26 مارچ 2006ء کو چین روانہ ہوا اور تین اپریل کو واپس آیا، مشاہد حسین اس وفد کے سربراہ تھے، اس میں دس افراد شامل تھے، میں اس وفد کا واحد "غیر پارلیمانی" اور غیر مسلم لگی رکن تھا، ہمارے وفد میں دو مسلم لگی خواتین بھی شامل تھیں، ہم لوگ 26 مارچ کو اسلام آباد سے بیجنگ پہنچے وہاں سے شنگھائی گئے، شنگھائی سے ارچی آئے اور ارچی سے واپس اسلام آباد آئے۔ یہ آٹھ روز ایک انتہائی دلچسپ تجربہ تھا۔

چینی لوگ دیوار چین کو "گرین وال" کہتے ہیں، یہ دنیا کا آٹھواں بڑا ہے اور یہ زمین کی واحد تعمیر ہے جو چاند سے دکھائی دیتی ہے، یہ دیوار چین کے پہلے شہنشاہ ہوانگ نے تعمیر کرائی تھی، اس کی تعمیر 221 قبل مسیح میں شروع ہوئی اور اس دیوار نے چند برسوں میں 6 ہزار 7 سو کلومیٹر پر پھیلی سلطنت کو اپنی پناہ میں لے لیا، یہ انسانی ہاتھوں کا سب سے بڑا تعمیراتی معجزہ تھی، یہ ایک بلند اور چوڑی دیوار ہے جس پر دس سے چند سو لوگ ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر چل سکتے ہیں، دیوار کی بیرونی سطحیں مضبوط پتھروں سے بنی ہیں جبکہ ان کے اندر چٹانیں، بیماری

پتھر اور چونا بھرا ہے آپ اس دیوار کی مضبوطی کا اندازہ اس کی تاریخ سے لگا لیجئے، آج اس دیوار کو بننے اڑھائی ہزار سال ہو چکے ہیں، ان اڑھائی ہزار برسوں میں دنیا پر بے شمار آفتیں نازل ہوئیں، دنیا میں بے شمار سیلاب آئے، لاقعد اور زلزلے، بارشیں اور طوفان آئے، بے شمار تہذیبیں بنیں اور لاقعد و معاشرے اپنا اپنا وقت پورا کر کے ختم ہو گئے لیکن یہ دیوار اپنی بنیادوں پر اسی طرح کھڑی رہی، اس نے مٹی سے اپنا رشتہ نہ ٹوٹنے دیا، اس دیوار کے راستے میں بے شمار پہاڑیاں اور 'یا' صحرا اور میدان آتے ہیں لیکن یہ دیوار ایک مضبوط اژدھ کی طرح ان میدانوں، ان صحراؤں، ان دریاؤں اور ان پہاڑوں کو روندتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور نقطہ انجام تک اپنا وقار اپنی عزت اور اپنی توقیر برقرار رکھتی ہے، انسانی تاریخ میں ہر چیز وقت کے سامنے سرنگون ہو گئی لیکن مصر کے احرام اور چین کی دیوار ایسے انسانی معجزے ہیں جو ہزاروں برس سے وقت کے سامنے ڈلے ہوئے ہیں اور وقت اپنی پوری کوشش اور اپنی پوری قوت کے باوجود ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا، یہ وقت کے سینے پر پاؤں رکھے کھڑے ہیں۔

ہم لوگ 28 مارچ کو دیوار کے کھلا رہنے کیلئے بھنگ سے لگے، تالی پوہان پوہان ہماری مترجم اور کوآرڈینیٹر تھی، ان کے سامنے چاؤ کیا گنگ تھے، یہ دونوں آٹھ روز تک ہمارے ساتھ رہے، دیوار پر شدید سردی تھی، پورے وفد نے اپنے سردار کان، حانپ رکھے تھے، ہماری نظر کی حد تک ٹل کھاتی ہوئی دیوار تھی اور دیوار کے نیچے بہت دور وقت بیٹھا تھا اور وہ حیرت سے دیوار پر ایستادہ برجیاں اور مینار دیکھ رہا تھا، پہ ایک دفاعی دیوار تھی، زمانہ قبل مسیح میں چین میں بیرونی حملہ آوروں کا پسندیدہ ملک تھا، یہ فنکاروں، صنعت کاروں اور تاجروں کی سر زمین تھی، یہ لوگ مٹی کو سونے میں ڈھالنے کے فن سے واقف تھے، جب دنیا تن ڈھاپنے کیلئے تپوں کی محتاج تھی اس وقت چین کے کارگر ریشم بناتے اور پہنتے تھے، ان لوگوں نے گرم مسالوں کو تجارت کی شکل دی تھی، یہ لوگ روغن بنانے، کاغذ تیار کرنے، بارود بنانے اور مٹی کو پتھر کی شکل دینے کے بھی ماہر تھے، زمانہ قدیم میں چین کے ہر گھر میں پانچ چھ بکریاں، ایک دو گائے، مینے دو مینے کا راشن اور سونے چاندی کے زیورات ہوتے تھے، یہ لوگ بلا کے ستارہ شناس تھے، یہ آسمان دیکھ کر آنے والے زمانوں کا حساب لگا لیتے تھے، جس وقت دنیا ننگے پاؤں پھرتی تھی، اس وقت یہ لوگ چرمی جوتے پہنتے تھے، ان کے پاس دنیا کی انتہائی حسین عورتیں اور انتہائی تیز رفتار گھوڑے ہوتے تھے اور یہ لوگ اپنے کھیتوں میں ایک کاشت سے دو دو فصلیں حاصل کرتے تھے، ان کی انگور کی بیلیں سات سات نسلوں تک پھل دیتی

تھیں "چینی لوگ فطرتاً سرما یہ کار ہیں، یہ لوگ دھیلے سے روپیہ بنانے کا فن جانتے تھے" کہا جاتا تھا اگر ایک چینی گھر سے پتھر لے کر نکلے تو وہ شام کو سونے کی آبی لے کر واپس لوٹے گا چنانچہ اس دور میں سال میں کئی کئی بار بیرونی حملہ آور چین پر حملہ کرتے تھے اور چین کو اجازت چلے تھے "چینی لوگ فطرتاً صنعت کار ذاتاً بیرون فن کار تھے لہذا جنگ لڑنا اور ان حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا ان لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی لہذا ان لوگوں نے اپنی سلطنت کی حفاظت کیلئے ایک مضبوط دیوار بنانے کا فیصلہ کیا اس وقت تک دنیا میں کسی قوم نے بیرونی حملہ آوروں سے بچنے کیلئے کوئی دیوار نہیں بنائی تھی دنیا کے کسی ایجنڈے کے پاس ایسی نیکنائوٹی بھی موجود نہیں تھی لیکن بادشاہ نے حکم دیا اور چینی عوام نے سات ہزار کلومیٹر لمبی دیوار کھینچ دی اس دیوار نے وقت 'خوف اور حملہ آوروں کو چینی حدود سے باہر پھینک دیا۔ اس نے چین کو محفوظ بنا دیا۔

یہ دیوار بنیادی طور پر چین کی نفسیات 'چین کے فلسفے اور چینی لوگوں کی عادات کی علامت ہے یہ دیوار ثابت کرتی ہے چینی قوم بنیادی طور پر پرامن لوگ ہیں یہ لوگ ذہنی طور پر 'آفیسر نہیں' ان کی پالیسی کسی دوسرے ملک پر حملہ کرنا نہیں بلکہ اپنا دفاع کرنا ہے 'دفاع کا یہ فطری عنصر' اسی تک چینی نفسیات کا حصہ ہے اس دیوار کی بنیادوں میں پوچھا یہ جذبہ آج تک چین کی خارجہ پالیسی ہے اس دور سے کے دوران جب بھی ہمارے کسی ساتھی نے چین کے کسی ذمہ دار شخص سے کہا "ہم سمجھتے ہیں چین مستقبل کی سپر پاور ہے" تو اس نے بڑے آرام سے انکار میں سر بلایا اور مسکرا کر جواب دیا "ہم سپر پاور نہیں بننا چاہتے" اس انکار کے پیچھے دیوار چین کی تاریخ چھپی ہوئی تھی 'چین امریکہ، یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ممالک پر حملہ نہیں کرنا چاہتا وہ دنیا کا کلچر بدلنے کا بھی خواہاں نہیں ہے وہ بس اپنا دفاع چاہتا ہے 'چینی لوگ حملہ نہیں کرتے لیکن اگر ان پر حملہ کر دیا جائے تو یہ دیوار چین بن جاتے ہیں یہ اس حملے سے بچنا جانتے ہیں 'چین کا فلسفہ ہے "آپ کسی معاملے میں پہل نہ کریں" یہ دیوار اس فلسفے کی سب سے بڑی علامت ہے 'چینی لوگ بے انتہا ہمتی ہیں یہ لوگ چیلنج قبول کرنے کے بھی ماہر ہیں یہ لوگ دنیا سے ہٹ کر کام کرتے ہیں جس چیز کو دنیا ناممکن سمجھتی ہے چینی ڈسٹری میں اس چیز کو ممکن کہا اور سمجھا جاتا ہے دیوار چین ان لوگوں کی اس عادت کا بھی خوبصورت اظہار ہے 'چینی لوگ ہر حال میں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں ان کا رنگ اور قامت اتنا منفرد ہے کہ آپ ہزاروں لوگوں میں سے چینی لوگوں کو فوراً پہچان لیں گے یہ دیوار چینوں کی اس انفرادیت کو بھی ثابت کرتی ہے 'چینی لوگ تازہ صنعت کار اور فن کار ہیں اور

320.....0 3 زبرد پوائنٹ

یہ تینوں چیزیں امن اور استحکام سے منسلک ہیں یہ حقیقت ہے جس جگہ امن نہیں ہوتا وہاں امن بھر سکتا ہے اور نہ ہی صنعت اور تجارت اور یہ دیوار چین کے امن استحکام اور دفاع کی مٹی علامت ہے لہذا کہنے کا مطلب ہے اگر آپ چین اور چینوں کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کو دیوار چین کو سمجھنا ہوگا یہ دیوار وہ دروازہ ہے جس سے ہو کر آپ چین کی فارن پالیسی چین کے نظام اور چینوں کے دلوں تک پہنچ سکتے ہیں۔

28 مارچ وہ دن تھا جب ہم دیوار چین پر کھڑے تھے اور چینوں کے دل ہمارے لئے کھلے تھے وہ ہمیں آواز دے رہے تھے۔ چینی کہاوت ہے "دنیا میں محبت سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں" چینی لوگ یہ ہتھیار لے کر ہمارے سامنے صرف آراء تھے اور ہم لوگ مقتول ہونے کے لئے تیار کھڑے تھے۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

”کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں آگتے“

جین اپنے محاوروں اور کہاوتوں میں بھی دنیا سے بہت آگے ہے، چینی محاورے اپنے اندر معانی، دانش اور خیالات کی اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ بیسوں کتابیں مل کر کسی ایک چینی محاورے کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، میں نے بچپن میں جو پہلا چینی محاورہ پڑھا تھا اس نے آنے والے دنوں میں میری زندگی کا سارا شاکل بدل دیا۔ میں زندگی میں جب بھی تلخ ہونے لگتا ہوں تو میں یہ محاورہ نکال کر پڑھتا ہوں اور فوراً ریٹیکس ہو جاتا ہوں، وہ محاورہ تھا ”جسے مسکرانا نہیں آتا اسے دوکان نہیں کھولنی چاہیے“ دوسرا تاریخی محاورہ اس دورے کے دوران ملا، میں نے اپنے ایک میزبان سے جین کی ترقی کی وجہ پوچھی تو اس نے مسکرا کر ایک چینی محاورہ سنایا، وہ محاورہ کچھ یوں تھا ”کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں آگتے“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرایا ”ہم نے ترقی سے پہلے ترقی کے بارے میں ریسرچ کی تھی، ہم نے اندازہ لگایا تھا آپ جب تک ہاتھی کا بچہ نہیں پالتے آپ اس وقت تک ہاتھی دانت حاصل نہیں کرتے چنانچہ ہم نے انٹرا سٹرکچر تیار کرنا شروع کر دیا! ہم نے پورے ملک کو سڑکوں کے ساتھ ملایا، ہم نے ریلوے لائنیں بچھائیں، ایئر پورٹس اور بندرگاہیں بنائیں، ہم نے تعلیم اور صحت عام کی، ہم نے دنیا کی سب سے بڑی ورک فورس تیار کی اور اس کے نتیجے میں ہمارے ہاتھی کے منہ میں دانت نکل آئے اور پوری دنیا ہم سے محبت کرنے لگی۔“ مجھے اس کی بات اچھی لگی، یہ سچ ہے ترقی سے پہلے ترقی کا

انفراسٹرکچر ضروری ہوتا ہے اور جس ملک کے پاس انفراسٹرکچر نہیں ہوتا وہ ملک کبھی ترقی نہیں کرتا اور چین اس کی سب سے بڑی اور تازہ ترین مثال ہے، اس وقت دنیا کا سب سے بڑا انفراسٹرکچر چین میں ہے۔ شنگھائی چین کا دوسرا بڑا شہر اور چین کا معاشی اور صنعتی دارالحکومت ہے، ہم لوگ 29 مارچ کو شنگھائی پہنچے تھے، شنگھائی کی آبادی اس وقت ایک کروڑ 74 لاکھ ہے، یہ ایک انتہائی خوبصورت، چاند اور زندہ شہر ہے۔ آپ جوں ہی اس شہر میں داخل ہوتے ہیں آپ کو زندگی کا احساس ہوتا ہے، 30 جولائی کو شنگھائی کے میئر شین ہوگ کووانگ نے ہمارے وفد کو لُج دیا تھا، اس لُج کے دوران مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری امتیاز احمد رانجھانے ان سے بڑا دلچسپ سوال پوچھا، انہوں نے پوچھا "شنگھائی میں کتنی غیر ملکی کمپنیاں کام کر رہی ہیں" میئر کے جواب نے پورے وفد کو حیران کر دیا، انہوں نے بتایا "اس وقت شنگھائی میں 30 ہزار ملٹی نیشنل کمپنیاں کام کر رہی ہیں" میئر کا یہ جواب چین کی اقتصادی اور صنعتی ترقی کا سب سے بڑا ثبوت تھا، شنگھائی حقیقتاً ایک بڑا صنعتی اور تجارتی شہر ہے، آپ اس کے کمرشل ولیم کا اندازہ اس میں کام کرنے والی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں سے لگا سکتے ہیں، اس وقت شنگھائی میں 46 ہزار 9 سو اشتہاری کمپنیاں کام کر رہی ہیں ہر ایک ملک میں 79 ہزار چین سو اشتہاری کمپنیاں ہیں، ان ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں سے آپ شنگھائی اور چین کے تجارتی سائز کا اندازہ لگا سکتے ہیں، چین اس وقت دنیا کی دوسری بڑی اقتصادی قوت ہے، چین کا جی ڈی پی 8 ٹریلین اور 158 بلین ڈالر ہے جبکہ اس کے مالیاتی ذخائر 819 بلین ڈالر ہیں، چین کا گروتھ ریٹ 19 اعشاریہ 5 فیصد ہے، یہ دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ گروتھ ریٹ ہے، چین کی ذاتی بچتوں کا سائز ایک ٹریلین اور 70 بلین ڈالر ہے، اس وقت پوری دنیا چینی مصنوعات استعمال کر رہی ہے، یورپ چینی مصنوعات کا سب سے بڑا خریدار ہے، وہ ہر سال چین سے 218 بلین ڈالر کی اشیاء خریدتا ہے، امریکہ دوسرا بڑا خریدار ہے وہ چین سے سالانہ 212 بلین ڈالر کی اشیاء لیتا ہے جبکہ جاپان اس فہرست میں تیسرے نمبر پر آتا ہے وہ ہر سال چین سے 185 بلین ڈالر کی اشیاء درآمد کرتا ہے، ان ممالک کے بعد یہ فہرست طویل ہوتی چلی جاتی ہے، عالمی ماہرین کا خیال ہے آپ دنیا کے کسی کونے میں چلے جائیں وہاں آپ کو "میڈ ان چائنا" ضرور ملے گا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے وہ چین جو کل تک دنیا کا پسماندہ ترین ملک تھا اس نے یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا، چین نے یہ مقام جنت اور انفراسٹرکچر سے حاصل کیا ہے، اس نے ہاتھی دانت

کے حصول کیلئے باہمی پائلے شروع کئے تھے۔ آپ نقل و حرکت کے ذرائع کا اندازہ لگائیے اس وقت چین میں 472 ایئر پورٹ ہیں، ان میں سے 75 فیصد ایئر پورٹس پر چین الاقوامی پروازیں اترتی ہیں، شنگھائی نے اس سال دنیا کی سب سے بڑی کارگو پورٹ کا مقام حاصل کر لیا ہے، اس پورٹ سے پچھلے سال 443 ملین ٹن سامان دنیا کے بازاروں میں گیا، اس وقت دنیا میں سب سے بڑی ورک فورس چین میں ہے، چین میں 48 کروڑ ہنرمند ہیں، یہ تمام ہنرمند اپنے اپنے کاموں کے ماہر ہیں، چین میں انفراسٹرکچر کو وسعت دینے کا کام ابھی تک جاری ہے، چین پچانگ دریا پر تین بڑے ڈیم بنا رہا ہے، ان ڈیموں پر 22 بلین ڈالر خرچ ہوں گے اور یہ ڈیم چین کو مزید 18 ہزار 2 سو میگا واٹ بجلی دیں گے، یہ دنیا کا سب سے بڑا ہائیڈرو پاور پلانٹ ہوگا، چین 59 بلین ڈالر کی مالت سے تیرہ سو کلومیٹر لمبی نہریں بھی کھود رہا ہے، چین 18 بلین ڈالر سے چار ہزار کلومیٹر لمبی گیس پائپ بھی بچھا رہا ہے، چین 34 بلین ڈالر سے 4480 کلومیٹر لمبے اور 20 کلومیٹر چوڑے جنگلات لگا رہا ہے، چینی اس منصوبے کو "گرین گرین وال پراجیکٹ" کہتے ہیں، یہ دنیا کا سب سے بڑا جنگلی ذخیرہ ہوگا، چینوں کا خیال ہے جب یہ منصوبہ مکمل ہوگا تو چاند سے صرف دو چیزیں نظر آئیں گی، ایک گرجا وال ٹاور اور دوسری گرجا گرین وال، ہم نے شنگھائی میں دو ایسے منصوبے دیکھے جنہوں نے ہماری آنکھیں کھول دیں، ہم جن ماڈرن اور گئے، یہ 468 میٹر اونچی 88 منزل عمارت ہے جس پر دنیا کا تیسرا بلند ترین ٹی وی ٹاور قائم ہے، یہ ٹاور دنیا کی بلند ترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے، اس کی لفٹ انتہائی سبک رفتار ہے، ہمارے میزبانوں نے ہمیں حیران کرنے کیلئے لفٹ کے فرش پر ایک سکہ کھڑا کر دیا، ہم 88 ویں منزل سے نیچے آئے لیکن یہ سکہ اسی طرح ایسا تار رہا، آپ اس بات سے اس لفٹ کے توازن کا اندازہ لگائیے، دوسرا منصوبہ شنگھائی کا "یانگ شان ڈیمپ سی پورٹ" تھی، یہ منصوبہ دس برس پہلے شروع ہوا، 1996ء میں شنگھائی کی حکومت نے گہرے پانیوں کی بندرگاہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لیے ان لوگوں نے سمندر کے اندر 32 کلومیٹر لمبا پل اور اس پل پر دو روہ سڑک بنادی، یہ سڑک پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد منصوبہ ہے۔ آپ جب اس سڑک پر سفر کرتے ہیں تو آپ خود کو گہرے سمندر میں پاتے ہیں، اس سڑک کے آخر میں 30 گودیوں کی ایک نئی بندرگاہ بنائی جا رہی ہے جس سے سالانہ 8 ہزار 5 سو کونٹینر لائے اور لے جائے جائیں گے۔ ہم لوگ جب اس جگہ پہنچے تو ہمیں اپنا گواہر بہت یاد آیا، مسلم لیگ کی مزدور ونگ کے صدر فقیر حسین بخاری نے اس موقع پر بڑا

خوبصورت تمبرہ کیا، انہوں نے کہا " ایک یہ ٹوٹ ہیں جو سمندر کو خشک کر کے بندرگاہیں بنا رہے ہیں اور ایک ہم لوگ ہیں جو قدرت کی دی ہوئی بندرگاہیں تک استعمال نہیں کر رہے۔" مجھے محسوس ہوا اس معاملے میں چین ہم سے بہت آگے ہے شاید یہ چین کی اسی سوچ کا نتیجہ ہے اس وقت دنیا کے تمام سرمایہ کار اپنے اپنے سرمائے کے ساتھ چین کا رخ کر رہے ہیں، صرف 2005ء میں انٹرنیشنل سرمایہ کاروں نے چین میں 60 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی تھی، چین کی یہ فتوحات حقیقتاً اس کے وژن اور اس کے انفراسٹرکچر کا نتیجہ ہیں۔

ہات بوری تھی چینی عمارتوں اور کہاوتوں کی تو مجھے چین کی ایک اور کہادت یاد آگئی، چینی میں کہا جاتا ہے "انسان کو پھول اس وقت توڑنے چاہیے جس وقت وہ توڑے جانے کے قابل ہوں" چین نے اپنے عمل سے یہ محاورہ بھی سچ ثابت کر دیا، اس نے معیشت اور اقتصادیات کے پھول کاشت کئے، انہیں جوان کیا اور آج پوری قوم پھول جن رہی ہے، عمارتوں سے یاد آیا، پنجاب کے کیوٹیکیشن اور ورس کے صوبائی وزیر رانا ظہیر الدین بھی ہمارے ساتھ تھے، وہ دلچسپ شخصیت کے مالک انسان ہیں، جو بھی شخص ان کی کہنی میں بیٹھ جاتا ہے وہ ان کا ہو کر رہ جاتا ہے، دوران سفر رانا صاحب نے اپنے والد مرحوم کے دو قول سنائے، یہ قول بھی سونے میں توڑنے کے قابل ہیں، رانا صاحب نے بتایا، ان کے والد کہا کرتے تھے، دنیا میں کچھ لوگ دولت مند ہوتے ہیں اور کچھ امیر، ہم ان سے پوچھا کرتے تھے ان دونوں میں کیا فرق ہوتا ہے تو وہ کہتے تھے، دولت مند وہ ہوتا ہے جس کے پاس دولت ہو جبکہ امیر وہ ہوتا ہے جو اس دولت کو ثبات کاموں میں خرچ کرے لہذا اللہ تعالیٰ سے دولت مند کی بجائے امیر ہونے کی دعا کرنی چاہیے اور وہ فرمایا کرتے تھے انسان کو اس طرح رہنا چاہیے کہ اس سے دوستوں کو ہمیشہ آس رہے اور دشمنوں کو خوف، میں رانا صاحب کے والد کے اقوال سے بہت متاثر ہوا اس کی وجہ بھی چینی اقوال ہیں، چینی لوگ کہا کرتے ہیں اگر تم ایک سال کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو تم کئی بوڑھے، اگر تم دس سال کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو تم درخت لگاؤ لیکن اگر تم صدیوں کیلئے منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو پھر تم لوگوں کی تربیت کرو، تم انہیں تعلیم دو، رانا صاحب کے والد کے اقوال تیسری سٹیجنگری میں قال کرتے ہیں لہذا میں نے پاکستان پہنچتے ہی یہ دونوں فقرے اپنی ڈائری میں لکھ لئے۔



ہم ایک زندہ دل قوم ہیں

سلیم احمد معین نیشنل ڈائنامس اینڈ جرنلزمین اتھارٹی (نادرا) کے چیئرمین ہیں۔ مجھے پندرہ دن پہلے ان کا ایک انٹرویو پڑھنے کا اتفاق ہوا اس انٹرویو میں سلیم معین کے انکشاف کیا نادرہ بنگلہ دیش کیلئے ہائی سکیورٹی ڈرائیونگ لائسنس بنانے کی نادرانے یہ کاٹریکٹ کھلی بولی میں حاصل کیا تھا اس سلسلے میں بنگلہ دیش نے بین الاقوامی کمپنیوں سے ٹینڈر طلب کیے 14 ممالک کی کمپنیوں نے اپلائی کیا بنگلہ دیش کی حکومت نے بولی کرائی نادرانے سب سے کم بولی دی تھی یہ ٹھیکہ نادرہ کو مل گیا ٹھیکے کے مطابق نادرہ بنگلہ دیش کو ایک ڈالر اور 80 سینٹ میں ڈرائیونگ لائسنس بنا کر دے گی اس پراجیکٹ کا سافٹ ویئر پاکستان میں تیار ہوگا جبکہ افرادی قوت بنگلہ دیش سے حاصل کی جائیگی میں نے جب یہ انٹرویو پڑھا تو میرے تین رد عمل تھے اول مجھے نادرہ کی پرفارمنس پر خوشی ہوئی ماشاء اللہ اب ہماری (یا شاید ہمارا) نادرہ بین الاقوامی کمپنی بن چکی ہے اس کے اختیارات اور قابلیت ملکی سرحد میں عبور کر کے دوسرے ممالک میں داخل ہو چکی ہے دوم نادرہ ہائی سکیورٹی ڈرائیونگ لائسنس بنانے کی مہارت رکھتی ہے اس کے پاس بین الاقوامی ڈاکومنٹس بنانے کی مہارت بھی آگئی ہے اور سوم نادرہ نے اپنی یہ قابلیت پاکستانوں پر آزمانے کی بجائے پہلے بنگالی بھائیوں کو اس کا حق دار سمجھا۔

ہائی سکیورٹی ڈرائیونگ لائسنس وہ سرکاری دستاویز ہے جس کی بنیاد پر یورپ امریکہ

مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ نے ترقی کی تھی آج سے بچاس برس پہلے برطانیہ نے سوچا تھا وہ کون سی جگہ وہ کون سا مقام ہے جس پر ملک کے تمام شہری روزانہ آتے ہیں معلوم ہوا وہ مقام یا وہ جگہ سڑک ہے جو بھی شخص اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے وہ سڑک پر ضرور آتا ہے ایک اندازے کے مطابق یورپ کا ہر شہری روزانہ اوسطاً 89 مرتبہ سڑک پر قدم رکھتا ہے امریکہ میں یہ تعداد 150 کو چھو رہی ہے جبکہ جاپان اور چین میں اس کی تعداد بالترتیب 121 اور 141 ہے برطانیہ نے محسوس کیا جب ہمارے لوگ اس بڑی تعداد میں روزانہ سڑک پر آتے ہیں تو پھر ہمیں سڑک کو اپنے نظام کا مرکز بنانا چاہیے چنانچہ 1950ء میں فیصلہ ہوا برطانیہ کی سڑکیں قانون کا مرکز ہوں گی اس وقت برطانیہ کے زیادہ تر حکمران یہ فقرہ بولتے تھے "قانون کا نفاذ سڑک سے شروع ہوتا ہے" آپ سڑکوں پر قانون نافذ کریں پورے ملک میں خود بخود قانون نافذ ہو جائے گا" برطانیہ نے اس دور میں ٹریفک پولیس کو عام پولیس سے الگ کیا اسے اختیارات سہولتیں اور بھاری تنخواہیں دیں اور اس کے بعد انہی سڑکیں اس کے حوالے کر دیں برطانیہ کی ٹریفک پولیس نے چند ماہ میں سڑکوں کو قانون کا محور بنا دیا یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو اس کے بعد فیصلہ ہوا اگر سڑکیں تمام شہریوں کی زندگی میں اہم رول ادا کرتی ہیں تو پھر ڈرائیونگ لائسنس کو بھی اہم ترین دستاویز ہونا چاہیے چنانچہ برطانیہ نے ڈرائیونگ لائسنس کو ہائی سکیورٹی ڈاکومنٹ بنا دیا اور اس کے حصول کو انتہائی پیچیدہ اور مشکل کر دیا اس دور میں کہا جاتا تھا برطانیہ کا وزیر اعظم بنا آسان ہے لیکن ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنا مشکل حکومت نے اس کیلئے بڑا کڑا معیار طے کیا لائسنس کے حصول کیلئے بالغ ہونا شریف ہونا قانون کا اور اک رکھنا اور ڈرائیونگ کا ماہر ہونا ضروری تھا آنے والے دنوں میں یہ معیار مزید مشکل ہو گیا چنانچہ آج یہ حالت ہے برطانیہ میں ڈرائیونگ لائسنس سب سے بڑا شناختی کارڈ ہے آپ کے پاس اگر یہ کارڈ موجود ہے تو برطانیہ کا ہر سرکاری اور غیر سرکاری دروازہ آپ کیلئے کھلا ہے بصورت دیگر آپ برطانیہ میں شہر کی حیثیت رکھتے ہیں برطانیہ کی دیکھا دیکھی ہائی سکیورٹی ڈرائیونگ لائسنس ٹریفک پولیس اور ٹریفک کے قوانین پر عملدرآمد کا سلسلہ یورپ کے دیگر ممالک تک پھیل گیا اور اس کے بعد یہ ڈرائیونگ لائسنس ترقی کا سب سے بڑا معیار بن گیا یہ طے ہو گیا سکون کی ترقی کا آغاز ان کی سڑکوں ٹرانسپورٹ اور ڈرائیونگ کے قوانین سے ہو گا آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا جس ملک کی سڑکیں ٹریفک اور ٹریفک قوانین بہتر ہیں صرف وہی ملک ترقی یافتہ کہا سکتا ہے آج اس وقت دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کا رول نما بچا کر رکھیں:

آپ کو ان تمام ممالک میں نریٹک اور نریٹک قوانین مشترک ملیں گے جبکہ آپ دنیا کے تمام ترقی پذیر ممالک کی فہرست بھی نکال کر دیکھ لیں آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی ان تمام ممالک میں نریٹک کے قوانین بہت کمزور اور نریٹک کا نظام انتہائی ناقص ہے آپ امریکہ، لاطینی امریکہ، یورپ، مشرق بعید اور اب مشرق وسطیٰ کے ممالک کے دورے کریں آپ کو ان تمام ممالک میں نریٹک کے قوانین انتہائی مضبوط اور ذرا نیٹک انٹرنیشنل انسٹنٹس ایک مقدس ڈاکومنٹ نظر آنے ہوگا آپ کو معلوم ہوگا ڈرائیونگ انٹرنیشنل تمام ممالک کا سب سے بڑا شناختی کارڈ ہے آپ ذرا سی ریسرچ کر کے دیکھ لیں اس وقت دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں بائی سیوری ڈرائیونگ انٹرنیشنل موجود ہیں۔

میں نے جب سلیم معین صاحب کا انٹرویو پڑھا تو مجھے محسوس ہوا ترقی کے عمل میں بنگلہ دیش ہم سے چند قدم آگے ہے جس وقت پاکستان کے نصف سے زائد ڈرائیوروں کے پاس عام ڈرائیونگ انٹرنیشنل موجود نہیں اس وقت بنگلہ دیش بائی سیوری ڈرائیونگ انٹرنیشنل کے دور میں داخل ہو رہا ہے بنگلہ دیش کی حکومت اور لوگ یورپ اور امریکہ کی طرح سوچ رہے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں ہم لوگ آج تک اپنے ذمہ داروں کو لائسنس لینے کیلئے جان لٹا کر سکتے اور سڑکوں پر

ہماری نادرا یہ ٹیکنالوجی پہلے پاکستانیوں کو دینے کی بجائے ملک سے باہر بیچ رہی ہے یہ بات ثابت کرتی ہے ہمارا دفتری نظام اس قدر خراب اور سرخ فیتے کا شکار ہو چکا ہے کہ پاکستان میں اس نظام کی گنجائش بھی موجود نہیں جو بنگلہ دیش ہم سے خرید رہا ہے میرا خیال ہے صدر صاحب اور وزیر اعظم صاحب کو چاہیے وہ سلیم معین کو بلوائیں اور ان سے دو درجات جاننے کی کوشش کریں جن کی وجہ سے ہم اپنی ٹیکنالوجی پاکستان سے پہلے بنگلہ دیش کو فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں ترقی ایک ایسے عمل کا نام ہے جس میں ہر چیز آگے کی طرف بڑھتی ہے اگر چیزیں آگے بڑھ رہی ہوں تو ہم ملکوں اور معاشروں کو ترقی پذیر کہتے ہیں ہمارے ملک میں بھی چیزیں آگے بڑھ رہی ہیں یہ سچ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے ہمارے ملک میں آگے بڑھنے کی دو رفتاریں نہیں جو اس عمل میں ہونی چاہیے ترقی تو یہ ہے کہ ہمارے ایک ادارے نے ایک ایسا سسٹم بنالیا ہے جس کی عالمی مارکیٹ میں مانگ ہے لیکن دوسری طرف یہ عالم ہے ہمارا اپنا ملک یہ سسٹم خریدنے اور اس سسٹم کو نافذ کرنے کیلئے تیار نہیں یہ عجیب بات نہیں تھی ہم اپنی جموں کی ریزرویاں دوسروں کی جموں میں ڈال رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس فیاضی کا جشن بھی من رہے ہیں۔

ہم حقیقتاً ایک زندہ دل قوم ہیں۔

ٹیری اگر یہاں ہوتی

ٹیری شانیو 1963ء میں فلوریڈا میں پیدا ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں اس نے مائیکل شانیو کے ساتھ شادی کرنی۔ 25 فروری 1990ء کو جب وہ 26 برس کی تھی تو ایک صبح اسے شدید الٹیاں شروع ہو گئیں اسے فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا۔ ہسپتال میں ڈاکٹروں نے اس کے مرض کی بروقت تشخیص نہ کر سکے۔ ٹیری کو ہارت ایک ہوا اس کے جسم میں آکسیجن ختم ہوئی اسے برین ٹیمبرج ہو گیا اور وہ ایک طویل سکتے میں چلی گئی۔ جس کے بعد ڈاکٹروں نے اس کے منہ میں خوراک کی تالی لگا دی وہ دن ہے اور آج کا دن ہے وہ مسلسل سکتے میں ہے۔ مائیکل شانیو نے غلط علاج کرنے پر ڈاکٹروں کے خلاف کیس کر دیا۔ اگست 1992ء میں عدالت نے اس کیس کا فیصلہ سنا دیا جس کے نتیجے میں دو ڈاکٹروں نے ٹیری کے خاندان کو ساڑھے بارہ لاکھ ڈالر تاوان ادا کیا۔ اسی سببے ٹیری کی طبی امداد کیلئے ایک ٹرسٹ بنا اور مائیکل نے تاوان کی رقم سے ساڑھے سات لاکھ ڈالر اس ٹرسٹ میں جمع کرائے جس کے بعد ٹیری فلوریڈا کے ایک ہسپتال کی مستقل مریض بن گئی۔ 1998ء میں مائیکل نے عدالت میں رٹ کی "ٹیری طبی لحاظ سے سرجیکل ہے ڈاکٹروں کا کہنا ہے گزشتہ آٹھ برس میں اس کی حالت میں ذرا فرق نہیں پڑا البتہ اسے زبردستی زندہ رکھنا اس کے ساتھ زیادتی ہے عدالت ہسپتال کی انتظامیہ کو اس کی خوراک کی تالی بنادینے کا حکم جاری کر دے" عدالت نے ڈاکٹروں کی رائے طلب کی؛ ڈاکٹروں نے مائیکل شانیو کی بات سے اتفاق

کیا چنانچہ عدالت نے 2000ء میں میری کی نیوب بنا دینے کی اجازت دے دی یہ حکم سننے ہی میری کے والدین عدالت میں پیش ہوئے اور انہوں نے عدالت سے درخواست کی "ہماری بیٹی زندہ ہے جب تک میڈیکل سائنس اسے مردہ قرار نہیں دیتی اس کی خوراک کی نالی نہ بنائی جائے" عدالت نے اس درخواست کے فیصلے تک نالی لگانے کی اجازت دے دی یہ 19 اگست 2003ء کی بات ہے اس کے بعد امریکی معاشروہ دوحصوں میں تقسیم ہو گیا قانون قانون دان اور عدالتیں میری کو مردہ قرار دینے لگیں اور وہ اس کے ملحق سے نالی بنانے کا مطالبہ کرنے لگیں جب کہ عام لوگ "میری زندہ ہے" کے نعرے لگانے لگے اور جب تک اس کی سانس چل رہی ہے فیڈنگ نیوب برقرار رکھنے کا مطالبہ کرنے لگے۔

میری کا مقدمہ 2003ء آگے بڑھنے لگا یہ کیس چھوٹی عدالت سے بڑی عدالت بڑی عدالت سے فیڈرل کورٹ اور فیڈرل کورٹ سے سپریم کورٹ پہنچ گیا ان تمام عدالتوں نے میری کو مردہ قرار دے دیا اور نیوب بنانے کا حکم جاری کر دیا لیکن اکتوبر 2003ء کو فلوریڈا کے گورنر جبیش نے عدالتوں کا یہ فیصلہ ماسخ سے انکار کر دیا اس کا کہنا تھا "میری زندہ ہے" ہم اس کی زندگی کی حفاظت کریں گے ہم اس کی نیوب نہیں اترنے دیں گے" ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ 18 مارچ 2005ء کو فیڈرل عدالت نے حتمی فیصلہ دے دیا اس فیصلے کے بعد ہسپتال کی انتظامیہ نے دن کے ایک بج کر 45 منٹ پر میری شانیو کی فیڈنگ نیوب اتار دی لیکن اس مرحلے پر وفاقی حکومت نے میری کے کیس میں مداخلت کی اور عدالت سے میری کی نیوب بحال کرنے کی درخواست کر دی عدالت نے فیصلہ دیا "امریکہ کا قانون میری کو زندہ تسلیم نہیں کرتا اگر حکومت میری کو بچانا چاہتی ہے تو اسے نیا قانون بنانا پڑے گا" حکومت نے میری کا معاملہ فوراً کانگریس میں پیش کر دیا کانگریس نے نیا بل تیار کیا اس پر بحث کی اور میری کے حق میں فیصلہ دے دیا جب اس بل پر بحث چل رہی تھی تو صدر بش ٹیکساس میں اپنے فارم پر چھٹیاں گزار رہے تھے انہوں نے چھٹیاں منسوخ کیں اپنے خصوصی طیارے پر بیٹھے اور وائٹ ہاؤس واپس آ گئے ان کی یہ واپسی حیران کن تھی کیونکہ پچھلے دو سو سال سے امریکہ میں یہ روایت چلی آ رہی ہے جب وہاں امریکی صدر چھٹیاں منانے جاتے ہیں تو انہیں کسی معاملے میں پریشان نہیں کیا جاتا ان کی ساری سرکاری اور شغلی مصروفیات منسوخ کر دی جاتی ہیں ان کے ٹیلی فون رابطے تک محدود کر دیے جاتے ہیں لیکن صدر بش نے نہ صرف یہ روایت توڑ دی بلکہ وہ ذوری طور پر واشنگٹن بھی واپس آ گئے اس موقع

پروائٹ ہاؤس کے ترجمان سکاٹ میک کلی ان نے صدر کی واپسی کا اعلان کرتے ہوئے کہا "صدر بٹل سمجھتے ہیں ایک مریض کی جان ان کی چھٹیوں سے زیادہ قیمتی ہے" نیری کیس کی تازہ ترین صورت حال کے مطابق آج 24 مارچ تک اس کی فیڈنگ نیوٹر ہوئی ہے اور وہ آہستہ آہستہ موت کی دلہیز کی طرف بڑھ رہی ہے امریکی قانون اس کی موت کا منتظر ہے جبکہ امریکی عوام اور امریکی حکام ایسا قانون بنانے میں مصروف ہیں جو نیری کی اتری ہوئی فیڈنگ نیوٹر دوبارہ لگا سکتے جو اس کی زندگی بچا سکتے۔

نیری کا یہ کیس ثابت کرتا ہے امریکی حکومت اپنے شہریوں کی زندگی کے بارے میں بہت تجیدہ ہے آپ ڈراؤ کیسے امریکہ کے ایک عام شہری کا کیس کا گھر میں گیا کا گھر میں نے معمول کی کارروائی روک کر یہ کیس سنا قانون میں تبدیلی کا فیصلہ کیا قانون سازوں نے نیابل تشکیل دیا اور صدر اس بل پر دستخط کرنے کیلئے اپنی چھٹیاں منسوخ کر کے دارالحکومت پہنچ گیا یہ

حقیقت ہے نیری نہاد وہ نہ تک زندہ نہیں رہے گی کیونکہ میڈیکل سائنس نیری کے معاملے میں ہے میں ہے لیکن اس کے باوجود امریکی حکومت نے اپنے شہریوں کے ساتھ اپنی محبت ثابت کر دی ہے ہم

اب امریکہ سے پاکستان آتے ہیں آپ نیری کے کیس کو سامنے رکھیں اور پھر اپنے اسلامی معاشرے پر نظر ڈالیں اور پھر سوچیں "کیا اللہ رسول اور قرآن کے دعوے دار اس معاشرے میں بھی انسان کو اتنی ہی وقعت اتنی ہی اہمیت حاصل ہے سوچنے امر نیری اس ملک میں ہوتی تو کیا ہماری پارلیمنٹ ہمارے وزیر اعظم اور ہمارے صدر کا رد عمل یہی ہوتا سوچنے امر نیری اس اسلامی معاشرے میں ہوتی تو کیا ہمارے حکمران اس کی جان بچانے کیلئے قانون تبدیل کر دیتے کیا یہ بھی اپنی چھٹیاں منسوخ کر دیتے" ہوسکتا ہے آپ کا جواب نفی میں ہوا اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو پھر آپ ایک بات پلے باندھ لیجئے اسلام کے جس دور میں حضرت عمر فرات کے بھوکے کتوں کو خلیفہ کی ذمہ داری قرار دیتے تھے اس وقت مسلمانوں کا اقتدار زمین کی آخری حدود پر دستک دے رہا تھا لیکن جب حضرت عمر کی اس سوچ کو مسلمانوں نے فراموش کر دیا اور امریکہ نے اسے قانون بنا دیا تو مسلمان اپنے ہی وجود میں سمٹ کر رہ گئے وہ اپنی ہی ذات میں شرمندہ ہو گئے سمجھ سے جب لوگ پوچھتے ہیں مسلمان امریکہ کا مقابلہ کیوں نہیں کر پاتے تو میں کہتا ہوں "صرف اس لئے کہ امریکہ کے دل میں اپنے شہریوں کا احترام باقی ہے ان میں انسانیت اور انسان دوستی موجود ہے جبکہ مسلمان کا دل رحم اور احترام سے خالی ہو چکا ہے اور اللہ ایسے سفاک لوگوں پر کرم نہیں کرتا"

گھائے کا سودا

لین جی کا تعلق چین کے صوبے جیانگسو (Jiangsu) سے ہے۔ وہ مرکزی شہر نان جنگ (Nanjing) سے پانچ سو کلومیٹر دور ایک گاؤں میں تانک کار بنے والا تھا۔ آج سے دس برس پہلے نان جنگ میں معاشی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو گاؤں کے زیادہ تر نوجوان صوبائی دارالحکومت میں منتقل ہو گئے۔ لین جی بھی ان کی پیروی میں نکل کھڑا ہوا۔ اس نے شہر کی ایک ٹیکسٹائل میں کام شروع کر دیا۔ کام دلچسپ تھا اور لین جی تھکنی لہذا وہ ترقی کرنے لگا۔ آنے والے برسوں میں وہ مزدور سے انٹرمین گیا۔ اس کی تنخواہ میں تین گنا اضافہ ہو گیا۔ لین جی کی زندگی مسرت اور اطمینان سے گزرنے لگی۔ تین برس پہلے لین جی نے اپنے گاؤں کی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد لین جی ایک نئے مسئلے کا شکار ہو گیا۔ اس کی بیوی گاؤں میں رہتی تھی جبکہ وہ اس سے پانچ سو کلومیٹر دور نان جنگ میں مقیم تھا۔ وہ اپنی بیگم سے سال میں ایک بار ملتا تھا۔ چھن میں تمام ورکروں کو نو اکتوبر پر ایک ماہ چھٹی ملتی ہے۔ انگریزی میں ان چھٹیوں کو سپرنگ ہالی ڈین یا لانگ ہالی ڈین کہا جاتا ہے۔ نو اکتوبر سے ایک دو دن پہلے تمام ورکروں کو اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں اور 29 جنوری تک چھٹیوں پر رہتے ہیں۔ لین جی بھی "لانگ ہالی ڈین" پر گیا۔ وہ گاؤں جاتا تھا اور ایک مہینہ اپنی بیگم کے ساتھ گزار کر واپس آ جاتا تھا۔ اس سال وہ گاؤں گیا تو وہ بیٹے کا باپ بن چکا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ لیکن اس کی ماں نے اسے ایک عجیب و غریب میں ڈال دیا۔ اس نے اس سے کہا "تہما۔۔۔ بیٹے کی"

ناک ہمارے خاندان سے نہیں ملتی، لیکن جی نے غور کیا تو بچے کی ناک واقعی خاندان سے مختلف تھی، اس نے بچہ اٹھایا اور اسے پیریشیا سنٹر لے گیا، سنٹر میں بچے کا ڈی این اے ٹیسٹ ہوا اور ہسپتال نے بچے کو لین جی کی اولاد ڈیٹیکٹ کر دیا، لین جی بچے کو لے کر خوشی خوشی گھر لوٹ آیا۔

چین میں اس وقت لین جی جیسے 14 کروڑ لوگ ہیں، یہ تمام لوگ اپنے گھروں سے دور کام کرتے ہیں اور سال میں صرف ایک بار گھر لوٹتے ہیں، گھروں سے اس دوری کے دوران جب یہ لوگ صاحب اولاد ہوتے ہیں تو یہ لین جی کی طرح شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی عائلی زندگی بری طرح متاثر ہو رہی ہے، شروع شروع میں یہ شکوک و شبہات طلاق پر جا کر ختم ہوتے تھے لیکن حکومت نے جلد ہی اس مسئلے کی تحقیقی کا اندازہ لگا لیا لہذا اس نے مختلف علاقوں میں پیریشیا سنٹر بنا دیئے، اس کے بعد اب مزدور نیو ایر پر گھر لوٹتے ہیں تو وہ اپنے اپنے نومولود بچے اٹھا کر پیریشیا سنٹر پہنچ جاتے ہیں، سنٹروں میں ان کا ڈی این اے ٹیسٹ ہوتا ہے اور اس ٹیسٹ کے بعد ہسپتال ان بچوں کی والدیت کا تعین کرتے ہیں، اس قسم کے ٹیسٹوں کے دوران 20 فیصد لوگوں کے خدشات صحیح ثابت ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ ہسپتال ہی سے اپنی بیوی کو طلاق بھجوا دیتے ہیں، "لائگ ہالی ایز" کے دوران ان سنٹروں میں بے تحاشا رش ہوتا ہے، سینکڑوں ہزاروں لوگ روزانہ یہاں آتے ہیں، ان کی گود میں بچے ہوتے ہیں اور وہ قطار میں کھڑے ہو کر اپنے اپنے مقدر کے فیصلے کا انتظار کرتے رہتے ہیں، یہ چین کا پہلا سماجی مسئلہ ہے۔

چین کا دوسرا سماجی مسئلہ رشتے ہیں، آج سے پچاس برس پہلے چین کی آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہوا تھا، چین کی حکومت نے آبادی کا ڈاؤروکنے کا فیصلہ کیا، جس کے نتیجے میں چین میں "سبز ستارہ" قسم کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں، لیکن جب اس میں خاص کامیابی نہ ہوئی تو حکومت نے اولاد کے سلسلے میں قانون بنا دیا، اس قانون کو سنگل چائلڈ لاء کہا جاتا ہے، اس قانون کی رو سے چین میں ایک جوڑا صرف ایک بچہ پیدا کر سکتا ہے، تاہم چین کے بعض مضافاتی اضلاع اور صوبوں میں دو بچوں کی اجازت بھی ہے، لیکن یہ اجازت صرف 12 فیصد رقبہ تک محدود ہے، باقی چین میں سنگل چائلڈ کا قانون نافذ ہے۔ جب اس قانون پر عملدرآمد شروع ہوا تو حاملہ خواتین ابتدائی مہینوں میں انٹراساؤنڈ کے ذریعے بچے کی جنس معلوم کر لیتی تھیں، اگر انہیں معلوم ہوتا وہ بیٹی کی ماں بننے والی ہیں تو وہ 1- تا 3 ماہ میں اس کے نتیجے میں چین میں مرد بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور حکومت کو محسوس ہوا، اگر یہ عمل اسی طرح جاری رہا تو 2000 تک چین میں صرف مرد ہی مردوں

مے چنانچہ حکومت نے پیدائش سے پہلے بچے کی جنس معلوم کرنے پر بھی پابندی لگا دی اور بلاوجہ استقامت کو بھی خلاف قانون قرار دے دیا لیکن اس قانون کے بعد نئے مسائل پیدا ہو گئے ان مسائل میں ہمیں میں رشتوں کا بحران بھی شامل ہے مثلاً اس وقت جین میں جو بچے پیدا ہو رہے ہیں ان کا کوئی بھائی، کوئی بہن نہیں ان کا کوئی چاچا، چاچی، تایا، تائی، ماسوں، ممانی، خالہ، خالو اور پھوپھا پھوپھی نہیں جین میں انکل کا لفظ تک ختم ہو چکا ہے اور چینی ماہرین کا خیال ہے یہ صورتحال جاری رہی تو دس برسوں بعد ڈکٹری سے بھائی، بہن، چاچا، چاچی، تایا، تائی، خالہ، خالو اور پھوپھا پھوپھی کے الفاظ تک ختم ہو جائیں گے چنانچہ جینی حکومت کی کوشش ہے جین میں کسی نہ کسی طرح یہ رشتے برقرار رکھے جائیں حکومت اب جین میں ایسے قوانین بنا رہی ہے جن کے ذریعے بچوں کو بہن بھائی اور کزن کے مصنوعی رشتوں میں پروایا جاسکے اس قانون کے بعد بچوں کو مجبور کیا جائے گا وہ سکول میں کسی بچی کو اپنی منہ بولی بہن یا منہ بولا بھائی بنا سکیں وہ کسی کو اپنا چچا زاد بھائی، خالہ زاد بہن اور تایا زاد بھائی، بہن ڈیکلیمتہ کریں اور باقی زندگی ان کے ساتھ رابطے میں رہیں جین میں کارڈ جمعانے والی بے شمار کہنیاں اس وقت مائی سویت انکل مائی ڈیئر برادر اور مائی ڈیئر سسٹر کے کارڈز بھاپ رہی ہیں حکومت کی کوشش ہے جین میں ایک ایسا پھوپھا پروانہ چھلایا جائے جس میں بچے یہ کارڈ اپنے مصنوعی رشتے داروں کو دینا شروع کریں اور اس کے بعد پوری زندگی ان کارڈوں کا تبادلہ جاری رکھیں۔

جین اس وقت دنیا کی سب سے بڑی انڈسٹریل اسٹیٹ سب سے بڑا شاہجگ مال اور دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت ہے یہ بحران اسی معاشی طاقت اس شاہجگ مال اور اسی انڈسٹری کا نتیجہ ہے دنیا میں پانچ سو سال سے ایک فقرہ حکمرانی کر رہا ہے ”کچھ پانے کیلئے کچھ کھوٹا پڑتا ہے“ جین نے پچھلی تین دہائیوں میں معاشی اور مالیاتی استحکام کے بدلے یہ سارے رشتے کھوئے ہیں وہ دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت سب سے بڑا شاہجگ مال اور سب سے بڑی انڈسٹریل سٹیٹ تو بن گیا لیکن اس نے اپنے سارے رشتے کھو دیئے اس نے والدین کا اولاد پر یقین متزلزل کر دیا، جینی سوسائٹی سے چاچے، ماسے، تائے اور پھوپھے ختم ہو گئے، جین کے معاشرے سے چاچیاں، ممانیاں، تایاں اور پھوپھیاں ختم ہو گئیں وہاں بہن بھائی اور کزن کا رشتہ ختم ہو گیا، آج جب جین میں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا باپ سب سے پہلے اسے جینی سنٹر لے جاتا ہے اس کی ولدیت کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے بعد اسے جینا یا جینی کہتا ہے جب یہ بچہ

ذرا سبب اہوتا ہے تو پوری دنیا میں ماں کے سوا اس کا کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا، وہ رشتوں کے ایک وسیع خلائ کے ساتھ پروان چڑھتا ہے اور جب یہ بچہ جوان ہوتا ہے تو یہ چین کی معاشی اور صنعتی ترقی کا تادان دینا شروع کر دیتا ہے لہذا چین اس وقت ایک ارب 20 کروڑ تبا لوگوں کا ملک ہے۔

میں نے کل پاکستان کے ایک پالیسی میکر کا بیان پڑھا، انہوں نے فرمایا ہم پاکستان کو چین بنا دیں گے، میں ان کا یہ بیان پڑھ کر پریشان ہو گیا اور میں نے فوراً سوچا پاکستان کو چین بنانے کیلئے حکومت کو ہر غنی منتر بھی بنانے پڑیں گے، اسے اس معاشرے سے رشتوں کی خوشبو رشتوں کے سارے رنگ بھی اڑانے ہوں گے، اسے اس معاشرے کی ساری خوبصورتی بھی مٹانا ہوگی، میں نے سوچا ”کیا ہم ایک فیکٹری، ایک دکان اور ایک شاپنگ مال کے بدلے اپنے سارے رشتوں کی قربانی دے سکتے ہیں؟“ میں نے پھر سوچا، میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے، ہمارے جیسے ملک میں عام شخص کی عام سی سوچ کی کوئی وقت نہیں ہوتی، ایسے ملکوں میں وہی ہوتا ہے جو کرنے والے کرنا چاہتے ہیں، جو پالیسی ساز بھان لیتے ہیں، میں نے پھر سوچا، چین نے رشتوں کی قربانی دے کر ترقی کر لی تھی لیکن کہیں ایسا نہ ہو، ہم قربانی بھی دے دیں اور ترقی بھی نہ کر سکیں، کیونکہ ہمارا ایک ریکارڈ ہے، ہم گلاب کی قلمیں لگاتے ہیں جب یہ قلمیں پودے بنتی ہیں اور ان پودوں پر پھول لگنے کا موسم آتا ہے تو ہم کانٹے تو ڈگر گھر لے آتے ہیں، ہم لوگ کھانے کا سودا کرنے میں ماہر ہیں۔



بٹ آئی لائیک یوسوچ

بعض اوقات آپ کو یونہی بیٹھے بیٹھے کوئی کہانی یاد آ جاتی ہے اور اس کے بعد اس کہانی کے تمام کردار آپ کے ذہن سے چپک کر رہ جاتے ہیں آپ اس کہانی اور اس کہانی کے کرداروں سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کردار اور وہ کہانی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتی دلہن اور جارج کی داستان بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے میں نے یہ کہانی برسوں پہلے کسی ڈائجسٹ میں پڑھی تھی اور یہ بھی بے شمار دوسری کہانیوں کی طرح میرے دماغ کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی میں جارج اور دلہن دونوں کو بھول گیا لیکن چند روز پہلے اچانک یہ کہانی اپنی پوری جزئیات کے ساتھ یاد آئی اور اس کے تمام کردار میرے ذہن میں اٹک کر رہ گئے میں نے ان سے جان چھڑانے کی بڑی کوشش کی لیکن دلہن اور جارج میرا پیچھا چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے یہ دونوں کردار اب ہر وقت سامنے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں یہ ہر وقت میرے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور میں انہیں اپنے آگے پیچھے چنا بھرتا دیکھتا ہوں۔

دلہن امریکی ریاست ٹیکساس کا مافیا لارڈ تھا اس کے دو ہی شوق تھے جانور پالنا اور دشمنیاں بنانا اس کا کہنا تھا دشمن آپ کی طاقت کا ثبوت ہوتے ہیں آپ کے جتنے زیادہ دشمن ہوں گے آپ اتنے ہی طاقتور ہوں گے لہذا وہ دشمن بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا لیکن اس کا دشمنوں کے ساتھ بننے کا طریقہ بہت دلچسپ تھا وہ جب بھی کسی شخص کو اپنا دشمن

بناتا تھا تو اس دشمن کے مقابلے میں ایک دوست بھی شیلش کرتا تھا یہ دوست اس کے دشمن کا دشمن ہوتا تھا وہ اس 'دوست' کو اطمینان دیتا تھا پیر اور حوصلہ دیتا تھا اسے دشمن سے لڑا دیتا تھا اور خود دور بیٹھ کر اس لڑائی کو انجوائے کرتا تھا اس جنگ کے دوران مونا اس کا دشمن مارا جاتا تھا جس کے بعد وہ دشمن کی میت پر آتا تھا دشمن کی نعش پر پاؤں رکھتا تھا اپنے شارٹ نرم دوست کو تھپکی دیتا تھا اور اس کے بعد اسے بھی گولی مار دیتا تھا اس کا فلسفہ تھا جب آپ کا کوئی دوست آپ کے دشمن کو شکست دے دیتا ہے تو وہ آپ کا دوست نہیں رہتا چنانچہ آپ کو چاہیے پہلی فرصت میں اپنے اس دوست سے جان چھڑائیں ایل۔ ڈین اس کا ایک ایسا ہی دوست تھا ایل۔ ڈین نے ولسن کے کہنے پر اس کے سب سے بڑے دشمن ماس سے ٹکری تھی ماس ولسن سے بہت بڑا اور مضبوط مانیا تھا ولسن کا خیال تھا ایل۔ ڈین ماس کو شکست نہیں دے سکے گا لیکن ایل۔ ڈین نے ماس کے نکلے نکلے کر دینے ولسن کو محسوس ہوا ایل۔ ڈین یہ جنگ جیت کر ماس کی جگہ لے چکا ہے چنانچہ اب اسے ایل۔ ڈین سے بھی جان چھڑا لینی چاہیے ایل۔ ڈین کی طرف بڑھا لیکن اس وقت تک ایل۔

ڈین ولسن کی نسبت بخیرانہ چکا تھا چنانچہ ایل۔ ڈین وہاں سے بھاگا اور اس نے ٹیکسا میں سے باہر جا کر اپنا ایک گلو بڑا مانیا بنالیا ایل۔ ڈین جرات مند بھی تھا ہوشیار بھی اور دوست مند بھی لہذا اس کا مانیا جڑ پکڑنے لگا اور لوگوں کو محسوس ہونے لگا ایل۔ ڈین ولسن کو برباد کر دے گا اس وقت ولسن کو ایک ایسے شارٹ نرم دوست کی ضرورت پڑی جو ایل۔ ڈین کا مقابلہ کر سکے جارح اس وقت نیا نیا ابھر رہا تھا اس میں جرات بھی تھی اور آگے بڑھنے کی خواہش بھی چنانچہ ولسن نے جارح کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا جارح ایل۔ ڈین کے سامنے ڈٹ گیا جس کے بعد جارح ایل۔ ڈین کے ٹھکانوں کا اندازہ لگا تا اور ولسن جارح کی آڑ میں ان ٹھکانوں پر حملہ کر دیتا ان حملوں میں ایل۔ ڈین کے بے شمار ساتھی مارے گئے اور اس کے زیادہ تر لہکانے اس کے ہاتھ سے نکل گئے حتیٰ کہ وہ جنگوں میں پناہ گزین ہو گیا ولسن نے اس کے بیڑے کو اتر پر اپنا ایجنٹ بٹھادیا جارح اس کا میاں پر پھولے نہیں ساتا تھا اس کا خیال تھا اب ولسن اسے اپنی ریاست کا جنوبی حصہ دے دے گا ایک دن ولسن نے جارح کو اپنے فارم ہاؤس پر بلایا جارح نے اسے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھا یہاں سے کہانی کا کھا ٹیکس شروع ہوتا ہے۔

ولسن نے ایل بیول بندوق اٹھائی جارح کو ساتھ لیا اور اپنے فارم ہاؤس کی سیر کیلئے نکل کھڑا ہوا سامنے ولسن کا عزیز ترین کتا کھڑا تھا کتے نے ولسن کو دیکھا تو وہ اس کے قدموں میں

لوٹنے لگا، ولسن نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا، اسے پیار کیا، چند قدم پیچھے بنا، کندھے سے بندوق اتاری، کتے کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی، کتے کے چیتھڑے اڑ گئے، جارح یہ منظر دیکھ کر سہم گیا، ولسن مسکرا کر بولا، "یہ میرا عزیز ترین کتا تھا لیکن افسوس اس کے دانت کمزور ہو گئے تھے، یہ اب شکار کو پر دی طرح دبوچ نہ سکتا تھا، بت آئی لائیک یوسوچ،" اس کے بعد ولسن نے جارح کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آگے چل پڑا، سامنے اس کا قیمتی ترین گھوڑا کھڑا تھا، ولسن نے اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرا، اسے تھکی دی، چند قدم پیچھے بنا اور گھوڑے کو بھی گولی مار دی، جارح کے ماتھے پر پسینہ آ گیا، ولسن نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا، "پورے امریکہ میں اس جیسا کوئی گھوڑا نہیں تھا لیکن افسوس اب اس کے گھٹنوں میں درد رہنے لگا تھا، بت آئی لائیک یوسوچ،" ولسن نے جارح کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گیا، سامنے اس کی پسندیدہ گاڑی کھڑی تھی، اس نے گاڑی کی طرف پیار سے دیکھا، ڈکی سے پٹرول کا کین نکالا، گاڑی پر پٹرول چھڑکا، چند قدم پیچھے بنا اور گاڑی پر فائر کر دیا، ایک شعلہ سا پکا اور گاڑی کو آگ لگ گئی، جارح کے پتھکے چھوٹ گئے، ولسن اس کی طرف مڑا، قہقہہ لگایا، "یہ میری سب سے بڑی گاڑی تھی لیکن اب چلنے ہوئے چھٹکے کھاتی تھی، بت آئی لائیک یوسوچ،" ولسن آگے چل پڑا، جارح اس کے پیچھے چلنے لگا، سامنے زعفران کا کھیت تھا، ولسن کھیت کے پاس پہنچا، کھیت کو چند لمحے پیار سے دیکھا، پٹرول کا کین اٹھایا، کھیت کے چاروں طرف پٹرول چھڑکا اور پٹرول پر دیا، سلامتی چھیک دی، پورا کھیت جل کر دکھ ہو گیا، ولسن نے قہقہہ لگایا، "یہ میرے فارم کا سب سے قیمتی کھیت تھا، پچھلے سال میں نے اس سے دو سو زعفران حاصل کی تھی لیکن اس سال اس نے صرف ڈیڑھ سو من فصل دی، میں کارکردگی میں کمی برداشت نہیں کر سکتا، بت آئی لائیک یوسوچ،" ولسن تھک کر گھاس پر بیٹھ گیا، اس نے بندوق میں ہاتھی مارنے والا بڑا کارٹوس بھرا اور جارح کی طرف دیکھ کر بولا، "تم نے وعدہ کیا تھا، تم پر ایل تک ایل۔ ڈین کو پکڑ لو گے، ذرا حساب لگا کر بناؤ، اپریل میں کتنے دن باقی ہیں،" جارح کا پورا جسم پسینے میں بیگم گیا، اس نے جیب سے رد مال نکالا، ماتھے پر پھیرا اور لرزتی آواز میں بولا، "مائی لارڈ، آئی ایم ٹرائینگ، بت ہی از سو کلیئر،" ولسن نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھا، اس کے کندھے پر چھگی دی اور مسکرا کر بولا، "ڈاؤنٹ درمی آئی لائیک یوسوچ،" اس کے بعد بڑی دیر تک وہاں سناٹا رہا، جارح نے ڈرتے ڈرتے ولسن سے پوچھا، "مے آئی گونا ڈسز،" ولسن نے مسکرا کر کہاں میں گردن ہلا دی، جارح اٹھا سلام کیا اور وہاں سے رخصت ہو گیا، ولسن اسے بڑے پیار سے دیکھتا رہا اور وہی منہ میں بڑبڑاتا رہا، "میں آئی

لائیک ہم سوچ آئی لائیک ہم سوچ بنت..... میں اپنی فطرت سے بہت تنگ ہوں کام ختم ہونے کے بعد مجھے اپنے دوستوں سے نفرت ہو جاتی ہے مجھے لوگ اچھے نہیں لگتے یہاں پہنچ کر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

یہ ایک عام سی کہانی تھی دنیا بھر کے لائیکسٹوں میں روزانہ ایسی بے شمار کہانیاں شائع ہوتی ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں چند دنوں سے مجھے یہ کہانی بہت یاد آ رہی ہے اور میں دلن کو اپنے سامنے چلا پھرتا ہوں کرتا تھپتھپے لگاتا اور ہندوق میں کارتوس بھرتا ہوا دیکھتا ہوں مجھے دلن کے فارم ہاؤس کے تمام مناظر یاد آتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کیا دنیا میں واقعی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے نزدیک دوستی ایک شارٹ ٹرم تعلق ہوتا ہے جن کی دوستیاں صرف ایک ٹاسک تک محدود ہوتی ہیں جو صرف پراجیکٹ نو پراجیکٹ تعلق رکھتے ہیں مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا میں پھر سوچتا ہوں بعض اوقات ہمیں یونگی بیٹھے بیٹھے کوئی کہانی یاد آ جاتی ہے اور اس کہانی کے تمام کردار ہمارے ذہن سے چپک کر رہ جاتے ہیں اور ہم لوگ پوری کوشش کے باوجود اس کہانی اور اس کہانی کے کرداروں سے جان نہیں چھڑا پاتے لیکن پھر میں سوچتا ہوں کیا امریکہ اور پاکستان کا تعلق بھی دلن اور جارج جیسا نہ ہو کہیں صدر بش دلن اور صدر پرویز مشرف دلن اور صدر پرویز مشرف جارج نہ ہو میں جب بھی یہ سوچتا ہوں تو میں فوراً انکار میں سر ہلاتا ہوں اور اپنے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہانیاں محض کہانیاں ہوتی ہیں ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔



معمول کی کارروائی

جان سمٹھ کا تعلق برازیل کے شہر ریو ڈی جنیرو سے تھا وہ امریکہ سے چھوٹی شوگر میس
 دورا بنا کر آتا تھا اس کا شمار برازیل کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا اور وہ ہر پختے امریکہ آتا تھا
 اکتوبر 2001ء میں وہ نیویارک ایئر پورٹ پر اترا تو اس نے وہاں عجیب صورت حال دیکھی اس
 نے دیکھا ایگریگیشن کے کاؤنٹرز کے سامنے طویل قطار لگی ہے اور جو بھی مسافر ایگریگیشن افسر کے
 پاس پہنچتا ہے وہ اپنی ٹائی ٹوپی جوتے اور پرس نکال کر ایک طرف رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد
 سکیورٹی کے دو اہلکار بڑی باریک بینی سے اس کی تلاش لیتے ہیں جان سمٹھ کیلئے یہ صورت حال
 حیران کن تھی وہ پچھلے 20 برس سے امریکہ آ رہا تھا اور اس نے کبھی یہ منظر نہیں دیکھا تھا جب اس
 کی باری آئی تو ایگریگیشن افسر نے اسے بھی جوتے اتارنے کا حکم دیا اس نے یہ آرڈر ماننے سے
 انکار کر دیا ایگریگیشن افسر نے اس کا پاسپورٹ لیا اور اس پر ڈی پورٹ کی مہر لگا دی جان سمٹھ اگلی
 قلائت سے واپس برازیل چلا گیا اس نے ریو ڈی جنیرو جاتے ہی پریس کانفرنس بلائی اور صحافیوں
 کو یہ سارا قصہ سنا دیا پریس نے اگلے دن طوفان برپا کر دیا حکومت نے امریکی سفیر کو طلب
 کر لیا لیکن امریکی حکومت نے اسے ”معمول کی کارروائی“ قرار دے دیا برازیلی حکومت نے یہ
 معاملہ پارلیمنٹ میں بھیج دیا پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا آج سے جو بھی امریکی برازیل کی سرزمین پر
 قدم رکھے گا اس کی تفصیلی تلاش ہوگی اگلے دن اس قانون پر عملدرآمد شروع ہو گیا امریکی حکومت

نے اسے ڈس کریٹیشن قرار دیا اور اس پر شدید احتجاج کیا، برازیل حکومت نے اس کا بڑا خوبصورت جواب دیا، اس نے کہا "یہ ہماری معمول کی کارروائی ہے" لہذا 2002ء سے 2006ء تک برازیل دنیا کا واحد ملک تھا جس کے ایئر پورٹس پر صرف ایک ملک کے شہریوں کی تلاشی ہوتی تھی اور وہ ملک تھا امریکہ۔

معمول کی کارروائی کا دوسرا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ بھارت کے سابق وزیر دفاع جارج فرنانڈس 2002ء میں امریکہ کے سرکاری دورے پر گئے تھے ڈیٹا اس ایئر پورٹ پر ان کی وصولی اور کرتے کی تلاشی ہوئی انہوں نے تلاشی دی اور اپنا دورہ منسوخ کر کے بھارت واپس آ گئے بھارت نے اس معاملے پر بھی امریکہ سے کسی قسم کا کوئی احتجاج نہ کیا، 2003ء میں فرنانڈس برازیل کے دورے پر گئے ان کی فلائٹ امریکہ سے ہو کر برازیل جانی تھی راستے میں وہ ڈیٹا اس ایئر پورٹ پر اترے تو ایک بار پھر ان کی تلاشی ہوئی، بھارتی حکومت اس بار بھی خاموش رہی، بھارت نے اس معاملے پر امریکہ سے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا، بھارت میں حکومت بدل گئی لی جے بی کی جگہ کانگریس کے من موہن سنگھ وزیر اعظم بن گئے جولائی 2004ء میں امریکہ کے ڈیٹا فریڈر خاچی رچرڈ آرٹسج سرکاری دورے پر بھارت آئے وہ جوں ہی دہلی کے ایئر پورٹ پر اترے بھارتی حکومت نے ان کی تلاشی کا حکم جاری کر دیا، امریکہ کے سفارتی عملے کے لئے یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی امریکی ایجنسی نے اعتراض کیا تو بھارت نے اس وقت اپنے سابق وزیر دفاع کے ساتھ ہونے والے سلوک پر سرکاری احتجاج کیا، یہ احتجاج اس قدر شدید اور قطعی تھا کہ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ نے نہ صرف دہلی ایئر پورٹ پر بھارتی حکومت سے معافی مانگی بلکہ وہ معافی مانگنے کیلئے بی جے پی کے لیڈر رائل کے ایڈوائس کی رہائش گاہ پر بھی گئے۔

ہم اگر بھارت اور برازیل کی سیاسی اور سفارتی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا ان دونوں ممالک کا امریکہ کے ساتھ کوئی دیرینہ تعلق نہیں تھا، بھارت 1990ء تک نہ صرف امریکہ کا مخالف رہا تھا بلکہ وہ اس کے حریف سوویت یونین کا گہرا دوست بھی تھا، اسی طرح برازیل دنیا کا سب سے بڑا متروک ملک ہے اور اس نے آج تک کسی عالمی مسئلے پر امریکہ کی حمایت نہیں کی جبکہ ان دونوں ممالک کے مقابلے میں پاکستان کا شمار امریکہ کے پرانے دوستوں میں ہوتا ہے، ہم لوگ امریکہ کی دوستی میں وہاں تک چلے جاتے ہیں جہاں سے خود کشی کی حدود شروع ہوتی ہیں آپ افغانستان کے دونوں جہاد دیکھ لیجئے 1980ء میں ہم دنیا کی واحد قوم تھے جو امریکی مفادات کے

لئے افغانستان میں سوویت یونین سے دست و گریبان تھے 2002ء میں بھی ہم نے امریکہ کے دہکے شور میں چھلانگ لگادی تھی، ہم اس وقت پوری دنیا میں دہشت گردی کے خلاف امریکہ کے سب سے بڑے حلیف ہیں لیکن اس کے باوجود 2006ء میں جب ہمارے وزیراعظم وائٹ ہاؤس کی دعوت پر امریکہ گئے تو سرکاری وفد میں شامل وزراء کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جس کا تصور تک محال ہے ہمارے وزراء کو قطار میں کھڑا کر کے ان کی تلاشی لی گئی ان کے جوتے اترائے گئے ان کی ٹائیاں کھولی گئیں اور ان کی نوجیاں جھانزی گئیں، میں نے جب ٹیلی ویژن پر یہ منظر دیکھا تو میرا خون کھول اٹھا اور میں نے خود سے پوچھا "کیا امریکہ میں بھارت اور براہیل کے وزراء کے ساتھ بھی یہ سلوک ہوتا ہے؟" میرا جواب نفی میں تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ 2005ء میں امریکہ نے "معمول کی اس کارروائی" کا سائل تبدیل کر دیا تھا، امریکی حکومت اب سرکاری دورے پر آنے والے وزراء و وزراء اعظم اور ان کے وفد میں شامل لوگوں کی تلاشی نہیں لیتی ہاں البتہ وہ وزراء اور وہ سینئر حکام جو نجی دوروں پر امریکہ آتے ہیں انہیں معمول کی اس کارروائی سے گزرنا پڑتا ہے لیکن جب پاکستان جیسے عزیز ترین دوست کی باری آتی ہے تو امریکہ اپنے ایئر پورٹس پر 2002ء کے قوانین نافذ کر دیتا ہے وہ پاکستان کے سرکاری وفد کو شکوک اور گھبراہٹ کی تحرث سمجھنا شروع کر دیتا ہے آپ ایک اور دلچسپ امر بھی ملاحظہ کیجئے جب اخبارات میں اس سلوک پر خبریں شائع ہوئیں اور ایک ٹیلی ویژن چینل نے اس سلوک کی فلم دکھا دی تو امریکی حکومت تو اس پر خاموش رہی لیکن ہمارے وزیراعظم جناب شوکت عزیز ہمارے وزیر داخلہ اقبال احمد شیرپاؤ اور امریکہ میں پاکستان کے سفیر جنرل جہانگیر کرامت نے باہرے معمول کی کارروائی قرار دے دیا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اگر یہ معمولی واقعہ ہے تو خاص واقعہ کیا ہوگا؟ خاص کارروائی اور خاص سلوک کیا ہوگا؟

ہم اگر پچھلے پانچ سال کے واقعات جمع کریں تو معلوم ہوتا ہے امریکہ اور یورپ میں ہمارے وزراء اور اعلیٰ سیاستدانوں کی توجہ معمول بن چکی ہے پچھلے سال صدر کے دورے کے دوران جناب خورشید محمود قصوری کی نہ صرف خوفناک تلاشی ہوئی تھی بلکہ ان کا سامان تک ایئر پورٹ پر روک لیا گیا تھا اور لوگوں نے انہیں پاکستان کے سفارتی عملے پر برستے اور یہ کہتے سنا تھا "میں کل کون سے کپڑے پہنوں گا" اسی طرح آئی ایس پی آر کے سابق ڈی جی صدر کے پریس سیکرٹری اور سرکاری ترجمان میجر جنرل راشد قویشی کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا تھا، امریکی

سفارتخانہ اکثر ہمارے سیاستدانوں کے ویزے ستر دکر تار بتا ہے اپریل 2005ء میں پاکستان کا ایک 8 رکنی سرکاری وفد یورپی یونین کے دورے پر گیا تھا جب یہ وفد برسلز پہنچا تھا تو مختصر حکام نے وفد میں شامل بزرگ سیاستدان مولانا مسیح الحق کو انٹری دینے سے انکار کر دیا تھا یہ ایٹو بعد ازاں پوری دنیا میں مشہور ہوا اور ٹیل کے ساحلوں سے لے کر تاجک کاشغر ہماری سکی اور بے عزتی ہوئی مولانا مسیح الحق نے لندن کے ذریعے واپس آنا تھا جب وہ پتھر وائیز پورٹ پر پہنچے تو سیکورٹی اہلکاروں نے وہاں بھی سوا گھنٹہ ان کی تلاش لی تھی۔ اپریل 2005ء ہی میں بلوچستان کے وزیر بلدیات حافظ حسین احمد شروڈی کو مائجسٹریٹ پورٹ پر رد کیا گیا تھا اور چار گھنٹے تک ان کی تلاش لی گئی تھی لیکن یہ ہمارا کمال ہے ہم نے معمول کی ان تمام کارروائیوں پر آج تک سرکاری سطح پر احتجاج کیا اور نہ ہی کوئی ایسی پالیسی بنائی جس کے ذریعے ایسے واقعات کا تذکرہ ہو سکے یہ حقائق بتاتے ہیں اگر ہم نے قومی سطح پر کوئی پالیسی نہ بنائی تو معمول کی یہ کارروائیاں آگے چلتی رہیں گی اور ہم لوگ اسی طرح ایگزٹریوٹوں پر بے عزت ہوتے رہیں گے حکومت کو چاہیے وہ پاکستان میں موجود امریکہ اور یورپ کے سفیروں کو بلوائے اور انہیں دو ٹوک الفاظ میں کہہ دے اگر ہمارے ساتھ آئندہ ”مصلوبوں کی کارروائی“ ہوئی تو ہم نہ صرف اپنے دورے منسوخ کر دیں گے بلکہ آپ سے سفارتی تعلقات بھی منقطع کر دیں گے اگر یہ ممکن نہیں تو ہم کم از کم پاکستان میں بھی یہ ”معمول کی کارروائی“ شروع کر دیں ہم آج سے یہ قانون بنادیں ہمارے ایگزٹریوٹوں پر جو بھی امریکی یا یورپی باشندہ اترے گا ہم اس کی جامہ تلاش لیں گے خواہ وہ رچرڈ آرٹس ہو یا گوئڈ ویز اراکس خدا کی پناہ ہمارا سرکاری وفد امریکہ جاتا ہے تو ان کے جوتے ٹوپی اور کوٹ تک اتروا کر تلاش لی جاتی ہے جبکہ سمندر پار آباد گوروں کا بیڑ بھی پاکستان آتا ہے تو اسے ریسیو کرنے کیلئے سرخ نمبر پلیٹ کی گاڑی رن وے پر پہنچ جاتی ہے کیوں؟ اس کیوں کا جواب ایک امریکی کہادت میں چھپا ہے امریکی محاورہ ہے جس بلیغ کی چونچ نہیں ہوتی بچے اس کے گلے میں رسی باندھ دیتے ہیں نمبر اخیال ہے وہ وقت آچکا ہے جب ہمیں اپنی چونچ باہر نکال لینا چاہیے اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو امریکی بچے ہمارے گلے میں رسی باندھیں گے اور ہمیں گلی گلی گھسیٹنا شروع کر دیں گے۔



اپنے بچے

Kashif Azad@OneUrdu.com

یہ 2001ء کی بات ہے، ابھی امریکہ میں نائن ایون کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا، عبدالرزاق داؤد پاکستان میں انٹرنیٹری ایجنٹ کام کر کے وفاق دہلی تھے، عبدالرزاق داؤد نے جاپان کے چند بڑے سرمایہ کاروں کو پاکستان کے دورے کی دعوت دی، سرمایہ کار پاکستان آئے تو حکومت نے انہیں کوئٹہ، گراچی، لاہور، فیصل آباد، سیالکوٹ اور اسلام آباد کا دورہ کرایا، وزٹ کے آخری مرحلے پر وفد کی وفاق سیکرٹریوں، سرکاری اداروں کے چیئرمینوں، ڈائریکٹرز جنرلوں اور وزراء کے ساتھ ملاقات کا بندوبست کیا گیا۔ ملاقات کا اہتمام پلاننگ کمیشن میں کیا گیا تھا، اس میٹنگ میں عبدالرزاق داؤد ان کے ساتھی وزراء اور اعلیٰ سول افسروں نے جاپانی وفد کو پاکستان کے بارے میں بریفنگ دی، پاکستانی حکام کا کہنا تھا پاکستان جغرافیائی لحاظ سے بڑا آئیڈیل ملک ہے، یہ ملک قدرتی وسائل سے مالا مال ہے، اس میں کم معاوضے پر ہنرمند دستیاب ہیں، یہاں کے لوگ محنتی ہیں اور اس ملک میں چاروں موسم پائے جاتے ہیں، لہذا پاکستان سرمایہ کاری کے لحاظ سے ایک آئیڈیل ملک ہے، جاپانی وفد بڑے غور سے یہ باتیں سنتا رہا، جب پاکستانی حکام اپنی تعریفیں کر کے تھک گئے تو جاپانی وفد کا لیڈر کہتا ہوا، اس نے اپنے ساتھیوں سے اجازت لی اور پاکستانی

حکومت کی مہمان نوازی، محبت اور حسن سلوک کی تعریف کے بعد بولا 'میں آپ لوگوں سے صرف دو سوال پوچھنا چاہتا ہوں' اگر آپ نے ان سوالوں کا جواب ہاں میں دے دیا تو ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں ہم پاکستان میں بڑے سے بڑے سرمایہ کاری کریں گے پاکستانی زما، برتن گوش ہو گئے' جاپانی سرمایہ کار نے پوچھا "آپ لوگ ایمان داری سے بتائیے کیا پاکستانی سرمایہ کار اپنا سرمایہ پاکستان میں لگا رہے ہیں؟" میٹنگ روم میں خاموشی چھا گئی' جاپانی سرمایہ کار نے مسکرا کر حاضرین کی طرف دیکھا اور اس کے بعد بولا "آپ کی خاموشی بتاتی ہے آپ کا جواب ناں میں ہے' ہم لوگ جانتے ہیں پاکستان کے بے شمار سرمایہ کار، صنعت کار اور تاجر دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں' میں اب دوسرے سوال کی طرف آتا ہوں' جاپانی سرمایہ کار ایک لمحے کیلئے رکا اور اس کے بعد اس نے دوسرا سوال پوچھا "کیا اور سیز پاکستانی اپنا سرمایہ پاکستان میں لگا رہے ہیں" اس سوال پر بھی ہاں میں خاموشی رہی' جاپانی سرمایہ کار مسکرایا اور نرم آواز میں بولا "حاضرین دنیا میں سرمایہ کاری کے دو ٹیسٹ ٹیسٹ ہوتے ہیں سرمایہ کار جب بھی کسی ملک میں سرمایہ کاری کا سوچتے ہیں تو وہ سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں اس ملک کے سرمایہ کار اپنے ملک میں کس حد تک اعتبار کرتے ہیں' اگر انہیں معلوم ہو اس ملک کے سرمایہ کار اپنا سرمایہ ملک سے باہر لے جا رہے ہیں تو وہ اس ملک میں بھی سرمایہ کاری نہیں کرتے' اس کے بعد وہ یہ دیکھتے ہیں کیا اس ملک کے اور سیز شہری اپنا سرمایہ لے کر اپنے ملک واپس آ رہے ہیں' اگر انہیں معلوم ہو اور سیز شہریوں کی زیادہ تر تعداد واپس آ رہی ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے اس ملک میں سرمایہ لگا دیتے ہیں" جاپانی سرمایہ کار نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں پاکستان سرمایہ کاری کے لحاظ سے ایک آئیڈیل ملک ہے' ہمیں اس کے موسم، زمین اور لوگ بھی اچھے لگے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے جس ملک پر اس ملک کے اپنے سرمایہ کار اعتماد نہیں کر رہے' اس ملک پر ہم غیر ملکی سرمایہ کاریوں اعتبار کریں گے"

جاپانی سرمایہ کاری کی بات ضرور سچ تھی لیکن یہ بات سچ تھی دنیا میں پرندے اور سرمایہ کار صرف ان ٹھینوں پر گھونسلے بناتے ہیں جن پر ان کی جان اٹنے اور گھونسلے محفوظ ہوتے ہیں' یہ جن ملکوں کے معاشی حالات خراب ہوں' جن میں قانون کمزور اور لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال غیر تسلی بخش ہو ان ملکوں سے سب سے پہلے سرمایہ کار بھاگتے ہیں' اٹلی میں میرے ایک دوست طارق بھی رہتے ہیں وہ نیلی کی ویکیشن کی صنعت سے وابستہ ہیں' ان کا شمار یورپ کے چند بڑے پاکستانی

سرمایہ کاروں میں ہوتا ہے انہوں نے ایک بار مجھے کہا تھا "حکومت کو سمجھائیں کوئی امریکی 'یورپی' جاپانی اور چینی سرمایہ کار پاکستان نہیں آئے گا" ان سرمایہ کاروں کو سٹیسیکو سے لے کر دہلی تک دنیا جو سروسز آفر کر رہی ہے پاکستان کبھی انہیں یہ سروسز فراہم نہیں کر سکتا، یہ لوگ یورپ جیسا لبرل ماحول چاہتے ہیں انہیں شراب خانے، جوا خانے، ڈسکو کلب اور چتر چائیس، یہ ٹیکس فری سسٹم اور سرمایہ کاری کا دوستانہ ماحول چاہتے ہیں جبکہ ہمارا معاشرہ ہماری روایات اور ہماری ثقافت ان لوگوں کی توقعات سے قطعاً مختلف ہے، ہم لوگ ان کی توقعات پر پورے نہیں اتر سکتے لہذا یہ لوگ کبھی پاکستان میں چین، یعنی 'ہانگ کانگ'، تھائی لینڈ اور سلیسیکو جتنی سرمایہ کاری نہیں کریں گے چنانچہ پاکستان کے پاس صرف اور میز پاکستانیوں کا آپشن رہ جاتا ہے۔ اس وقت دنیا میں ایسے بے شمار پاکستانی ہیں جو انتہائی خوشحال ہیں، جو یورپ، امریکہ اور مشرق بعید میں بڑی بڑی کمپنیاں چلا رہے ہیں، یہ لوگ پاکستان بھی آنا چاہتے ہیں، اگر حکومت ان پاکستانیوں کو بہتر ماحول، تحفظ اور اچھا نظام دے تو یہ لوگ پاکستان میں اربوں ڈالر لگا دیں گے، یہ پاکستان کا مفد بدل دیں گے" میں نے ان سے پوچھا تھا "حکومت کو اور میز پاکستانیوں کا اعتماد بحال کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیے" طارق جمالی نے جواب دیا "یہ لوگ حکومت کی ذرا سی سپورٹ، ذرا سی لوج اور ذرا سی سپینڈ چاہتے ہیں، ہم لوگ جب دو تین لاکھ ڈالر لے کر دنیا کے کسی ملک میں جاتے ہیں تو وہاں کی حکومت ہمیں ریڈ کارپٹ استقبال دیتی ہیں لیکن جب ہم لوگ اپنے ملک میں اربوں ڈالر لے کر آتے ہیں تو انٹیرپورٹ سے لے کر گھر تک لیرے ہمارا اچھا کرتے ہیں، ہم کسی سرکاری دفتر جاتے ہیں تو ہمارے ساتھ جانوروں جیسا سلوک ہوتا ہے، عدالتیں ہماری آواز نہیں سنتیں اور حکومت ہمارے ساتھ ہاتھ نہیں ملاتی، آپ حد ملاحظہ کیجئے جب ہماری کمپنیوں کا کوئی گورا ملازم پاکستان جاتا ہے تو اس کے لئے نیچے سے لے کر اوپر تک سارے دروازے کھل جاتے ہیں، اسے سرکاری سطح پر تحفے تک ملتے ہیں لیکن جب ہم لوگ چیک، بکس کے بریف کیس لے کر پاکستان آتے ہیں تو ہمیں تھانے کا ایس ایچ او تک ملنے کیلئے تیار نہیں ہوتا، ہم رجسٹریشن اور لائسنس کیلئے اپلائی کرتے ہیں تو دس دس سال تک ہمیں جواب نہیں ملتا، ہم زمین خرید لیتے ہیں تو اس پر حق خفہ ہو جاتا ہے، بینک ہمارے اکاؤنٹس نہیں کھولتے، ہمیں بجلی، گیس، سڑک اور پانی کیلئے کروڑوں روپے رشوت دینا پڑتی ہے اور ہم لوگ گارڈز کے بغیر باہر نہیں نکل سکتے، اسی طرح اگر خدا نخواستہ ہم ٹیکریٹنگ مینیس تو 60 قسم کے ٹکٹے ہمارے پیچھے لگ جاتے ہیں، ہر شخص ہم سے پیسے مانگتا ہے"

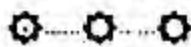
ہمیں ناظم سے لے کر چیف فنانسنگ سب کو خوش رکھنا پڑتا ہے اور ہم لوگ اگر پورا نکلیں دے دیں تو مجرم ہیں نہ دیں تو بھی مجرم ہیں لہذا پھر ہم سوچتے ہیں جب ہمارے ملک کو ہماری ضرورت نہیں تو ہمیں اس دھول اس خاک اور اس حقارت میں زندگی گزارنے کی کیا ضرورت ہے ہم کیوں نہ اس معاشرے اس ملک میں رہیں جہاں ہمارا پیر اور ہم دونوں محفوظ ہیں۔

میں نے طارق بھٹی سے اتفاق کیا میرے ایک دوسرے دوست ہر انور پرویز نے برطانیہ سے آٹھ سو ملین پاؤنڈ لاکر پاکستان میں سرمایہ کاری کی تھی وہ جب بھی پاکستان آتے ہیں تو انہیں شدید مایوسی ہوتی ہے ان کا کہنا ہے انہوں نے جتنے مسائل پھیلے چند برسوں میں دیکھے ہیں اتنے انہوں نے چالیس برس میں مجموعی طور پر نہیں دیکھے ان کی بات درست ہے یہ عام مشاہدہ ہے پاکستان میں جو بھی اور ویز پاکستانی سرمایہ لے کر آتا ہے وہ لٹ لٹا کر واپس جاتا ہے اور اس کے بعد واپس آنے کا نام نہیں لیتا بے شمار پاکستانی اس ملک آ کر جان تک سے ہاتھ دھو بیٹھے لہذا آج ہمارے اور ویز پاکستانی ہمارے نظام پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں یہ عجیب بات ہے ہم پوری دنیا کو سرمایہ کاری کی دعوت دیتے ہیں لیکن وہ لوگ جن کے پاس سرمایہ بھی ہے اور جو پاکستان میں سرمایہ کاری بھی کرنا چاہتے ہیں ہم انہیں لٹ لٹ کر اتار دیتے ہم انہیں دعوت اور ماحول فراہم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں ہم نے پچھلے پانچ برسوں میں بے شمار سرمایہ کاری اداروں کی بنیاد کاری کی ہم نے یہ ادارے کوزیوں کے سول غیر ملکیوں کو بیچ دیئے ہم اگر یہ پوتس اور ویز پاکستانیوں کو دے دیتے تو ذرا سوچئے ان لوگوں کا کس قدر اعتماد بحال ہوتا۔ یہ لوگ اس ملک پر کتنا اعتبار کرتے اور ان کا یہ اعتبار آگے چل کر باہر سے کتنا سرمایہ لاتا۔

صدر پرویز شرف نے 17 اپریل 2006ء کو کراچی میں "پاک امریکن بزنس کونسل" کی ایک کانفرنس سے خطاب کیا تھا اس خطاب میں بھی صدر نے امریکہ میں آباد پاکستانیوں کو پاکستان میں سرمایہ کاری کی دعوت دی صدر نے فرمایا ہم آپ لوگوں کو سرمایہ کاری کے لئے سازگار ماحول اور تحفظ فراہم کریں گے ہو سکتا ہے صدر اس معاملے میں ٹیک نیت ہوں لیکن جب ہم اپنے نظام کا تجربہ کرتے ہیں تو بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے پاکستان دنیا میں سرمایہ کاری کے حوالے سے ایک انتہائی ناموافق اور غیر محفوظ ملک ہے اور سرمایہ کار صرف لاروں پلوں پر کسی ملک میں سرمایہ کاری نہیں کیا کرتے انہیں مضبوط اور عملی یقین دہانیاں چاہیے ہوتی ہیں یہ لوگ تو اس قدر سمجھدار ہوتے ہیں کہ یہ اس بینک میں اکاؤنٹ نہیں کھولتے جس کے گارڈز کا تھوڑا سا جھٹ سے کم

• 347 - O...3 زیر پوائنٹ

ہو اور یہ اس گاڑی میں نہیں بیٹھتے جس کے ٹائروں میں ہوا 28 کعب فٹ سے کم ہو لہذا ہمیں ان کا اعتماد بحال کرنے کے لئے اور ریزر پاکستانوں کا سہارا لینا پڑے گا، ہمیں ان لوگوں کو ملک کی ترقی کیلئے پاکستان آنے کی دعوت دینا پڑے گی جو ہمارے اپنے لوگ ہیں جو اپنے ملک واپس آنا چاہتے ہیں پنجابی کی کہادت ہے جو ماں اپنے بچے سے چار نہیں کرتی وہ دوسروں کے بچوں سے کیا محبت کرے گی ہمارے اپنے بچے ہماری محبت کے زیادہ حقدار ہیں چنانچہ ہمیں حق دینے کا سلسلہ اپنے بچوں سے شروع کرنا چاہیے، ہمیں پاکستان کی ترقی کا عمل پاکستانوں سے شروع کرنا چاہیے۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

پہلا پڑاؤ

میرے ایک دوست ایسٹرنڈیم میں رہتے ہیں وہ آج سے 20 برس پہلے ہالینڈ

گئے تھے شہریت لی اور پوری بچوں کو بھی وہاں بلا لیا ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا وہیں پیدا ہوئے تو ہیں

پڑھے اور وہیں جوان ہوئے میرے یہ دوست سال میں ایک مہینے کیلئے پاکستان آتے ہیں ان

کے بچے بھی عموماً ان کے ساتھ ہوتے ہیں وہ پچھلے مہینے تشریف لائے تو میری ان سے طویل مپ

شب ہوئی ان کا کہنا تھا مجھے پاکستان چھوڑے بیس سال ہو چکے ہیں اس عرصے میں کوئی دن ایسا

نہیں گزرا جب میں نے پاکستان کو یاد نہ کیا ہو میں نے ان سے عرض کیا "آپ پھر پاکستان

کیوں نہیں آ جاتے" انہوں نے میرے سوال کا بڑا عجیب جواب دیا "انہوں نے فرمایا "میں نے کئی

بار سوچا لیکن پھر یہ سوچ کر رہ جاتا ہوں میری دو جوان بچیاں ہیں میں پاکستان میں ان کی حفاظت

کیسے کروں گا" میرے لئے ان کی یہ منطق انوکھی تھی کیونکہ میں نے تو یہ دیکھا تھا ہمارے اکثر

تارکین وطن اپنے بچوں ہاتھوں میں بچپن کیلئے کروڑوں ڈالر کا کاروبار چھوڑ کر امریکہ اور یورپ سے

پاکستان آ جاتے ہیں لیکن وہ ایک مختلف کہانی مختلف دہلیز پیش کر رہے تھے۔

میں نے وضاحت کی درخواست کی میرے دوست بولے "ہالینڈ میں میری بچیاں

آزادانہ پھرتی ہیں وہ رات کو دو دو بچے ٹرینوں اور بسوں پر سفر کرتی ہیں سنسان گلیوں اور ویران

سڑکوں پر چہل قدمی کرتی ہوئی گھرواپس آتی ہیں مگر ہمیں کوئی خوف نہیں ہوتا ہم جانتے ہیں اس

ملک میں کسی میں اتنی جرأت نہیں وہ ان کی طرف تیزی آگے سے دیکھے اس غیر اسلامی ملک میں ہماری بچیوں کی عزت آبرو اور اناسب کچھ محفوظ ہے جبکہ اس اسلامی ملک میں دن کی روشنی میں بھی اگر کسی بچی نے ہمسائے کے گھر جانا ہو تو اسے گلی میں قدم رکھنے سے پہلے اپنے بھائی والد یا خاندان کی ضرورت پڑتی ہے ہم چار بھائی ہیں ہم چاروں لاہور کی ایک تہ گلی میں رہتے ہیں ہمیں جب پاکستان آتا ہوں اور میری بچیوں نے اپنے بچا کے گھر جانا ہو تو میں انہیں چھوڑنے کیلئے ساتھ جاتا ہوں میری بچیاں مجھ سے کہتی ہیں پاپا ہم ایسٹرنڈیم میں روزانہ رات کو دو دو بجے آتی ہیں آپ وہاں پریشان نہیں ہوتے لیکن اپنے ملک میں آپ ہمیں اکیلے دو سو گز دور نہیں جانے دیتے میں انہیں کیا بتاؤں ان کے اپنے وطن پاکستان میں ان کی عزت کتنی غیر محفوظ ہے ان کی بات سن کر مجھے شندے پسینے آگئے میں نے سخت منانے کیلئے کہا "پاکستان کی صورت حال اتنی بھی خراب نہیں یہاں....." انہوں نے میری بات کاٹ دی اور بڑے یقین سے بولے "بالیئڈ میں آبرو ریزی کی آخری واردات 18 سال پہلے ہوئی تھی اس کے بعد اس قسم کی کوئی واردات نہیں ہوئی لیکن تم اپنے آج کے اختیارات اٹھا کر دیکھ لو تمہیں اس میں آبروریزی چھینٹ جانا اور جنسی طور پر ہراساں کرنے کے بیسیوں واقعات ملیں گے تم کل کی خبر پڑھ لو کل لیاقت حمزہ ایم میں موسیقی کا پروگرام ہو رہا تھا وہاں نوجوان لڑکوں نے لڑکیوں کا کیا مشر کیا تم مجھے اس معاشرے میں واہس آنے کی دعوت دے رہے ہو جس میں برقعے والیاں محفوظ ہیں اور نہ ہی جینز والیاں اور جس میں بچیاں اکیلی سکول نہیں جا سکتیں تم میرے ایک دوست کی مثال لو اس نے اپنی بیٹی کو کالج سے اٹھایا میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا میرے بیٹے نے جاب کر لی ہے اور میں بیمار رہنے لگا ہوں لہذا ہمارے لئے بچی کو کالج چھوڑنا ممکن نہیں رہا میں نے کہا تم اسے وین یا ٹیکسی لگوا دیتے اس نے بتایا بچی پہلے بھی وین پر ہی کالج جاتی تھی لیکن اسے چھوڑنے اور لینے کیلئے میرا بیٹا ساتھ جانا تھا اب ظاہر ہے یہ ممکن نہیں ہم بچی کو اکیلے بھیجے گا رسک نہیں لے سکتے وقت بہت خراب ہے چنانچہ تم جواب دو جس ملک میں یہ صورت حال ہو تم مجھے وہاں آنے کی دعوت دے رہے ہو میرا دوست خاموش ہو گیا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

پاکستان میں ایک طرف یہ صورت حال ہے جبکہ دوسری طرف ہم روشن خیالی اور اعتماد پسندی کا راگ الاپ رہے ہیں حکومت میراتھن کے جہانے بچیوں کو سڑکوں پر لانے کی کوشش کر رہی ہے اور مذہبی رہنماؤں سے کے زور میں انہیں واہس گھروں میں چھکیل رہے ہیں پسلافریق

دوسرے فریق کو اعتدال پسندی اور روشن خیالی کا مخالف قرار دے رہا ہے اور دوسرا فریق پہلے فریق کو فاشی، عربیائی اور بد اخلاقی کا مجرم گردان رہا ہے جبکہ اصل مسئلے کی طرف پہلا فریق توجہ دے رہا ہے اور نہ ہی دوسرا سوچنے کی بات ہے جس معاشرے میں عورت کی آبرو غیر محفوظ ہو گیا وہ معاشرہ اسلامی ہو سکتا ہے میرا خیال ہے اسلامی تو رہا ایک طرف وہ معاشرہ معاشرہ نہیں کہلا سکتا جس ملک میں مارکیٹ، بازار، سکول اور کالج میں جس ملک میں بسوں، اینوں اور رکشوں میں بوہٹیوں کے آچل بھینچے جاتے ہوں، جس ملک میں چھٹی کے وقت زنانہ کالجوں کے سامنے اوباش نوجوانوں کا تھمکھا لگ جاتا ہو اور جس معاشرے میں ہر نگاہ دعوتِ دینی اور ہر نظر گھورتی پائی جاتی ہو وہ معاشرہ اسلامی ہو سکتا ہے اور نہ ہی اعتدال پسند، جس معاشرے میں آج بھی کاروکاری، دنی اور عورتوں کی خرید و فروخت جاری ہو، جس میں عتقاری کو انصاف کیلئے وزیر اعظم کے دروازے پر دستک دینی پڑے اور جس معاشرے کی 95 فیصد گالیوں میں ماؤں بہنوں کا ذکر آتا ہو، اس معاشرے کو مہذب معاشرہ نہیں کہہ سکتے، تم یقین کر دو روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی جگہوں میں تہذیب اور سائنس پہلا پڑاؤ ہوتی ہے لیکن ہم لوگ اس پڑاؤ پر رے بغیر یہ رنگ بیچنا چاہتے ہیں ہم لوگ اپنی گلیوں اپنے بازاروں میں تہذیب اور قانون نافذ کئے بغیر اپنی بچیوں کو گھروں سے باہر لانا چاہتے ہیں ہم ایک ہار پھر کیلئے کے درختوں پر ٹھل سکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میرے اسی دوست نے مجھ سے پوچھا تھا "تم میرا تھن ریس کے حامی ہو یا مخالف؟" میں نے جواب دیا "میں حامی ہوں میرا خیال ہے یہ چیزیں جس دم کے شکار اس معاشرے کا سینہ کھول دیں گی لوگوں میں وسعت اور اعتدال آئے گا" میرے دوست نے ہنس کر پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے پاکستان کی روشن خیالی اور اعتدال پسند قوتیں اپنی اس کوشش میں مخلص ہیں؟" میں نے جواب دیا "میرا خیال ہے یہ لوگ مخلص ہیں" میرے دوست نے تہمت لگایا "اگر یہ لوگ مخلص ہیں تو پھر ان لوگوں کی اپنی بچیاں میرا تھن ریس میں کیوں نہیں آتیں؟ تم تما ڈو وہ پولیس جو ڈنڈے کے ڈریئے ریس میں حائل رکاوٹیں دور کر رہی ہے وہ انتظامیہ، وہ سیاستدان جو روشن خیالی کی حمایت میں بیان دے رہے ہیں ان کی اپنی بچیاں گھروں میں کیوں بیٹھی ہیں؟" میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔



کانڈ کا گلاس

امریکہ میں کانڈ کا پہلا گلاس 1918ء میں بنا تھا۔ گلاس بنانے والی کمپنی کا کہنا تھا لوگوں کی مصروفیت میں اضافہ ہو گیا ہے لہذا ہمیں اب نئے حالات کو سامنے رکھ کر برتن بنانے چاہئیں، کمپنی کا کہنا تھا چند برسوں میں وحیات اور شیشے کے گلاس ناپید ہو جائیں گے اور ان کی جگہ کانڈ کے یہ گلاس لے لیں گے، لوگوں نے شروع شروع میں اس تصور کو پسند نہ کیا لیکن 1925ء تک کانڈ کے یہ گلاس ایک ڈسپوزیبل گلاس میں تبدیل ہو گئے، گلاس کے بعد کانڈ کی پلینس آئیں، ان پلینوں کیلئے پلاسٹک کے پیچھے چھریاں اور کانٹے بنے اور پھر اس ڈسپوزیبل کراکری کیلئے "ٹیک اے ون" ریستوران بن گئے، کھانے کی جگہ برگر، سینڈویچ اور کولڈ ڈرنک کھجڑا آیا، بریک فاسٹ باکس، لٹچ باکس اور ڈائنا باکس بنے، آئس کریم کے کپ اور پانی کی ڈسپوزیبل بوتلیں، فروٹ کا کٹیل، فٹس اینڈ چیمپس، سلاڈ پیک اور کافی کے ڈسپوزیبل گلاس بنے، چھس کے لفافے، ٹمکو، بسکٹ اور پیک پیس کے پیکٹ بنے، مٹھائیوں اور سویت ڈشز کے پیالے بنے اور شروبات کی ڈسپوزیبل بوتلیں بنیں، یہاں تک کہ امریکہ کا پورا پورا درمی خانہ فٹ پاتھ اور سڑک پر آ گیا، لوگ دفتر جاتے ہوئے راستے میں رکتے، کسی سنور سے ناشتے کے چند پیکٹ خریدتے اور بس ٹیکسی یا ٹرین میں بیٹھے بیٹھے ناشتہ شروع کر لیتے، لٹچ کے وقت لوگ دفنوں سے چلتے، قریب ترین سنور سے چند پیکٹ اٹھاتے اور کھڑے کھڑے لٹچ کر لیتے، اسی طرح ڈرنک کے وقت "ڈائنا باکس" لیتے

اور بس سٹاپ پر بس کا انتظار کرتے کرتے اس ضرورت سے بھی فارغ ہو جاتے۔

کھانا انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ تھا ایک عام شخص روزانہ تین سے چار کھانے کھانے پر صرف کرتا ہے اگر آپ اس میں بھری کی خریداری، سفائی، کھائی اور پکائی بھی شامل کر لیں تو یہ دورانیہ مزید بڑھ جاتا ہے جب امریکہ نے کھانے کے عمل کو ڈسپوزیبل شکل دی تو امریکی معاشرے کی زندگی آسان ہو گئی لوگوں کیلئے کھانے کا حصول اور کھانا کھانا مشکل نہ رہا بس آپ کی جیب میں ڈال رہونے چاہئیں اور آپ کسی بھی جگہ رکھیں اور ہر ایک فاسٹ فوڈ اور ڈز کے مسئلے سے فارغ ہو جائیں کھانے کے بعد یہ ڈسپوزیبل کچرا آگے بڑھا اب شیو امریکہ اب اس کا دور اتار گت تھا مردوں کیلئے شیو جگ کا ایسا سامان تیار ہوا جسے وہ تھیلے میں رکھتے بس اور ٹرین میں بیٹھے اپنے منہ پر گیلہا تھو بھرتے بیڑی سیلوں کی ایک چھوٹی سی مشین منہ پر رکھتے اور ان کا چہرہ تروتازہ ہو جاتا اسی طرح عورتیں بستر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ جاتیں اپنا ہینڈ بیگ کھولتیں 'سرخنی پاؤڈر کی شیشیاں لگاتیں اور چند سیکنڈ میں تیار ہو جاتیں یہ کچرا آگے بڑھا اور بال پوائنٹ نے کھانے کی جگہ کے لیے نئی سلیٹ کی جگہ لگائی اور کاپی کی جگہ چھلکے والے کاغذ آگے کھڑوں کی ملکیت بن گیا تصور بدل گیا 'فرشڈ کھرنے اور کھنے گئے' آپ صرف اپنا بیگ اٹھائیں اور نئے گھر میں داخل ہو جائیں آپ کی ضرورت کی تمام اشیاء وہاں موجود ہوں گی آپ جب تک اس میں رہنا چاہیں رہیں جب دل بھر جائے تو چاہی مالک مکان کے حوالے کریں اور نئے گھر میں منتقل ہو جائیں 'کرایوں کا تصور مہینے سے ہفتے پر آ گیا لوگ اب پہلی تاریخ کی بجائے ہفتے کے ہفتے کرایہ دینے اور لینے گئے نوکریاں بھی ویک نو ویک ہو گئیں تمام کمپنیاں اپنے ملازمین کو جمعہ کے دن نکوا ہیں دینے لگیں ملازمت گھنٹوں میں تصور ہونے لگی لوگ ہفتوں 'مہینوں اور برسوں کی بجائے پینتیس اور چالیس گھنٹوں کے ملازم ہو گئے وہ جتنی دیر کام پر آنا چاہیں آئیں اور ان گھنٹوں کی تنخواہ لے لیں اس دوران اگر انہیں اچھی نوکری مل جائے تو وہ چپ چاپ نئی جگہ شفٹ ہو جائیں یہ کچرا آگے بڑھا اور میاں بیوی کا رشتہ بھی ڈسپوزیبل ہو گیا آپ کو چلنے پھرتے کوئی پسند آ گیا تو وہ آپ کا خاوند بن گیا اس کے ساتھ رہیں مگر کھانا اپنا کھائیں نوکری اپنی کریں اگر رول کرے تو ایک آدھ بچہ بھی پیدا کر لیں اور کسی دن بوٹی چلنے پھرتے دوسرے فلیٹ میں منتقل ہو جائیں اس کچر میں بیوی بیوی نہ رہی وہ پانچ اور گرل فرینڈ بن گئی جتنے دن دوستی کی حرارت رہی تعلق قائم رہا حرارت ختم ہوئی تو کاغذ کے کپ کی طرح ڈس بین میں پھینک دی گئی اور اس کی جگہ نیا کھانا نیا کپ آ گیا۔

Kesari.com

امریکہ اس وقت سر سے پاؤں تک ڈسپوزیبل کلچر میں رنگا ہوا ہے اس کے پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بال تک ہر چیز ڈسپوزیبل ہر چیز "یوز اینڈ تھرو اودے" کے اصول پر کاربند ہے وفاداری استحکام اور طویل عمر کا ساتھ یہ وہ لفظ ہیں یہ وہ جذبے ہیں جن سے امریکی پچھلے چالیس سال سے نا آشنا ہیں امریکہ میں دانشگری اور وفاداری ذہنی عارضہ اور بیماری بن چکا ہے وہاں اگر کوئی شخص دو چار سال کسی کے ساتھ گزار لے تو لوگ اسے دماغی ہسپتال لے جاتے ہیں ایک سنڈی کے مطابق امریکی شہریوں کی زندگی کی 82 فیصد ضروریات ڈسپوزیبل ہو چکی ہیں آپ کمپیوٹر استعمال کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنا کمپیوٹر خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں آپ کسی سیٹ کینے میں داخل ہوں ایک دو ڈالر دیں اور کمپیوٹر استعمال کر لیں ٹیلی فون کیلئے ٹیلی کارڈ لیں کسی بوتھ میں کھڑے ہو کر نمبر ڈائل کریں بات کریں اور باہر آ جائیں پبلک ٹوائلٹ میں سکے ڈالیں فطری ضروریات پوری کریں اور باہر آ جائیں آپ کی جیب میں پیسے نہیں ہیں تو کریڈٹ کارڈ نکالیں اور جو چیز پسند آ جائے وہ خریدیں اور آگے نکل جائیں گرمیوں کے کپڑے سردیوں کے شروع میں کچرا گھر میں پھینک دیں اور سردیوں کے کپڑے گرمیوں کے شروع میں کباڑے کو وے دیں اور ایک اینڈ پراسٹیجی بدل لیں ڈون اگنسٹ رہیں اور ایک دوسرے کا نام تک جانے بغیر واپس آ جائیں یہ ہے امریکی کلچر یہ کلچر اس وقت صرف امریکہ تک محدود نہیں بلکہ یہ یورپ، مشرق بعید اور اب کسی حد تک ایشیا تک بھی پہنچ چکا ہے پوری دنیا اس وقت ڈسپوزیبل کلچر کا حصہ بن چکی ہے لیکن یہ حقیقت ہے اس کلچر کے بانی امریکی ہیں لہذا اس وقت امریکہ اس کلچر کا سب سے بڑا مرکز ہے یہ کلچر صرف امریکی زندگی تک محدود نہیں بلکہ یہ اب ان کی سوچ ان کے ذہن اور ان کی پالیسی کا حصہ بن چکا ہے اس کلچر کا رنگ اب ان کی سیاست ان کی سفارت اور ان کے انٹرنیشنل ریلیشنز میں بھی آ گیا ہے یہ لوگ اب پوری دنیا کو ڈسپوزیبل پوائنٹ آف ویو سے دیکھتے ہیں ان کی نظروں میں دوستیاں سفارتی تعلقات سٹریٹجک پارٹنرشپ اور کانغڈ کے گلاس میں کوئی فرق نہیں یہ کہتے ہیں "یوز تھرو اینڈ فارگٹ" (استعمال کر ڈھونگھو اور بھول جاؤ) ان لوگوں کی پوری سفارتی پالیسی ڈسپوزیبل کلچر پر استوار ہے یہ لوگ مارکوس کو اپنا دوست کہتے ہیں پھر اسی مارکوس کو ہوائی میں مرنے کیلئے چھوڑ دیتے ہیں یہ شاہ ایران کو اپنا محبوب بناتے ہیں لیکن کام نکلنے کے بعد اسے واشنگٹن تک آنے کی اجازت نہیں دیتے مصدام حسین ان کا بھائی ہوتا ہے لیکن پھر اسی مصدام حسین پر حملہ کرتے ہیں اور اسے گرفتار کر کے اسی کو پھانسی دے دیتے ہیں 1980ء سے 1990ء تک

پاکستان ان کا دوست تھا 1990ء سے 2000 تک یہی پاکستان ان کا دشمن ہو گیا اور 2001ء سے 2007 تک پاکستان ایک بار پھر ان کا دوست بن گیا ہم سب امریکہ کے اس طرز عمل پر اسے گالی دیتے ہیں ہم اس کے پرچم جلاتے ہیں اس کے خلاف سرکوں اور گلیوں میں بائے بائے کے نعروں لگاتے ہیں لیکن ہم کبھی اس کی اس "بے وفائی" کی وجہ تلاش نہیں کرتے ہم ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں اس میں امریکہ کا کوئی قصور نہیں ان کے کلچر اور ہمارے کلچر میں زمین آسمان کا فرق ہے ہم شہرگ تک ملکیت کے احساس اور وفاداری کے جذبات میں ڈوبے ہوئے لوگ ہیں جبکہ امریکی لوگ اپنی ضرورت کو اولیت دیتے ہیں یہ یوزر تھرو اینڈ فارگٹ کے قائل ہیں لہذا جب ہم اپنے مقام سے امریکہ کو دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں برا لگتا ہے لیکن اگر ہم امریکہ کی نظر سے اپنے آپ کو دیکھیں تو مجھے یقین ہے ہمیں اپنا آپ برا لگے گا آپ خود سوچئے کیا کوئی شخص کانڈ کے گھاس سے محبت کر سکتا ہے کوئی شخص کانڈ کے گھاس کو کتنی دیر اٹھائے اٹھائے پھرے گا امریکی ہاتھوں اور کانڈ کے گھاس میں اتنی دیر اٹچ منہ رہ سکتی ہے جتنی دیر کوئی ڈسٹ بین نہیں آتی یہ جون کا مہینہ اور 2007ء سے اور اس وقت پوری دنیا چاہتی ہے کئی کے دوسرے موزوں ایک ڈسٹ بین موجود ہے کانڈ کا گھاس لٹے میں چورا امریکی کے ہاتھ میں ہے اور وہ تیزی سے ڈسٹ بین کی طرف بڑھ رہا ہے اس حقیقت سے پوری دنیا واقف ہے اگر کوئی نادانف ہے تو وہ کانڈ کا گھاس ہے پوری دنیا ہمارے انجام سے واقف ہے لیکن ہم کیوں ترکی طرح آنکھ بند کر کے بھومدہ ہیں۔



حرص کی مٹی

دیو جانسن کلبی یونان کا ایک عجیب کردار تھا، تاریخ اسے نسل انسانی کا سب سے بڑا
 جنرل اور سب سے بڑا طاقت پسند دانشور کہتی ہے وہ آٹھویں سے نہدھارکین اول اولیٰ سے روشناس
 شخص تھا اس کے پاس ایک کتا تھا یہ کتا اس کا ساتھی بھی تھا اور راہبر اور ہنسا بھی اس کتے کی نسبت
 سے لوگ اسے "کلبی" کہتے تھے دیو جانسن کلبی ارسطو اور سکندر اعظم کے دور میں تھا اور اس کے
 بارے میں عجیب اور دلچسپ واقعات مشہور تھے مثلاً کہا جاتا ہے وہ ایک دن دو پہر کے وقت ہاتھ
 میں چراغ لے کر ایٹنز کی گلیوں میں گھوم رہا تھا کسی نے اس سے پوچھا "دیو جانسن تم چراغ لے کر
 کیا تلاش کر رہے ہو؟" اس نے مسکرا کر جواب دیا "میں آدمیوں کے بھوم میں انسان تلاش کر رہا
 ہوں" اس زمانے میں ارسطو نے انسان کے بارے میں اپنا مشہور فلسفہ دیا تھا "ارسطو کا کہنا تھا"
 انسان ایک ایسا جانور ہے جو دو ناکوں پر چلتا ہے اور اس کی قامت سیدھی ہوتی ہے" یہ فلسفیوں
 'عالموں اور علم پرستوں کا دور تھا چنانچہ ارسطو کا یہ فلسفہ گلی گلی پھیلنے لگا، جہاں دو لوگ جمع
 ہو جاتے وہ آپس میں "ارسطو کے انسان" کے بارے میں گفتگو شروع کر دیتے تھے ایک دن ارسطو
 اپنے شاگردوں میں گھرا بیٹھا تھا دیو جانسن کلبی وہاں آیا اس نے شاگردوں کو دائرہ وسیع کرنے کا
 حکم دیا ان کے درمیان بیٹھا بغل سے ایک سرخ نکالا مرغ کو زمین پر کھڑا کیا، ایک ہاتھ سے مرغ
 کی ناک میں زمین کے ساتھ لگاؤں دوسرے ہاتھ سے مرغ کی چونچ پکڑی اور چونچ کو کھینچ کر آسمان

کی طرف اٹھا دیا، مرغ سیدھا کھڑا ہو گیا اس کے بعد دیو جانسن کلیسی نے ارسطو کے شاگردوں کی طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر بولا "یہ ہے تمہارے استاد کا انسان" ارسطو کے منہ سے بھی قہقہہ نکل گیا، دیو جانسن کلیسی کی درویشی اور سادگی پر سے یونان میں مشہور تھی وہ مونا شہر سے باہر جہا تھا، اگر اسے کھانے کیلئے کچھ مل جاتا تھا تو وہ کھا لیتا تھا بصورت دیگر فاتے کرتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا، وہ کسی حد تک توحید پرست بھی تھا اس کا کہنا تھا اس کائنات کی تمام چیزیں دیوتاؤں نے بنائی ہیں لیکن دیوتاؤں کو کس نے بنایا ہے! وہ کہتا تھا جس طاقت نے دیوتا بنائے ہیں وہی طاقت دراصل اس کائنات کا مالک ہے اور میں اس مالک کو ماننے والا ہوں اس کا کہنا تھا دنیا کا سامان و اسباب انسان کو اصل خوشی سے محروم کر دیتا ہے اگر انسان زندگی میں حقیقی خوشی پاتا چاہتا ہے تو اسے دنیا کے ساز و سامان سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیے اس کا کہنا تھا ہمارا گھریا ہمارے بیوی بچے، شہر، لوگ، عزیز رشتے دار، روایات، قوانین اور ضابطے ہماری آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں انسان اس وقت تک پوری طرح آزاد نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا داری سے رہائی نہیں پالیتا اور اس کا کہنا تھا انسان کی ضروریات انتہائی مختصر ہیں لیکن انسان ضروریات کے حوالے سے کوہنٹا پیلا لیتا ہے کہ بڑی زندگی کے سفر کے باوجود وہ اوزر و عظیم نہیں ہوتا اس کا کہنا تھا بہادر شخص وہ ہے جو اپنے اندر کے خوف کو شکست دے۔

دیو جانسن کلیسی زندگی کے آخری حصے میں شہر سے نکل کر جنگل میں آباد ہو گیا تھا کسی نے اس سے پوچھا "تمہیں جنگلی جانوروں سے ڈر نہیں لگتا" اس نے مسکرا کر جواب دیا "انسان کا دشمن انسان ہے جانور نہیں" ایک اور جگہ لکھا ہے "انسان کو جانوروں سے نہیں انسان سے خطرہ ہے" وہ کہا کرتا تھا "انسان سے بچو انسان کی زندگی ہزاروں نعوں پر بھاری ہے" بڑا مشہور واقعہ ہے سکندر اعظم اس کی تلاش میں شہر سے باہر نکلا، دیو جانسن کلیسی ایک بیابان میں بیٹھا دھوپ تاپ رہا تھا سکندر حاضر ہوا اور نہایت عاجزی انکساری سے عرض کیا "یا استاد میرا نام سکندر ہے اور میں آپ کی خدمت کرتا چاہتا ہوں" دیو جانسن نے مسکرا کر جواب دیا "خوابوں کا غلام بادشاہ ایک آزاد شخص کی کیا خدمت کر سکتا ہے" سکندر اعظم نے اصرار جاری رکھا جب وہ تنگ آ گیا تو اس نے قہقہہ لگا دیا اور سکندر سے کہا "بادشاہ سلامت آپ میری دھوپ روک کر کھڑے ہیں مہربانی فرما کر میرے آگے سے ہٹ جائیں مجھے سورج کی مہربانیوں سے لطف اندوز ہونے دیں" دیو جانسن کلیسی آخری عمر میں توکل اور قناعت کی انتہائی میزجی پر چڑھ گیا اس کے پاس مٹی کا ایک پیالہ ہوتا تھا وہ اس سے پانی بھی پیتا تھا اور اس پیالے سے پلیٹ کا کام بھی لیتا تھا ایک دن وہ پانی پینے کیلئے نڈی پر گیا

اس کا ایک شاگرد بھی ساتھ تھا شارد نے ایک جانور دیکھا جانور ٹھٹھکتا ہوا جنگل سے نکلا آدمی کے کنارے پہنچا پانی پر جھکا پانی پیا اور ٹھٹھکتا ہوا جنگل میں واپس چلا گیا شارد نے استاد کو جانور کی حرکات و سکنات بتائیں تو دیو جاسن نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا "تم پرتف ہو ایک جانور بھی تو کل میں تم سے کتنا آگے ہے تم ابھی تک پیالے کی محتاجی سے آزاد نہیں ہو سکتے" اس نے اسی وقت پیالہ پتھر پر ملا لود کر جیسا اٹھا کر مندی میں پھینک دیں اور اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پیالے کی محتاجی سے بھی آزاد ہو گیا۔

دیو جاسن کبھی سارا دن جنگلوں اور ویرانوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور شام کو واپس اپنے گھکانے پر آ جاتا تھا یہ گھکانہ کچی مٹی کا ایک چھوٹا سا ٹب تھا وہ ٹب میں لیٹتا ناگئیں باہر لٹکاتا اور سوچتا سوچتا سوچتا جا تا یہ ٹب اس کی کل کا نکت تھا ایک دن سردیوں کی سنہری دوپہر تھی دیو جاسن کبھی ٹب میں لیٹتا تھا اتنے تنہا ایک ہر کارہ اس کے پاس آیا اور اسے آ کر خوشخبری سنائی "مبارک ہو سکندر اعظم پوری دنیا فتح کر کے واپس اپنے وطن آ رہا ہے" دیو جاسن کبھی نے قہقہہ لگایا اور اس کے بعد وہ تاریخی فقرہ کہا جو آنے والے زمانوں میں دیو جاسن کی پہچان بن گیا جس نے پانچ ہزار

ہر کسی بعد بھی دیو جاسن کبھی کو لادہ رکھا اس نے کہا "ان انسان قناعت پسند نہ ہو تو آدمی کے اس دنیا میں بھی خوش رہ سکتا ہے لیکن اگر وہ حرص ہو جائے تو پوری کائنات بھی اس کیلئے چھوٹی ہے" دیو جاسن کبھی کا یہ فقرہ مجھے کل سے یاد آ رہا ہے کل میرے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا تھا جب انسان کیلئے ایک گاڑی پانچ سے آٹھ مرلے کا ایک مکان پچاس ہزار روپے ماہانہ اور ایک ٹیلڈون کافی ہوتا ہے تو وہ اس کے باوجود کرپشن کیوں کرتا ہے اس نے پوچھا ہمارے حکمران پچاس پچاس گاڑیاں چار چار جہاز سو سو ایکڑ کے محلات اور چالیس چالیس کروڑ کے سیکرٹ فنڈ کیوں چاہتے ہیں ان کے دل کیوں نہیں بھرتے" میں نے اسے دیو جاسن کبھی کا یہ فقرہ سنایا اور اس کے بعد عرض کیا "انسان اگر مطمئن ہو نہ سیکھ لے تو وہ کچی مٹی کے ٹب میں بھی خوش گوار زندگی گزار سکتا ہے لیکن اگر اس کی آنکھوں میں حرص آ جائے تو ساری دنیا کی گاڑیاں ساری دنیا کے جہاز ساری دنیا کے محلات ساری دنیا کا سونا چاندی اور لادہ ساری دنیا کا اقتدار مل کر بھی اس کی جھوک نہیں مٹا سکتا" وہ اپنی پوری زندگی مزید سے مزید اور زیادہ سے زیادہ کی تلاش میں گزار دیتا ہے" میں نے اس سے عرض کیا "بد قسمتی سے ہمارے حکمرانوں ہماری رونگ کلاس کا تعلق لوگوں کے اس گروہ سے ہے جن کی آنکھیں اور جن کے ہمدے حرص کی مٹی سے بنے ہیں لہذا یہ لوگ کبھی میرے نہیں ہوں گے یہ لوگ اپنے کفن تک پر چینیں تو انہیں اور یہ دوزخ میں بھی نہ لے سکتے ہیں"

آدھا گلاس

شیخ صاحب میرے ایک بزرگ دوست چنان کپڑے کی صنعت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ شیخ صاحب نے کئی کئی گلاسوں کا تجربہ کیا ہے۔ پر کئی کئی گلاسوں کے تجربے کے بعد انہوں نے ایک نیا اور ان کا کاروبار چل نکاڑا۔ آج کل ارب پتی ہیں ان کی کئی ٹیکنیکل ملیں اور شورومز ہیں آج سے دس برس پہلے انہیں بلڈ پریشر ہوا پھر شوگر ہوئی پھر دل کا درد شروع ہوا پھر نیند کم ہوئی اور پھر وہ شدید قسم کے چڑچڑ سے پن کا شکار ہو گئے ان کے حراج کی ترشی نے اثر دکھایا اور وہ تنہا ہوتے چلا گئے جب وہ دفتر جاتے تو تمام لوگ مختلف جیلے بہانوں سے آگے پیچھے ہو جاتے، گھر میں بھی سب لوگ ان سے دور دور رہتے ان کے چوکیدار گارڈز اور ڈرائیورز تک تیزی سے بدلنے لگے جو بھی ڈرائیور ان کے ساتھ ایک دن نوکری کر لیتا تھا وہ شام کو انہیں سلام کر کے رخصت ہو جاتا تھا اس تنہائی اور چڑچڑ سے پن نے اثر دکھایا اور وہ بری طرح اعصابی مریض بن گئے ان کے کندھوں، گردن اور کمر میں مسلسل درد رہنے لگا اور اس قدر شدت اختیار کر لیتا تھا کہ وہ اپنی ناگوں پر رسیاں لپیٹنے پر مجبور ہو جاتے تھے انہوں نے دنیا جہان کے ڈاکٹروں سے مشورے کئے دنیا کی قیمتی ترین دوائیں کھائیں، حکیموں اور شیا سیوں تک سے علاج کرایا لیکن انہیں افادہ نہ ہوا وہ اکثر کہا کرتے تھے بس میرا آخری وقت آ گیا ہے مجھے مرنے کا فسوس نہیں اگر فسوس ہے تو یہ کہ میرے جنازے میں کوئی شخص شامل نہیں ہوگا میں انہیں تسلی دیتا تھا لیکن وہ میری تسلی سے

مزید چڑھتے تھے میں خود ان کی حالت سے مایوس ہو گیا تھا مگر پھر ایک روز عجیب معجزہ ہوا شیخ صاحب ٹھیک ہونا شروع ہو گئے ان کا چڑچڑاپن ختم ہو گیا ان کا فصد دور ہو گیا وہ ایک دم بزدل شیخ اور بزم آرا ہو گئے وہ سارا سارا دن اٹھنے سناٹے اور قہقہے لگاتے رہتے اس کے نتیجے میں ساری دنیا ایک بار پھر ان کی کر دیکھ ہو گئی مگر میں دو "موسٹ ولفیڈ" شخص ہو گئے دفتر میں لوگ ان کا انتظار کرتے رہے اور ملازم ان کی خدمت کرنے ان کے ساتھ اپنی ڈیوٹی لگوانے کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے لگتے تیار یوں میں سب سے پہلے ان کی ٹینڈ کا مسئلہ حل ہوا وہ ساری رات بغیر کروت بدلے آرام سے سونے لگے پھر دل کا مسئلہ حل ہوا پھر ہلڈ پریش نازل ہوا اور آخر میں شوگر ٹھیک ہو گئی وہ جوانوں کی طرح بھاگتے دوڑنے لگے ایک طویل عرصے بعد میں نے انہیں دیکھا تو حیران رہ گیا وہ بچی نے نہیں جانتے تھے انہوں نے بڑی خوبصورت اسپورٹیز جینز پہن رکھی تھی ان کی شرٹ بھی آج کے فیشن کے مطابق تھی آنکھوں پر جوانوں والی ٹینک تھی اور پاؤں میں گوجی کے جوتے تھے ان کا چہرہ سرفنی مائل تھا اور ہاتھ کی گرفت میں گری تھی وہ بات بے بات قہقہے لگا رہے تھے۔

میں نے ان سے اس کا پکچر کی وجہ پوچھی تو میں حیرت میں رہ گیا ان کی بات بہت دلچسپ تھی انہوں نے بتایا ایک روز میں سنا تھا تو میرے پورے جسم میں درد ہوا ہاتھ میرا جلد پر پتھر زیادہ تھا شوگر بھی نازل نہیں تھی میں ڈانگ ٹیبل پر ناشتے کیلئے بیٹھا تو ایک ایک کر کے سارے ملازم وہاں سے بھاگ گئے یہاں تک کہ میری بیوی تک بھاگ نکا کر باہر چلی گئی میں بالکل اکیلا رہ گیا میں نے نوکروں کو آواز دی میری آواز پر کسی نے جواب نہ دیا اس وقت مجھے محسوس ہوا میں پوری دنیا میں اکیلا ہوں میں نے وہیں اس میز پر بیٹھے بیٹھے اپنے آپ سے سوال کیا میری اس تنہائی اس اکیلے پن کی وجہ کیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے مجھے محسوس ہوا اپنے تمام تر مسائل کا ذمہ دار میں خود ہوں میں ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا کبھی دنیا جہان کی رونقیں میری تلاش میں سرگرداں رہتی تھیں میں جہاں بیٹھتا تھا وہاں لوگوں کے میلے لگ جاتے تھے میں نے اپنے آپ سے پوچھا "پھر وہ شخص اکیلا کیسے ہو گیا وہ کون سی چیز ہے جس نے اس شخص کو تنہا کر دیا" میں نے سوچنا شروع کیا تو سوچتا ہی چلا گیا میں نے اپنے ذہن میں اپنی تمام پرانی عادتیں دہرائیں اور تمام کا جائزہ لیا کہ جو میں ماشی میں کیا کرتا تھا میں یاد کرتا گیا نہ ہر اتنا گیا یہاں تک کہ میرے دماغ میں ایک پنکٹی برائی اور مجھے یاد آ گیا میں آج سے دس چند برس قبل ایک ثابت موجی کا حامل شخص تھا میں ایک پرامید اور روشن خیال شخص تھا حالات کچھ بھی ہوتے مصلحت اور پریشانیوں خود تھی ہی خمیہ اور تھین بوتلیں میں

کبھی امید کا دامن نہ چھوڑتا میں بیٹھ اللہ تعالیٰ سے خیر اور بہتری کی توقع کرتا تھا لیکن پہ نہیں کیوں میں نے اپنی یہ عادت ترک کر دی میں اپنا یہ اصول بھلا بیٹھا لہذا میں آہستہ آہستہ بیمار ہوتا چلا گیا میں تنہا اور اداس ہوتا گیا میں نے اسی میز پر بیٹھے بیٹھے اپنی خامی پکڑ لی میں نے اپنی کوتاہی کا اندازہ لگایا اور جب میں وہاں سے اٹھا تو میں ایک تبدیل شدہ انسان تھا۔ میں نے پازیتو ٹھنک لگ یعنی مثبت سوچ کو اپنا شعار بنا لیا اب میں دنیا کے افسوسناک ترین واقعے سے بھی اچھی چیز دریافت کر لیتا ہوں مثلاً چھپے دنوں سونامی آیا اس سانحے میں دو سے تین لاکھ لوگ مارے گئے اس سانحے پر ساری دنیا ماتم کر رہی تھی جس کو دیکھو وہ غمناک اور پریشان تھا لیکن میرا رویہ اس کے بارے میں بالکل مختلف تھا میں نے دیکھا اس حادثے کے بعد عالمی برادری حرکت میں آئی ہے 45 ممالک نے سونامی سے متاثر ہونے والے ممالک میں امدادی نہیں بھجوا دی ہیں 112 ممالک میں اداکاروں، کھلاڑیوں، مسخانیوں اور دوسرے طبقات نے سونامی کے متاثرہ لوگوں کیلئے امدادی شوق کئے دنیا کے چوہرب لوگوں نے اپنے متاثرہ بھائیوں اور بہنوں کیلئے چند سے جمع کئے دنیا بھر کے لوگوں کے دلوں میں ان لوگوں کیلئے رحم اور محبت کے جذبات پیدا ہوئے میں نے دیکھا لوگ ہزاروں لاکھوں میل کا قاصد ملے کر کے انڈونیشیا، سری لنکا اور فلپائن گئے اور انہوں نے لمبے صاف کرنے کیلئے وہاں کے لوگوں کی مدد کی پوری دنیا نے ان لوگوں کو کھیل خیسے، کپڑے اور خوراک بھجوائی میں لوگوں کی یہ کوششیں دیکھ کر خوش ہوتا رہا لوگوں کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کے جو جذبات موجزن تھے میں انہیں محسوس کر کے خوش ہوتا رہا میں نے دیکھا نیشنوں کے عین درمیان ایک بچی گیند کے ساتھ کھیل رہی تھی لوگ نیشنوں کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہا رہے تھے لیکن میں اس بچی کی مصمصیت پر خوش ہوا رہا تھا میں موت کے درمیان موجود زندگی کے اس احساس سے لطف اندوز ہوا رہا تھا میرے لئے خوشی کی دوسری بات یہ تھی کہ دنیا بھر کے سائنس دانوں نے اس سانحے کے ردعمل میں ایسے آلات ایجاد کرنے کا فیصلہ کیا جو سونامی سے پہلے لوگوں کو اس کی اطلاع دے دینا میرے لئے خوشی کی تیسری بات یہ تھی کہ ہماری سرحدوں سے چند ہزار میل دور اتنا بڑا سانحہ پیش آیا لیکن اللہ نے ہم پر کرم فرمایا ہم لوگ ایسی تباہی سے بچ گئے یہ بڑی بات تھی میں اللہ کے اس کرم پر خوش تھا میں نے اس کا شکر ادا کیا میں یوں ہی تمام بڑی خیروں کو تمام چھوٹے بڑے حالاتوں اور سانحوں سے بہتری اور اچھائی دریافت کر لیتا ہوں اگر کسی جگہ کوئی عمارت گر جائے پائل نوٹ جائے تو میں یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں اس جگہ پہلے سے کئی سال پہلے خود مصورت اور شاندار عمارت بننے کی کوئی بندہ فوت ہو جائے تو میں یہ

سوچتا ہوں یہ کتنا خوش نصیب ہے یہ اب ان ہستیوں کو دیکھ سکتا ہے جن کو ہماری مادی نظریں نہیں دیکھ سکتیں! مجھے اگر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو میں سوچتا ہوں وہ رقم جو مجھے ملنی تھی وہ کسی دوسرے کی جیب میں چلی گئی ہو سکتا ہے وہ مجھ سے زیادہ مستحق ہو جس سال مندر ہو یا ہمارا منافع کم ہو جائے تو میں سوچتا ہوں اس سال لوگوں کو سستا کپڑا ملے گا ہمارے حصے کے منافع سے سینکڑوں ہزاروں لوگ فائدہ اٹھائیں گے میرے سامنے کوئی ایسا حادثہ کوئی ایسا سانحہ پیش ہو جائے جس میں سے مجھے کوئی قسمت اشارہ نہ ملے تو میں یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں اس میں میرے اللہ کی رضا شامل تھی اور میرا رب کبھی غلط فیصلہ نہیں کرتا میری اس عادت میری اس پنازی تو تھکنک نے مجھے دوبارہ دوبارہ یاد دلا کر کیا میں دوبارہ زندہ ہو گیا میں آج سوچتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے میں آج سے دو تین مہینے پہلے چڑھیں گھنے کا شکی تھا مجھے دنیا کی ہر چیز برعکس ہو سوج سے شکایت تھی اختلاف تھا یہ اختلاف یہ شکایت مجھے ہر وقت بہار رکھتی تھی میں نے شکایت کرنا چھوڑ دیا میں اختلاف کو سمیٹ کر نقطہ نظر اور رائے تک لے آیا مجھے جب کوئی اعتراض ہوتا ہے تو میں بڑے آرام سے کہتا ہوں "میرا یہ خیال سے اور یہ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے" میرے اس انداز سے میرا اختلاف میرا اعتراض کبھی میری لگاتار بن جاتا ہے وہ میرا نقطہ نظر ہو جاتا ہے لہذا اس سے نلوا لوگ ناراض ہوتے ہیں اورندی میں چڑچڑے پن کا شکار ہوتا ہوں۔

شیخ صاحب خاموش ہو گئے میں نے پوچھا "اور بیماریاں تو وہ مسکرا کر بولے" میرا خیال ہے ہماری 80 فیصد بیماریاں ہماری اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں یہ ہمارے منطقی رویوں کا رد عمل ہوتی ہیں اگر ہم مثبت طرز فکر اپنائیں تو ہم سدا سحت مند رہیں ہم پوری زندگی خوش اور تسکرت رہیں" میں نے شیخ صاحب سے ہاتھ ملایا اور خوش خوش واپس آ گیا میں نے محسوس کیا شیخ صاحب نے خبر ابواگاس دیکھنا شروع کر دیا ہے جبکہ ہم لوگ آدھے گلاس کو روٹے رہتے ہیں۔

خوشی

یہ 1640ء تھا، اس وقت نیو یارک پانچ حصوں میں تقسیم تھا، شمالی حصے پر ہالینڈ کا قبضہ تھا، بالینڈ کے جاگیردار آفریقا سے غلام لائے تھے اور انہیں اپنے کھیتوں میں بجا کر لگا رہتے تھے۔ اس وقت شمالی نیو یارک کے ارد گرد جنگل تھے، عام بعض اوقات پہرے داروں کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے تھے اور کھیتوں سے بھاگ کر جنگلوں میں چھپ جاتے تھے، یہ ایک مسئلہ تھا، ہالینڈ کے جاگیرداروں کا دوسرا مسئلہ اس سے بھی تمہیر تھا، اس دور میں انگلینڈ سے فوج آئی اور اس نے بالینڈ کے قابضین سے لڑنا شروع کر دیا، برطانوی فوج اسلحے اور تعداد میں آج لوگوں سے بڑی تھی چنانچہ لڑجے جاگیردار خوف کا شکار ہو گئے، ان لوگوں نے اپنے بچاؤ کیلئے شمالی نیو یارک میں ایک دیوار بنائی اور اس دیوار کے پیچھے پناہ گزین ہو گئے، یہ دیوار 1652ء میں مکمل ہوئی، اور یہ 1699ء تک برقرار رہی، 1698ء میں انگلینڈ کی فوج نے شمالی نیو یارک پر قبضہ کر لیا اور لڑجے سرداروں کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا جس کے بعد یہ دیوار گرا دی گئی، ڈیڑھوں کے دور میں اس دیوار کے ساتھ ایک نسبتاً کھلی گلی ہوتی تھی، لوگ اس گلی کو "وال سٹریٹ" کہتے تھے، یہ دیوار 1699ء میں ختم ہو گئی، لیکن وال سٹریٹ آج تک قائم ہے۔ وال سٹریٹ آج دنیا کی سب سے بڑی سٹاک ایکسچینج مارکیٹ ہے، انیسویں صدی کے شروع میں جب نیو یارک میں بلند عمارتوں کی تعمیر شروع ہوئی تو دنیا کی تمام بڑی کمپنیوں نے آسمان کو ہاتھ لگانے کیلئے اسی جگہ کا انتخاب کیا تھا،

زیر پبلک ڈومین 3.....0.....363

یہ جگہ اس وقت دنیا کا سماجی دار الحکومت بھی کہلاتی ہے اس وقت وال سٹریٹ میں دنیا کی تمام بڑی کمپنیوں اور تمام بڑے سرمایہ کاروں کے دفاتر موجود ہیں، کہا جاتا ہے دنیا میں سرمائے کا سورج روزانہ وال سٹریٹ سے طلوع ہوتا ہے اور جس دن یہ سورج طلوع نہیں ہوگا اس دن دنیا دیوالیہ ہو جائے گی اس وقت وال سٹریٹ میں 3124 امریکی، 93 کینیڈین، 195 یورپی، 181 ایشیائی، 59 کرسیوں، 189 ملٹی امریکہ اور 10 نڈل ایسٹ اور افریقہ کی کمپنیاں رجسٹر ہیں اور اس وقت وال سٹریٹ میں دنیا کے 21 ٹریڈین ڈالرڈن ہیں آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہو اس وقت دنیا کی کل دولت 33 ٹریڈین ڈالر ہے اور ان 33 ٹریڈین ڈالر میں سے 21 ٹریڈین ڈالر اس وقت وال سٹریٹ میں ہیں جبکہ باقی 12 ٹریڈین ڈالر سے دنیا بھر کا روزانہ کاروبار چلا رہا ہے۔

اگر ہم وال سٹریٹ کی کمپنیوں اور ان کمپنیوں کے ساتھ وابستہ لوگوں کا جائزہ لیں تو یہ دنیا کے امیر اور خوشحال ترین لوگ ہیں ان میں سے ہر شخص اور ہر کمپنی کا کاروبار سوسے زائد ملین ڈالر تک پھیلا ہوا ہے اور یہ لوگ ہرگز نہ ہاسٹل سیکنڈ میں امیر سے امیر تر ہوتے جا رہے ہیں مجھے ایک بار وال سٹریٹ کے ایک گھلاڑی کا انٹرویو دیکھنے کا اتفاق ہوا، انٹرویو کرنے والے نے اس سے سوال کیا "اس وقت آپ کے اکاؤنٹس میں کتنی رقم ہے" اس نے مسکرا کر جواب دیا "آپ کے سوال کرنے سے پہلے میرے پاس بارہ ٹریڈین ڈالر نو سو ملین ڈالر تھے لیکن میرے جواب دینے کے بعد اس رقم میں تین ملین کا اضافہ ہو جائے گا" یہ لوگ زندگی کو اس طرح دیکھتے اور سوچتے ہیں "ہائرم ازم" (وقت دولت ہے) کے نثاروں نے بھی اسی "گلی" میں جنم لیا تھا، وال سٹریٹ میں حقیقتاً ہر سیکنڈ سونے کے بھاؤ تولد اور پائیم کی قیمت میں بیجا جاتا ہے لہذا بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے وال سٹریٹ کے لوگوں تک زندگی کی گرم ہوا کبھی نہیں پہنچتی یہ لوگ ان تمام تکلیفوں اور مسائل سے آزاد ہوتے ہیں جن سے اس دنیا کے سوا چاروں لوگوں کا روزانہ پالا پڑتا ہے یہ لوگ حقیقتاً خوش اور خوشحال ہیں اور انہوں نے زندگی میں کبھی ان صحیح حقائق کی کڑواہٹ محسوس نہیں کی جو روزانہ ہمارے حلق کو زہر بناتے ہیں لیکن چند روز پہلے مجھے وال سٹریٹ میں ہونے والے ایک سردے رپورٹ دیکھنے کا اتفاق ہوا اس رپورٹ نے مجھے حیران کر دیا امریکہ کی ایک کمپنی نے وال سٹریٹ کے پاسیوں سے پوچھا "تم لوگوں نے کبھی خوشی کو محسوس کیا" ان تاجروں، کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو اور یورو کروں کا جواب بہت دلچسپ تھا ان میں سے 91 فیصد لوگوں کا کہنا تھا انہوں نے زندگی میں کبھی خوشی کو محسوس نہیں کیا، انہوں نے کہا کہ وہ

اس کا اظہار کس طرح کیا جاتا ہے، کمپنی نے مزید تحقیق کی تو پتہ چلا وال سٹریٹ کے زیادہ تر لوگ مسکراتا، تہمت لگانا اور ہنسنا بھول چکے ہیں اور اس "بازار" میں اگر کبھی کسی کے منہ سے قبضہ نکل جائے تو سب لوگ مزہ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہیں، میرے لئے یہ تحقیق حیران کن تھی، میں بے شمار دوسرے لوگوں کی طرح دولت اور خوشحالی کو خوشی کا جوہر سمجھتا تھا، میرا خیال تھا جب تک کسی شخص کی جیب میں ایک دو کروڑ روپے نہ ہوں اس وقت تک اسے خوشی نہیں ہوتی، دو اس وقت تک خوشی کو پوری طرح محسوس نہیں کر پاتا لیکن وال سٹریٹ کے اس سروے نے اس سارے فلسفے کو جڑوں سے ہلا دیا اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا خوشی دولت اور خوشحالی سے ماورا کوئی چیز ہوتی ہے اور اس کا تعلق جذبوں کے کسی دوسرے ماخذ سے ہوتا ہے، مجھے معلوم ہوا ایک چھوٹا بچہ روزانہ چار سو بار ہنستا ہے جبکہ ایک نارٹل بالغ شخص کے چہرے پر صرف پندرہ مرتبہ مسکراہٹ آتی ہے اور جوں جوں یہ بالغ شخص خوشحالی کی تلاش میں آگے بڑھتا جاتا ہے اس کے چہرے سے ہلکی اور خوشی غائب ہوتی چلی جاتی ہے، مجھے معلوم ہوا دولت دنیا میں بے شمار خوبیاں لے کر آتی ہے، یہ انسان کو بے شمار نفع دینا، انعامات بھی دینا، لیکن یہ اپنے ساتھ کبھی خوشی اور مسرت نہیں لے کر آتی۔

اس شام میرے پاس اللہ کے ایک ولی تشریف آئے، میں نے ان سے سوال کیا "حضور خوشی کیا ہوتی ہے؟" انہوں نے قبضہ لگایا اور بڑے یقین سے بولے "دنیا میں لوگ دولت دے کر کوئی نہ کوئی جنس خریدتے ہیں آپ روپے دے کر آنا، دالیں، چینی، جوتے اور کپڑے لیتے ہیں، ہم اس خرید و فروخت کو کاروبار کہتے ہیں، انسان جب جنس کے بدلے روپیہ اور روپے کے بدلے جنس لیتا ہے تو اسے خوشی حاصل نہیں ہوتی، خوشی صرف اس خرید و فروخت میں حاصل ہوتی ہے جس میں آپ روپے ادا کرتے ہیں لیکن اس کے بدلے میں آپ کوئی جنس نہیں خریدتے، آپ کو اس کے عوض کوئی چیز نہیں ملتی" میں نے پوچھا "مثلاً، دو مسکرائے" مثلاً آپ کسی ضرورت مند طالب علم کی نہیں ادا کر دیتے ہیں، کسی مریض کا ملانج کرا دیتے ہیں یا آپ کسی یتیم کو جوتا خرید دیتے ہیں" ان کا فرمانا تھا "خوشی صرف خوش نصیب لوگوں کو ملتی ہے اور خوش نصیب وہ ہوتے ہیں جو اپنے نصیب پر خوش ہوتے ہیں، جو اللہ کی رضا کو اپنا مقدر بنا لیتے ہیں" مجھ ان کی بات اچھی لگی لیکن ساتھ ہی میں نے سوچا "مگر بچوں کو تو نصیب کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی خوشی کا، وہ پھر روزانہ چار چار سو بار کیوں مسکراتے ہیں" مجھے محسوس ہوا خوشی کیلئے "مضموم ہونا بھی ضروری ہوتا ہے اور ہم زندگی میں جس قدر آگے بڑھتے جاتے ہیں، ہم "مضموم" بناتے جاتے ہی دور ہوتے جاتے ہیں، ہم

زیر پبائٹڈ 3.....0.....365

جوں جوں چالاک، ہوشیار اور سمجھ دار ہوتے جاتے ہیں، ہم توں توں خوشی سے دور ہوتے جاتے ہیں، ہم توں توں مسرت سے خالی ہوتے جاتے ہیں۔ ”مجھے محسوس ہوا خوشی کیلئے توکل اور مصمصویت دونوں ضروری ہوتی ہیں اور قدرت سرمائے دار کو سرمایہ دے کر یہ دونوں انعام چھین لیتی ہے، وہ اسے چالاک اور پرکینیکل بنا دیتی ہے اور پرکینیکل اور چالاک لوگ کبھی خوش نہیں رہ سکتے، وہ کبھی وجود کی جڑوں تک خوش نہیں ہو سکتے۔“



Kashif Azad@OneUrdu.com

21 گرام

ڈاکٹر ایل جان نے دس سال قبل تجربات شروع کئے تھے وہ انسانی روح کا وزن معلوم کرنا چاہتا تھا اس نے نیو یارک کے چند ڈاکٹروں کو ساتھ لایا اور مختلف طریقے وضع کرنا شروع کر دیئے یہ لوگ بالآخر ایک طریقے پر متفق ہو گئے۔ ڈاکٹر زرع کے حکار لوگوں کو ششے کے باکس میں رکھ دیتے تھے 'مریض کی تاک میں آسکین کی چھوٹی سی نگلی لگا دی جاتی تھی اور باکس کو انتہائی حساس ترازو پر رکھ دیا جاتا تھا' ڈاکٹر باکس پر نظریں جما کر کمرے ہو جاتے تھے 'مریض آخری نگلی لپاتا تھا اس کی جان نکلتی تھی اور ترازو کے ہندسوں میں تھوڑی سی کمی آ جاتی تھی' ڈاکٹر یہ کمی نوٹ کر لیتے تھے 'ان لوگوں نے پانچ سال میں بارہ سو تجربے کئے' 2004ء کے آخر میں ڈاکٹر ایل جان کی ٹیم نے اعلان کیا "انسانی روح کا وزن 67 گرام ہوتا ہے" ڈاکٹر جان نے اپنی تیسویں کے جواز میں 12 سو مردوں کی ہسٹری بیان کی اس کا کہنا تھا ان کے باکس میں رکھا شخص جوں ہی فوت ہوتا تھا اس کا وزن 67 گرام کم ہو جاتا تھا لہذا وہ بارہ سو تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں انسانی روح کا وزن 67 گرام ہوتا ہے۔ اسی قسم کے تجربات لاس انجلس کے ایک ڈاکٹر ابراہام نے بھی کئے تھے اس نے انتہائی حساس ترازو بنایا وہ مریض کو اس ترازو پر لٹاتا 'مریض کے پیچھروں کی آسکین کا وزن کرتا اور اس کے مرنے کا انتظار کرتا' ڈاکٹر ابراہام نے سینکڑوں تجربات کے بعد اعلان کیا "انسانی روح کا وزن 21 گرام ہے" ابراہام کا کہنا تھا انسانی روح اس

21 گرام آکسیجن کا نام ہے جو پھیپھڑوں کے کوٹوں، کھدروں، دوزوں اور کلیروں میں چھپی رہتی ہے، موت بھگی کی صورت میں انسانی جسم پر وارد کرتی ہے اور پھیپھڑوں کی تہوں میں چھپی اس 21 گرام آکسیجن کو باہر دھکیل دیتی ہے اس کے بعد انسانی جسم کے سارے تیل مر جاتے ہیں اور انسان فوت ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ایل جان کا تخمینہ درست ہے یا ڈاکٹر ابراہام کی تحقیق، یہ فیصلہ ابھی باقی ہے تاہم یہ طے ہو چکا ہے انسانی روح کا وزن گراموں میں ہوتا ہے اور ہمارے جسم سے 21 یا 67 گرام زندگی خارج ہوتی ہے اور ہم فوت ہو جاتے ہیں، میں نے پچھلے دنوں ہالی وڈ کی ایک فلم دیکھی تھی، یہ فلم ڈاکٹر ابراہام کی تھیوری پر مبنی تھی اور اس میں بھی انسانی روح کو 21 گرام قرار دیا گیا تھا لہذا اگر ہم فرض کر لیں ہمارے جسم میں بھاگنے دوڑنے والی زندگی کا وزن محض 21 گرام ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے ان 21 گراموں میں ہماری خواہشوں کا وزن کتنا ہے اس میں ہماری فطرتیں ہمارے

ارادے ہمارے منصوبے، ہماری ہیرا پھیریاں، ہمارے سمجھوتے، ہماری چالاکیاں، ہمارے لالچ، ہماری سازشیں اور ہماری اداکارانہ زندگی، ہمارے گناہ، ہمارے گناہوں میں ہماری

یونٹ فارم، ہمارے ایل ایف او، ہماری ذلیل، ہمارے اقتدار، ہمارے انکیش، ہماری لبرل ازم، ہماری آزاد خیالی اور ہماری بہادری کا کتنا وزن ہے، ان 21 گراموں میں ہمارے حوصلے، ہماری قوت برداشت، ہماری جرأت، ہماری خوشامد، ہماری پھرتیوں، ہماری عقل اور ہماری فہم کا کتنا حصہ ہے، ان 21 گراموں میں ہماری سمارٹنس، ہماری الٹرنس، ہماری فارن پالیسی اور ہماری امریکہ نوازی کا بوجھ کتنا ہے اور ہم چودھری صاحب کی طرح لاہور کے سارے پلاٹ اٹھانا چاہتے ہیں، ہم اپنی اعلیٰ نسل کو بادشاہ بنانا چاہتے ہیں، ہم اپنی ساری دولت سپین شفٹ کرنا چاہتے ہیں اور ہم اگلے جیس پیچیس برس تک کرسی پر جلوہ افروز رہنا چاہتے ہیں، ہم نے خوشامد کو آرٹ کی شکل دے دی ہے، ہم روزانہ بیسیوں لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں، ہم ایک منٹ میں دس دس مرتبہ اپنے ضمیر کا سودا کرتے ہیں اور ہم صرف اپنا اقتدار بچانے کیلئے چھ چھ سو بے گناہوں کو ظالموں کے حوالے کر دیتے ہیں، ہم واڈھی اور نماز کو خوف کی شکل دے رہے ہیں اور ہم ظالم سے نفرت کرنے والے ہر شخص کو مجرم سمجھتے ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے ہماری ان ساری سوچوں، ہمارے ان سارے خیالات اور ہماری ان ساری خواہشوں کا وزن کتنا ہے اور ان 21 گراموں میں ہماری گردن کی اکڑ، ہمارے بچے کے تکبر اور ہماری نظر کے غرور کا بوجھ کتنا ہے اور ہم ان 21 گراموں کی مدد سے قدرت کا کتنی دیر

تک مقابلہ کر سکتے ہیں، ہم ان 21 گراموں کی مدد سے قدرت کے فیصلوں سے کتنی دیر تک بچ سکتے ہیں، یہ 21 گرام ہمیں کتنی دیر تک وقت کی آٹھ سے بچا سکتے ہیں، یہ 21 گرام کب تک ہمارے غرور کی حفاظت کر سکتے ہیں اور یہ 21 گرام ہمارے منصوبوں اور ہماری خواہشوں کی کتنی دیر تمبہائی کر سکتے ہیں۔

میں نے کسی جگہ پڑھا تھا تبت کے لوگ 21 گراموں کی اس زندگی کو موم سمجھتے ہیں لہذا یہ لوگ صبح کے وقت موم کے دس بیس ٹکسے بناتے ہیں اور یہ جسے اپنی دلہیز پر رکھ دیتے ہیں، ان میں سے ہر بجرس ان کی کسی نہ کسی خواہش کی نمائندگی کرتا ہے، دن کو سورج کی تپش میں اضافہ ہوتا ہے تو یہ جسے پھٹنے لگتے ہیں حتیٰ کہ شام تک ان کی دلہیز پر موم کے چند آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں بچتا، یہ لوگ ان آنسوؤں کو دیکھتے ہیں اور اپنے آپ سے پوچھتے ہیں "کیا یہ تمہیں میری ساری خواہشیں" اور اس کے بعد ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور وہ کائنات کی اس طاقت کے سامنے جھک رہے ہو جاتے ہیں جو ان کے 21 گرام کی اصل مالک ہے، جس کے حکم سے ان کی سانس

چلتی اور ان کے اندام چمکتے ہیں، میں نے کسی جگہ پڑھا تھا ہمارے بدن میں ایک منٹ میں 87 کروڑ حرکتیں ہوتی ہیں اور ہمارے ذہن میں ایک منٹ میں اربوں خیال آتے ہیں اور ہم ایک منٹ میں ایک لاکھ دس ہزار منصوبے بناتے ہیں لیکن اگلے منٹ یہ سارے خیال، یہ سارے منصوبے اور یہ ساری کروٹیں ہمارے ذہن کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہیں، ہم اپنے خیال بھول جاتے ہیں۔ ہمارے یہ سارے خیال، ہمارے یہ سارے منصوبے اور ہماری یہ ساری حرکتیں بھی انہیں 21 گراموں کی مہربان منت ہیں اور یہ 21 گرام آگے چل کر موم کے پتلے ثابت ہوتے ہیں لیکن آپ انسان کا کمال دیکھئے ذیادہ سو گرام گندم 8 اونس شراب اور کسی ایک سینئر کی خوشامد اس کے 21 گراموں کو خدا بنا دیتی ہے۔ یہ خدا کے لہجے میں بولنا شروع کر دیتا ہے، یہ اپنی ذات کو ملک کی بقا قرار دے دیتا ہے اور یہ خود کو ناکرز پر سمجھنے لگتا ہے، ہم سب کیا ہیں؟ محض 21 گرام محض ایک سانس، محض ایک ہنگامی، محض ایک چھبک، محض ایک جھٹکا، محض ایک بریک، محض دماغ کا ایک شارٹ سرکٹ اور محض دل کے اندر اٹھتی ہوئی ایک لہر اور بس، ہم نے کبھی سوچا 21 گرام کتنے ہوتے ہیں 21 گرام لوسے کے 14 دانے ہوتے ہیں، ایک نماز یا بیاز کی ایک پرت، ریت کی چھ چٹکیاں اور پانچ نشوونما ہوتے ہیں، یہ ہیں ہم اور یہ ہے ہماری اوقات لیکن ہم بھی کیا لوگ ہیں، ہم 21 گرام کے انسان خود کو کھربوں ٹن وزنی کائنات کے خدا سمجھتے ہیں، ہم 21 گرام کے انسان

369.....0.....3 زیر و پوائنٹ

خود کو 21 گرام کے کروڑوں انسانوں کا حکمران سمجھتے ہیں، ہم وقت کو اپنا غلام اور زمانے کو اپنا ملازم سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں بس ذرا سی تپش کی دیر ہے اور ہمارے سارے اختیار ہمارے سارے اقتدار کی موسم کچھل جائے گی، ہم شام تک موسم کا آنسو بن جائیں گے، ہمارے 21 گرام منوں میں مل جائیں گے، ہم تاریخ کی سلوں تلے دفن ہو جائیں گے اور 21 گرام کا کوئی دوسرا خدا ہماری جگہ لے لے گا۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

کفن چور

اس کی ناک پر سنہری رنگ کی خوبصورت ٹینک دھری تھی اور گود میں لیب ٹاپ تھا۔
 ظالمین، بڑا بھلا بھلا ہے ہی اس نے سڑھو کوئی لیب ٹاپ اس پر کھا اور گام شروع کر دیا میں جہاز میں
 دستیاب میگزین اور اخبارات پڑھنے لگا، کئی گھنٹے گزر گئے لیکن وہ کام کرتا رہا، کھانے کے دوران
 اس نے ذرا دیر کیلئے وقفہ کیا، میں نے موقع قیمت جانا اور اس کے ساتھ گپ شپ شروع کر دی وہ
 سٹنگ پور کار ہنے والا تھا، وہ پچھلے سال یونیورسٹی سے فارغ ہوا اور اس نے سرکاری ملازمت اختیار
 کر لی وہ چھٹیاں گزارنے امریکہ جا رہا تھا، اس کے تعارف میں چھٹیوں والی بات حیران کن تھی،
 ہمارے ملک میں پڑاوی اور ایس ایچ او کے سوا کوئی سرکاری ملازم پہلے سال چھٹیاں گزارنے
 امریکہ نہیں جاسکتا، میں نے اسے کہہ کر پتا شروع کر دیا، اس نے بتایا یہ دورہ خالصتاً زالی تھا اور اس
 کے تمام اخراجات وہ اپنی جیب سے ادا کر رہا تھا، اس کا کہنا تھا وہ خاندانی لحاظ سے بھی کوئی خوشحال
 شخص نہیں اور پچھلے پانچ برسوں میں اس کے والدین نے اسے ایک پائی نہیں دی، میں نے آخر میں
 اس سے وزٹ کے اخراجات کے بارے میں پوچھ لیا، یہاں سے کہانی نے نرن لیا، اس نے بتایا
 سٹنگ پور کی بیورو کر سٹی ایف پی ٹیسی اور ڈیپوری میں دنیا میں پہلے نمبر پر ہے، سٹنگ پور کے اس اعزاز کی دو
 بڑی وجوہات ہیں، پہلے نمبر پر ٹیلنٹ آتا ہے، سٹنگ پور کی حکومت یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بہترین
 طالب علموں کو نوکری کی پیش کش کرتی ہے اور دوسرے نمبر پر سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کا کٹھن ہے

سنگاپور میں سرکاری ملازمین کی تنخواہیں نئی شے کو سامنے رکھ کر طے کی جاتی ہیں اگر ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے اسٹنٹ کو پانچ ہزار ڈالر تنخواہ دیتی ہیں تو حکومت بھی اس گریڈ کے ملازمین کی تنخواہ اور مراعات پانچ ہزار ڈالر کر دیتی ہے سنگاپور میں سرکاری اور نجی شے کے ڈائریکٹریکٹوریٹس اور ایگزیکٹو آفیسر منیجر کلرک اور چیف ایگزیکٹوز کے چیک کیساں ہوتے ہیں لہذا سنگاپور دنیا کا واحد ملک ہے جس میں لوگ نجی شعبوں سے نوٹ کر سرکاری محکموں میں آتے ہیں اس نے بتایا سنگاپور کے سرکاری افسر اس قدر خوشحال ہیں کہ وہ اپنی جیب سے اس کے پاس چھٹیاں گزار سکتے ہیں ان کی اس خوشحالی کے نتیجے میں سنگاپور نے "ہیٹ بیوروڈ کرک سسٹم" کا اعزاز حاصل کیا ہے اس نے بتایا سنگاپور میں بڑے سے بڑے فیصلہ اور مشکل سے مشکل ترین فائل بھی جھیل کیلئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لیتی کسی سال کو اپنے کام کیلئے انتظار نہیں کرنا پڑتا اور کوئی شخص کسی سرکاری محکمے کی شکایت نہیں کرتا وہ جان ایف کینڈی ایئر پورٹ پر اترا اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا لیکن مجھے ایک نیا راستہ ایک نئی سوچ دے گیا۔

بیوروڈ کرکسی کیا ہوتی ہے؟ بیوروڈ کرکسی عوامی حقوق کو عوام تک پہنچانے کا نظام ہوتا ہے لوگوں کو انصاف چاہیے لوگوں تک یہ انصاف بیوروڈ کرکسی پہنچانے کی لوگوں کو دوا، تعلیم، خوراک اور صاف ستھرا ماحول چاہیے اور عوام کی یہ ساری ضرورتیں بیوروڈ کرکسی پوری کرے گی بیوروڈ کرکسی بنیادی طور پر وہ دروازہ ہوتا ہے جس سے ملک میں رہنے والے ہر شخص کو گزرنا پڑتا ہے لہذا جب تک بیوروڈ کرکسی کا نظام ٹھیک نہیں ہوتا اس وقت تک ملک ٹھیک پر فارم نہیں کرتا یہ حقیقت ہے بیوروڈ کرکسی کا نظام سے اچھے نتائج لینے کیلئے بیوروڈ کرکسی کا مٹین 'خوشحال اور ریٹیکس رہنا ضروری ہوتا ہے لیکن بد قسمتی سے پاکستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جن کا سرکاری ملازم غیر مٹین بھی ہے اور بد حال بھی لہذا ہمارے ملک میں دنیا کا انتہائی ست اذیت ناک اور شرم انگیز سرکاری نظام پایا جاتا ہے اس نظام میں آپ کو آکسیجن لینے کیلئے چرہی سے وڈیرا عظیم تک کا سفر کرنا پڑتا ہے اور اس کے باوجود آپ کو ایک گھونٹ آکسیجن نہیں ملتی پاکستان کے انتہائی قابل اور پڑھے لکھے نوجوان سی ایس ایس اور پی ایس ایس کے امتحان دیتے ہیں لیکن جب یہ نوجوان بیوروڈ کرکسی کا حصہ بنتے ہیں تو یہ اس نظام کا ایک آدھ پرزہ مزید توڑ دیتے ہیں جس کے بعد اس کی رفتار میں مزید کمی واقع ہو جاتی ہے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی صرف اور صرف ایک وجہ ہے اور وہ وہ ان لوگوں کا کھینچ ہے ایک سرکاری ملازم اور پرائیویٹ ملازم کی تنخواہ میں اتنا واضح فرق ہے کہ سرکاری ملازم

کیلئے رشوت کے بغیر زندگی گزارنا ممکن نہیں رہتا آپ کو یقین نہ آئے تو آپ پاکستان میں سی ایس ایس کے امتحان میں پہلی دس پوزیشنیں حاصل کرنے والے نو جوانوں کا کھج دیکھ لیں آپ کو معلوم ہوگا ان کے مقابلے میں کم صلاحیت کے نو جوان پرائیویٹ سیکٹر میں دو دو لاکھ روپے تنخواہ لے رہے ہیں جبکہ سی ایس ایس میں پوزیشن حاصل کرنے والوں کو س ہزار روپے سیکریٹری ل رہی ہے ذرا خود سوچئے اس تنخواہ میں یہ لوگ کام کا جذبہ کہاں سے لائیں گے چیف سیکرٹری صوبے کا سب سے بڑا افسر ہوتا ہے وہ پورے صوبے کا زیور کر یک نظام چلاتا ہے فیڈرل شریعت کورٹ کے رجسٹرار میرے دوست ہیں وہ گزشتہ روز مجھے پنجاب کے چیف سیکرٹری سلیمان صدیق کے بارے میں بتا رہے تھے ان کا کہنا تھا سلیمان صدیق صبح آٹھ بجے دفتر آتے ہیں اور رات دس گیارہ بجے تک دفتر میں کام کرتے ہیں جبکہ ان کا کھج صرف 45 ہزار روپے ہے یہ تنخواہ شیل کینی یونیورسٹی پاکستان ٹوبکو کینی یا عریہ ناؤن کے کسی جو نیر افسر کے کھج سے بھی کم ہے پاکستان میں ٹرک چلانے والے لوگ بھی مہینے میں اس سے زیادہ پیسے کمایتے ہیں آپ 45 ہزار روپے ماہانہ میں اپنے ایک بچے کو کسی ایسے تعلیمی ادارے میں تعلیم نہیں دے سکتے لہذا خود بتائیے کیا اس کھج سے چیف سیکرٹری کی کارکردگی متاثر نہیں ہوگی آپ چیف سیکرٹری کے کھج کو سامنے رکھ کر ڈی سی او اور اسٹنٹ کمشنر کی تنخواہوں کا اندازہ بھی کر لیجئے حکومت ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کو جتنی تنخواہ دیتی ہے اتنی رقم ایک درمیانے درجے کا ڈاکٹر پرائیویٹ پریکٹس سے ایک دن میں کمالیتا ہے اور ایک درمیانے درجے کی کینی کا سیکورٹی افسر شہر کے ایس ایس پی سے زیادہ تنخواہ لیتا ہے چنانچہ یہ تفاوت وہ بنیادی خالی ہے جس کی وجہ سے ہمارے سرکاری نظام کی کارکردگی شرمناک شکل اختیار کر چکی ہے۔

حکومت نے اس ظلم پر ایک اور ظلم "ایم پی گریڈون" سکیم کی شکل میں کیا حکومت مختلف اہلکاروں، کمنوں اور کارپوریشنوں کی سربراہی کیلئے مارکیٹ سے منجر ہائز کر رہی ہے اور ان لوگوں کو تین ساڑھے تین لاکھ روپے تنخواہ دی جاتی ہے یہ لوگ آگے چل کر ایک ایسے سیکرٹری یا چیف سیکرٹری کی "قیادت" میں کام کرتے ہیں جس کا کھج چالیس پینتالیس ہزار روپے ہوتا ہے آپ خود فیصلہ کیجئے سیکرٹری ساڑھے تین لاکھ کے جیسر میں کے ساتھ کام کرتے ہوئے کیا محسوس کرتا ہوگا میں کل اخبار میں خبر پڑھ رہا تھا حکومت نے ان لاکھ پتی چیز مینوں کی تنخواہ میں مزید 60 ہزار روپے اضافہ کر دیا ان لوگوں کو اس کے علاوہ 50 فیصد اضافی ہاؤس رینٹ اور پینشنی بنز کی حد میں مزید 20 ہزار روپے بھی ملیں گے یہ سیدھی سادھی زیادتی ہے میرا خیال ہے حکومت اگر

تمام سرکاری شعبوں کے انتظامی افسروں کو ایم پی گریڈ ون وے وے اور ان کے بچے کو ان کی کارکردگی سے منسلک کر دے تو بڑی حد تک پاکستان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں مجھے معلوم ہے حکومت اس معاملے میں فنڈ زکار و ناروے کی لیکن اس کا حل بھی موجود ہے حکومت اگر ایک سال تک صدر اور وزیر اعظم کے شاہانہ دوروں پر پابندی لگا دے کابینہ کا سائز کم کر دے صدر اور وزیر اعظم سمیت ملک کی دس بڑی شخصیات کی سرکاری گاڑیوں کی تعداد آدھی کر دے یا پھر پانچ بڑے شہروں کے پانٹوں کی آمدنی کا صرف ایک فیصد ان لوگوں کی تنخواہوں کیلئے مختص کر دے تو یہ مسئلہ دو دن میں حل ہو سکتا ہے ہمیں اس مسئلے پر نظر جیسی پیرٹ کا مظاہرہ کرنا ہوگا، نظر نے سرکاری ملازموں کو ان کی مرضی کا بچہ دیا تھا لیکن ان سے کام اپنی مرضی کے مطابق لیا تھا ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں کیونکہ یہ سچ ہے جب آپ بھوکے کو مٹھائی سے کھیاں اڑانے کی ذمہ داری سونپیں گے تو آپ کی مٹھائی کا تول کبھی پورا نہیں ہوگا فرانسسی کہاوت ہے ننگے ہمیشہ کفن چور ہوتے ہیں ہماری چور و کرسی بیٹ سے بھوکی اور تن سے ننگی ہے لہذا اس ملک میں ہمارے کفن محفوظ ہیں اور نہ ہی مٹھائی۔

Kashif Azad@OneUrdu.com

کاشف آزاد
ممبر
2010

وی آرسوری

میں نے جہاز سے اترتے ہوئے اخبار اٹھا لیا یہ گلف نیوز کا دو مارچ 2007ء کا شمارہ

تھا اخبار کے اندر دوئی صفحات پر انتہائی دلچسپ تصویر جیسی تھی تصویر کے اوپر "مارچ فولیوں" کی

سرفی لگی تھی اور تصویر میں مختلف عمروں کی خواتین اور حضرات فٹ پاتھ پر مارچ کر رہے تھے ان

سب کے ہاتھ زنجیروں سے بندھے تھے اور ان کے گلے میں قلیل نما لکڑیاں تھیں تصویر کے نیچے

کیپشن میں لکھا تھا "مل شہر کے سینکڑوں شہری غلامی پر پابندی کے دو سو سال پورے ہونے پر لندن

تک مارچ کر رہے ہیں یہ لوگ شدید بارش کے باوجود چار سو گلو میٹر تک مارچ کریں گے اور 25

مارچ کو لندن پہنچیں گے اس مارچ کے دو مقصد ہیں ان تمام لوگوں کی نسلوں سے معافی مانگنا

جنہیں دو سو سال پہلے برطانوی باشندوں نے غلام بنا کر امریکہ میں بچا دیا تھا اور دوسرا مل شہر کے

عظیم سیوت ولیم ویلبر فورس کو سلام عقیدت پیش کرنا جس کی بیس سالہ کوشش کی بدولت ہاؤس آف

کامنز نے غلامی پر پابندی لگا دی یہ اخبار پچھلے ایک ماہ دو دن سے میرے پاس پڑا ہے میں روزانہ

یہ تصویر دیکھتا ہوں اور اس کے بعد خود سے دو سوال پوچھتا ہوں ولیم ویلبر فورس کون تھا اور کیا اللہ

تعالیٰ نے دنیا کے تمام اچھے کام یورپی لوگوں کے نصیب میں لکھ دیئے ہیں؟

ولیم ویلبر فورس برطانیہ کے خوبصورت شہر مل کے ایک امیر خاندان کا فرد تھا اس کا والد

رابرٹ ویلبر فورس شہر کا سب سے بڑا تاجر تھا ولیم 24 اگست 1759ء کو پیدا ہوا اور اس نے

1788ء میں ایم اے کی ڈگری لی لیکن وہ ایم اے سے آٹھ سال پہلے ہاؤس آف کامنز کا رکن بن چکا تھا وہ دارالعوام کا کم سن ترین رکن تھا اس وقت اس کی عمر صرف 21 برس تھی اس وقت وہ ایم ویلبر فورس کی کہانی کو ذرا دیر کیلئے روکوں گا اور آپ کو اس سے تین سو سال پیچھے لے جانے کی کوشش کروں گا کرسٹوفر کولمبس نے 1492ء میں امریکہ دریافت کیا تھا اور 1500ء میں یورپی تاجروں نے اس نئی دنیا پر یلغار کر دی تھی شمالی اور جنوبی امریکہ اس وقت حقیقتاً سونے کی کان تھی پورا براعظم جنگلی بھینسوں سے اٹا پڑا تھا زمین کے ایک سرے سے دوسرے کوئے تک جنگلی ہی جنگل تھے اور جنگلات کے بعد سونے چاندی اور ہیروں کی ہزاروں کانیں تھیں امریکہ کی زمین گنے سے لے کر کئی اور سو درجہ کھیتی سے لے کر تباہ کن ہر قسم کی فصل کیلئے انتہائی سود مند تھی چنانچہ یورپی تاجر امریکہ اور لاطینی امریکہ پہنچے انہوں نے بندوق کے زور پر مقامی آبادی کو غلام بنایا اور انہیں کانوں سے سونا نکالنے اور زمین پر گناہ مکتی اور تباہ کن کاشت کرنے پر لگا دیا یورپی تاجر ظالم اور بے رحم تھے لہذا یہ مقامی لوگوں سے غیر انسانی سلط پر کام لیتے تھے اس زیادتی کے نتیجے میں مقامی آبادی تیزی سے کم ہونے لگی آپ اس کی مثال صرف کیوبا سے لیتے ہیں 1500ء میں کیوبا کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ تھی 1511ء میں ہسپانوی فوجیوں نے کیوبا میں کالونی قائم کی کیوبا کے لوگوں کو غلام بنایا اور انہیں سونا نکالنے پر لگا دیا کیوبا کے لوگ شدید غذائی قلت بیماریوں اور مظالم کا شکار ہونے لگے یہاں تک کہ 1517ء میں محض چھ برس بعد کیوبا کی آبادی صرف دو ہزار رہ گئی یہی حالت برازیل، میکسیکو اور جمنائن، ہولیویا، کولمبیا، ونیزویلا اور چلی کی تھی جبکہ شمالی امریکہ میں نیکیاس، کیلیفورنیا اور نیویارک کی حالت اس سے بھی تیلی تھی اور جینیا کے ڈچ حکمران تباہ کن فصل بولیتے تھے تو انہیں تباہ کن کھانے اور سینے والے لوگ نہیں ملتے تھے پر جنگلی طالع آزمائے طور پر یہاں کے جنگلوں میں دو دو سو بھینسے مار لیتے تھے لیکن انہیں بھینسوں کی کھال اتارنے والے نہیں ملتے تھے اسی طرح مین بھینس میں کما کی فصل کھڑی کھڑی سوکھ جاتی تھی لیکن ولندیزی اور برطانوی زمینداروں کو فصل کاٹنے والے نہیں ملتے تھے چنانچہ امریکہ کے تمام یورپی آقا افرادی قوت کے شدید بحران کا شکار ہو گئے ہسپانوی ولندیزی اور پرتگیزی تاجروں نے جلد ہی اس کا حل نکال لیا یہ لوگ بحری جہاز لے کر افریقہ پہنچتے سیاہ فاموں کا پورا پورا قبیلہ انہوا کرتے اور انہیں امریکہ لاکر کھیتوں، جنگلوں اور کانوں پر لگا دیتے یہ سلسلہ چل پڑا تو سیاہ فام لوگوں کا انہوا اور انہیں امریکہ پہنچانے کا کام باقاعدہ تجارت کی شکل اختیار کر گیا پارسلوٹا، اسٹروڈیم، نیپلز اور اینڈور پن میں

تجارتی کمپنیاں نہیں اور یہ کمپنیاں غلامی کی باقاعدہ تجارت کرنے لگیں یہ کمپنیاں دو طریقوں سے غلام حاصل کرتی تھیں یہ گھانا، کانگو، گولڈا، میکانا اور مغربی افریقہ سے لوگوں کو زبردستی اغوا کر لیتے تھے یا پھر شراب، ٹکواروں، بندو توں اور سونے کے سکوں کے عوض لوگوں کو خرید لیتے یہ لوگ بعد ازاں منڈیوں میں لائے جاتے ان کی بولی دی جاتی اور یہ مختلف خریداروں کے ہاتھوں سے ہوتے ہوئے امریکہ پہنچ جاتے ایک اندازے کے مطابق 1500ء سے 1850ء تک افریقہ سے ایک کروڑ 20 لاکھ غلام امریکہ لائے گئے ابتدا میں یہ تجارت صرف سین ہالینڈ اور پرتگال تک محدود تھی لیکن پھر برطانیہ بھی اس کاروبار میں کود پڑا برطانیہ نے 1730ء میں غلاموں کی تجارت شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا سے آگے نکل گیا 1780ء میں دنیا میں غلاموں کی چار بڑی منڈیاں اور غلاموں کو امریکہ پہنچانے کی چار ہی بڑی بندرگاہیں تھیں یہ چاروں منڈیاں اور بندرگاہیں برطانیہ میں تھیں یہ منڈیاں لیور پول، لندن، برمنگھم اور لیسن کیسٹرس میں قائم تھیں برطانوی تاجر اس کاروبار میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے 1790ء تک 34 لاکھ

غلام افریقہ سے اغوا کر کے امریکہ میں بھیجے۔
Kashif Azad@Copyright.com

اب ہم واپس ولیم ویلر فورس کی طرف آتے ہیں ولیم اس تجارت کو انسانیت کی تذلیل سمجھتا تھا اس نے 12 مئی 1789ء کو ہاؤس آف کامنز میں پہلی بار انسانی تجارت کے خلاف آواز اٹھائی اس وقت وہ اس ایئر پر بولنے والا پہلا شخص تھا وہ پورا سال بولتا رہا یہاں تک کہ ہاؤس نے 1790ء میں یہ مسئلہ پارلیمانی سلیکٹ کمیٹی کے حوالے کر دیا ولیم نے اپریل 1791ء میں پارلیمنٹ میں پہلی بار غلاموں کی تجارت کے خلاف بل پیش کیا لیکن بد قسمتی سے وہ 88 کے مقابلے میں 163 ووٹوں سے ہار گیا لیکن اس نے بہت تہ باری وہ ہر سال اسمبلی میں بل پیش کرتا رہا یہاں تک کہ 20 برس بعد مارچ 1807ء آ گیا اور ولیم ویلر فورس 16 ووٹوں سے جیت گیا یوں برطانیہ میں 25 مارچ 1807ء کو غلاموں کی تجارت پر پابندی لگ گئی ولیم ویلر فورس 29 جولائی 1833ء تک زندہ رہا وہ 1807ء کے بعد جب بھی لوگوں سے ملتا تھا وہ کہتا تھا ”میں نے ایک چھوٹی سی مچھلی میز پر لا کر رکھ دی میں دیکھتا رہا دیکھتا رہا اور ایک دن یہ مچھلی وکیل بن گئی“ ولیم ویلر فورس کی بات درست تھی اس کی بیس سال کی محنت رجب الائی اور اس نے افریقہ کے ان تمام بچوں کو خوف سے آزاد کر دیا جو ماؤں کی کوکھ میں سہمے بیٹھے تھے اس نے انسانوں کو

انسان ہونے کا فخر واپس کر دیا لہذا وہ دن ہے اور آج کا دن مل کے لوگ ہر سال مارچ کے مہینے میں ولیم ویلر فورس کی یاد میں بے شمار تقریبات کرتے ہیں۔

مارچ 2007ء میں برطانیہ میں غلامی پر پابندی کے دو سو سال پورے ہو گئے تھے لہذا

مل کے لوگوں نے اس دن کو منانے کیلئے خصوصی اہتمام کا فیصلہ کیا انہوں نے مل سے لندن تک

400 کلومیٹر لمبا مارچ کرنے کا اعلان کیا یہ معافی کا مارچ تھا اس مارچ کے ذریعے مل کے لوگوں

نے ان تمام سیاہ فاموں کی روجوں اور نسلوں سے معافی مانگ لی جنہیں برطانوی تاجروں نے

امریکہ میں بیچ دیا تھا میں نے جب سے یہ تصویر دیکھی ہے میں اس وقت سے اپنے آپ سے یہ

سوال پوچھ رہا ہوں "کیا اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تمام اچھے کام یورپی لوگوں کے نصیب میں لکھ دیے

ہیں" مجھے اس کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا میں روز سوچتا ہوں کیا ہمارے ملک میں بھی کسی گروہ کسی

طبقہ لکڑ کو قوم سے معافی مانگنے کی جرأت ہوگی کیا غلام محمد سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک وہ

تمام ممبران قوم سے اجتماعی معافی مانگ سکتے ہیں جنہوں نے اس ملک کے اقتدار پر شب خون مارا

تھا کیا ہمارے وہ تمام سیاستدان قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں جنہوں نے اس ملک میں امر

کے پاؤں اور ہاتھ مضبوط بنائے تھے کیا کبھی یہ لوگ بھی کسی ایک شہر میں اکٹھے ہو کر اپنی سیاسی بد

دیانتوں اپنی سیاسی مصلحتوں اور اپنی ضمیر فریبیوں کا اعتراف کر سکتے ہیں اور اس کے بعد قوم سے

اتقا کہہ سکتے ہیں "وی آر سوری" کیا پی سی او کے تحت حلف لینے والے تمام سابق اور موجودہ چیف

قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں کیا اس ملک کے تمام دانشور ادیب شاعر اور صحافی اپنی مصلحتوں

اپنے سمجھوتوں اور اپنی ضمیر فریبیوں پر قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں اور کیا وہ تمام سابق فوجی افسر

قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں جنہوں نے صدر ایوب سے لے کر یحییٰ خان اور جنرل ضیاء الحق سے

لے کر جنرل پرویز مشرف تک جرنیلوں کو اقتدار تک پہنچایا تھا اور جو اس ملک کے آئین قانون

دستور اور جمہوریت کو نقصان پہنچانے میں برابر کے شریک رہے تھے اور کیا اس ملک کے وہ تمام

تاجرانہ استاد وکیل اور ڈاکٹر بھی قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں جو برعکس چپ چاپ سہتے رہے جو ہر

زیادتی برداشت کر گئے اور جو ہمیں ایک ایسا ملک دے کر رہنا تر ہو گئے جس میں انصاف ہے

روزگار ہے اور نہ ہی میرٹ کیا اس ملک کے کسی طبقے میں اتنی جرأت اتنی ہمت موجود ہے یقین

کینے میں اس دن اس ملک اور اس میں رہنے والوں کو مسلمان سمجھوں گا جب جنرل سوارخان سے

زیر و پائنت 3.....0.....378

لے کر جنرل حمید گل اور جنس شیخ ریاض سے لے کر مولانا فضل الرحمن اور اعجاز الحق سے لے کر
چوہدری شجاعت تک اس ملک کے تمام زندہ اکابرین ملک پر مارشل لا لگانے پی سی او کے تحت
حلف اٹھانے کی ایک بنانے اور یونفارم کے حق میں ووٹ دینے پر قوم سے معافی مانگیں گے
جب یہ سب لوگ گلے میں وی آر سوری کی تختیاں لٹکا کر سڑکوں پر مارچ کریں گے کاش میری
زندگی میں وہ دن آجائے۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

سیلی بریشن

میں 2001ء میں آخری مرتبہ امریکہ گیا تھا۔ یہ دورہ امریکی حکومت کی طرف سے تھا

اور اس کے تمام تر ایشیا جات واشنگٹن کی ایک فاؤنڈیشن نے ادا کیے تھے۔ یہ فاؤنڈیشن امریکہ کے

ایک سرمایہ دار خاندان نے قائم کی تھی اور یہ تیسری دنیا کے لوجان صحافیوں کو امریکہ کی دس

ریاستوں کی سیر کراتی تھی۔ مجھے 2001ء میں اس فاؤنڈیشن کا مہمان بننے کا موقع ملا، فاؤنڈیشن

کا دفتر سرمایہ دار خاندان کے محل میں قائم تھا، یہ محل واشنگٹن کے سین قلب میں واقع تھا اور یقیناً

کرودوں ڈالر مالیت کا ہوگا۔ ہمیں دورے کے پہلے دن اس محل میں لے جایا گیا اور فاؤنڈیشن

کے بارے میں بریٹنگ دی گئی۔ یہ بریٹنگ ایک نیم سیاہ فام امریکی ڈاکٹر فلب وے رہا

تھا۔ بریٹنگ کے دوران چائے کا وقفہ ہوا تو میں باہر نکلی ہوا میں آ گیا۔ یہ محل کا خوبصورت گارڈن

تھا، باغ میں بلند و بالا درخت تھے اور دور دور تک پھیلی کھیلوں میں پھول لہرا رہے تھے۔ میں بیچ پر

بیٹھ گیا، ڈاکٹر فلب بھی باہر آ گیا، امریکہ میں عمارتوں کے اندر سگرٹ پینے پر پابندی ہے لہذا ڈاکٹر

فلب سگرٹ پینے کے لیے باہر آیا تھا۔ میں بیچ سے اٹھا اور ڈاکٹر فلب کے ساتھ گپ شپ شروع

کردی۔ وہ کیلیفورنیا کا رہنے والا تھا۔ اس کے والدین سات نسل پہلے افریقہ سے آئے تھے، اس کا

والد سیاہ فام جبکہ ماں سفید تھی لہذا اس کا رنگ سیاہ سے نیم سیاہ ہو گیا تھا، وہ یونیورسٹی میں ریسرچ

پڑھتا تھا اور 80ء کی دہائی میں ایک سال کراچی رہا تھا۔ پاکستان کا ذکر آیا تو اس نے کراچی کی

باتیں چھیڑ دیں۔ اسے کراچی کلبھنگہ اور لوگ بہت اچھے لگتے تھے۔ اس نے بتایا کراچی میں اسے ایک حکیم صاحب ملے تھے۔ وہ بہت حلیم الطبع اور شائستہ انسان تھے، فلب اکثر ان کے کلینک چلا جاتا تھا۔ وہ حکیم صاحب بعد از ان کراچی کے گورنر بھی بنے تھے فلب بار بار ان کام نام یاد کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر اسے ان کا نام یاد نہیں آ رہا تھا، میں نے اسے بتایا ان کا نام حکیم سعید تھا اور وہ بد قسمتی سے 1997ء میں شہید ہو گئے ہیں" اس کے منہ سے آہ نکلی اور وہ چند لمحوں کے لیے ادا اس ہو گیا۔ میں نے اسے بتایا میں نے حکیم سعید کی شہادت پر کالم لکھا تھا جس پر مجھے 1997ء کے بہترین کالم نگار کا ایوارڈ ملا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی، اس نے فوراً سگریٹ بجھایا۔ سگریٹ کا ٹوٹا گاڑوں کی باؤٹھری وال پر رکھا اور مسکرا کر تالیاں بجانے لگا۔ میں اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ تالیاں بجانے کے بعد اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے بڑی گرم جوشی سے مبارکباد پیش کی۔ میں نے جھک کر اس کا شکریہ ادا کیا اس نے سگریٹ کا ٹوٹا دوبارہ جلا یا، تین چار لمبے کش لیے، ٹوٹا "ڈسٹ بین" میں پھینکا اور اندر چلا گیا لیکن میں ڈاکٹر فلب کے رد عمل کے بارے میں سوچتا رہا، مجھے محسوس ہوا میں نے جب اپنے ایوارڈ کے بارے میں اسے بتایا تھا تو اس نے ایمانہ لگایا یہ میری زندگی کی ایک بڑی انجمنٹ ہے اور اسے میری انجمنٹ کو "سٹی برینٹ" کرنا چاہیے چنانچہ اس نے سگریٹ بجھایا اور تہائی میں کھڑے ہو کر میرے لیے تالیاں بجانا شروع کر دیں اس کی یہ یاد آ رہی اور وہ گاڑوں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میری یادداشت کا حصہ بن گیا۔

ڈاکٹر فلب کے ساتھ گزارے ہوئے وہ دس منٹ مجھے زندگی بھر کے لیے ایک نیا سہتی دے گئے۔ وہ سبق "سٹی برینٹ" تھا۔ ڈاکٹر فلب نے مجھے سکھایا، ہمارے دوست، ہمارے عزیز رشتے دار، بہن، بھائی، ہمسائے اور ساتھی اپنی کامیابیوں پر ہم سے مبارکباد کی توقع رکھتے ہیں۔ کسی نے اچھی تصویر بنائی ہے، کسی کی آواز اچھی ہے اور اس اچھی آواز کی وجہ سے اسے کوئی ایوارڈ ملا ہے۔ کسی نے اچھا مضمون لکھا ہے۔ کسی نے اچھی تقریر کی ہے، کسی نے امتحان میں اچھے نمبر لیے ہیں، کسی کی تنخواہ میں دو سو روپے اضافہ ہو گیا، کسی نے گالف کھیلنا شروع کر دی، کسی نے گھر بنایا، کسی نے شادی کی، کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا، کسی کے بچے نے سکول میں انعام لیا کسی کی بیوی نے اچھا اچار بنایا، کوئی اچھی ٹائی لگا کر آیا اور کسی کا عزیز رشتے دار جرنیل بن گیا یہ سب لوگ اپنی کامیابیوں کی "سٹی برینٹ" چاہتے ہیں۔ ان کے دل کے کسی گوشے میں مبارکباد کی خواہش اجزائی لیتی ہے اور جو شخص ان کی یہ خواہش پوری کر دیتا ہے وہ ڈاکٹر فلب کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے

لیے ان کے دل میں جگہ پالیتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا "سلی بریشن" ایک ایسی طاقت ہوتی ہے جو انسان کے حوصلے میں دس گنا اضافہ کر دیتی ہے جو لوگوں کا ٹیلنٹ بڑھاتی ہے اور جو لوگوں کی کامیابیوں میں اضافہ کرتی ہے مجھے محسوس ہوا مغربی معاشروں اور ہمارے ملکوں میں ایک فرق سلی بریشن بھی ہے۔ وہ لوگ دوسروں کی خوشیوں اور کامیابیوں کو سلی بریشن کرتے ہیں، وہ لوگ ایک دوسرے کو کارڈ اور پھول بھجواتے ہیں، ایک دوسرے کے لیے تالیاں بجاتے ہیں اور وہ لوگوں کو مستوج کر کے اعلان کرتے ہیں "خواتین و حضرات میرے اس دوست سے ملنے، اس کے کھیت میں ایک کلو کا نمٹا کر پیدا ہوا تھا یا کل اس کی بی بی نے چھ بچے دیئے تھے" اور لوگ کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے ہیں، مجھے یاد آیا میں ایک بار ہالینڈ کی ایک چلی کا مہمان بنا تھا، ان دنوں میربان کے بچے نے زندگی کی پہلی ڈرانگ بنائی تھی، میرا میربان گھر آنے والے ہر ملاقاتی کو بچے کا کارنامہ بتاتا تھا اور بچے اور ڈرانگ دونوں کو ملاقاتی کے حضور پیش کر دیتا تھا۔ ملاقاتی جی بھر کر بچے کے ٹیلنٹ اور ڈرانگ کی تعریف کرتا تھا، میربان نے مجھے بھی ڈرانگ دکھائی، وہ ایک انتہائی فضول اور بھدی ڈرانگ تھی، میں نے محسوس کیا لوگ صرف بچے کی حوصلہ افزائی کیلئے اس ڈرانگ کی تعریف کر رہے ہیں۔ مجھے اس وقت یہ بات عجیب لگی لیکن بعد ازاں معلوم ہوا یورپ میں لوگ دوسروں کی حوصلہ افزائی کو اپنا فرض اور ذمہ داری سمجھتے ہیں، وہاں لوگ دوسروں کی خوشیوں کو سلی بریشن کرتے ہیں۔ یورپ میں لوگ ایک دوسرے کو ملنے کے فوراً بعد "ٹانکس ٹائی یا ٹانکس سوٹ" کا نعرہ لگاتے ہیں اور پھول اور کارڈ سے دوسروں کا استقبال کرتے ہیں اور یہ عادت یورپ کی کامیابی کی بڑی وجہ ہے۔

میں نے ڈاکٹر ظہر کے بعد مغربی سوسائٹی اور پاکستانی معاشرے کا تقابل کیا تو معلوم ہوا ہم لوگ سلی بریشن کے معاملے میں بہت کجسوس ہیں۔ ہم دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے، مبارکباد پیش کرتے ہوئے یا دوسروں کے حق میں تالیاں بجاتے ہوئے شرماتے ہیں، ہم دوسروں سے دس ہزار گئے کر لیں گے لیکن ان کی خوشی میں شریک ہونے سے گریز کریں گے۔ ہم لوگوں کو خوش ہونا اور خوشی منانا نہیں آتا، آپ پاکستان کی شادیوں کو دیکھ لیجئے پاکستان کی ہر شادی کا آغاز ناراضی سے ہوتا ہے، عین شادی کے دن سارا خاندان ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ہارات آنے پر پتہ چلتا ہے دو لہجے کی بھابھی راستے سے واپس چلی گئی تھی یا بہن نے ناشتہ نہ ملنے پر رورہ کر دیا تھا، پاکستان کی تمام چھو بھیمیاں، چاچے اور ماسوں شادی پر ضرور

ناراض ہوتے ہیں، اسی طرح بچے کا نام رکھنے پر اکثر گھروں میں فساد ہو جاتا ہے۔ نئی گاڑی لینے، ملک سے باہر جانے یا سرسرا کو تھکا دینے پر بھی آدھا خاندان ناراض ہو جاتا ہے۔ میں نے اکثر پروموشن پانے والے لوگوں کے بارے میں کوئیگ کو کہتے سنا "یہ خوشامدی تھا، صاحب کا سالہ تھا یا سازشی تھا لہذا اسے پروموشن مل گئی" میں نے ہمیشہ امتحانوں میں زیادہ نمبر لینے والے طالب علموں پر نقل کا الزام لگتے دیکھا، میں نے لوگوں کو نوکری پانے والے امیدواروں کو ہمیشہ سفارشی کہتے پایا اور میں نے ہمیشہ ناکام سیاستدانوں کے منہ سے وہ اندلی کا الزام سنا، میں نے آج تک پاکستان کے کسی والد کو اپنے بیٹے یا بیٹی کی آواز، ڈرانگ یا کھیل کی تعریف کرتے نہیں دیکھا اور میں نے آج تک کسی شخص کے منہ سے کسی سیلف میڈ کی اچھائی نہیں سنی۔ میں نے آج تک ہر شخص کی کامیابی پر دوسروں کو کڑھتے اور جلتے ہوئے دیکھا۔ میرے ایک دوست کل دوسرے دوست پر رشوت خوردی کا الزام لگا رہے تھے، میں نے وجہ پوچھی تو وہ مسکرا کر بولے "اس نے ملازمت کے پانچویں سال میں گھر بنا لیا" میں نے کہا "ملازمت کے پانچویں سال میں گھر بنانے کا مطلب رشوت تو نہیں ہوتا، کیا تم نے کبھی اسے رشوت لینے دیکھا، کسی نے تمہیں بتایا اور کیا آج تک اس کے خلاف رشوت ستانی کا کوئی کیس درج ہوا" اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میں دوسرے دوست کو بھی جانتا تھا مجھے معلوم تھا اس نے بے شمار لوگوں سے قرض لے کر مکان بنایا تھا لیکن میرا دوست میری بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا، یہ ایک جلیس رویہ تھا ہمارا پورا معاشرہ اس جلیس رویے کا شکار ہے، ہم دوسروں کی کامیابیوں میں خامیاں تلاش کرتے ہیں شاید یہی وجہ ہے ہمارے ہاں ٹیلنٹ پروان نہیں چڑھ رہا، ہم لوگ دوسرے کی خوشی پر خوش نہیں ہوتے شاید یہی وجہ ہے ہم سب میں خوشی ختم ہوتی جا رہی ہے، ہم لوگ بھول گئے ہیں خوشی ہمیشہ دوسرے لوگوں کو خوش رکھنے کی جلتی ہے اور جب تک آپ دوسروں کی کامیابی کو تسلیم نہیں کرتے آپ خود بھی کامیاب نہیں ہوتے، ہم لوگ بھول گئے ہیں خوشی کی تیل ہمیشہ مسائے کے گھن میں لگتی ہے اور وہاں سے ہوتی ہوئی ہمارے گھن میں سایہ کرتی ہے اور ہم بھول گئے ہیں اگر مسایہ خوش نہیں ہوگا تو ہم تک کبھی خوشی نہیں پہنچے گی اور اگر ہم دوسروں کی خوشی کو سیلی برت نہیں کریں گے تو دوسرے کبھی ہماری کامیابیوں کو "سیلی بریشن" کی کھا نہیں دیں گے۔



ترتیب

خواجہ صاحب نے فرمایا "بنیادی طور پر ہماری ترتیب غلط ہے، ہماری ترجیحات درست نہیں، مثلاً آپ ریٹائرمنٹ کو الے لیجئے پاکستان میں میجرز کی جگہ فیلڈ مارشل لینے والے نیچے کیا کر گئے ہیں؟" وہ خاموش ہوئے اور میری طرف دیکھنے لگے، میں نے جواب دیا "وہ ایف ایس سی میں داخلہ لیتے ہیں، وہ میڈیکل میں چلے جاتے ہیں یا انجینئرنگ کا شعبہ اختیار کر لیتے ہیں، وہ سکرائے، بالکل ٹھیک، یہ نیچے سائنس کا شعبہ منتخب کرتے ہیں، یہ ڈاکٹری بن جاتے ہیں یا انجینئر، جبکہ کم نمبر لینے والے نیچے ایف اے کرتے ہیں اور اس کے بعد بی اے کر لیتے ہیں، بی اے میں زیادہ نمبر لینے والے نیچے ایم اے یا ایم ایس سی کرتے ہیں، کسی کالج میں پیکچر ادب پڑھتی ہوتے ہیں یا پھر ایم فل اور پی ایچ ڈی کر لیتے ہیں جبکہ کم نمبر والے ای ایس ایس کرتے ہیں اور بیورو کریش بن جاتے ہیں، تعلیم کے اس کھیل میں پیچھے رہ جانے والے نیچے سیدھے سیاست کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں، یہ لوگ کونسلر بنتے ہیں، ناظم منتخب ہوتے ہیں، ایم پی اے، ایم این اے اور سینیٹر بنتے ہیں، مشیر اور وزیر بن جاتے ہیں اور پھر پورٹلک چلاتے ہیں، وہ ایک لمحے کے لئے رے کے اور اس کے بعد بوئے، تم اس سارے عمل کا جائزہ لو، کلاس میں سب سے لائق پچھڑا کٹر بنا، اس سے کم لائق پچھڑا کٹر کیسی میں آیا اور سب سے لائق نیچے کا ہاں بن گیا اور کلاس کا سب سے نالائق پچھڑا سیاست میں گیا اور پورے صوبے یا پورے ملک کے ڈاکٹروں اور بیورو کریش کا افسر بن گیا اور اس کے ہاتھ میں

پورے ڈیپارٹمنٹ کی عنان آگئی "میں ہنس پڑا ان کی بات واقعی دلچسپ تھی۔

وہ مسکرائے اور اسی نرم آواز میں بولے "یہ پورے معاشرے کا المیہ ہے تم غور کرو ہمارے معاشرے کا ناکام شاگرد بڑا ہو کر کیا بنتا ہے وہ استاد بن جاتا ہے ناکام استاد وائس چانسلر ہو جاتا ہے ناکام ڈاکٹر دو اڈوں کی فیکٹری لگا لیتا ہے یا ہسپتال کا مالک بن جاتا ہے نالائق انجینئر چند برسوں میں چیف انجینئر بن جاتا ہے ناکام وکیل جج مہرتی ہو جاتا ہے بے ایمان اور چور شخص زکوٰۃ کمیٹی کا چیئرمین بن جاتا ہے ناکام کرکٹرز پاکستان کرکٹ بورڈ کا چیئرمین ہو جاتا ہے ناکام خاوند اور ماہوس باپ سفیر بنا دیا جاتا ہے نوکری کے دسترو یو میں قیل ہونے والا نوجوان کمپنیوں کا مالک بن جاتا ہے سکول میں بچوں کے لٹچ باکس چوری کرنے والا شخص بینک شیجر ہو جاتا ہے اور سکول اور کالج کے ہر امتحان میں قیل ہونے والا بچہ وزیر تعلیم بن جاتا ہے "وہ دم لینے کے لئے رکے اور لمبا سانس بھر کر بولے "تم دیکھ لو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری ترتیب الٹ ہے ہم میں سے ہر شخص کا پاس ہم سے نالائق ہے معاشرے میں ہر باصلاحیت شخص کے اوپر ایک نالائق اور تم صلاحیت کا شخص پہنچا ہے تم سیاست کو دیکھ لو سیاست ملک کا سب سے اہم شعبہ ہوتا ہے لیکن تم یونین کونسل سے پارلیمنٹ تک تمام سیاستدانوں کو دیکھو جنہیں ان میں دنیا جہان کی خرابیاں اور خامیاں ملیں گی استاد معاشروں کے معیار ہوتے ہیں تم اپنے استادوں کا معیار اور صلاحیت دیکھ لو بیورو کریٹس سسٹم کی مائیں ہوتے ہیں تم ان کا معیار اور صلاحیت دیکھ لو کاروباری لوگ معاشروں کا خون ہوتے ہیں تم ان لوگوں کی ذہنیت اور خیالات دیکھ لو پروفیشنل لوگ معاشروں کا جسم ہوتے ہیں تم ان کو دیکھ لو اور دانشور صحافی اور ادیب قوموں کی روح ہوتے ہیں یہ لوگ عوام کی کردار سازی کرتے ہیں تم ان لوگوں کا معیار بھی دیکھ لو تمہیں شرم آئے گی "وہ ر کے اور دوبارہ بولے "تم مجھے بتاؤ کیا ہم نے پچھلے ساٹھ برسوں میں عالمی سطح کا کوئی دانشور ادیب اور صحافی پیدا کیا؟ کیا ہم نے عالمی سطح کی کوئی ایک کپٹی بنائی؟ کیا ہم نے عالمی سطح کا کوئی ایک چیف ایگزیکٹو کوئی ایک انجینئر کوئی ایک ڈاکٹر کوئی ایک وکیل اور کوئی ایک سیاستدان پیدا کیا؟ کیا ہم اپنے کسی ایک سیاستدان کا مقابلہ یورپ امریکہ اور جاپان کے سیاستدانوں سے کر سکتے ہیں "انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا میں نے انکار میں سر ہلا دیا "وہ مسکرائے "یہی وجہ ہے ہم اکیسویں صدی میں یونین فارم کا دفاع کر رہے ہیں ہمارے وزیر اعلیٰ پنجاب جناب چودھری پرویز الہی جلسہ عام میں اعلان کرتے ہیں وہ جنرل پرویز مشرف کو یونین فارم کے ساتھ دس مرتبہ صدر منتخب کریں گے اور

ہماری اسمبلیاں وروی کے حق میں قراردادیں پاس کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے ہمارے بیورو کرپک سسٹم کو دنیا کا ناقص ترین نظام قرار دیا جاتا ہے، ہمارے ڈاکٹروں کو تصانی کا خطاب ملتا ہے، دنیا ہماری عدالتوں کو "کینگر کورٹس" کہتی ہے اور ہماری انڈسٹری کو جعلی صنعت کہا جاتا ہے" وہ رک گئے، میں ان کی بات غور سے سن رہا تھا۔

وہ بولے "ہم اب آتے ہیں دین کی طرف، دین کی حالت اس سے بھی خراب ہے، تم اپنے علماء کرام کی حالت دیکھ لو، یہ کون لوگ ہیں؟ کیا ہم لوگ خانہ ان کے معذور، کند ذہن اور بیمار بچے کو مولوی نہیں بنا دیتے؟ کیا یہ بچے بعد ازاں پورے ملک کی امامت نہیں کرتے، کیا یہ لوگ بعد ازاں ہم لوگوں کا اسلام سیدھا اور معاشرے کی دینی تربیت نہیں کرتے؟" وہ رکے اور دوبارہ بولے "حقیقت تو یہ ہے ہمارے دینی طبقے کے تو بے فیصد لوگ انگریزی نہیں جانتے، یہ لوگ ہوائی جہاز پر نہیں بیٹھتے، انہیں کمپیوٹر چلانا نہیں آتا اور یہ پاکستان کا جغرافیہ نہیں بتا سکتے، تم خود دیکھو، ہم دین کو کس قسم کا "سٹف" دے رہے ہیں، کیا آج تک پاکستان میں میٹرک، ایف اے، بی اے اور

ایم اے کے امتحانات میں ایسا پوزیشن حاصل کرنے والا کوئی نوجوان مولوی بنا؟ کیا بی اے ایس اور سی ایس ایس میں اول پوزیشن حاصل کرنے والا کوئی افسر ہمارا امام بنا؟ کیا ہمارے ملک میں بارورڈ، کیمبرج، آکسفورڈ اور ہائینڈل برگ کا کوئی ڈگری ہولڈر شخص عالم دین بنا؟ کیا آج تک ہمارے کسی عالم دین نے مذاہب میں پی ایچ ڈی کی اور اس کی ڈگری کو دنیا کی دس بڑی یونیورسٹیوں نے تسلیم کیا؟ کیا ہم نے آج تک پاکستان میں عالمی سطح کی کوئی دینی یونیورسٹی قائم کی؟ کیا آج تک پاکستان کے کسی بڑے سیاسی گھرانے کا کوئی فارن کوالی فائینڈ بچہ در سے میں بھرتی ہوا اور کیا آج تک ہمارے علماء کرام نے ملک میں کوئی میڈیکل کالج، کوئی انجینئرنگ یونیورسٹی، کوئی مینجمنٹ انسٹیٹیوٹ اور کوئی ریسرچ لیبارٹری بنائی؟ وہ خاموش ہو گئے، میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

وہ مسکرائے "دین مسلمان کی زندگی کی سب سے بڑی ترجیح ہوتی ہے لیکن ہم اس ترجیح کو سب سے کم اہمیت دیتے ہیں۔ ہم معاشرے کا سب سے محروم اور معذور ترین شخص اس شعبے کے حوالے کرتے ہیں لہذا آج ہمارے دین کی بھی وہی حالت ہے جو سیاست، کاروبار، تجارت اور تعلیم کی ہے" میں خاموش رہا، وہ بولے "ہم امریکہ، اسرائیل اور یورپ کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں لیکن جب تک ہم اپنے معاشرے میں ان جیسی ترتیب قائم نہیں کریں گے اس وقت تک ہم ان

کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے، امریکہ میں اس وقت 26 ہزار بی ایچ ڈی پادری ہیں، امریکہ میں چرچ 55 ہزار ہسپتال اور میڈیکل کالج چلا رہا ہے۔ امریکہ میں ہر سال ہارورڈ، شین فورڈ، کولمبیا اور جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے دو ہزار پادری ڈگری لیتے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور جاپان کی کابینہ کے 70 اےسڈاز کان پروفیسر ہیں اور یورپ کے 82 فیصد سیاستدان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ اسرائیلی تاجروں میں سب سے زیادہ ٹیکس دیتے ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ "پڑھا کوڑا" سیاستدان برطانیہ میں پائے جاتے ہیں۔ اسرائیل نے 1965ء میں فارمولایا تھان کے سب سے زیادہ ذہین شخص کو مذہب میں جانا چاہیے۔ اس سے کم صلاحیت کے شخص کو تعلیم میں آنا چاہیے۔ اس سے کم کو سیاست میں، اس سے کم کو کاروبار میں، اس سے کم بیوروکریسی میں اور اس سے کم صلاحیت کے لوگوں کو فنی اور ٹیکنیکی شعبوں کا رخ کرنا چاہیے۔ اسرائیل میں آج کوئی طلاق یافتہ کوئی کنوارہ اور کوئی ناکام باپ جمع نہیں بن سکتا۔ دو برس پہلے اسرائیل کے ایک چیچ کا بیٹا چوری کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ وہ چیچ صاحب اسی دن مستعفی ہو گئے تھے، کیوں؟ کیونکہ یہودی سمجھتے ہیں جو شخص اپنی بیوی کو راضی نہیں رکھ سکتا اور جو اپنے اپنے کو مجرم بننے سے نہیں روک سکتا وہ معاشرے کو انصاف فراہم نہیں کر سکتا لہذا وہ لوگ دنیا میں بھی ترقی کر رہے ہیں اور ان کا مذہب بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے، جب تک ہم لوگ بھی ایسی ترتیب قائم نہیں کرتے، ہم اپنی ترجیحات ٹھیک نہیں کرتے، ہم لوگ آگے نہیں بڑھیں گے، ہم لوگ اس طرح مار کھاتے رہیں گے۔"



جاب اور کام

نوجوان کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس نے پکوں پر نشور کھ لیا، ہم سب چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ اس کی جگہ کوئی بھی نہ دتا تو اس کی یہی صورت حال ہوتی، آپ ایک لمحے کے لیے خود سوچنے لگے۔

اگر آپ نے اچھی پوزیشن کے ساتھ ایم بی اے کیا ہوتا، آپ ایک صحت مند اور خوبصورت جوان ہوتے لیکن آپ نوکری کے لیے جہاں بھی درخواست دیتے ہوں، آپ کو وہاں سے صاف جواب مل جاتا ہوتا ہے کہ آپ پر کیا گزرے گی، آپ کا رد عمل کیا ہوگا لہذا یہ نوجوان بری طرح داخلی نوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

میں نے اس سے کہا "میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں" اس نے سراٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تجر اور بے بسی تھی، میں نے عرض کیا۔ "کیپ ٹاؤن کی میڈیکل یونیورسٹی کو طبی دنیا میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کا پہلا بائی پاس آپریشن اسی یونیورسٹی میں ہوا تھا اس یونیورسٹی نے تین سال پہلے ایک ایسے سیاہ فام شخص کو "ماسٹر آف میڈیسن" کی اعزازی ڈگری دی جس نے زندگی میں کبھی سکول کا مہ نہیں دیکھا تھا۔ جو انگریزی کا ایک لفظ پڑھ سکتا تھا اور یہی لکھ سکتا تھا لیکن 2003ء کی ایک صبح دنیا کے مشہور سرجن پروفیسر ڈیوڈ ڈینٹ نے یونیورسٹی کے آؤٹ روم میں اعلان کیا، ہم آج ایک ایسے شخص کو میڈیسن کی اعزازی ڈگری دے رہے ہیں جس نے دنیا میں سب سے زیادہ سرجن پیدا کیے، جو ایک غیر معمولی استاد اور ایک حیران کن سرجن ہے اور جس نے میڈیکل سائنس اور انسانی دماغ کو حیران کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پروفیسر

نے ہیملٹن کا نام لیا اور پورے ایڈیٹوریم نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ یہ اس یونیورسٹی کی تاریخ کا سب سے بڑا استقبال تھا۔ "نوجوان چپ چاپ سنتا رہا۔ میں نے عرض کیا "ہیملٹن کیپ ٹاؤن کے ایک دور دراز گاؤں سنیانی میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین چاہے تھے وہ بکری کی کھال پہنتا تھا اور پہاڑوں پر سارا سارا دن ننگے پاؤں پھرتا تھا، بچپن میں اس کا والد بیمار ہو گیا لہذا وہ بھیڑ بکریاں چھوڑ کر کیپ ٹاؤن آ گیا۔ ان دنوں کیپ ٹاؤن یونیورسٹی میں تعمیرات جاری تھیں۔ وہ یونیورسٹی میں مزدور بھرتی ہو گیا۔ اسے دن بھر کی محنت مشقت کے بعد جتنے پیسے ملتے تھے وہ پیسے گھر بھجواتا تھا اور خود اپنے چپا کر کھلے گراؤنڈ میں سو جاتا تھا۔ وہ برسوں مزدور کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ تعمیرات کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ یونیورسٹی میں مالی بھرتی ہو گیا۔ اسے ٹینس کورٹ کی گھاس کاٹنے کا کام ملا وہ روز ٹینس کورٹ پہنچتا اور گھاس کاٹنا شروع کر دیتا، وہ تین برس تک یہ کام کرتا رہا پھر اس کی زندگی میں ایک عجیب موڑ آیا اور وہ میڈیکل سائنس کے اس مقام تک پہنچ گیا جہاں آج تک کوئی دوسرا شخص نہیں یہ ایک نرم اور گرم مہمان تھی۔"

نوجوان سیدھا بول کر بیٹھ گیا۔ میں نے عرض کیا "پروفیسر وارنٹ جوڑ ڈرائے پر تھیں

کر رہے تھے، وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے جب زرافہ پانی پینے کے لیے گردن جھکاتا ہے تو اسے فٹنی کا دورہ کیوں نہیں پڑتا؟ انہوں نے آپریشن ٹیبل پر ایک زرافہ لٹایا، اسے بے ہوش کیا لیکن جوں ہی آپریشن شروع ہوا زرافے نے گردن بلا دی چنانچہ انہیں ایک ایسے مضبوط شخص کی ضرورت پڑ گئی جو آپریشن کے دوران زرافے کی گردن جکڑ کر رکھے۔ پروفیسر تھمیزر سے باہر آئے، سامنے ہیملٹن گھاس کاٹ رہا تھا، پروفیسر نے دیکھا وہ ایک مضبوط قد کاٹھ کاٹھ کا صحت مند جوان ہے۔ انہوں نے اسے اشارے سے بلایا اور اسے زرافے کی گردن پکڑنے کا حکم دے دیا۔ ہیملٹن نے گردن پکڑ لی، یہ آپریشن آٹھ گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران ڈاکٹر چائے اور کافی کے وقفے کرتے رہے لیکن ہیملٹن زرافے کی گردن تھام کر کھڑا رہا۔ آپریشن ختم ہوا تو وہ چپ چاپ باہر نکلا اور جا کر گھاس کاٹنا شروع کر دی۔ دوسرے دن پروفیسر نے اسے دوبارہ بلایا وہ آیا اور زرافے کی گردن پکڑ کر کھڑا ہو گیا، اس کے بعد یہ اس کی روٹین ہو گئی وہ یونیورسٹی آتا آٹھ دس گھنٹے آپریشن تھمیزر میں جانوروں کو پکڑتا اور اس کے بعد ٹینس کورٹ کی گھاس کاٹنے لگتا، وہ کئی مہینے دوہرا کام کرتا رہا اور اس نے اس ڈیوٹی کا کسی قسم کا اضافی معاوضہ طلب کیا اور تھی شکایت کی۔ پروفیسر رابرٹ جوڑ اس کی استقامت اور اخلاص سے متاثر ہو گیا اور اس نے اسے مالی سے "لیب اسٹنٹ" بنا

دیا۔ ہیملٹن کی پرموشن ہوگئی۔ وہ اب یونیورسٹی آف آپریشن تھیز پینچا اور سرجنوں کی مدد کرتا۔ یہ سلسلہ بھی برسوں جاری رہا۔ 1958ء میں اس کی زندگی میں دوسرا اہم موڑ آیا۔ اس سال ڈاکٹر برنارڈ یونیورسٹی آئے اور انہوں نے دل کی منتقلی کے آپریشن شروع کر دیئے۔ ہیملٹن ان کا اسٹنٹ بن گیا، وہ ڈاکٹر برنارڈ کے کام کو غور سے دیکھتا رہتا، ان آپریشنوں کے دوران وہ اسٹنٹ سے ایڈیٹل سرجن بن گیا۔ اب ڈاکٹر آپریشن کرتے اور آپریشن کے بعد اسے ٹانگے لگانے کا فریڈ سونپ دیتے، وہ انتہائی شاندار ٹانگے لگاتا تھا، اس کی انگلیوں میں صفائی اور تیزی تھی، اس نے ایک ایک دن میں پچاس پچاس لوگوں کے ٹانگے لگائے۔ وہ آپریشن تھیز میں کام کرتے ہوئے سرجنوں سے زیادہ انسانی جسم کو سمجھنے لگا چنانچہ بڑے ڈاکٹروں نے اسے جونیئر ڈاکٹروں کو سکھانے کی ذمہ داری سونپ دی۔ وہ اب جونیئر ڈاکٹروں کو آپریشن کی تکنیکس سکھانے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ یونیورسٹی کی اہم ترین شخصیت بن گیا۔ وہ میڈیکل ایمنس کی اصطلاحات سے ناواقف تھا لیکن وہ دنیا کے بڑے سے بڑے سرجن سے بہتر سرجن تھا۔ 1970ء میں اس کی زندگی میں تیسرا موڑ آیا، اس سال جگر پر تحقیق شروع ہوئی تو اس نے آپریشن کے دوران جگر کی ایک ایسی ٹریان کی نشاندہی کر دی، جس کی وجہ سے جگر کی منتقلی آسان ہوگئی۔ اس ہی اس نشاندہی سے میڈیکل سائنس کے بڑے دماغوں کو حیران کر دیا، آج جب دنیا کے کسی کونے میں کسی شخص کے جگر کا آپریشن ہوتا ہے اور مریض آکھ کھول کر روشنی دیکھتا ہے تو اس کا سیاب آپریشن کا ثواب براہ راست ہیملٹن کو چلا جاتا ہے، اس کا حسن ہیملٹن ہوتا ہے، اس خاصوش ہو گیا۔

نوجوان ستارہ رہا، میں نے عرض کیا "ہیملٹن نے یہ مقام اخلاص اور استقامت سے حاصل کیا۔ وہ 50 برس کیپ ناؤن یونیورسٹی سے وابستہ رہا، ان 50 برسوں میں اس نے کبھی چھٹی نہیں کی۔ وہ رات تین بجے گھر سے نکلتا تھا، 14 میل پیدل چلتا ہوا یونیورسٹی پینچا اور ٹھیک چھ بجے تھیز میں داخل ہو جاتا۔ لوگ اس کی آمدورفت سے اپنی گھڑیاں ٹھیک کرتے تھے، ان پچاس برسوں میں اس نے کبھی تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ نہیں کیا، اس نے کبھی اوقات کار کی طوالت اور سہولتوں میں کمی کا شکوہ نہیں کیا لہذا پھر اس کی زندگی میں ایک ایسا وقت آیا جب اس کی تنخواہ اور مراعات یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے زیادہ تھیں اور اسے وہ اعزاز ملا جو آج تک میڈیکل سائنس کے کسی شخص کو نہیں ملا۔ وہ میڈیکل ہسٹری کا پہلا ان پڑھ استاد تھا۔ وہ پہلا ان پڑھ سرجن تھا جس نے زندگی میں تیس ہزار سرجنوں کو ٹریینگ دی، وہ 2005ء میں فوت ہوا تو اسے یونیورسٹی

میں دفن کیا گیا اور اس کے بعد یونیورسٹی سے پاس آؤٹ ہونے والے سرجنوں کے لیے لازم قرار دے دیا گیا وہ ڈگری لینے کے بعد اس کی قبر پر جائیں، تصویر بنوائیں اور اس کے بعد عملی زندگی میں داخل ہو جائیں۔ میں رکا اور اس کے بعد نوجوانوں سے پوچھا "تم جانتے ہو اس نے یہ مقام کیسے حاصل کیا" نوجوان خاموش رہا، میں نے عرض کیا "صرف ایک ہاں سے" جس دن اسے زرانے کی گردن پکڑنے کے لیے آپریشن تھیٹر میں بلایا گیا تھا اگر وہ اس دن انکار کر دیتا، اگر وہ اس دن یہ کہہ دیتا میں مالی ہوں میرا کام زرافوں کی گردنیں پکڑنا نہیں تو وہ مرتے دم تک مالی رہتا یہ اس کی ایک ہاں اور آٹھ گھنٹے کی اضافی مشقت تھی جس نے اس کے لیے کامیابی کے دروازے کھول دیئے اور وہ سرجنوں کا سرجن بن گیا۔"

نوجوان خاموش رہا، میں نے اس سے عرض کیا "ہم میں سے زیادہ تر لوگ زندگی بھر جاب تلاش کرتے رہتے ہیں جبکہ ہمیں کام تلاش کرنا چاہیے" نوجوان نے غور سے میری طرف دیکھا، میں نے عرض کیا "دنیا کی ہر جاب کا کوئی نہ کوئی کرائی میرا ہوتا ہے اور یہ جاب صرف اس شخص کو ملتی ہے جو اس کرائی نہر پر پورا تر تھے جبکہ کام کوئی کرائی نہر یا نہیں ہوتا۔ میں باگرا آج چاہوں تو میں پتہ نہیں میں دنیا کا کوئی بھی کام شروع کر سکتا ہوں اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس کام سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ہیملٹن اس راز کو چاہتا تھا لہذا اس نے جاب کی بجائے کام کو فوقیت دی یوں اس نے میڈیکل سائنس کی تاریخ بدل دی۔ ذرا سوچو اگر وہ سرجن کی جاب کیلئے اپلائی کرتا تو کیا وہ سرجن بن سکتا تھا؟ کبھی نہیں، لیکن اس نے کھرپے نیچے رکھا، زرانے کی گردن تھامی اور سرجنوں کا سرجن بن گیا" میں رکا اور ہنس کر بولا "تم اس لیے بے روزگار"۔ تاکام ہو کہ تم جاب تلاش کر رہے ہو، کام نہیں، جس دن تم نے ہیملٹن کی طرح کام شروع کر دیا تم نوٹل پرائز حاصل کر لو گے، تم بڑے اور کامیاب انسان بن جاؤ گے۔"



ون میں شو

حاجی صاحب چینی کے بیوپاری تھے، انہوں نے زندگی کا آغاز پاٹری (لوڈر) کی حیثیت سے کیا، انہیں برس پہلے انہوں نے چینی کی دس بوریاں اڈھار لیں، ایک ٹرک سے پرہیز نہیں اور پاٹری سے دوکاندار بن گئے، ان کا کاروبار چل نکلا اور وہ 80ء کی دہائی میں پاکستان میں چینی کے سب سے بڑے بیوپاری سمجھے جانے لگے، حاجی صاحب کی دوکان سے جس قیمت پر پہلی بوری نکلتی تھی وہ اس دن پورے ملک میں چینی کا ریٹ ہوتا تھا، ان کا ٹیجر بور یوں میں نوٹ بھر کر بینک لے جاتا تھا، حاجی صاحب 1990ء میں انتقال کر گئے، ان کے چار بیٹے تھے، وہ اپنے بیٹوں کیلئے بے تحاشا جائیداد اور دولت چھوڑ کر گئے لیکن آج 16 برس بعد ان کے چاروں بیٹے فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں، ان کی جیب میں راولپنڈی سے اسلام آباد تک کا کرایہ نہیں ہوتا اور وہ قطار میں لگ کر پولیٹنی سٹور سے سستی چینی خریدتے ہیں۔

حاجی صاحب اور ان کی اولاد پاکستان کے ”جینک پر ایلز“ کی ایک ادنیٰ سی مثال ہیں۔ ہم لوگوں میں ایک جینیاتی خامی ہے ہماری ایک نسل کا ہنر ترکہ ور شا اور تجربہ دوسری نسل میں منتقل نہیں ہوتا ہے، ہماری ایک نسل بے تحاشا دولت کماتی ہے جب یہ دولت دوسری یا تیسری نسل تک جاتی ہے تو وہ اسے ضائع کر دیتی ہے وہ فقیر ہو جاتی ہے، ایک نسل دنیا کی بہترین صنعت کار، بزنس مین، مصور، موسیقار، نچوکار اور دانشور ہوتی ہے جبکہ دوسری نسل بانجھ، ان پڑھ، عیاش اور

نکٹھو ہوتی ہے، ہماری ایک نسل بادشاہوں کی طرح زندگی گزارتی ہے جبکہ دوسری نسل چٹائیوں پر سوتی ہے، ہماری ایک نسل سونے کے نوالے کھاتی ہے جبکہ دوسری نسل ایک ایک لقمے کو ترس جاتی ہے۔ ہماری ایک نسل فنکار ہوتی ہے جبکہ دوسری نسل بے ہنر اور بے ٹہن ہوتی ہے، ہماری ایک نسل زمیندار ہوتی ہے جبکہ دوسری نسل فیکٹریوں میں مزدوری کرتی ہے، ہماری ایک نسل جہازوں میں سفر کرتی ہے جبکہ دوسری نسل ویکوں میں اٹھکے کھاتی ہے اور ہماری ایک نسل علامہ محمد اقبال ہوتی ہے جبکہ دوسری نسل جاوید اقبال ہوتی ہے؟ کیوں؟ یہ "کیوں" اس ملک کا اصل مسئلہ ہے اور اس کیوں میں اس خطے کے تمام مسائل کی جڑیں پھوست ہیں، ہم لوگ بنیادی طور پر انفرادیت پسند اور انفرادیت پرست ہیں، ہم لوگ اپنا ہنر، اپنی کامیابی، اپنی انجمنیت اور اپنا تجربہ دوسری نسل میں منتقل نہیں کر پاتے، ہم لوگ ادارہ بنانے کی قابلیت یا اہلیت پیدا نہیں کر پاتے، ہم لوگ اپنی کامیابی کو کبھی کی شکل نہیں دے پاتے، ہم لوگ "ون مین شو" ہیں، ہمارے تمام ادارے، تمام دفاتر، تمام فیکٹریاں اور تمام کاروبار کسی ایک شخص کی ذات کے ارد گرد گھومتے ہیں، جس دن وہ شخص چھٹی کر جاتا ہے، ملک سے باہر چلا جاتا ہے، ہزار ہوں سے باہر نکل جاتا ہے، انتقال کر جاتا ہے، اس دن وہ پورا ادارہ، وہ پوری ایسپائریشن چلتی ہے اور وہ سارا کاروبار تباہ ہو جاتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں یورپ، امریکہ اور مشرق بعید کے لوگ اپنی کامیابی، اپنا ہنر، اپنی قابلیت، اپنی دولت اور اپنا تجربہ دوسرے لوگوں کو منتقل کرتے ہیں، وہ اپنی اگلی نسل کو دولت کے ساتھ ساتھ تجربہ، اعتماد اور ہنر بھی دیتے ہیں، وہ ایسے ادارے بناتے ہیں جو ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتے ہیں، آپ آج مل گئیں گے کوئی کاروبار یا سائنس سے نکال دیں یقین کیجئے اس سے مائیکروسافٹ کے کاروبار پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، یہ ادارہ سو پچاس سال تک اسی رفتار سے آگے بڑھتا رہے گا جبکہ اس کے مقابلے میں آپ میاں فٹا کو نکال دیں، آپ دیوان ضیاء یا عیش ڈیڈی کو الگ کر دیں، آپ دیکھیں گے پوری ایسپائریشن جڑیں تک مل جائیں گی، گورے اور پاکستانی میں یہی فرق ہے، یہ بنیادی طور پر اپروچ کا فرق ہے۔ یہ زیادہ یہ نظر اور طریقہ کار کا فرق ہے، مغرب کے لوگ مل کر ادارہ بناتے ہیں، وہاں شخص کی بجائے اداروں کی حیثیت اور اہمیت ہوتی ہے، وہاں لوگ نظام یا سسٹم پر توجہ دیتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں لوگ ہزار ہزار ملازمین کے اداروں کو اپنی ہاں اور تان پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ پورے پورے چھکے کو اپنا نظام بنا دیتے ہیں، وہ پورے پورے ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ مزارعوں جیسا سلوک کرتے ہیں لہذا ہمارے زیادہ تر ادارے "ون مین شو" ہوتے ہیں اور جس دن

”ون مین“ ختم ہو جاتا ہے اسی دن سارے ”شو“ کی تہیاں بچھ جاتی ہیں آپ اپروچ کا فرق ملاحظہ کیجئے پوری دنیا میں ماکان اپنے اداروں کیلئے ماہر اور ”کیسینٹ“ لوگوں کو منتخب کرتے ہیں جبکہ ہم لوگ اپنے گرد ہمیشہ خوشامد یوں، چالیسوں اور منانوں کی فوج جمع کرتے ہیں، ہمارے معاشرے میں خوشامد سب سے بڑی اہلیت اور قابلیت سمجھی جاتی ہے، ہم ہمیشہ کمزور، نالائق اور غلامانہ ذہنیت کے شخص کو ملازم رکھتے ہیں اور ہم ایسے ملازم منتخب کرتے ہیں جو ہمارے ادارے میں پچیس تیس برس تک کم تنخواہ پر کام کرتے رہیں، ہمارا دوسرا کھیل اس سے بھی خطرناک ہوتا ہے ہم اپنی زندگی میں اپنے بچوں کو اپنے کام، اپنے ہنر اور اپنے تجربے سے دور رکھتے ہیں، ہم انہیں بڑی گاڑیاں اور بھاری کریڈٹ کارڈ دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں ”جا بچہ پیش کر“ اور بچہ پیش کرنا شروع کر دیتا ہے لہذا اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے جس دن ہماری آنکھ بند ہوئی ہے اسی دن ہمارا شو ختم ہو جاتا ہے، اسی دن ہماری ساری ایما پانڈھرا م ہو جاتی ہے۔

ہمارا یہ مسئلہ صرف کاروبار اور کارپوریٹ سیکٹر تک محدود نہیں، ہماری حکومتیں اور نظام بھی ون مین شو ہوتے ہیں، ہمارے حکمران ایک نظام تشکیل دیتے ہیں وہ جب تک اقتدار میں رہتے ہیں ان کا نظام دنیا کا بہترین سمجھا جاتا ہے لیکن جوں ہی وہ ایوان اقتدار سے باہر قدم رکھتے ہیں ان کا نظام، ان کی اصلاحات اور بعض اوقات ان کا آئین بھی رخصت ہو جاتا ہے، آپ صدر ایوب خان کو لیجئے ایوب خان نے پاکستان میں جمہوریت، خوشحالی، صنعت کاری اور پرائیویٹائزیشن کا دس سالہ جشن منایا تھا لیکن جب وہ رخصت ہوئے تو ان کا بی ڈی سشم، ان کی خوشحالی اور ان کے پانچ پانچ سالہ منصوبے بھی گھر چلے گئے، ان کا آئین بھی ختم ہو گیا اور ان کا دل پونٹ بھی نوٹ گیا، جسنو اپنے ساتھ نیشنلائزیشن اور اسلامی سوشلزم لائے تھے ان کی یہ دونوں پالیسیاں ضیاء الحق کے دور میں پھانسی چڑھ گئیں اور جنرل ضیاء الحق کی اسلامی اصلاحات 1988ء میں ہوا میں پھٹ گئیں، اس کے بعد بے نظیر بھٹو کی پالیسیوں کو جناب نواز شریف نے روند دیا اور نواز شریف کے فارمولے 12 اکتوبر 1999ء کو فارغ ہو گئے لہذا آپ ہماری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے ہماری کسی حکومت کی کوئی خوبی دوسری حکومت تک ٹرانسفر نہیں ہوئی، ہماری حکومتوں کا بنایا کوئی منصوبہ دوسری حکومت تک نہیں پہنچا یہاں حالت یہ ہے بے نظیر بھٹو کے دور میں بجلی کے قحط پونٹ خوشحالی اور کامیابی ہوتے ہیں لیکن نواز شریف کے دور میں وہ تھاری اور کرپشن بن جاتے ہیں ایک دور میں موٹروے کا نامہ ہوتا ہے اور دوسرے دور میں وہی موٹروے سفید ہتھی کا درجہ پا

جاتی ہے کیوں؟ یہ کیوں ہماری جینیاتی خرابی ہمارا دن میں شو ہے ہماری ساری کامیابیاں صرف ہماری ذات تک محدود رہتی ہیں ہم انہیں آگے ٹرانسفر کرنے میں ناکام رہتے ہیں آپ موجودہ حکومت کو لیجئے، آج جب حکومت اپنے نظام کے بارے میں دھوے کرتی ہے، جب یہ خوشحالی اور اعتدال پسندی کے نعرے لگاتی ہے تو مجھے ہنسی آ جاتی ہے کیونکہ میں اس ملک، اس خطے کی تاریخ سے واقف ہوں، میں جانتا ہوں جس دن ان حکمرانوں کے پاؤں دہلیز سے نیچے اتریں گے اسی دن ان کی اعتدال پسندی اور ان کی خوشحالی کا فبارہ پھٹ جائے گا، اسی دن ان کا دن میں شو بھی ختم ہو جائے گا۔ ہم لوگوں کے جنموں میں خرابی ہے، ہم میں سے ہر نسل اپنے لئے نیا گھر بناتی ہے ہمارے ملک میں باپ کی سوچ بیٹے کو منتقل نہیں ہوتی اور بیٹا اپنا تجربہ اپنا ہنر اپنی صلاحیت اور اپنی کامیابی اپنے بیٹے کو منتقل کئے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے چنانچہ ہماری ہر نسل اپنے لئے نئی بنیادیں کھودتی ہے اور ہماری ہر نسل اپنے لئے نیا سٹیم بناتی ہے!

ہم جب تک اپنی اس خرابی کو نہیں سمجھیں گے اور ہم جب تک اسے دور کرنے کی محسوس بندوبستی نہیں کریں گے ہم آگے نہیں بڑھیں گے ہم اس وقت تک ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے چلتے رہیں گے ہم اس وقت تک دائروں میں سفر کرتے رہیں گے۔



وقادار

جوزف رائیل سے میری ملاقات ایک لائف ٹائم تجربہ تھا۔ جوزف ایسٹراڈیم میں فاسٹ فوڈ کی سب سے بڑی کمپنی کا مالک تھا۔ شہر میں اس کے چھ اس کے زیادہ ریستوران تھے وہ دن میں آدھ گھنٹہ کیلئے اپنے کسی ریستوران پر جاتا اپنے کارکنوں سے ملتا ان کے ساتھ کپ شپ لگاتا اور اگلے ریستوران کی طرف نکل جاتا شام کو وہ ”ڈیم سکوائر“ کے ایک ریستوران میں بیٹھتا کافی پیتا اپنے دوستوں کے ساتھ کپ لگاتا اور گھر چلا جاتا یہ اس کا معمول تھا میرا ایک دوست اس کے ریستوران میں کام کرتا تھا میرا یہ دوست 1990ء میں ہالینڈ گیا تھا اس نے جوزف کے پاس نوکری شروع کی تھی اور اس کے بعد اس نے 16 سال جوزف کے ساتھ گزار دیئے میں اس کی مستقل مزاجی پر حیران تھا یورپ میں ایک ہی ادارے اور ایک ہی نوکری سے چپکے رہنے کو نفعیاتی مرض سمجھا جاتا ہے یورپ کے بارے میں کہا جاتا ہے وہاں نوکری عورت اور موسم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا لیکن میرے اس دوست نے یورپ کے اس فلسفے کو بدل دیا اس نے 16 سال ایک ہی ریستوران کے کاؤنٹر پر گزار دیئے میں نے ایک دن اس سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ مسکرا کر بولا ”صرف جوزف کی وجہ سے“ مجھے بڑی حیرت ہوئی میرے دوست نے اپنی بات جاری رکھی ”صرف میں نہیں بلکہ آج تک جس شخص نے بھی جوزف کو جوائن کیا وہ اسے چھوڑ کر نہیں گیا“ میرے لئے یہ بات بھی حیران کن تھی میں نے اپنے دوست سے وجہ پوچھی وہ مسکرا کر بولا ”جوزف ہر

شام ہمارے رستوران میں آتا ہے کافی پیتا ہے اور دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا ہے میں آج اس کے ساتھ تمہاری ملاقات طے کر دیتا ہوں تم اس سے خود پوچھ لینا۔" میں نے فوراً حامی بھری۔

جوزف کے ساتھ میری ملاقات طے ہو گئی شام چھ بجے جوزف وہاں آ گیا وہ ایک

کنو بیہودی تھا اس کی ناف تک لمبی داڑھی تھی سر پر سیاہ ہیٹ اور گھٹنوں تک لمبا کوٹ تھا اس کے

ہاتھ میں قیمتی پتھروں کی چھوٹی سی تینجی تھی اور وہ وقفے وقفے سے عبرانی زبان میں کچھ بڑا بڑا تھا

میرے دوست نے مجھے اس کے سامنے بٹھا دیا میں نے جوزف کا غور سے جائزہ لیا مجھے اس کی

شخصیت میں ایک ان دیکھی کشش محسوس ہوئی وہ دھلا دھلا سا نرم مزاج شخص تھا اس نے

میرے ساتھ گپ شپ شروع کر دی وہ مختلف موضوعات پر سوال کرتا اور میرے جوابوں میں سے

نئے سوال نکالتا سوال و جواب کے اس سلسلے کے دوران میں نے اس کے ملازمین کا حوالہ دیا اور

اس سے پوچھا "آپ کے ملازم آپ کو چھوڑتے کیوں نہیں ہیں؟" وہ مسکرایا "میں ملازمین کا

انتخاب بڑی احتیاط سے کرتا ہوں میرا اپنا کرائیو ہے اور جو شخص اس کرائیو پر پورا نہیں اترتا

میں اسے ملازم نہیں رکھتا" میں خاموشی سے سنتا رہا وہ بولا "جب کوئی شخص میرے پاس نوکری کے

لئے آتا ہے تو میں اس سے پوچھتا ہوں کیا تم عبادت کرتے ہو اگر وہاں میں جواب دے دو وہ

میرا پہلا امتحان پاس کر جاتا ہے" میں نے اسے نوک کر پوچھا "عبادت سے تمہاری کیا مراد ہے"

اس نے مسکرا کر جواب دیا "اگر وہ مسلمان ہے تو کیا وہ نماز پڑھتا ہے وہ عیسائی ہے تو کیا وہ چرچ

جاتا ہے یہودی ہے تو سینا گوگا بند ہے تو مندر اور بودھ ہے تو کیا وہ ٹھیل جاتا ہے وہ کسی مذہب کا

ماننے والا ہو جس میں صرف یہ دیکھتا ہوں کیا اس کا مذہب کے ساتھ تعلق قائم ہے" میں نے ہاں میں سر

ہلا دیا وہ بولا "میں اس کے بعد اس سے پوچھتا ہوں وہ اپنے خاندان بیوی اور بچوں کو کتنا وقت دیتا

ہے اگر اس کا جواب روزانہ چار گھنٹے اور ہفتے میں دو دن ہو تو میں اسے ملازم رکھ لیتا ہوں میں

طلاق یافتہ اور مطلقہ لوگوں کو ملازمت نہیں دیتا اگر کوئی کنوارا شخص میرے ادارے میں ملازم

ہو جائے تو دو سال کے اندر اندر شادی کا پابند ہوتا ہے" میرے لئے یہ شرط بھی عجیب تھی لیکن میں

خاموش رہا وہ بولا "میں یہ دیکھتا ہوں کیا وہ سال میں ایک مہینے چھٹیاں لیتا ہے اور کیا وہ یہ چھٹیاں

اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کسی اچھے مقام پر گزارتا ہے" میں یہ دیکھتا ہوں وہ اور قائم تو نہیں لگتا اور

وہ ہفتے اور اتوار کی چھٹی اپنے خاندان اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتا ہے اگر مجھے معلوم ہو وہ سارا

سال کام کرتا ہے وہ اور قائم لگتا ہے یا وہ ہفتے اور اتوار کے دن بھی کام کرتا ہے تو میں اسے ملازم

نہیں رکھتا" میں خاموش رہا وہ بولا "میں اس سے پوچھتا ہوں کیا وہ ہفتے میں کم از کم پانچ دن

ایکسر سائز کرتا ہے، کیا وہ واک 'جائنگ' سائیکلنگ اور ویٹ ٹریننگ کرتا ہے؟ اگر اس کا جواب ناں میں ہو تو میں فوراً معذرت کر لیتا ہوں" میں اس کی بات غور سے سننا رہا، وہ بولا "اور میں اس سے آخری سوال پوچھتا ہوں، کیا وہ باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہے؟ کیا وہ اخبارات، رسائل یا کتابیں پڑھتا ہے اور کیا اس کے دوستوں میں کوئی پڑھا لکھا شخص موجود ہے؟ اگر وہ ہاں کہہ دے تو میں اسے نوکری دے دیتا ہوں" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے جوزف سے کہا "یہ ساری چیزیں تو ذاتی ہیں، ان کا کام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور یہ ملازمت کے سرورج اصولوں کے بھی خلاف ہیں" اس نے تہتہ لگا یا اور میرا ہاتھ دبا کر بولا "مجھے معلوم تھا تم مجھ سے یہی کہو گے" وہ تھوڑی دیر کا "اس نے بیٹا کر سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر بولا "ان تمام چیزوں کا تعلق ذات سے نہیں بلکہ وفاداری سے ہے" میں سمجھتا ہوں جو شخص اپنے ساتھ وفادار نہیں وہ دنیا کے کسی شخص کے ساتھ وفادار نہیں ہو سکتا، جو شخص اپنے رب کی اطاعت نہیں کرتا وہ دنیا کے کسی شخص کی اطاعت نہیں کرتا، جو شخص اپنے آرام کا خیال نہیں رکھتا وہ کسی شخص کو آرام نہیں پہنچا سکتا، جو شخص اپنے خاندان کو دقت نہیں دے سکتا وہ دنیا کے کسی شخص کو دقت نہیں دیتا، جو شخص اپنی سمحت اور سلاستی کا خیال نہیں رکھتا وہ شخص کسی شخص کی سلاستی اور سمحت کا خیال نہیں رکھ سکتا اور جو شخص پڑھتا نہیں وہ شخص زندگی میں سیکھتا نہیں اور جو شخص زندگی میں سیکھتا نہیں وہ کسی ادارے کسی کپنی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا، میرا فلسفہ ہے جو شخص اپنے ساتھ وفادار نہیں وہ کسی ادارے، کسی کپنی اور کسی شخص کے ساتھ وفادار نہیں ہو سکتا لہذا میں ہمیشہ اپنے لئے وفادار لوگوں کا انتخاب کرتا ہوں" اس کی بات میرے لئے بالکل تازگی میں نے سوچا "وائی وفاداری کا آغاز انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے جو شخص اپنے ساتھ بے وفا ہو وہ دوسروں کے ساتھ کیسے وفاداری کر سکتا ہے؟ جو شخص اپنے اللہ کے ساتھ دھوکہ کر رہا ہو، جو اپنی ذات کے ساتھ دغا کر رہا ہو، جس نے اپنے خاندان، اپنے وجود اور اپنے ذہن کو محروم کر رکھا ہو وہ دوسروں کے ذہن، وجود اور خاندان کو کیسے نواز سکتا ہے؟ وہ ان کا بھلا کیسے سوچ سکتا ہے؟" میں نے اس بیوی کی ہاتھ تھاما، اسے سیلوٹ کیا اور باہر آ گیا اور فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر سوچنے لگا "میں بھی ان لوگوں میں شمار ہوتا ہوں جو روز اپنے ساتھ بے وفائی کرتے ہیں، جو اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور انہوں نے اس دھوکے کو پروفیشنل، چاب اور مصروفیت کا نام دے رکھا ہے" میں نے اسی وقت اپنا تھیلا کندھے پر رکھا اور فٹ پاتھ پر جو گنگ شروع کر دی، میں نے وفاداری کے میدان میں پہلا قدم رکھ دیا۔



بس ایک قدم

”تم جانتے ہو دنیا کا مصروف ترین ایئر پورٹ کون سا ہے؟“ ان کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں میں نے پانچ سات ایئر پورٹوں کا نام لیا لیکن ہر نام پر انہوں نے غلی میں سر ہلا دیا میں نے تھک کر عرض کیا ”سر آپ ہی بتا دیجئے“ وہ ٹھٹھے لہجے میں بولے ”شکاگو کا او۔ ہیئر (O. HARE) دنیا کا مصروف ترین ایئر پورٹ ہے اس ایئر پورٹ سے روزانہ 60 انٹرنیشنل فلائٹس اڑتی ہیں یہ دنیا میں یونائیٹڈ ایئر لائنز کا سب سے بڑا اور امریکن ایئر لائنز کا دوسرا بڑا مرکز ہے اس نے 2003ء میں ٹالی امریکہ کے بہترین ایئر پورٹ کا اعزاز بھی حاصل کیا تھا اس کے 4 ٹرمینل اور چھ پرائمری ایئر کیئر بیزنس ویز ہیں۔“

میں نے انہیں ستائشی نظروں سے دیکھا وہ مسکرا کر بولے ”لیکن کہانی یہ نہیں کہانی اس ایئر پورٹ کا نام ہے“ میں خاموشی سے سنتا رہا وہ بولے ”او۔ ہیئر ایک چھوٹا سا سرکاری ملازم تھا او۔ ہیئر کا پورا نام ہیئر او۔ ہیئر (BUTCH-O HARE) تھا وہ امریکی فوج میں فائینٹر پائلٹ تھا دوسری جنگ عظیم کے دوران اس کی ڈیوٹی ایئر کرافٹ کیئر بیئر LEXINGTON پر لگ گئی یہ ایئر کرافٹ کیئر بیئر چیفک اوشین میں کھڑا تھا او۔ ہیئر اور اس کے دوسرے فائینٹر پائلٹس بحری جہاز سے طیارے اڑاتے تھے جاپانیوں پر حملے کرتے تھے اور واپس آ جاتے تھے 1941ء دسمبر کی ایک شام او۔ ہیئر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اڑا یہ لوگ ابھی چند میل دور گئے تھے کہ او۔ ہیئر نے

اپنے منگلی انجن "گرودرین ایف 4 ایف" طیارے کے فیول کی سوئی دیکھی اس کے طیارے میں پٹرول بہت کم تھا۔ او۔ بیر نے اپنے چیف کو اپنی پوزیشن بتادی چیف نے اسے فوری طور پر واپس جانے کا حکم دے دیا۔ او۔ بیر ائیر کرافٹ کیریئر کی طرف واپس مڑ گیا جب وہ کیریئر کے قریب پہنچا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا اس نے دیکھا 9 جاپانی طیارے کیریئر پر حملہ آور ہیں اور کیریئر کی حفاظت کیلئے وہاں کوئی طیارہ موجود نہیں اس صورتحال میں او۔ بیر کے پاس دو راستے تھے وہ اکیلا ان تمام جاپانی طیاروں کا مقابلہ کرتا یا پھر وہ اپنی جان بچا کر فرار ہو جاتا۔ او۔ بیر ایک دلیر شخص تھا لہذا اس نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا وہ جاپانی طیاروں پر چل پڑا وہ نضا میں طیاروں پر بھینستا ان پر گولے پھینکتا اور دوسری طرف نکل جاتا وہاں سے واپس پلٹتا اور دشمن طیاروں پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتا اس نے آدھے گھنٹے میں دشمن کے 5 طیارے مار گرائے اس دوران اس کا بارود ختم ہو گیا اس نے نئی تکنیک سے لڑنا شروع کر دیا وہ دشمن طیارے پر بھینستا اور اسے اپنے طیارے کے پر سے چھینتا اور دوسری طرف نکل جاتا اس تکنیک کے نتیجے میں دشمن کے مزید تین طیارے تباہ ہو گئے جبکہ دشمن کا آخری طیارہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور وہ سمندر میں گر گیا۔ او۔ بیر کیریئر پر آتا آیا اسی اثناء میں اس کے ساتھی پھیلٹا واپس آ گئے او۔ بیر نے انہیں سزاوی رو داد سنائی لیکن لوگوں نے یقین کرنے سے انکار کر دیا اس زمانے میں امریکی فضائیہ کے تمام طیاروں میں کمرے نصب ہوتے تھے یہ کمرے آپریشنز کے دوران تصویریں اتارتے رہتے تھے او۔ بیر اپنے طیارے سے کمرہ اتار کر لے آیا جب تصویریں بن کر آئیں تو پورے امریکہ میں شور ہو گیا امریکہ کا بچہ بچہ او۔ بیر زندہ باد کے نعرے لگانے لگا حکومت نے فروری 1942ء میں اوہیر کو دوسری جنگ عظیم کا پہلا نیوی ایس (ACE) ایوارڈ دیا جبکہ 1943ء میں اسے امریکن آرمی کے انتہائی شاندار ایوارڈ فلائنگ کراس سے بھی نوازا گیا او۔ بیر 26 نومبر 1943ء میں ایک جنگی مہم پر نکلا اس کا طیارہ دشمن کا نشانہ بنا وہ سمندر میں گر اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے لاپتہ ہو گیا اس کی موت کے بعد امریکی حکومت نے اپنا سب سے بڑا ایئر پورٹ اس کے نام منسوب کر دیا وہ خاموش ہو گئے۔

میں نے جذباتی لہجے میں کہا "سرویل ڈن یہ تو واقعی لاجواب کہانی ہے" وہ مسکرائے "میں میں تمہیں اس سے بھی اچھی کہانی سنانا چاہتا ہوں" میں ہنسنے لگا "میں نے سنا کہ وہ بولے" شکاگو میں ایزی ایزی نام کا ایک وکیل رہتا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے بے تھمنا ذہانت سے نوازا رکھا تھا"

اسے امریکہ کا سارا قانون اذرتھا وہ شکاگو کا سب سے اچھا مقرر بھی تھا کیریئر کے آغاز میں اس کی ملاقات الکپون نام کے ایک بد معاش سے ہو گئی الکپون شکاگو کا مافیا لارڈ تھا پورا شہر اس سے ڈرتا تھا الکپون نے ایزی ایڈی کو اپنا ڈبیل نامزد کر دیا پولیس جب بھی الکپون کو پکڑتی ایزی ایڈی اسے بڑی مہارت سے چھڑا لیتا اس زمانے میں لوگ کہتے تھے اگر الکپون کو ایزی ایڈی کا تعاون حاصل نہ ہو تو اس کا سارا مافیا ایک مہینے میں بکھر جائے ایزی ایڈی نے الکپون سے بے تحاشا مالی فوائد حاصل کیے جس کے نتیجے میں اس کا شمار شکاگو کے امرا میں ہوتا تھا اس کے پاس شہر کا سب سے بڑا فارم ہاؤس تھا وہ بیسیوں گاڑیوں اور لمبے چوڑے بینک بیلنس کا مالک تھا ایزی ایڈی کا ایک ہی بیٹا تھا اس نے اسے دنیا کی برکت دے رکھی تھی ایک دن یہ بیٹا گھر آیا اور اپنے باپ کا دامن پکڑ کر بولا ایزی ایڈی میں جب بھی باہر جاتا ہوں تو بچے مجھے الکپون الکپون کہہ کر بھیجتے ہیں بیٹے کی یہ بات باپ کے دل پر گئی وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور اس نے سوچا میں نے اپنے بیٹے کو دنیا کی تمام سہولتیں دے دی ہیں لیکن میں اسے ایک اچھی شناخت ایک اچھا نام نہیں دے سکا ایزی ایڈی نے اسی وقت الکپون کا ہاتھ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا وہ گھر سے نکلا تو وہ جانتا تھا وہ اب کبھی گھر واپس نہیں آسکے گا کیونکہ الکپون کے کانغذوں میں خداری کی سزا موت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ایزی ایڈی سیدھا ہاتھ دیا اور اس نے الکپون کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے کا اعلان کر دیا پولیس نے اسی وقت الکپون کو گرفتار کر لیا ایزی ایڈی گھر کی طرف رخصت ہوا تو اسے راستے میں کسی نے گولی سے اڑا دیا "وہ ر کے اور میری طرف دیکھ کر مسکرائے" یہ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے "میں نے حیران ہو کر عرض کیا "سر یہ تو ایک نہایت ہی فضول اور بچکانہ کہانی ہے "جاسوس ناول اور ڈائجسٹ ایسی کہانیوں سے مجھے بڑے ہیں "انہوں نے تہقیر لگایا "میں ابھی ایک فقرہ بولوں گا اور یہ دنیا کی بہترین اور انتہائی قیمتی کہانی ہو جائے گی" انہوں نے سرکس کے جادو گروں کی طرح میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے "ہماری پہلی کہانی کا ہیرو داو۔ ہیرا اس ایزی ایڈی کا بیٹا تھا" مجھے جھٹکا لگا اور میں شدت حیرت سے کھڑا ہو گیا۔

وہ مسکرائے "میرے پوپے بعض فیصلے بعض نیکیاں کھجور کے درختوں کی طرح ہوتی ہیں ایک نسل انہیں کا شت کرتی ہے ان کی آبیاری کرتی ہے انہیں جو ان کرتی ہے اور اس کے بعد قبر میں اتر جاتی ہے اور دوسری نسل اس نیکی اس فیصلے کا پھل کھاتی ہے اگر ایزی ایڈی اس لمحے یہ فیصلہ نہ کرتا تو اس کا بیٹا بڑا ہو کر کسی مافیا کا حصہ بن جاتا وہ کسی پولیس مقابلے میں مارا جاتا اور تاریخ

اس کا نام تک فراموش کر دیتی لیکن ایزی ایڈی نے اپنے بیٹے کو اچھا نام دینے کا فیصلہ کیا، وہ خود مہر مہیا لیکن اپنے بیٹے کو نیکی اور سچ کے راستے پر کھڑا کر گیا یہاں تک کہ اس کا بیٹا او۔ ہیرا اس راستے پر چلتا چلا امریکہ کا قومی ہیرو بن گیا، وہ اپنے باپ کو ایک ایسی شناخت دے گیا جو قیامت تک برقرار رہے گی، آج بھی جب کوئی طیارہ او۔ ہیرا نیر پورٹ پر اترتا ہے "انیر ہوشس خواتین و حضرات ہم چند لمحوں میں او۔ ہیرا نیر پورٹ پر اترنے والے ہیں" کا اعلان کرتی ہے تو سب لوگ سر سے ٹوپی اتار کر ایزی ایڈی کی عظمت کو سلام کرتے ہیں، وہ سر خم کر کے اسے زندہ باد کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، ایزی ایڈی اور اس کے بیٹے او۔ ہیرا کی کہانی بتاتی ہے اچھے فیصلے درخت کی قلم کی طرح ہوتے ہیں، اگر آپ چاہتے ہیں آپ کی اولاد گری، تپش اور بارش سے محفوظ رہے تو آپ کو ایزی ایڈی کی طرح اپنے گمن میں کسی اچھے فیصلے کی قلم بونا پڑتی ہے، آپ کو اپنی نسل اپنی اولاد کو اچھا نام دینے کیلئے اپنی جان اپنی ذات کی قربانی دینا پڑتی ہے، میں چاہتا ہوں اس ملک کا ہر صاحب اولاد اپنی سبز پر ایزی ایڈی کا نام لکھ کر دے اور ہر فیصلہ کرنے سے پہلے ایک منٹ کیلئے سوچے، کیا میرا یہ فیصلہ میرے بیٹے کو او۔ ہیرا بنا دے گا، اگر اس کا جواب ہاں ہو تو اسی وقت فیصلے کی طرف اٹھ کھڑا ہو، فیصلہ کا یہ ایک تدمہ اسے تاریخ کا سنگ میل بنا دے گا۔"



ایڈجسٹمنٹ

نو جوان کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ بار بار انگلی کی نوک سے آنسو صاف کرتا تھا اور شرمندگی سے دائیں بائیں دیکھتا تھا میں اسے پچھلے پندرہ منٹ سے دیکھ رہا تھا اس کی زندگی طوفانوں میں گھری تھی وہ تین سال کا تھا تو اس کی والدہ انتقال کر گئی والد نے دوسری شادی کرنی سوتیلی ماں سوتیلی زیادہ تھی اور ماں کم لہذا جوانی تک گھر اس کیلئے گھر نہیں تھا اس کا سارا بچپن سارا لڑکپن اور جوانی کا ایک لسیا حصہ محرومیوں میں گزرا وہ معمولی معمولی خواہشوں کیلئے ترستار ہا اسکول میں اسے اچھے استاد اور بہتر دوست نہ ملے اس نے ایف ایس سی کی کوشش کی لیکن ناکام ہو گیا ایف اے میں اس کے نمبر اچھے نہ آئے اس نے سپورٹس میں پینے کی کوشش کی لیکن نہ بن سکا اس نے اداکاری، صداکاری اور مصوری کی کوشش کی لیکن لیل ہو گیا اس نے موسیقی سیکھنے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی اس کی کوئی پوزیشن نہ تھی وہ نوکریاں تلاش کرتا رہا ہر جگہ درخواست دی ہر میٹ میں بیٹھا ہر جگہ انٹرویو دیا لیکن ناکام رہا اس نے اپنا کاروبار شروع کیا وہ بھی نہ چل سکا وہ اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن لڑکی کے والدین اپنی بیٹی کسی ناکام شخص کے حوالے کرنے کیلئے تیار نہیں تھے لہذا 245 ممالک پر پھیلی اس دنیا میں اس کا کوئی دوست نہ تھا وہ کتابیں پڑھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن آدمی سے زیادہ کتاب نہیں پڑھ سکتا تھا وہ آدمی قلم دیکھ کر اٹھ جاتا تھا اور کوئی گانا پورا

نہیں سن سکتا تھا وہ تبلیغی جماعت میں شامل ہوا لیکن راستے سے بھاگ آیا وہ کبھی سگریٹ پینا شروع کر دیتا تھا اور کبھی سگریٹ نوشی ترک کر دیتا تھا وہ کبھی مولوی بن جاتا تھا اور کبھی ڈانسروں کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا اور وہ کبھی کسی درگاہ پر بیٹھ جاتا تھا اور کبھی رندوں اور جواریوں کی محفل کا حصہ بن جاتا تھا اسے سمجھ نہیں آتی تھی وہ کیا ہے وہ کیوں ہے اور اس نے زندگی میں کیا کرنا ہے؟ اس کا کہنا تھا وہ دنیا کا نا کام ترین شخص ہے!

میں بڑے غور سے اس کی کہانی سنتا رہا وہ بول بول کر تھک گیا تو میں نے اسے پانی کا گھاس پیش کیا اور اس سے پوچھا "تم جانتے ہو دنیا میں کتنے موسم ہیں" وہ ڈرا سوچ کر بولا "سردی، گرمی، بہار اور خزاں چار موسم ہیں" میں نے پوچھا "سردیوں میں کیا ہوتا ہے؟" اس نے خشکی سے میری طرف دیکھا اور ناراض لہجے میں بولا "سردیوں میں سردی ہوتی ہے!" میں نے مسکرا کر گردن ہلائی اور اس سے سوال کیا "ہم سردیوں میں سردی سے بچنے کیلئے کیا کرتے ہیں" وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا میں نے عرض کیا "ہم کونکوں کی انگلیں جلا لیتے ہیں، ہم ہینڈ کراؤنگس پہنتے ہیں، ہم گرم کپڑے پہنتے ہیں، سویٹر، جزیان، گوٹ اور چیکس پہنتے ہیں، ہاروں کے گرد منظر لپیٹ لیتے ہیں اور سر پر اونٹنی ٹوپی پہن لیتے ہیں، ہم پاؤں میں گرم جرابیں اور بند جوتے پہنتے ہیں اور کم سے کم باہر نکلتے ہیں، ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟" میں اس کی طرف دیکھنے لگا وہ ڈرا دیر تک کر بولا "ہم سردی سے بچنے کیلئے کرتے ہیں" میں نے انکار میں سر ہلایا اور آہستہ سے جواب دیا "نہیں ہم جانتے ہیں سردیاں چند دنوں کی بات ہے اگر ہم نے یہ دو تین ماہ گزار لئے تو موسم کھل جائے گا اور ہم گرم کپڑوں کے بغیر باہر نکل سکیں گے" وہ خاموش رہا میں نے عرض کیا "گرمیوں میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہوتی ہے ہم ٹھنڈے کپڑے پہنتے ہیں، کمروں میں پچھلے روم کولر اور ایئر کنڈیشنر لگا لیتے ہیں، درختوں کے نیچے بیٹھتے ہیں اور سایوں میں چلتے ہیں، ہم دن میں دو دو تین تین بار غسل کرتے ہیں، شربت پیتے ہیں اور گرم دوپہروں میں باہر نہیں نکلتے، کیوں؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا میں نے دوبارہ عرض کیا "موسم خزاں میں پودوں کے پتے گر جاتے ہیں، ساری گھاس جل جاتی ہے اور درخت ٹنڈ ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد بہار آتی ہے، گھاس کی کونٹیں نکلتی ہیں، شاخیں ہری ہوتی ہیں، ان پر پتے نکلتے ہیں اور پتوں کے ساتھ پھول کھلتے ہیں" میں خاموش ہو گیا اس نے کروٹ بدلی اور گرم آواز میں بولا "لیکن میراں موسموں کا مرہ، کہا، کے ساتھ کس تعلق؟ حساب، عاد، آ، ناکر، ایلا، ہینڈ، اور فٹنڈ،

بات کر رہے ہیں، میں آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں اور آپ کچھ جواب دے رہے ہیں مجھے آپ کی پائلٹ سمجھ نہیں آ رہی“

میں نے تہقہہ لگایا اور نوجوان سے عرض کیا ”میں دو ہاتھ ثابت کرنا چاہتا ہوں ہم لوگ موسم کی سختیاں اس لئے برداشت کرتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہوتا ہے یہ سردیاں یہ گرمیاں اور یہ خزاں چند دنوں کی بات ہے اور اس کے بعد وقت بدل جائے گا اگر ہم اس حقیقت سے واقف نہ ہوں تو تم یقین کرو ہم لوگ سردیوں میں جم جائیں یا پھر گرمیوں میں پگھل جائیں تمہارا پہلا مسئلہ یہ ہے تم وقت کی حقیقت سے واقف نہیں ہو تم یہ نہیں جانتے تبدیل ہونا وقت کی فطرت ہے جب تک زندگی اور کائنات قائم ہے وقت تبدیل ہوتا رہے گا سردیاں گرمیوں میں ضرور تبدیل ہوں گی اور گرمیاں سردیوں میں ضرور ڈھلس گئی شام کی صبح ضرور ہوگی اور صبح شام کے پردوں میں ضرور گم ہوگی ناکامی کا سماجی میں ضرور بدلے گی کمال ضرور زوال پذیر ہوگا اور طاقت کمزور طاقت اور اختیار بے اختیار میں ضرور تبدیل ہوگا خوشبو بد بو اور بد بو خوشبو میں ضرور تبدیل ہوگی اور

دوسرا تم یہ نہیں جانتے دنیا کی کوئی طاقت موسموں کو نہیں بدل سکتی دنیا کے سارے حکمران سارے اختیارات اور ساری قوتیں مل کر سردیوں کو نہیں روک سکتیں دنیا کا کوئی شخص گرمیوں کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا اور دنیا کی کوئی طاقت خزاں اور بہار کو نہیں روک سکتی دنیا کا کوئی شخص ناکامی مشکل بنتی اور بیماری سے نہیں بچ سکتا اور دنیا کا کوئی شخص سدا کا میاں ہمیشہ خوشحال تا مرگ صحت مند اور پوری زندگی کبھی نہیں رہ سکتا وقت اور کیفیت کبھی یکساں نہیں رہتی وہ خاموشی سے سنتا رہا میں نے عرض کیا ”ہم لوگ موسموں وقت اور کیفیتوں کو تبدیل نہیں کر سکتے ہم ان کے ساتھ صرف ایڈجسٹ کر سکتے ہیں آندھی آئے تو ہمیں نیچے بیٹھ جانا چاہیے سردیاں ہوں تو آگ جلا کر سردی گزرنے کا انتظار کریں گرمیاں آئیں تو ٹھنڈی جگہ بیٹھ جائیں اور ہلکے پھلکے کپڑے پہن لیں خزاں آئے تو ٹھنڈے درختوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں اور بہار آئے تو چند دن کی بہار سے لطف اٹھائیں بہار سے پاس وقت اور موسموں کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا اسی طرح ہم نے برسے وقتوں ناکامیوں خرابیوں بیماریوں اور پریشانیوں کے ساتھ بھی ایڈجسٹ کرنا ہوتا ہے اگر ہماری ماں تین سال میں ہمیں چھوڑ گئی تو ہم اسے واپس نہیں لاسکتے چنانچہ ہم نے ماں کی کمی کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا ہے ہمیں اچھے سکول اچھے استاد اور اچھے کلاس فیلو نہیں ملے ہم کسی کلاس میں اچھے نمبر نہیں لے سکتے ہمیں نوکری نہیں ملی ہم پرنس میں ناکام ہو گئے اور ہماری شادی مرضی

کے مطابق نہیں ہوئی تو ہم نے ان کیوں کے ساتھ بھی ایڈ جسٹ کرنا ہے ہم نے کبھی اپنی خواہشوں پر کبھی دے دینا ہے اور کبھی اپنی حسرتوں کو سائے میں لٹا دینا ہے ہم نے کبھی اپنی آرزوؤں کو دودھ یا غسل دینا اور کبھی انہیں سینر کے سامنے ٹھکانا دینا ہے ہم نے کبھی آنکھوں میں زمین پر لٹ کر وقت بدلنے کا انتظار کرنا ہے اور کبھی درختوں پر چڑھ کر صبح کی راہ کھنی ہے ہم نے زندگی کے ساتھ ایڈ جسٹ کرنا ہے "میں رکا اور ذرا دیر بعد بولا" ہم میں سے جو لوگ موسموں کے ساتھ ایڈ جسٹ نہیں کرتے وہ جم جاتے ہیں یا پگھل جاتے ہیں "میں خاموش ہو گیا وہ سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے بولا "لیکن سر میں نے کب تک ایڈ جسٹ کرنا ہے" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور ہنس کر جواب دیا "جب تک تمہارے مقدر کی آمدگی تمہیں نہیں جاتی یاد رکھو دنیا کی کوئی تختی ساڑھے سات برس سے لمبی نہیں ہوتی اور دنیا کا کوئی شخص جس کیفیت میں پیدا ہوتا ہے اس کیفیت میں فوت نہیں ہوتا اور دنیا کا کوئی ناکام شخص پوری زندگی ناکام نہیں رہتا کیونکہ تبدیلی وقت کا مقدر بھی ہے اور فطرت بھی"

Kashif Azad@OneUrdu.com

بڑے گھروں والے

میں نے ان سے پوچھا "خوبصاحب پورا عالم اسلام زوال کا کیوں شکار ہے، ہم دنیا کے بڑے گھروں والے ہیں، ہر خطے میں ہمارے گھرانے اور ذوالے تو کثرت سے پائے گئے" فرعونیت کی وجہ سے "میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا، یہ وہ وقت ہوتا ہے جب وہ سوال پسند نہیں کرتے، انہوں نے فرمایا "فرعون کے بے شمار معانی ہیں، ان معنوں میں ایک مطلب بڑے گھر والا بھی ہوتا ہے، فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا، اس کی اس جسارت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے ناپسند فرمایا، جب اللہ تعالیٰ کسی کو ناپسند فرماتے ہیں تو وہ اس شخص کی ہر ادا، ہر عادت کو خرابی بنا دیتے ہیں اور آنے والے زمانوں میں جو بھی شخص اللہ کے اس شرک کی بچہ دہی کرتا ہے، جو بھی اس کی عادات اپناتا ہے اللہ اسے بھی اس زوال، اس انجام کا شکار بنا دیتا ہے" میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا، انہوں نے فرمایا "فرامین مصر کو بلند و بالا اور وسیع و عریض ہمارے بنانے کا شوق تھا، ان کا خیال تھا محلات، دربار، قلعے اور دروازے طاقت اور اختیار کی علامت ہوتے ہیں اور اگر انہوں نے خود کو خدا ثابت کرتا ہے تو انہیں پہاڑوں سے بلند عمارتیں بنانی چاہیں چنانچہ وہ اس خیال میں مبتلا ہو گئے، خود را در کیلئے رکے منگرا کر میری طرف دیکھا اور اس کے بعد بولے "یہاں تک کہ انہوں نے اپنے لئے دنیا کی سب سے بڑی قبریں تیار کیں، آپ اہرام مصر دیکھیں، یہ کیا ہیں یہ وسیع و عریض قبریں ہیں، سائنس آج تک حیران ہے یہ لوگ اتنے بڑے بڑے پتھر کہاں سے

اے انہوں نے یہ پتھر ایک دوسرے کے ساتھ کیسے جوڑے اور ان لوگوں نے کربوں کے بغیر یہ پتھر ایک دوسرے کے اوپر کیسے رکھے، یہ مقبرے دراصل ان کی سوچ اور فکر کے آئینہ دار ہیں، یہ مقبرے ثابت کرتے ہیں فرعون حقیقتاً بڑے عُروں والے لوگ تھے اور وہ اپنے بڑے بڑے گھروں، قلعوں اور قبروں سے خود کو خدا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ خولبہ صاحبہ مکمل طور پر خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا: "لیکن فرعون کے گھروں کا ہمارے زوال کے ساتھ کیا تعلق؟" وہ مسکرائے "بڑا گہرا تعلق ہے، فرعون اللہ کا دشمن تھا اور اللہ اپنے دشمن کی عادتوں کو پسند نہیں کرتا چنانچہ دنیا کے تمام بڑے گھروں والے لوگ جلد یا بدیر فرعون جیسے انجام کا شکار ہوتے ہیں، یہ لوگ ان کی خدائی اور ان کے بڑے بڑے گھریلا خرزوال پذیر ہو جاتے ہیں "میں خاموشی سے سنتا رہا، وہ بولے "تم دنیا میں ترقی اور بہتری پانے والے لوگوں، معاشروں، قوموں اور ملکوں کا جائزہ لو تو چھبیس چھوٹے گھروں، چھوٹے دفاتروں اور چھوٹی گاڑیوں والے لوگ، ملک اور معاشرے ترقی پاتے نظر آئیں گے جبکہ بروہ ملک جس کے بادشاہ، حکمران، وزیر، مشیر، بیوروکریٹس اور تاجر بڑے

گھروں، چھوٹے دفاتروں میں رہتے ہیں وہ ملک اور معاشرہ خرزوال پذیر ہوگا "میں خاموشی سے سنتا رہا، انہوں نے فرمایا "پورا عالم اسلام بڑے گھروں کے خطا میں مبتلا ہے، اس وقت دنیا کا سب سے بڑا گھل برداری کے سلطان کے پاس ہے، عرب میں سینکڑوں ہزاروں محلات ہیں اور ان محلات میں سونے اور چاندی کی دیواریں ہیں اور اسلامی دنیا اس وقت تیشی اور مٹی کی گاڑیوں کی سب سے بڑی مارکیٹ ہے "وہ خاموش ہوئے، وزیر اور سوچا اور پھر بولے "تم پاکستان کو دیکھو، تم ایوان صدر، وزیر اعظم ہاؤس، گورنر ہاؤس، گورنر مائنڈ ہاؤس، آئی جی ہاؤس، آئی بی ہاؤس، ڈی سی او ہاؤس اور سرکاری گیٹ ہاؤس کو دیکھو، یہ سب کیا ہیں؟ یہ سب بڑے گھر ہیں، پاکستان کے ایک ضلع میں 18 ویں گریڈ کے ایک سرکاری مہدیہ اسکول کا گھر 106 کنال پر مشتمل ہے، راولپنڈی کا ایک سابق ایوان صدر اس قدر وسیع تھا کہ اس میں یونیورسٹی بنائی گئی، اسلام آباد کے وزیر اعظم ہاؤس کا رقبہ قائد اعظم یونیورسٹی سے مجموعی رقبے سے چار گنا ہے، ایبٹ آباد گورنر ہاؤس پنجاب یونیورسٹی سے بڑا ہے اور ایوان صدر کا سا اتنا خرچ پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں سے مجموعی بیعت سے زیادہ ہے "میں خاموشی سے سنتا رہا "تم لوگ اپنے حکمرانوں کے دفتر دیکھو، ان کی شان و شوکت دیکھو، ان کے اثراجات اور عمدہ دیکھو، کیا یہ سب فرعونیت نہیں، کیا اس سارے مہمیا سے بددھی اللہ تعالیٰ ہم سے راضی رہے گا جبکہ اس کے برعکس تم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کا اٹھ سائل

دیکھو، بل تیس دنیا کا امیر ترین شخص ہے دنیا میں صرف 18 ممالک ایسے ہیں جو دولت میں بل تیس سے امیر ہیں باقی 192 ممالک اس سے کہیں غریب ہیں لیکن یہ شخص اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتا ہے، وہ اپنے برتن خود دھوتا ہے، وہ سال میں ایک دو مرتبہ ٹائی لگاتا ہے اور اس کا دفتر مائیکروسافٹ کے کلرکوں سے بڑا نہیں، وارن ہفٹ دنیا کا دوسرا امیر ترین شخص ہے اس کے پاس 50 برس پرانا اور چھوٹا گھر ہے، اس کے پاس 1980ء کی گاڑی ہے اور وہ روز کوکاکولا کے ذبے شورز پر سپائی کرتا ہے، برطانیہ کے وزیر اعظم کے پاس دو بیڈروم کا گھر ہے، جرمنی کی چانسلر کو سرکاری طور پر ایک بیڈروم اور ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم ملا ہے، اسرائیل کا وزیر اعظم دنیا کے سب سے چھوٹے گھر میں رہ رہا ہے، اس کی بجلی تک کٹ جاتی ہے، بل کنٹن کو لیونسکی کیس کے دوران کورٹ فیس ادا کرنے کے لئے دوستوں سے ادھار لینا پڑا تھا، وہ ایٹ ہاؤس کے صرف دو کمرے صدر کے استعمال میں ہیں، اول آفس میں صرف چار کرسیوں کی گنجائش ہے اور جاپان کے وزیر اعظم کو شام چار بجے کے بعد سرکاری گاڑی کی سہولت حاصل نہیں چتا چھ تم دیکھ لو چھوٹے گھروں والے یہ لوگ ہم جیسے بڑے گھروں والے لوگوں پر حکمرانی کر رہے ہیں، یہ آگے بڑھے ہیں اور ہم دن رات پیچھے جا رہے ہیں، لڑو جا موش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا "گویا آپ کا فرمانا ہے ہم ترقی نہیں کر سکتے؟" انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے "ہاں جب تک ہم فرعون کے دربار سے نکل کر موسیٰ کے خاک ساروں میں شامل نہیں ہوتے، جب تک ہم بڑے گھروں سے نقل مکانی کر کے چھوٹے گھروں میں نہیں آتے اور جب تک ہم قلعوں، ایوانوں اور محلوں سے نکل کر مکانوں، گھروں اور قلیوں میں شامل نہیں ہوتے ہم اس وقت تک ترقی نہیں کریں گے، ہم اس وقت تک بڑی قوم نہیں بنیں گے" وہ ر کے، انہوں نے کچھ سوچا اور مسکرا کر بولے تم خود بتاؤ "اللہ نے جو قانون اپنے نبیوں کیلئے نہیں بدل تھا وہ یہ قاعدہ ہمارے لئے کیوں تبدیل کرے گا۔"



جسے اللہ عزت دے

میں وزیر صاحب کو باہر چھوڑ کر واپس آیا تو میرا دوست اسی طرح منہ بھلا کر بیٹھا تھا،

اس کے چہرے پر بنا کواری، نفرت اور غصے کے تاثرات تھے۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی چہرے پر

اتنی لکیریں نہیں دیکھی تھیں جتنی اس وقت میرے دوست کے منہ پر تھیں، میں خاموش بیٹھ گیا، وہ

بڑی دیر تک اپنے جذبات سے الجھتا رہا، ہمارے درمیان وقت سرگتار با، آدھ گھنٹے بعد اس نے

سراٹھایا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "یہ تمہارا وزیر میرا پرانا کلاس فیلو ہے، ہم دونوں لنگوٹے

تھے۔ آج اس سے بیس برس بعد ملاقات ہوئی تو میں اپنے جوش کو دبا نہیں سکا، یہ اس بے تکلفی کا

عادی نہیں تھا چنانچہ بات بگڑ گئی، میں اس پر شرمندہ ہوں" میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا، اس

کی شرمندگی بجا تھی لیکن یہ واقعہ اس سے کہیں دلچسپ تھا۔

ایک گھنٹہ پہلے ہم دونوں دفتر میں بیٹھے تھے اچانک دروازہ کھلا اور وزیر صاحب اندر

داخل ہو گئے۔ میں ان کے استقبال کیلئے آگے بڑھا، میرا دوست بھی اپنی نشست سے اٹھا اور اس

نے دوری سے "اوائے" کا نعرہ لگا دیا۔ اس کے اس نعرے سے وزیر صاحب کا رنگ فق ہو گیا اور

مجھے پینت آ گیا، وزیر صاحب چپ چاپ بیٹھ گئے، وہ پندرہ منٹ میرے دفتر میں بیٹھے رہے اس

دوران میرا دوست انہیں ان کا بچپن یاد کراتا رہا۔ انہوں نے کس پیری سے کتنے ہیر توڑے تھے۔

انہوں نے کس لڑکی سے کتنے جوتے کھائے تھے اور انہوں نے کس کس سمجھے کی تاریخیں اتار کر کہاں کہاں بیچیں تھیں۔ وزیر صاحب ہر انکشاف پر جڑ بڑ ہو جاتے تھے، پہلو بدلنے تھے اور مجھ سے آنکھیں چراتے تھے، انہوں نے بڑی مشکل سے چائے شہم کی، اپنی ایک مصروفیت کا بہانہ بنایا اور رخصت ہو گئے، وہ جب دفتر سے نکلنے لگے تو میرا دوست ان سے بغل گیر ہونے کیلئے آگے بڑھا لیکن وزیر صاحب اسے "انگیزہ" کر کے باہر چلے گئے۔ میں انہیں پورچ میں چھوڑ کر واپس آیا تو میرا دوست شدید جلن اور پشیمانی کا شکار تھا، میں نے اس سے عرض کیا "تم اس سارے معاملے کے بونی سونی مجرم ہو تم نے بڑی کوشش کر کے اپنی بے عزتی کرائی تھی"۔ اس نے سرفاٹا کر میری طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، میں نے کہا "تمہارا سٹاکس دنیاوی لحاظ سے بھی ٹھیک نہیں تھا اور دینی لحاظ سے بھی" اس کے چہرے پر حقیر جھیل گیا، میں نے عرض کیا "ہم لوگ سرمائے کی دنیا میں آباد ہیں، ہم لوگ بینکوں میں اکاؤنٹس کھولتے ہیں اور ان اکاؤنٹس میں اپنی پونجی جمع کراتے ہیں۔ یہ بچت ہمارا سرمایہ ہوتی ہے اور یہ سرمایہ مشکل وقت میں ہمارے کام آتا ہے، ہم زمین جائیداد کھلی بیاتے ہیں، یہ زمین جائیداد ہمیں زندگی میں بہتے اصول اور احتیاط دینی ہے، ہم زیورات بھی خریدتے ہیں، ہم پرائز بانڈ، لائبریاں اور ڈالر بھی جمع کرتے ہیں، یہ سب سرمائے کی مختلف شکلیں ہیں اور یہ سرمایہ مشکل وقتوں میں ہمارے کام آتا ہے، کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو؟" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا، میں نے اس سے عرض کیا "دنیا میں سب سے بڑا سرمایہ انسان ہوتا ہے، جہاں ہماری دولت و زمین جائیداد اور سونا چاندی جواب دہ جاتی ہے وہاں ہمارے یمن بھائی اور دوست احباب کام آتے ہیں لہذا ہمارا سب سے بڑا اکاؤنٹ انسان ہوتے ہیں، جو لوگ ان "یومیمن اکاؤنٹس" پر توجہ نہیں دیتے، جو ان کے ذہن اور کریمینٹ کا خیال نہیں کرتے وہ بارشوں کے وقت اکیلے رہ جاتے ہیں اور ان کا مشکل وقت مزید مشکل ہو جاتا ہے" میرا دوست خاموشی سے میری بات سنتا رہا، میں نے عرض کیا "ہم لوگ پوری زندگی دوستیاں بناتے رہتے ہیں، ہم مشکل وقتوں میں اپنے دوستوں کا ساتھ دیتے ہیں، ہم انکسے یہ توڑتے ہیں، ہم ان کیلئے مانگتے ہیں اور ہم دوستی کے استحکام کیلئے، وہ یہ بھی خریدتے کرتے ہیں لیکن جب ہمارا دوست زندگی میں آگے نکل جاتا ہے، وہ جب سی ایس ایس کے بڑا فخر بن جاتا ہے، وہ وزیر ہو جاتا ہے

یادہ صنعت کار اور کارخانے دار بن جاتا ہے تو ہم اسے "اوسے" کہہ کر ناراض کر دیتے ہیں اور ہم اس سے فاصلے پر چلے جاتے ہیں، کیا ہمارا رویہ عقلی لحاظ سے درست ہے؟ "میرے دوست نے نفی میں سر ہلادیا، میں نے اس سے کہا "ہم کتنے بے وقوف لوگ ہیں، ہمارا دوست جب ہماری طرح بے بس، بے اختیار اور غریب تھا تو ہم اس کی عزت کرتے رہے تھے لیکن جب وہ ہماری مدد کرنے کے قابل ہوا تو ہم نے اس کی بے عزتی شروع کر دی، ہم نے اسے ناراض کر دیا" میں خاموش ہو گیا۔

وہ بولا "بھیس کیا کرنا چاہیے" میں نے عرض کیا "بھیس دوست کی کامیابی کو نورا تسلیم کر لینا چاہیے، بھیس اپنے دوستوں کے عروج کے زمانے میں انہیں ماضی کے مقابلے میں زیادہ عزت دینی چاہیے، بھیس ان کی ترقی کو مان لینا چاہیے" وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا، میں نے عرض کیا "یہ دنیاوی پہلو تھا، اب آتے ہیں اس واقعے کے دینی پہلو کی طرف، میں تم سے ایک

سوال کرنا چاہتا ہوں "لوہہ لہنگہ کوش ہو گیا، محمد نے پوچھا "غیر ذمہ فرعون اور ابو جہل کا انجام کیوں برابرا ہوا تھا؟" اس نے تھوڑی دیر سوچا اور مسکرا کر بولا "یہ لوگ مشرک تھے لہذا یہ اللہ کے عذاب کا

شکار ہوئے" میں نے ہاں میں گردن بلائی اور اس کے بعد عرض کیا "میرے عزیز یہ فقط ایک پہلو ہے، اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے" اس نے پوری آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا، میں نے عرض کیا "اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام کو عزت بخشی تھی لیکن ان لوگوں نے انبیاء کرام کی توہین شروع کر دی چنانچہ یہ لوگ اللہ کے عذاب کا شکار ہو گئے، تم دیکھ لو ان انبیاء کرام کے اودار میں بے شمار ایسے لوگ تھے جو پوری زندگی مشرک پر قائم رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی قسم کی سزا نہ دی کیوں؟ کیونکہ یہ لوگ مشرک کے ساتھ انبیاء کرام کی توہین نہیں کرتے تھے لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں غرور فرعون اور ابو جہل کے انجام سے بچائے رکھا" میرا دماغی ہے جب قدرت لوگوں کو عزت دیتی ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے اس کے بندے اس کے فیصلے کا احترام کریں دو بھی اس شخص کی عزت کریں لیکن جب کوئی شخص ان لوگوں کی توہین کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے برداشت نہیں کرتا اور وہ اسے اپنے فیصلے، اپنے کرم اور اپنے ہم کی توہین سمجھتا ہے" میں رکا، میرا وہ دست خاموشی سے دیکھتا رہا، میں نے عرض کیا "اللہ تعالیٰ کو انسان کی کوئی ایک ادا پسند آ جاتی ہے جس کے بدلے میں

زیر پوائنٹ 3 0 412

وہ اسے نیک نامی سے نوازتا ہے لہذا میرا خیال ہے اللہ تعالیٰ جسے عزت دے ہمیں اس کی توہین کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے ہمیں اس کی برتری تسلیم کر لینی چاہیے بصورت دیگر ہم فرعون کے انجام کا شکار ہو جاتے ہیں "میرے دوست نے میری بات سنی مجھ سے وزیر صاحب کا ٹیلی فون نمبر لیا اور دفتر سے رخصت ہو گیا۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

آج سے

وہ آگے جھکا اور سرگوشی میں بولا "سر اس ملک میں کوئی ایسی بات بھی ہوگی؟ چمن سے گواد اور کراچی سے لنڈی کوٹ تک سرکاری نظام بچا ہے اس نظام کا کوئی نہ کوئی پرزہ، کوئی نہ کوئی کارندہ اچھا، ایماندار اور مخلص بھی ہوگا؟ اس ملک میں 16 کروڑ لوگ رہتے ہیں ان 16 کروڑ میں چند اچھے لوگ بھی ہوں گے؟ مسلم لیگ (ق) ملک کی رونگ پارتی ہے اس جماعت میں بھی کوئی نہ کوئی درد دل رکھنے والا باضمیر شخص ہوگا اور صدر پرویز مشرف اور شوکت عزیز میں بے شمار خرابیاں اور خامیاں ہوں گی لیکن ان دونوں نے پچھلے سات برسوں میں کچھ اچھے کام بھی کئے ہوں گے؟ آپ وہ کام، وہ اچھائیاں اور وہ خوبیاں بیان کیوں نہیں کرتے؟ آپ تصویر کے دوسرے رخ پر کیوں نظر رکھتے ہیں؟"

میں غور سے اس کی بات سنتا رہا، وہ خاموش ہوا تو میں نے عرض کیا "اس ملک اور اس ملک کے پاسیوں میں بے شمار خوبیاں اور بے شمار اچھائیاں ہیں دنیا میں اس وقت 140 ممالک میں خیرات، صدقہ اور چیریٹی ہوتی ہے، ان 140 ممالک کی فہرست میں پاکستان پانچویں نمبر پر ہے، ہم پوری دنیا میں فی کس آمدنی کے لحاظ سے سب سے زیادہ خیرات دینے والے لوگ ہیں، پاکستان میں ہر سال 100 سے 140 ارب روپے ضرورت مندوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں، پاکستان دنیا میں مفت کھانا کھلانے والے آٹھ ممالک میں شامل ہے، پاکستان میں اس وقت

ازحائی ہزار کے قریب ایسے حزار ہیں جن پر دن رات نگر چلتا ہے اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ ان حزاروں سے کھانا کھاتے ہیں، آپ لاہور کے داتا دربار، اسلام آباد کے بری امام، سبون شریف کے محلی لال شہباز قلندر اور کراچی کے شاہ غازی کے دربار پر جا کر دیکھ لیں آپ کو وہاں چڑھیں کھنے نگر چلتا ملے گا، پاکستان کا ہر شہری ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہے، لوگ اپنے کپڑے، جوتے، برتن، دوائیں اور فرنیچر ضرورت مندوں کو دے دیتے ہیں، پاکستان میں لاکھوں خیم خانے، بیوہ گھر، مسجدیں، درگاہیں، دربار، قبرستان اور سکول اہل ثروت کے پیسوں سے چل رہے ہیں اس وقت پاکستان میں چھوٹے بڑے دس لاکھ کے قریب مدر سے ہیں یہ تمام مدارس عوام کی معاونت سے چل رہے ہیں اور ان میں تعلیم پانے والے بچوں کو نہ صرف کتابیں دی جاتی ہیں بلکہ انہیں رہائش، کھانا اور لباس تک فراہم کیا جاتا ہے، ہمارے مدارس دنیا کا سب سے بڑا چیرٹی بورڈنگ سسٹم ہیں، اس وقت پاکستان کے تمام قصبوں اور شہروں میں ایسے سکول، ہسپتال اور ڈسپنسریاں موجود ہیں جن میں تعلیم اور علاج کی سہولت مفت دی جاتی ہے، دنیا کی سب سے بڑی پرائیویٹ ایجوکیشن سروس پاکستان میں ہے، ہمارے عبدالستار ایڈمی کنیوٹیو بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہیں اس وقت دنیا میں کیفر کا سب سے بڑا چیرٹی ہسپتال پاکستان میں ہے، یہ ہسپتال کرکٹ سٹار عمران خان نے بنایا تھا اور پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس کا ہر چوتھا شہری فلاح عامہ کا کوئی نہ کوئی کام کر رہا ہے اور جس میں رمضان میں ہر گھر میں انٹاری کی دعوت ہوتی ہے اور جس میں سب سے زیادہ خون دیا جاتا ہے اور جس میں بحران، آفت اور حادثے میں لوگ دوسروں کی سب سے زیادہ مدد کرتے ہیں اور پاکستان دنیا کا دوسرا ملک تھا جس نے بچپن سے چالیس لاکھ غیر ملکیوں کو پناہ دی تھی اور پاکستان کا شمار دنیا کے ان چند ممالک میں ہوتا ہے جس میں لوگ بھوکے نہیں سوتے۔

میں رکا اور اس کے بعد عرض کیا "وہ گیا ہمارا سرکاری نظام تو آج کے زمانے میں بھی پولیس، محکمہ مال اور کسٹم میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی ایمانداری کی قسم کھائی جاسکتی ہے، ہمارے ملک میں ایسے جج بھی موجود ہیں جن کے تمام فیصلے ضمیر کے کعبے سے نکلتے ہیں اور ایسے سیاستدان بھی زندہ ہیں جو برائی کو برائی اور اچھائی کو اچھائی کہنے کی جرأت رکھتے ہیں" میں خاموش ہو گیا اس نے کرسی پر کروٹ لی اور مسکرا کر بولا "پھر آپ ان لوگوں کے بارے میں کیوں نہیں لکھتے" میں نے عرض کیا "اس کی دود جو بات ہیں اول یہ تمام انفرادی اچھائیاں ہیں اور یہ آج

تک اجتماعی شکل اختیار نہیں کر سکیں دوسرا ہمارے ملک میں برائی اچھائی پر غالب آ رہی ہے، ہمارا ہر نیا دن ہمارے کسی نہ کسی اچھے، پائیدار اور ایماندار شخص کی لغزش سے طلوع ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام معاشروں میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے بھی، ہم نے دیکھا یہ ہوتا ہے معاشرے میں اچھے لوگ زیادہ ہیں یا برے، اگر کسی معاشرے میں عبدالستار ایڈمی جیسے لوگ زیادہ ہوں تو وہ معاشرہ اچھا ہوتا ہے اور اگر اس میں بلیک مسلموں، بد معاشوں، بدتماشوں، سمجھوتے بازوں، ابن الوتوں، غراڈیوں، ڈکیتوں، چوروں اور نوسر بازوں کی تعداد زیادہ ہو تو وہ معاشرہ برا ہوتا ہے، بد قسمتی سے ہمارے معاشرے، ہمارے ملک میں پہلی قسم کے لوگوں کی تعداد کم اور دوسری قسم کے لوگ تعداد اور اثر سونخ میں زیادہ ہیں۔ اگر مسئلہ صرف یہ ہوتا تو شاید اتنی پریشانی نہ ہوتی لیکن اصل مسئلہ پہلی قسم کے لوگوں کی تعداد میں آنے والی کمی ہے۔ ہمارے ملک سے جب بھی کوئی اچھا شخص رخصت ہوتا ہے تو پورے ملک میں اس کی جگہ لینے والا کوئی نظر نہیں آتا اور ہمارے سارے کھیتوں میں برائی کی بیجی لگی ہے اس میں کوئی شک نہیں خیرات، چیرئی اور ہمدردی بہت بڑی دولت ہوتی ہے لیکن معاشرے صرف ان سے نہیں چلا کرے، معاشروں کو تعلیم، روزگار، انصاف، جمہوریت، سڑکیں اور صاف پانی بھی چاہیے، خوف، لالچ اور ظلم سے پاک ماحول بھی درکار ہوتا ہے لیکن بد قسمتی سے ہماری مسجدوں کے امام تک سیکورٹی گارڈ کے بغیر نماز شروع نہیں کراتے اور ہمارا پانی اور بجلی کا وائرنگ منرل وائر پینا اور گھر میں جنزیر چلتا ہے، ہمارے وزیر تعلیم کے بچے پرائیویٹ سکولوں میں پڑھتے ہیں اور ہمارا وزیر صحت پرائیویٹ ہسپتالوں میں علاج کراتا ہے۔ ذرا سوچو کیا ان حالات پر ہمارا دل نہ دکھے، ذرا سوچو اگر ہم بھی ان حالات پر خاموش ہو جائیں، اگر ہم بھی عوام کو معاشرے کی مصدوم ہوتی اچھائیوں کا لالی پاپ دینا شروع کریں اور اگر ہم بھی لوگوں کو خوش فہمیوں کی اٹیون کھانا شروع کریں تو ظلم کے خلاف آواز کون اٹھائے گا؟ کون بات کرے گا؟ اور لوگوں کو کون دگائے گا؟ میں خاموش ہو گیا۔

اس نے ذرا دیر سوچا اور مسکرا کر بولا "سر ہم لوگ بہت دکھی ہیں اوپر سے آپ لوگ ہمارے زخموں پر نمک چھڑک دیتے ہیں جس سے ہماری تکلیف میں اضافہ ہو جاتا ہے آپ مہربانی فرما کر کبھی کبھی ان زخموں پر مرہم بھی رکھ دیا کریں، سر مریض کو جو صلے کی ضرورت ہوتی ہے، ہم جانتے ہیں آپ ہمیں شفا نہیں دے سکتے لیکن آپ ہمیں کم از کم تسکین تو دے سکتے ہیں، آپ ہماری بہت توجہ دے سکتے ہیں، آہ کبھی کبھی اسباب، کروا کر س، آہ کی مدد مانی ہوگی" میں نے قبضہ لگا

اور آگے جھک کر عرض کیا "مریض کو حوصلے اور تھکی سے پہلے دوا کی ضرورت ہوتی ہے، دنیا کی دس ہزار تھکیاں مل کر کسی ایک شخص کا درد نہیں مٹا سکتیں، اگر تم چاہتے ہو میں ڈاکٹر کو بلانے کے بجائے مریض کے سر ہانے بیٹھ کر بانسری بجانا شروع کر دوں تو میں حاضر ہوں، میں آج سے تصویر کا وہ رخ پیش کرنا شروع کر دیتا ہوں جس نے ابھی جنم نہیں لیا، میں آج سے اس خوشحالی، اس امن، اس سکون، اس انصاف اور اس جمہوریت کے گن گانا شروع کر دیتا ہوں جس کا ابھی پہلا بیج پیدا نہیں ہوا، جس کے تصور تک نے ابھی ہماری رونگ کلاس کے دماغ پر دستک نہیں دی، میں آج سے خالی گلاس کو بھرا کہنا شروع کر دیتا ہوں اور میں پتھر میں ڈرل مشین سے سرخ گلاب کی قلم لگا دیتا ہوں، میں آج سے پاکستان کی حکومت، برادارے اور آنے والے ہر حکمران کو پابندہ باو کہنا شروع کر دیتا ہوں، میں آج سے جو ہڑ کے کنارے بیٹھ کر امید کے سورجوں کا انتظار شروع کر دیتا ہوں، میں آج سے سرکنڈوں سے ذمفران چھڑنے کی امید شروع کر دیتا ہوں اور میں آج سے توڑے کی دوسری پرت کو روشن کہنا شروع کر دیتا ہوں تو میں خود کو تہہ مل کر لیتا ہوں اب تم لوگ تسلی اور تھکی سے اپنے سارے مسائل حل کر لو تم لوگ تھیلیوں پر چڑھنا لو اور تم ہاتھیوں کو قیدر پارلو"





ہم سارا دن بیٹھی کے کنکڑرات میں بھرتے رہے اور شام کو سورتو چلے گئے سورتو میں اس وقت سورج ڈوب رہا تھا ہمارے ہونک کی کھڑکی سے سمندر کے چمکے کھاتے کناروں تک سونے کا ایک سنہری راستہ بچھا تھا تم نے کہا تھا ”مجھے یقین نہیں آتا دنیا میں ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں سبز پہاڑوں کے قدموں میں سمندر ہوں“ میں خاموش رہا تم نے پوچھا ”کیا ہم دوبارہ اس جگہ آئیں گے“ میں نے اثبات میں

میں سر ہلا دیا تب تم نے ناخن سے کھڑکی کے فریم پر تاریخ لکھ دی تمہیں یاد ہوگا ہماری اگلی صبح کپہری میں طلوع ہوئی تھی کپہری سمندر کے درمیان ایک خوبصورت پہاڑ تھا اور اس پہاڑ پر کپہری کا شہر آباد تھا بالکل پرستان جیسا شہر کپہری پہاڑ کے نیچے یا قوت کا غار تھا اور اس غار میں تلے پانیوں کی ”آزردہ لیک“ تھی ہمارے اطالوی ملا نے لیک میں داخل ہوتے ہی کوئی دھن چھینر دی تھی تب تم نے پانی میں انگلیاں ڈبوی تھیں اور عمارکی دیوار پر میرا نام لکھ دیا تھا تم نے دہش کی گرم دہت پر بھی میرا نام لکھا تھا تم نے موٹی کارلو کے رائٹل گارڈن کے درختوں کی ٹین کے سٹلٹے ساحل وٹس کے گنڈولوں، فگورس کے عجائب گھروں ایپسا کے مینار سلمان کے ڈومو جرج آ نکل اور کی جونی جرج کے گنڈولوں اور انیسویں ڈیک کے پتوں پر بھی میرا نام لکھا تھا تم نے بروچ کی نبر میں لہروں سے تصویریں بھی بنائی تھیں تم نے روس کے نوادروں میں اپنے اور میرے نام کے نکلے بھی چھپکے تھے اور تم نے ہاں تم نے جس کے پیکال جرج میں ہمارے نام کی موم عتی بھی جلائی تھی لیکن ان موم عتیوں ان تصویروں ان سکوں اور ریت پر کھینچے ان حرفوں کا کیا نتیجہ نکلا! جب وقت بدلا تو کوئی حرف کوئی تصویر اور کوئی موم عتی ہمیں نونے ہمیں بکھرنے سے نہ بچا سکی کوئی وعدہ سورج کے کھر تک جانے کی کوئی خواہش اور آفرقی سانس تک چلنے رہنے آگے بڑھتے رہنے کا کوئی عہد ہمیں الگ ہونے سے نہ روک سکا اور ہم اور ہماری خواہشیں بھی بالآخر لہروں کے ساتھ بہ گئیں ہم بھی ماضی کے بے شمار لوگوں کی طرح ماضی کی دیوار میں چن دینے گئے۔

میں آج ایک بار پھر سورتو کی اسی کھڑکی میں کھڑا ہوں اور میرے سامنے سورج کا سنہری راستہ بچھا ہے لیکن کھڑکی کے فریم پر کسی اور کا نام لکھا ہے میں اوپر آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں اور اپنے خالق سے پوچھ رہا ہوں یا باری تعالیٰ یہ کیسی دنیا ہے جس میں کھڑکیوں غاروں دیواروں اور فراروں کی عمریں بھی اور انسانوں اور ان کے جذبوں کی سانس چھوٹی ہوتی ہیں جس میں انسان چلے جاتے ہیں لیکن کھڑکیاں رو جاتی ہیں مجھے آسمان سے کوئی جواب نہیں مل رہا پلیز تم بھی اپنی کھڑکی چھو لو اور آسمان سے یہ سوال ضرور پوچھو شاید تمہیں جواب مل جائے۔

علم و فن پبلشرز

34 اورنگ آباد بازار، لاہور۔ فون: 7222226، 7222222